بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ

ترجمہ: ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے
تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟

معالم العرفان
فی
دروس القرآن

افادات
حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی
خطیب جامع مسجد نور
بانی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

مرتب
الحاج لعل دین، ایم۔اے [علوم اسلامیہ]

ناشر
مکتبہ دروس القرآن
فاروق گنج ○ گوجرانوالہ

روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

سورۃ البقرۃ

جلد ۳

افادات

حضرت مولانا صوفی عبد الحمید صاحب سواتی دام مجدہم

خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

چھبیسواں ایڈیشن

(جملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

نام کتاب .... معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ بقرہ آیت نمبر ۱۴۲ تا آخر سورۃ) جلد ۳

افادات .... حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

مرتب .... الحاج لعل دین۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالامار ٹاؤن لاہور

تعداد طباعت .... پانچ سو (۵۰۰)

سرورق .... سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسینی رحمۃ اللہ علیہ

کتابت .... محمد امان اللہ قادری، گوجرانوالہ

ناشر .... مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

قیمت .... -/260 روپے (دوسو ساٹھ روپے)

تاریخ طبع چھبیسواں ایڈیشن۔ ذوالقعدہ ۱۴۳۴ھ بمطابق اکتوبر 2013

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ

(۲) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور

(۳) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور

(۴) مکتبہ سید احمد شہیدؒ، اردو بازار، لاہور

(۵) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی

(۶) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان

(۷) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی

(۸) اسلامیہ کتب خانہ اڈا گامی، ایبٹ آباد

(۹) مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ

(۱۰) مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور

(۱۱) کتب خانہ صفدریہ حق سٹریٹ اردو بازار لاہور

فہرست عنوانات

معالم العرفان فی دروس القرآن جلد نمبر ۳

پیش لفظ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی
اَمَّا بَعْد

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا وہ آخری کلام ہے، جسے خود اللہ جل شانہ نے احسن الحدیث کا لقب دیا ہے۔ اَللّٰہُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِھًا مَّثَانِیَ عربی کا ایک مقولہ ہے "کلام الملوک ملوک الکلام" جو کلام خود مالک الملک کا ہے، اس سے بہتر کلام کس کا ہوسکتا ہے جس کلام کی نسبت خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ کی طرف ہے اس کی ہمسری کا دعویٰ کون کرسکتا ہے۔ اور جس کے متعلق وہ خود اعلان فرمائے کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا اُس سے اعلیٰ وارفع کلام کس کا ہوسکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود چیلنج کردیا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا اُس خداوند قدوس کی بات سے سچی بات کس کی ہوسکتی ہے فرمایا اگر ان حقائق کے متعلق کوئی شک ہے۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ تو اس جیسی ایک ہی سورۃ بنا کر لے آؤ، مگر یہ چیلنج آج تک تشنہ قبولیت رہا ہے۔

آیئے ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور اُن سے پوچھیں کہ کیا ہم نے قرآن حکیم کو وہ مقام دیدیا ہے جس کا وہ متقاضی ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں اپنے دلوں کی زمین کو پرکھنا ہوگا کہ وہ قرآن پاک کی برکات کو جذب کرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں وَالْبَلَدُ الطَّیِّبُ یَخْرُجُ نَبَاتُہٗ بِاِذْنِ رَبِّہٖ وَالَّذِیْ خَبُثَ لَا یَخْرُجُ اِلَّا نَکِدًا اچھی زمین اللہ کے حکم سے سبزیاں اُگاتی ہے مگر خراب زمین سے فضول چیزیں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ اپنے دلوں سے سوال کرنے سے پہلے آیئے قرآن پاک کے اولین مخاطبین کی طرف ایک نگاہ اٹھا کر دیکھ لیں کہ

اُن پاکیزہ دِلوں نے اِس احسن الکلام کی برکات کو کس طرح اپنے اندر سمیٹ لیا۔

فاروق اعظمؓ کی شہ زوری کے قصّے زبان زدِ عام تھے۔ آپ قلب وجسم اور ارادے کے مضبوط اللسان تھے، دیگر مخالفین کی طرح اہلِ اسلام کو ترکا کرنے میں پیش پیش تھے۔ ایک رات ناپاک ارادے سے نکلتے ہیں حضور علیہ السلام حرم شریف میں نماز ادا کرتے ہیں، سورۃ الحاقّۃ کی آیات زبان پر ہیں اَلْحَآقَّةُ ٥ مَا الْحَآقَّةُ ٥ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ کان میں آواز پڑی تو اس کی حلاوت وشیرینی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ مخالفت کی آگ ٹھنڈی ہوگئی، قرآن کے نظم اور اسلوب بیان پر غور کیا۔ تو خیال پیدا ہوا کہ شاید یہ کسی شاعر کا کلام ہے مگر اسی لمحہ حضور علیہ السلام کی زبان مبارک پر یہ آیت تھی اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ٥ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ٥ یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ پھر خیال آیا شاید یہ کسی کاہن کا کلام ہو مگر اس کا جواب تھا وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ یہ کسی کاہن کا کلام بھی نہیں بلکہ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٥ یہ تو تمام جہانوں کے پروردگار کا نازل کردہ ہے۔ دِل پہ چوٹ لگ چکی تھی۔ قرآن پاک کی حقانیت سے مغلوب ہو ہو چکے تھے مگر ابھی مخالفت برائے مخالفت کا اثر باقی تھا۔

پھر یہی عمر فاروقؓ ایک دن ہادئ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے نکلتے ہیں کہ راستے میں بہن اور بہنوئی کے ایمان لانے کی خبر ملتی ہے۔ فوراً ادھر کا رُخ کرتے ہیں۔ دونوں کو ظلم وستم کا نشانہ بناتے ہیں مگر جونہی سورۃ طٰہٰ کی آیات کان میں پڑتی ہیں طٰهٰ ٥ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ٥ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى (اے رسولِ اعظم! ہم نے یہ قرآن آپ پر اس لیے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں، یہ تو ہر ڈرنے والے شخص کے لیے یاددہانی ہے)

فاروق اعظمؓ کی تمام شقاوت دُور ہو چکی تھی۔ بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگے اشکوں کا سیلاب امڈ آیا، قلب نورِ ایمان سے منور ہوگیا، چنانچہ درِ اقدس پر حاضر ہو کر کلمہ پڑھ لیا۔

طفیل دوسی بہت بڑے شاعر وادیب اور اپنے قبیلے کے معززین میں سے تھے۔

مکے آتے ہیں تو قریش نے ہر چند سمجھایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دام میں نہ پھنس جانا۔ پہلے تو کانوں میں روئی ٹھونس کر پھرتے رہے کہ کہیں حضور علیہ السلام کی آواز کان میں نہ پڑ جائے، پھر خیال آیا کہ میں بھی شعر و ادب پہ عبور رکھتا ہوں، کیوں نہ اُس کلام کا بھی جائزہ لیا جائے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نماز میں قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہیں۔ طفیل سنتا ہے اور سنتا ہی رہ جاتا ہے جب آپ نے نماز ختم کی تو ساتھ ہی ہو لیا۔ اور اپنے آپ کو اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کا مصداق بنا دیا، خود کہا کرتے تھے "خدا کی قسم آج تک اس سے بہتر کلام نہ میرے کانوں نے سنا اور نہ اس سے زیادہ عادلانہ مذہب کوئی دیکھا۔

جبیرؓ ابن مطعم نیک سیرت انسان تھے۔ مگر جاہلیت کی عصبیت قبول حق میں مانع تھی۔ جنگ بدر کے قیدی چھڑانے کے لیے دونوں مدینہ منورہ آئے، حضور نبی کریم نماز میں سورۃ طور کی تلاوت فرما رہے ہیں وَالطُّوْرِ ۝ وَکِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝ وَّالْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ ۝ جبیر کہتے ہیں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا قلب پھٹ جائیگا، پھر جب آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۝ تو کپکپی طاری ہوگئی۔ ایسا خوف پیدا ہوا کہ کہیں اسی وقت اللہ کا عذاب نازل نہ ہو جائے۔ اس کے بعد آپ جلد ہی ایمان لے آئے۔

حضرت عثمانؓ ابن مظعون کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ سادہ طبیعت اور نیک انسان تھے، سورۃ نحل کی آیت سنتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ خود بیان کرتے ہیں، کہ "یہی وہ وقت ہے جب ایمان میرے دل میں جاگزیں ہوا اور میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے لگا۔

الغرض! خود قرآن پاک نے اپنے متعلق فرمایا۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ط اگر یہ قرآن پہاڑوں پہ نازل ہوتا تو وہ بھی خوفِ الٰہی سے ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ مگر ایک حضرت انسان

ہے، جو اسکی اثر انگیزی سے بیگانہ اور اس کی برکات سے محروم ہے۔ ہاں اس کا اثر وہ شخص قبول کرتا ہے۔ جس کے پاس سوچنے والا دماغ، سمجھنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھ ہے۔ جس کی آنکھ میں روشنی نہیں اس کے لیے آفتاب کی روشنی بھی بیکار ہے۔ قرآن پاک قلب و ذہن کی کایا پلٹ دینے والا کلام ہے۔ اس میں دلوں کو کھینچ لینے والی مقناطیسیت ہے۔ اس نغمہ میں وہ سرور ہے، جس کو سن کر انسان تو کجا شجر و حجر بھی وجد میں آجاتے ہیں۔ یہ قلب کو گرما اور روح کو تڑپا دینے والا کلام ہے۔ اللہ نے اس کا نام ہدایت بھی رکھا ہے اور نور بھی۔ یہ برہان بھی ہے اور فرقان بھی۔ اس میں رحمت بھی ہے اور شفا بھی۔ کاش! ہم اس کی برکات کو اپنے دامن میں سمیٹ سکیں۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے سلسلہ دروس القرآن جاری ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ اس کار خیر میں حصہ لینے والی پوری ٹیم اور اس کے ساتھ دامے، درمے، سخنے تعاون کرنے والے حضرات کی استقامت اور کامیابی کی دعا کریں۔

الحمد للہ سلسلہ دروس القرآن کی تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پیشتر مختلف جلدوں کا مختصر تعارف ہر جلد کے ساتھ آچکا ہے۔ یہ جلد اس لحاظ سے اہم ہے۔ کہ اس کے ذریعے سورۃ البقرہ کی تکمیل ہو رہی ہے۔ قرآن حکیم کی طویل ترین سورۃ کو دو حصوں میں شائع کیا گیا ہے پہلا حصہ پہلے پارے پر مشتمل تھا، اب دوسرے حصے میں دوسرا مکمل پارہ اور تیسرا پارہ تا اختتام سورۃ شامل ہو گیا ہے اللہ تعالےٰ کا لاکھ شکر ہے کہ اس نے اس کام کی توفیق بخشی۔ جیسا کہ گزشتہ جلد کی ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے۔ سورۃ آل عمران پر بیشتر کام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ جلد بھی جلد ہی زیور طباعت سے مزین ہو کر قارئین کے مطالعہ میں آجائے گی۔ انشاء اللہ

سورۃ البقرہ سے پہلے تیسویں ۳۰ پارے پر مشتمل بیسویں جلد شائع ہوئی تھی۔ قارئین کرام تیسویں پارے اور سورۃ البقرہ کے مضامین میں واضح فرق محسوس کریں گے بیسویں جلد کی ۳۷ سورتوں میں سے ۳۴ مکی دور کی ہیں جب کہ صرف ۳ سورتیں مدنی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ تیرہ سالہ مکی دور میں قرآن پاک نے اپنے مخاطبین کو اسلام کی ابتدائی دعوت

دی چنانچہ مکی سورتوں میں کفر و شرک کا رد، ایمانیات اور معاد سے متعلق موضوعات ہیں برعلاف اس کے مدنی سورتوں کے مضامین مختلف نوعیت کے ہیں۔

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو سب سے پہلے یہودیوں سے واسطہ پڑا۔ یہ لوگ تورات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیاں پڑھ کر اُن کی آمد کے منتظر تھے۔ وہ اس زعم میں مبتلا تھے۔ کہ اللہ کا آخری نبی بنی اسرائیل میں سے آئے گا، اور وہ اُسے فوراً تسلیم کر لیں گے، اُن کی توقع کے خلاف جب دعویٰ نبوت بنو اسماعیل کے ایک فرد نے کیا، تو یہودی حسد کی آگ میں جل گئے۔ وہ سمجھتے تھے۔ کہ اگر انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم کر لیا تو اُن کی ساری اجارہ داری اور دوسری اقوام پر تفوق ختم ہو جائے گا لہٰذا انہوں نے آپ کی رسالت کا سرے سے انکار ہی کر دیا اور پھر اس انکار پہ اصرار کرتے ہوئے اہل اسلام کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ دوسری طرف کچھ یہودی ایسے بھی تھے، جو اسلام کا روشن مستقبل دیکھ کر بظاہر مسلمان ہو گئے، مگر ان کے دل یہودیوں کے ساتھ منسلک رہے۔ اور اس طرح یہ لوگ مسلمانوں کے اندر سے اُن پہ شب خون مار کر اُن کی جمعیت کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے رہے یہ لوگ منافق کہلائے چنانچہ سورۃ بقرہ کے بیشتر حصہ میں۔ اہل کتاب یہود اور منافقین کی سازشوں کا تذکرہ ہے۔

مدینہ منورہ پہنچ کر مسلمان ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اب انہیں روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کے لیے قانون کی ضرورت تھی چنانچہ اس طویل سورۃ میں ایمانیات کے علاوہ، نماز، روزہ، حج، قربانی، انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ سے متعلق کچھ تفصیلات آگئی ہیں۔ حلت و حرمت کے مسائل ہیں۔ ازدواجی زندگی اور اس سے متعلقہ مسائل نکاح، طلاق، خلع، عدت، مہر، نان نفقہ رضاعت وغیرہ کی بعض تفصیلات ہیں، معاشرتی مسائل میں والدین، اقربا، ہمسایوں اور یتیموں وغیرہ سے حسن سلوک کی تلقین ہے۔ خیرات و صدقات کی برکات، لین دین کے معاملات، مقروض کے ساتھ نرمی، شہادت اور امانت جیسے مسائل بھی آگئے ہیں صلح و جنگ کے قواعد، قصاص اور دیت کی بعض مبادیات بھی آگئی ہیں۔ اس سورۃ

میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، فرشتوں کے ساتھ مکالمہ اور ابلیس کا تذکرہ بھی مجملاً ہو گیا جد الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی اولاد میں منصب امامت کے قیام اور پھر اسی ضمن میں بیت اللہ شریف کی تعمیر اور دیگر شعائر اللہ کا مختصر بیان بھی آ گیا ہے۔

ہمیں پورا پورا احساس ہے۔ کہ اس جلد کی اشاعت میں اندازے سے زیادہ عرصہ لگ گیا ہے۔ کام کی رفتار بھی قدرے سست رہی، نیز اس عرصہ میں ادارہ کو حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب کی گراں قدر تالیف "نماز مسنون کلاں" کی طرف بھی توجہ مبذول کرنا پڑی۔ بلاشبہ نماز کے موضوع پر اس ضخیم کتاب نے باقی کتب سے بے نیاز کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محترم صوفی صاحب کی ایک دیرینہ خواہش اور عوام کی اہم ضرورت کو پورا فرما دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ صوفی صاحب کو اجرِ عظیم عطا فرمائے اور آپ کو دین کی مزید خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ قارئین سے التماس ہے۔ کہ آپ کی صحت اور درازی عمر کے لیے صدق دل سے دعا کریں۔

امید ہے کہ سلسلہ دروس القرآن کی آئندہ جلد کم از کم وقت میں شائع ہو جائے گی۔

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ

احقر العباد

لعل دین

ایم اے (علوم اسلامیہ)

شالامار ٹاؤن لاہور

---

(۱) یہ تفسیر الحمد للہ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ میں مکمل بیس جلدوں میں شائع ہو گئی ہے۔ (فیاض)

سخنہائے گفتنی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْکَرِیْمِ خَاتَمِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ :- اَمَّا بَعْد

مستند جامع، قرآن، احادیث اور مسلک سلف کے مطابق تفسیر، سادہ، دلپسند، پُرمغز اور تصنع سے پاک انداز بیان، مختصر، عام فہم اور اغلاق سے مبرّا مضامین، اسلام کے بنیادی عقائد کی توضیح و تبیین، کفر، شرک اور بدعات کا احسن طریقے سے رد، مخالفین پر تنقید میں اعتدال، اور تلخی درشتگی، سے گریز۔

مسلمانوں کی بنیادی خامیوں کی نشاندہی اور اس میں راہ عمل، باطل نظامہائے حکومت پر بے لاگ تبصرہ، قصص کا سلسلہ مربوط اور دلکش حکمت ولی اللہی، ضروری فقہی مسائل سیاسی، اقتصادی، معاشی مسائل اور عصر حاضر میں ان کا حل اور اس طرح کی مفید بحثیں درس القرآن کا خاص امتیازہے۔

ولی اللہی فکر اور قرآن کریم کی انقلابی روح کو پوری طرح ان دروس میں سمونے کی کوشش کی گئی ہے، رواں دواں سہل، مانوس، آسان اور سادہ زبان استعمال کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشی بدحالی کا پورا کھوج لگایا گیا ہے۔ اور قرآنی طریق کار کی طرف ان کا رُخ موڑنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ سائنسی اور جدید دور میں مشکل حالات کا مقابلہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں قرآنی روشنی کی طرف راہنمائی کی گئی ہے۔ لہو ولعب، عیاشی و فحاشی اور رفاہیت بالغہ کی پوری طرح حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔

مسلمانوں کی فکری گمراہی اور ذہنی غلامی کے فساد کو پوری طرح نمایاں کیا گیا ہے۔

دروس القرآن صحیح معنوں میں اساتذہ و شیوخ سے حاصل کردہ اور حضرت صوفی صاحب دام مجدہم کی زندگی بھر کے مطالعہ سے حاصل ہونے والے علوم و فنون کا نچوڑ ہے۔

زیر نظر جلد پارہ ۲ کے شروع سے سورۃ بقرہ کے آخر تک کے حصہ پر مشتمل ہے اس جلد میں دعوت الی التوحید والرسالت، فرائض خمسہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ایمانیات، خلافت کبریٰ کے تمام اہم اصولوں، نظام سلطنت، سیاست مدن قانون خانہ داری، جہاد فی سبیل اللہ، صداقت قرآن، علم القصص اور بہت سی مثالوں اور دیگر بہت سے مضامین کا ذکر ہے۔

قرآن پاک کا منشاء سمجھنے اور اذہان کو قرآن پاک کے قریب تر کرنے اور سلف صالحین کی تفاسیر سے صحیح آگاہی کے لیے دروس القرآن کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس حضرت صوفی صاحب دام مجدہم اور انجمن محبانِ اشاعت قرآن کے جملہ اراکین اور خصوصاً جناب الحاج لعل دین صاحب ایم، اے علوم اسلامیہ اور اسکی اشاعت میں حصہ لینے والے تمام حضرات کی فوز و فلاح اور بخشش کا ذریعہ بنائے، ان کی اس سعی کو قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقط

محمد اشرف

(فاضل مدرسہ نصرت العلوم و وفاق المدارس العربیہ)

(۲۴ ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۱ جولائی ۱۹۸۷ء)

پیش لفظ

طبع ششم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی اَمَّا بَعْدُ !

تفسیر معالم العرفان فی دروس القرآن کی تیسری جلد طبع ششم قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔
اللہ رب العزت نے اس تفسیر کو اپنی خصوصی عنایات سے بے شمار شرف قبولیت سے نوازا ہے جس کا منہ بولتا ثبوت ایک قلیل عرصہ میں اسکے متعدد ایڈیشنوں کا طبع ہو کر چار دانگ عالم پھیل کر داد تحسین حاصل کرنا ہے
یہ تفسیر رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ میں بیس ضخیم جلدوں میں طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔ اندرون ملک اور بیرونی ممالک سے کثیر خطوط اور ٹیلیفون کے ذریعہ عوام الناس نے اس کے مکمل ہونے پر مبارک بادیں پیش کی ہیں اور اس بات کا برملا اقرار کیا ہے کہ اردو زبان میں اتنی سہل مفصل اور عام فہم تفسیر آج تک دیکھنے میں نہیں آئی۔ اہل سنت والجماعت حنفی دیوبندی مسلک کی صحیح ترجمانی اور اکابر علماء دیوبند کے جا بجا مفید ذکر نے اس کی افادیت کو مزید اجاگر کیا ہے۔ اللہ رب العزت کے حضور دعا ہے کہ وہ اس تفسیر کو صاحب تفسیر کے لیے اور تمام معاونین اور قارئین کے لیے نجات کا ذریعہ بنا دے اور دنیا میں لوگوں کی ہدایت کے لیے اور قرآن کریم سے تعلق قائم کرنے کا سبب بنائے۔ آمین۔

طبع ششم میں کتابت کی جو اغلاط رہ گئی تھیں انھیں بھی کافی حد تک درست کر دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ قبول و منظور فرمائے۔ آمین۔

احقر:
محمد فیاض خان سواتی
ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ بمطابق اگست ۱۹۹۹ء

سُورَةُ البَقَرَةِ

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ
الَّتِیْ كَانُوْا عَلَیْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ یَهْدِیْ
مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ
اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَ یَكُوْنَ
الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ شَهِیْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ
الَّتِیْ كُنْتَ عَلَیْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ یَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ
یَّنْقَلِبُ عَلٰی عَقِبَیْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِیْرَةً اِلَّا عَلَی
الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِیُضِیْعَ اِیْمَانَكُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴۳﴾

ترجمہ: عنقریب لوگوں میں سے بیوقوف لوگ کہیں گے۔ کہ اِن کو کس چیز نے اِن کے قبلہ سے پھیر دیا ہے، جس قبلہ پر یہ تھے۔ آپ کہہ دیجیے، اللہ ہی کے لیے ہیں مشرق اور مغرب۔ وہ جس کو چاہتا ہے۔ سیدھے راستے کی راہنمائی کرتا ہے ﴿۱۴۲﴾ اور اسی طریقہ سے ہم نے تمہیں ایک افضل امت بنایا ہے۔ تاکہ تم لوگوں پر گواہی دینے والے بنو۔ اور رسول تم پر گواہی دینے والا ہو۔ اور نہیں بنایا ہم نے اس قبلہ کو جس پر آپ تھے مگر اس لیے تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی تابعداری کرتا ہے ان لوگوں میں سے جو اپنی ایڑیوں پر پھرتے ہیں۔ اور بیشک یہ بات بھاری ہے مگر ان لوگوں پر کہ جن کو اللہ نے ہدایت دی۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ایمانوں کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ شفیق اور نہایت ہی مہربان ہے ﴿۱۴۳﴾

تحویلِ قبلہ

اس سے پہلے ملّتِ ابراہیمی اور خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ بیت اللہ شریف حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور اُن کی اولاد کا قبلہ رہا۔ قیام مکہ کے دوران حضور علیہ السلام کا قبلہ بیت المقدس اور بیت اللہ دونوں ہی تھے بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں، کہ آپ دوران نماز بیت اللہ شریف کی طرف اس طرح رُخ کرتے تھے۔ کہ یہ رُخ بیت المقدس کی طرف بھی ہو جاتا تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کیا۔ اور تمام مسلمان اُسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے، اس میں بھی مصلحت تھی۔ بیت المقدس بھی سابقہ انبیاء کا قبلہ رہا ہے۔ اور اسی طرح بہت سے انبیاء کا قبلہ بیت اللہ شریف بھی رہا ہے، اور آخر کار اللہ تعالےٰ نے حضور خاتم النبیین علیہ السلام کے لیے خانہ کعبہ کو ہی قبلہ مقرر فرمایا، جو تا قیام قیامت قائم رہے گا۔

ہجرت کے ابتدائی عرصہ میں بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے کا ایک مقصد یہودیوں کی تالیف قلبی بھی تھا تاکہ وہ مسلمانوں سے قریب تر ہو کر اسلام کی برکات سے فیضیاب ہوں۔ اور اس طرح دین حق کو قبول کر لیں، مگر یہ لوگ انتہائی متعصب اور ضدی تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی رواداری سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا بلکہ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے رہے۔ تاہم حضور علیہ السلام کی دلی خواہش یہ تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ بیت اللہ شریف کو مسلمانوں کا قبلہ مقرر فرما دیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی خواہش کو پذیرائی بخشی اور جیسا کہ اگلی آیات میں آئیگا، بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ کو قبلہ پکڑنے کا صریح حکم نازل فرما دیا۔

تحویلِ قبلہ پر پہلا اعتراض

اہل کتاب چونکہ ضدی، عنادی اور ہٹ دھرم تھے۔ اللہ رب العزت جانتے تھے، کہ مسلمانوں کے قبلہ کی تبدیلی پر یہ لوگ اعتراض کریں گے اور مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈا کریں گے لہذا انہوں نے تحویل قبلہ کے حکم کے ساتھ ہی اہل اسلام کو خبردار کر دیا کہ یہ لوگ اس تبدیلی پر معترض ہوں گے۔ لہذا تم ان کے

پراپیگنڈا سے متاثر ہو کر کسی قسم کے شک یا تردد میں مبتلا نہ ہونا۔ چنانچہ اہل کتاب
پہلے اعتراض کا تذکرہ اس انداز میں بیان فرمایا سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ عنقریب
اہل کتاب کے بیوقوف لوگوں میں سے بعض یوں کہیں گے مَا وَلّٰهُمْ عَنْ
قِبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا مسلمانوں کو ان کے قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا
ہے، جس قبلہ پر وہ پہلے تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا مسلمان ہجرت نبوی کے بعد سولہ
یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اور اس کے بعد
بیت اللہ کے قبلہ مقرر ہونے کا حکم نازل ہوا۔ تو یہودیوں نے اعتراض پیش کر دیا۔ کہ
کیا اللہ تعالیٰ کو اس قبلہ کا پہلے علم نہ تھا۔ جو اب نیا حکم دے دیا۔ پہلے قبلہ میں کیا خرابی
تھی۔ وہ بھی سابقہ انبیاء کا قبلہ رہا ہے۔ اب اس کی تبدیلی کی کیا ضرورت پیش آئی۔

یہاں پر اہل کتاب کے لیے سفہاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو کہ سفیہ کی جمع
ہے۔ جس کا معنی بیوقوف ہے۔ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جو کوئی ملت ابراہیمی
سے اعراض کرتا ہے، وہ بیوقوف ہے۔ "وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ إِبْرٰهِيمَ
إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ"۔ ظاہر ہے کہ کوئی سلیم الفطرت آدمی ملت ابراہیمی سے انحراف
نہیں کر سکتا۔ یہ یہود، نصاریٰ، اور مشرکین ہی ہیں، جو ایسا کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ بیوقوفوں
میں داخل ہیں، جو دین فطرت اور دین توحید اسلام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اسکا جواب — اہل کتاب کے اس اعتراض کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ
وَالْمَغْرِبُ اے پیغمبر علیہ السلام! آپ فرما دیں۔ کہ یاد رکھو، مشرق و مغرب اللہ ہی
کا ہے۔ یہ بات تو نہیں ہے۔ کہ مشرق اللہ کا ہے اور مغرب کسی دوسرے کا۔ لہٰذا
ہر جہت اسی کی ہے تو پھر اسی کی اطاعت لازم ہے۔ وہ جس طرف کو منہ کرنے
کا حکم دے ماننا پڑے گا۔ اس میں کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ جو کوئی اللہ
تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرے گا، اس کی خوشنودی کو پا لے گا۔ اور جو اس کے کسی حکم پر
معترض ہو گا، اس کی تعمیل میں لیت و لعل کرے گا۔ وہ ملعون اور مردود ٹھہرے گا۔ اور
پھر یہ بھی ہے۔ کہ عبادت کے لیے کسی قبلہ یا جہت کا مقرر کرنا انسان کے محض جسمانی

تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے۔ کہ انسان کے روح کی توجہ تو ہمیشہ تجلی الٰہی کی طرف رہتی ہے، اس کا بظاہر رُخ کسی طرف بھی ہو، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ بیت المقدس یا بیت اللہ شریف کی جہت کا تقرر تو مسلمانوں کے اتفاق واتحاد کی ایک علامت ہے کہ تمام عبادت گذاروں کا رُخ ایک ہی جہت میں ہوتا ہے وگرنہ جس طرف بھی منہ کر لو، عبادت اسی کی ہوگی۔ پہلے گذر چکا ہے فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ۔ تم جدھر بھی رُخ کروگے، اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی اُدھر ہی پاؤگے۔ اسی لیے یہ مسئلہ ہے کہ دوران سفر اگر قبلہ کا تعین نہ ہو سکے۔ تو جس طرف بھی رُخ کرکے نماز پڑھوگے۔ اللہ تعالیٰ قبول کرے گا۔ قبلہ معلوم ہو جانے کے بعد نماز کو لوٹانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ دونوں قبلوں میں صرف اس قدر فرق ہے۔ کہ بیت المقدس اس لحاظ سے قومی قبلہ ہے۔ کہ یہ خاص خاص پیغمبروں کا قبلہ رہا ہے۔ اور بیت اللہ شریف بین الاقوامی قبلہ ہے۔ کہ یہ تمام انبیاء بشمول حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ ہے۔

مقام تحویل قبلہ

آگے تفصیل سے ذکر آئے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم بنی سلمہ کی مسجد میں ظہر یا عصر کی نماز ادا فرما رہے تھے۔ کہ دوران نماز ہی قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا۔ آپ نے آدھی نماز بیت المقدس کی طرف منہ کرکے پڑھی اور بقیہ نصف بیت اللہ شریف کی جہت میں صحیح حدیث میں آتا ہے کہ نزول حکم پر جب حضور علیہ السلام نے پلٹ کر رُخ پھیر لیا۔ تو تمام صحابۂ کرام بھی پلٹ گئے اگر کسی کو کچھ تردد نہیں ہوا۔

اگلے روز قبا کے لوگ اپنی مسجد میں فجر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ اُن کا رُخ حسب معمول بیت المقدس کی طرف تھا۔ اسی دوران میں کسی نے آکر خبر دی۔ کہ قبلہ کا حکم تو بدل چکا ہے۔ تم ابھی تک بیت المقدس کی طرف رُخ کیے ہوئے ہو۔ یہ سنتے ہی لوگوں نے نماز کی حالت میں اپنا رُخ بیت اللہ شریف کی طرف پھیر لیا۔ کسی شخص نے حیل وحجت نہ کیا۔ یہ صرف اہل کتاب تھے۔ جو تحویل قبلہ پہ اعتراض

کر رہے تھے۔ اُن کے یہ اعتراضات آگے دُور تک چلے گئے ہیں اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ تک یہ سلسلہ موقع بہ موقع ملتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کا یہ شکوہ بار بار منظر عام پہ آتا ہے۔ حالانکہ اگر مسلمانوں کی طرح وہ بھی ملّتِ ابراہیمی پر قائم ہوتے تو اس قسم کے اعتراضات پیش کرنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر لیتے۔

فرمایا مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل ہونی چاہیئے مگر بات یہ ہے۔ کہ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ وہ جسے چاہتا ہے۔ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ اہل کتاب اپنی ضد کی وجہ سے اس ہدایت سے محروم رہے حالانکہ اُن کی اپنی کتابوں میں بیت اللہ شریف کے افضل اور بین الاقوامی قبلہ ہونے کے احکام موجود تھے اور یہ پیش گوئی بھی پائی جاتی تھی۔ کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ بیت اللہ شریف یعنی خانہ کعبہ ہو گا۔

افضل امت اور اسکی گواہی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح ہم نے تمہارا قبلہ افضل بنایا ہے۔ اسی طرح ہم نے تمہیں (اے اہل اسلام) امت بھی افضل بنایا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا وسط کے لفظی معنی درمیان کے ہیں۔ یعنی تمہیں درمیانی امت بنایا۔ اور ظاہر ہے۔ کہ درمیان والی چیز ہی عدل و انصاف پر مبنی اور افراط و تفریط سے پاک ہوتی ہے۔ لہذا یہی چیز افضل ہوتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو وَسَطًا کا لقب دیکر اسے افضلیت کے مقام پہ فائز فرمایا ہے اور اس امت کے افضل ہونے کی غرض و غایت یہ ہے لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ تاکہ تم دوسرے لوگوں پہ گواہ بن جاؤ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا اور رسول اکرم علیہ التحیۃ والسّلام تم پہ گواہی دینے والے بن جائیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ اس دوہری گواہی کا مظاہرہ قیامت والے دن میدانِ محشر میں ہو گا۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اپنی کتاب الزھد میں حدیث لائے ہیں جس سے مذکورہ گواہی کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔

بیان کرتے ہیں کہ قیامت کے روز جب سب لوگ اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوں گے۔ اور مقدمہ چلے گا۔ تو سب سے پہلے اللہ رب العزت اسرافیل سے پوچھیں گے۔ کیا تم نے میری امانت ادا کر دی۔ اسرافیل علیہ السلام عرض کریں گے کہ ہاں باری تعالیٰ میں نے وہ امانت جبرائیل علیہ السلام کو پہنچا دی، پھر جبرائیل کو طلب کر کے پوچھا جائے گا۔ کہ کیا اسرافیل نے میری امانت تم تک پہنچا دی۔ وہ اقرار کریں گے کہ ہاں اسرافیل علیہ السلام نے وہ امانت مجھ تک پہنچا دی۔ چنانچہ اسرافیل کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اور جبرائیل سے مزید سوال ہو گا۔ کہ تم نے میری امانت کے ساتھ کیا کیا، وہ عرض کریں گے کہ اے باری تعالیٰ! میں نے تیری امانت تیرے رسولوں تک پہنچا دی۔ اب رسولوں کو طلب کر کے پوچھا جائے گا کیا جبرائیل نے میری امانت تم تک پہنچا دی۔ تو رسول بھی عرض کریں گے، ہاں مولا کریم! جبرائیل علیہ السلام نے تیری امانت ہم تک پہنچا دی۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ تم نے اس امانت کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ رسول عرض کریں گے کہ ہم نے تیرا پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیا۔ پھر امتوں کو طلب کیا جائے گا۔ اور پوچھا جائے گا۔ کیا میرے نبیوں نے میری امانت تم تک پہنچائی۔ فَمِنْهُمُ الْمُصَدِّقُ وَمِنْهُمُ الْمُكَذِّبُ پھر ان میں سے بعض امتیں تصدیق کریں گی۔ کہ اے اللہ! تیرے نبیوں نے تیری امانت ہم تک پہنچائی۔ اور بعض امتیں انکار کریں گی۔ کہ ہم تک وہ امانت نہیں پہنچی۔ انکار کرنے والی امتوں کے نبیوں سے کہا جائے گا کہ وہ اس بات پہ گواہ پیش کریں، کہ واقعی انہوں نے امانت اپنی امتوں تک پہنچا دی۔ تو انبیاء کرام اپنی گواہی کے لیے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا نام پیش کریں گے۔ امت محمدیہ کو طلب کر کے پوچھا جائے گا تو وہ لوگ اس بات کی گواہی دیں گے کہ انبیائے کرام نے اپنی امانت اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دی۔ وہ امتیں اس گواہی کا انکار کریں گی کہ مولا کریم یہ لوگ ہمارے زمانہ میں نہیں تھے، ہم ان کو بالکل نہیں پہچانتے لہذا یہ ہمارے خلاف کیسے گواہی دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ

پھر دریافت فرمائے گا کہ اے امت محمدیہ کے لوگو! تم ان کی گواہی کیسے دیتے ہو جبکہ تم تو ان کے زمانے میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ تو لوگ عرض کریں گے۔ یا اللہ! تو نے ہماری طرف آخری رسول بھیجا۔ اور کتاب نازل فرمائی۔ تیرے خاتم النبیین علیہ السلام اور تیری کتاب نے بتایا اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ کہ تمام انبیاء نے اللہ کا پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیا۔ لہٰذا ہم اس یقین کے ساتھ گواہی دیتے ہیں۔ کہ واقعی تیرے انبیاء نے تیرا پیغام پہنچا دیا۔

اس کے بعد اپنی امت کے تزکیہ کے لیے اللہ تعالیٰ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا کرے گا۔ آپ اپنی امت کا تزکیہ کریں گے کہ یہ لوگ صحیح گواہی دے رہے ہیں۔ اسی کے متعلق فرمایا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا۔ یعنی ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے۔ اور پھر ان سب پر آپ کو بطور گواہ پیش کیا جائے گا۔

تقرر قبلہ کی غایت

فرمایا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اور نہیں بنایا ہم نے قبلہ جس پر پہلے آپ تھے یعنی بیت المقدس کو اِلَّا لِنَعْلَمَ مگر تاکہ ہم جان لیں۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر چیز کا جاننا تو ازلی ہے یہاں نَعْلَمَ سے مراد ہے ظاہر کردیں مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے۔ اور کون اپنی ایڑیوں پر پھر جاتا ہے یعنی انکار کرتا ہے۔ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ اور بیشک یہ چیز بھاری ہے یعنی یہود و نصاریٰ پر اپنے قبلہ اول کو چھوڑنا بڑا دشوار ہے سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نوازا ہے۔ ایسے لوگ ہی ملت ابراہیمی کے پیرو ہیں اور یہی لوگ اللہ رب العلمین کی فرمانبرداری کو اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے نئے حکم کی تعمیل بالکل دشوار نہیں۔ وہ ہمیشہ تعمیل حکم میں پیش پیش رہتے ہیں پہلے گذر چکا ہے۔ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی جب ابراہیم علیہ السلام کو اُن کے رب نے کہا کہ

فرمانبردار ہو جاؤ۔ تو انہوں نے کہا کہ میں رب العلمین کا فرمانبردار ہو گیا۔ جو ارشاد ہوا اس کی تعمیل کے لیے بسر و چشم تیار ہوں۔ اس قسم کے اصول پر چلنے والے لوگوں کے لیے تحویل قبلہ جیسی چیز کیسے بھاری ہو سکتی ہے۔ نماز کے متعلق بھی پہلے پارہ میں گزر چکا ہے وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ۔ یہ نماز منافقین پر بڑی بھاری ہے مگر ان لوگوں پر نہیں، جن میں عاجزی اور خشیت الٰہی جیسی صفات موجود ہوں۔ ان کے لیے تو نماز راحت کا ذریعہ ہے کیونکہ اس سے تعلق باللہ پیدا ہوتا ہے۔ تو یہاں پر بھی فرمایا کہ تحویل قبلہ کا حکم اہل کتاب کے لیے سخت گراں ہے مگر ان لوگوں کیلئے نہیں ہے جنہیں اللہ نے ہدایت دے دی ہے۔

تحویل قبلہ پر دوسرا اعتراض

تحویل قبلہ سے متعلق اہل کتاب کا دوسرا اعتراض یہ تھا۔ کہ جو لوگ بیت اللہ شریف کے قبلہ مقرر ہونے سے پہلے فوت ہو گئے ہیں۔ انہیں تو اس طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ تو بیت المقدس کی طرف ہی منہ کرتے رہے۔ لہٰذا اس نئے حکم کی روشنی میں ایسے لوگوں کی نمازوں کی کیا حیثیت ہوگی۔ وہ مقبول ہوں گی یا نہیں۔ اِس اعتراض کے جواب میں اللہ نے فرمایا وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ط اللہ ایسے لوگوں کے ایمان ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ایمان سے مراد نماز ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی نمازیں ضائع نہیں کریگا۔ جو لوگ تحویل قبلہ سے پہلے فوت ہو گئے، ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔ سابقہ لوگوں نے جو نمازیں پڑھی ہیں۔ وہ اپنے اپنے انبیاء کے حکم کے مطابق صحیح طریقے سے ادا کی ہیں۔ لہٰذا ان کی نمازیں مقبول ہیں، اُن پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس قسم کا معاملہ شرابیوں کے متعلق سورۃ مائدہ میں آئے گا۔ کہ جن لوگوں نے حرمت شراب سے پہلے شراب نوشی کی تھی اور وہ فوت ہو گئے، اُن کا کیا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ نیکی کرنے والوں پر کوئی الزام نہیں ہے۔ جس

وقت ایک چیز حرام نہیں تھی، اُس وقت اس کے استعمال سے گناہ لازم نہیں آتا۔ ہاں جو شخص حرمتِ شراب کے حکم آجانے کے بعد اسے پیئے گا، وہ ضرور اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجائے گا۔ اِس مقام پر بھی اعتراض کا جواب یہی دیا۔ کہ جن لوگوں نے تبدیلی قبلہ سے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھی ہیں۔ اُن کی نمازیں بالکل درست اور اللہ کے ہاں قابلِ قبول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتے وہ بڑے شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔

قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ
قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ
وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ
رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَلَئِنْ
اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا
قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ
بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْ
وقف لازم بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۵﴾ م
اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ
وقف منزل وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ ؔ
ع ۱۷ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۱۴۷﴾ ع

ترجمہ: تحقیق ہم آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف (بار بار) پلٹنا دیکھتے ہیں۔ پس ہم آپ کو والی بنادیں گے اُس قبلے کا جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ پس اب پھیر دیں آپ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف۔ پھر جہاں بھی آپ ہوں، پس پھیر دیں اپنے چہروں کو اُسکی طرف۔ اور بیشک وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی۔ البتہ جانتے ہیں۔ کہ یہ حق ہے، اُن کے رب کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے غافل نہیں ہے، جن کو یہ کرتے ہیں (۱۴۴) اور اگر آپ اُن لوگوں کے پاس جن کو کتاب دی گئی ہے، ہر قسم کی نشانی

بھی لائیں۔ تو وہ پھر بھی آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور آپ بھی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔ اور نہ ان میں سے بعض، بعض کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے ہیں۔ اور اگر آپ نے اُن کی خواہشات کا اتباع کیا اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے، تو بے شک آپ اُس وقت نا انصافوں میں سے ہوں گے (۱۴۵) وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی، وہ اُس کو اس طرح جانتے ہیں، جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔ اور بیشک ایک گروہ ان میں سے البتہ حق کو چھپاتا ہے اور وہ جانتے ہیں (۱۴۶) حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس آپ شک کرنیوالوں میں سے نہ ہوں (۱۴۷)

ربطِ آیات

بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بیان کی جاچکی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ امتحان لے کر ظاہر کرنا چاہتا تھا۔ کہ کون اللہ کے رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون ہے جو تعصب اور عناد پر ٹھہرا رہتا ہے۔ چنانچہ اہل کتاب اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔ کیونکہ وہ لوگ قتل انبیاء، ضد اور عناد میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنی کتابوں کو تبدیل کر دیا تھا اور برائیوں میں منہمک ہو چکے تھے۔ وہ اگرچہ اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسحٰق علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کرتے تھے۔ مگر عملی طور پر ان میں نسبت کا شائبہ تک نہ تھا۔

تحویلِ قبلہ کی دوسری وجہ

بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کرنے کی دوسری وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ تحقیق ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھتے ہیں۔ ہجرت مدینہ کے بعد اگرچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز ادا فرماتے تھے۔ مگر آپ کی دلی خواہش یہ تھی۔ کہ بیت اللہ شریف قبلہ مقرر ہو جائے۔ چنانچہ تبدیلی قبلہ کے حکم کے لیے وحی کا انتظار کرتے تھے۔ اور اپنا چہرہ مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام کی عام عادت مبارکہ یہ تھی۔ نَظْرُهٗ اِلَى الْاَرْضِ اَكْثَرُ مِنْ نَظْرِهٖ اِلَى السَّمَآءِ یعنی آپ کی نگاہ مبارک اکثر و بیشتر زمین کی طرف رہتی ہے

مگر انتظارِ وحی میں آپ اپنی نگاہ بار بار آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔
سابقہ کتب میں اس بات کی پیشین گوئی موجود تھی۔ کہ نبی آخر الزمان کا قبلہ وہی ہوگا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا یعنی خانہ کعبہ۔ نیز یہی جذبہ آپ کے قلب مبارک میں بھی ڈال دیا گیا تھا۔ لہذا آپ کی خواہش تھی۔ کہ بیت اللہ شریف کی طرف منہ کرنے کا حکم نازل ہو جائے۔ اور آخری نبی کی آخری امت کا قبلہ قومی کی بجائے بین الاقوامی مقرر ہو جائے۔ مسلمانوں کو اسی قبلہ (بیت اللہ شریف) کی طرف منہ کرنے کا حکم ہو۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ لہذا آپ اسی شوق میں نگاہِ مبارک بار بار آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔

تحویل قبلہ کا حکم

آخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی خواہش کو شرفِ قبولیت بخشا اور تحویل قبلہ کا حکم نازل فرما دیا۔ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰهَا اب ہم آپ کو اس قبلے کا والی بنا دیں گے، جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ لہذا حکم ہوا۔ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ آپ اپنا چہرہ الور مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ اور آپ لوگ جہاں بھی ہوں۔ اپنے چہروں کو اسی کی طرف پھیریں۔
تاریخی روایتوں میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بنی سلمہ کے محلہ میں بشر ابن براء ابن معرورؓ کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ یہ جگہ مدینہ طیبہ سے چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ نماز ظہر کا وقت ہوا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع دیگر صحابہ محلہ کی مسجد میں نماز کے لیے تشریف لے گئے آپ نماز ادا فرما رہے تھے۔ کہ اسی دوران میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ آپ دو رکعت ادا فرما چکے تھے۔ نزول وحی پر فوراً آپ نے اپنا رخ مبارک بیت المقدس سے بیت اللہ شریف کی طرف پھیر لیا۔ آپ کی اقتداء میں مرد اور عورتیں نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ نے رُخ تبدیل کیا۔ تو تمام صحابہؓ نے بھی اپنی صفوں کو پلٹ دیا۔ اسی سبب سے بنی سلمہ کی اس مسجد کو مسجد قبلتین

یعنی دو قبلوں والی مسجد کہا جاتا ہے۔

جہت قبلہ

اس آیت کریمہ میں لفظ شطر تفصیل طلب ہے۔ اس میں ایک حکم تو یہ ہے کہ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط یعنی آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیں۔ دوسری بات یہ فرمائی وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ط تم جہاں کہیں بھی ہو، اس کی طرف منہ کر و۔ لفظ شطر مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا ایک معنیٰ "نصف" آتا ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے۔ اِنِّيْ اَرْجُوْ اَنْ تَكُوْنُوْا شَطْرَ اَهْلِ الْجَنَّةِ یعنی مجھے امید ہے۔ کہ جنت میں جانے والے کل لوگوں میں نصف تعداد تمہاری ہوگی۔

شطر کا دوسرا معنیٰ جزو بھی آتا ہے۔ جیسا کہ اِنَّ الفرائض شطر العلم یعنی فرائض اور وراثت علم کا جزو ہے۔ مگر اس آیت کریمہ میں شطر جہت کے معنی میں آیا ہے۔ اس سلسلے میں فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ نماز شروع کرتے وقت جس شخص کو کعبہ شریف نظر آرہا ہو۔ اُسے عین کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہے۔ اور جس کو کعبہ نظر نہ آتا ہو، اُسے عین کعبہ کی بجائے اُس کی طرف یا اُس کی جہت میں رُخ کرنے کا حکم ہے۔

اس آیت میں عین کعبہ کی بجائے مسجد الحرام کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ عین کعبہ کی طرف رُخ کرنا قدرے مشکل ہے۔ لہذا پوری مسجد حرام کو جہت کو وسعت دے دی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ مسجد حرام میں نماز پڑھنے والوں کے لیے عین کعبہ جہت ہوگی۔ جو لوگ حدود حرم کے اندر رہنے والے ہیں۔ اُن کے لیے مسجد الحرام جہت ہے۔ اور جو لوگ حدود حرم سے باہر دور دراز کے رہنے والے ہیں۔ اُن کیلیے پورا حرم جہت ہے۔ مقصد یہ کہ جوں جوں لوگ خانہ کعبہ سے دور ہوتے جائیں گے اُن کے لیے جہت میں وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔

ایک دوسری حدیث شریف میں آتا ہے۔ مَا بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَۃٌ یعنی مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ اور یہاں اس کو ہم یوں کہیں گے کہ شمال اور جنوب کے درمیان قبلہ ہے مقصد یہ کہ اگر عین کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوتا تو یہ دشوار تھا اور جہت عام ہے۔ حتیٰ کہ جب تک کعبہ کی طرف بالکل پشت نہ ہو جائے۔ نماز درست ہے۔ اس کے لیے زاویہ قائمہ ضروری نہیں ہے اگر زاویہ حادہ کے ساتھ رُخ کر کے بھی نماز پڑھی جائے گی، تو وہ درست ہو گی۔ البتہ اگر آسانی کے ساتھ جہت کا تعین ہو سکے۔ تو ضرور کرنا چاہیئے۔

ایک زمانہ میں عنایت اللہ خاں مشرقی نے اپنی تحقیق کے مطابق عام مسجدوں کے رُخ غلط بتائے تھے۔ وہ ایک ریاضی دان تھے۔ اُن کے نزدیک صرف بادشاہی مسجد کا رُخ درست تھا، باقی سب غلط تھے اُن کے بقول نمازیوں کا رُخ عین قبلہ کی طرف نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی نمازیں باطل تھیں۔ اُن کا یہ نظریہ غلط تھا کیونکہ قبلہ کا تعین اللہ تعالےٰ نے ریاضی کے اصولوں پر کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ فطری اصول پر جہت کعبہ یا جہت مسجد حرام کا حکم ہے۔

اگر عین کعبہ یا عین مسجد حرام کی پابندی لازمی ہوتی تو واقعی یہ بڑا مشکل کام تھا بعض مقامات پر جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں بڑی بڑی لمبی قطاریں بن جاتی ہیں ایسی صورت میں ہر نمازی کا رُخ عین کعبہ یا عین مسجد حرام کی طرف ہونا ممکن ہی نہیں رہتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے صرف جہت کا حکم دیا ہے۔

جس طرح بدن، کپڑا اور مکان کی طہارت نماز کی شرائط میں سے ہے۔ اسی طرح استقبال قبلہ بھی نماز کے لیے بمنزلہ شرط کے ہے۔ اسی لیے حکم یہ ہے کہ نماز شروع کرتے وقت جہت قبلہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ریل گاڑی یا جہاز پر بھی سفر کر رہا ہے۔ تو قبلہ کا تعین کر سکتا ہے۔ تاہم اگر دوران نماز سواری پر ہونے کی وجہ سے رُخ تبدیل بھی ہو جائے، تو کوئی حرج نہیں، نماز درست ہو گی۔ البتہ جہاں تعین قبلہ ممکن نہ ہو، وہاں تحری کا حکم ہے۔ یعنی اپنی طرف سے استقبال قبلہ کی

پوری کوشش کرے۔ اور نماز شروع کرلے۔ اور پھر اس طرح سے متعین کیا ہوا رُخ غلط بھی ہوگا، تو نماز درست ہوگی۔ کیونکہ یہ نمازی کے اختیار سے باہر تھا اس کے متعلق آیت گذر چکی ہے۔ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ایک موقع پر رات کے وقت صحابہ کرامؓ سے یقین کے ساتھ تعین قبلہ نہ ہوسکا۔ ہر ایک نے اپنی اپنی کوشش اور سمجھ کے مطابق قبلہ کا تعین کیا۔ اگرچہ ان کے استقبال قبلہ میں ایک دوسرے سے اختلاف پایا جاتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن سب کی نمازوں کو شرفِ قبولیت بخشا۔ اور اس آیت کے ذریعے نماز کی درستگی کی تصدیق فرمائی

مخالفت برائے مخالفت

استقبال قبلہ کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی ہٹ دھرمی کا ذکر کیا ہے۔ کہ یہ لوگ اہل ایمان کی مخالفت محض مخالفت کی بناء پر کرتے ہیں، ورنہ ان پر حق تو واضح ہوچکا ہے۔ فرمایا، وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ اور وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی ہے۔ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے اُن کے رب کی طرف سے، مگر دیدہ دانستہ حق کی مخالفت کررہے ہیں۔ انہیں علم ہے۔ کہ اُن کی اپنی کتابوں کے مطابق بیت اللہ شریف کی جہت بالکل درست ہے۔ وہ جانتے ہیں۔ کہ نبی آخرالزمان کا قبلہ یہی ہے۔ اس کے باوجود مخالفت پر کمر بستہ ہیں۔

ام المؤمنین حضرت صفیہؓ یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ کا باپ اور چچا یہودی عالم تھے اور خیبر میں رہتے تھے۔ جب حضور علیہ السلام مکہ مکرمہ سے ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے۔ تو یہ دونوں بھائی آپ کو ملنے کے لیے آئے۔ آپ سے بالمشافہ گفتگو ہوئی۔ ملاقات کے بعد جب واپس خیبر پہنچے تو دونوں بھائیوں نے حضور علیہ السلام کے متعلق آپس میں کچھ بات چیت کی جسے ام المؤمنینؓ نے بھی سن لیا۔ آپ کے چچا نے آپ کے باپ سے پوچھا، کہ سچ سچ بتاؤ۔ کہ کیا یہ وہی نبی ہیں۔ جن کا ذکر ہماری کتابوں میں موجود ہے۔ صفیہؓ کے باپ نے تصدیق کی کہ ہاں یہ وہی نبی آخرالزماں ہیں۔ جن کی نشانیاں ہمارے

پاس موجود ہیں۔ اس پہ چچا نے کہا۔ کہ اگر ایسا ہی ہے۔ تو پھر ہمیں اُن پر ایمان لے آنا چاہیئے۔ مگر باپ کہنے لگا۔ کہ جب تک میری جان میں جان ہے۔ میں اسکی مخالفت کرتا رہوں گا۔ اور آپ کے پروگرام میں رکاوٹ بنا رہوں گا۔ مقصد یہ ہے کہ محض عناد کی وجہ سے حضور علیہ السلام اور اہل ایمان کے ساتھ مخالفت ان کا جزوایمان بن چکی تھی۔ حضرت صفیہؓ کا باپ جنگ خیبر میں قتل ہوا۔ آپ لونڈی کی حیثیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں۔ حضور علیہ السلام نے اُن کو آزاد کر دیا اور پھر اُن سے نکاح کر لیا۔ یہ واقعہ خود حضرت صفیہؓ نے سنایا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اُن کی ضد اور عناد کا تذکرہ بیان کرتے کے بعد فرمایا۔ کہ یہ لوگ حق کو چھپانے کی جتنی بھی کوشش کریں۔ مگر وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے غافل نہیں بلکہ ان کی ایک ایک حرکت کو خوب جانتا ہے۔

فرمایا، اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ اگر آپ اہل کتاب کے پاس ہر قسم کی نشانی بھی لے آئیں؛ اور دلائل کے ساتھ ثابت کر دیں۔ کہ بیت اللہ شریف ہی صحیح قبلہ ہے۔ مَا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ تو پھر بھی یہ لوگ آپکے قبلہ کو تسلیم نہیں کریں گے۔ حالانکہ یہ چیز انجیل میں بھی موجود ہے کہ جب مسیح علیہ السلام آسمان کی طرف اٹھائے جا رہے تھے۔ تو اس سے کچھ عرصہ پہلے آپ نے فرمایا تھا۔ کہ بھائی! میں تمہاری طرف اپنے خداوند کی جانب سے اُس موعود کو بھیجتا ہوں، جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مگر اے لوگو! جب تک تمہیں عالم بالا سے قوت حاصل نہ ہو جائے تم یروشلم میں ہی ٹھہرنا یعنی تمہارا قبلہ یہی ہوگا، اور پھر جب تمہیں قوت حاصل ہو جائے گی، تو تمہارا قبلہ بھی تبدیل ہو جائیگا۔ اس کے باوجود یہودیوں نے بیت اللہ شریف کو قبلہ تسلیم نہ کیا۔

شاہجہان کے زمانے میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی رح بہت بڑے عالم ہوئے

ہیں۔ انہوں نے بیضاوی پہ حاشیہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سابقہ کُتب کی پیش گوئیاں بعض صریح الفاظ میں ہیں۔ اور بعض کنایۃً کی زبان میں ہیں۔ اس آیت میں کنایۃً بتایا گیا ہے۔ کہ موعود سے مراد حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے اور انجیل کے الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو جائے۔ اور انہیں قوت یعنی فتح اور غلبہ حاصل ہو جائے گا تو قبلہ بھی تبدیل ہو جائے گا۔ اس کے بعد یروشلم قبلہ نہیں رہیگا۔ چنانچہ قبلہ ہونے کی وجہ سے یروشلم یعنی بیت المقدس اب بھی محترم اور معزز ہے مگر وہ قبلہ نہیں رہا۔ اس طرف رُخ کر کے نماز ادا نہیں کر سکتے۔

استقبالِ قبلہ اور شعائر اسلامی

فقہائے کرام فرماتے ہیں، کہ نماز کی حالت میں نمازی کے سینے کا جہتِ قبلہ ہونا فرض ہے۔ اور چہرے کا اُس رُخ پہ ہونا سنت ہے۔ چنانچہ اگر نماز کے دوران سینہ جہتِ قبلہ سے منحرف ہو گیا تو نماز باطل ہو جائے گی۔ چہرے کے منحرف ہونے سے نماز باطل نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ محض مکروہ ہوگا۔ استقبال قبلہ سے متعلق ایک حدیث میں یوں ارشاد فرمایا کہ ملتِ ابراہیمی کو ماننے والوں میں سے مَنْ صَلّٰى صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُؤْمِنُ یعنی جس نے ہمارے جیسی نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کیا۔ اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ مؤمن ہے۔ اگرچہ یہودی بھی بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ مگر یہاں پہ ہمارا قبلہ کہہ کر ان کے قبلہ کی نفی کر دی۔ اسی طرح وہ ہماری طرح نماز نہیں پڑھتے اور مسلمانوں کا ذبیحہ بھی نہیں کھاتے لہذا وہ ملّتِ اسلامیہ میں شامل نہیں گویا حضور علیہ السلام نے استقبالِ قبلہ کو شعائرِ اسلامی میں شامل کیا۔

سرسوتی کا اعتراض

دیانند سرسوتی آریہ سماجی ہندوؤں کا مشہور لیڈر گزرا ہے۔ اُس نے مسلمانوں پہ اعتراض کیا تھا۔ کہ یہ لوگ ہندوؤں کو تو بت پرستی کا طعنہ دیتے ہیں۔ مگر خود ایک مکان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ جو پتھروں سے تعمیر کیا ہوا ہے۔ کیا یہ بت پرستی نہیں ہے؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے دو حصوں پہ مشتمل کتاب لکھی اس کے ایک حصہ میں سرسوتی کے اہل اسلام پہ دس عام اعتراضات کے جوابات لکھے، اور دوسرے حصے میں صرف قبلہ پہ اعتراضات کا جواب دیا۔ "قبلہ نما" نامی یہ کتاب

بڑی دقیق اور نہایت ہی عمدہ کتاب ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ کہ عجیب اعتراض ہے کجا ہمارا استقبال قبلہ اور کجا تمہاری بت پرستی۔ تم تو بتوں کو نافع اور ضار سمجھ کر ان کے سامنے سجدہ کرتے ہو، اُن کی پوجا کرتے ہو۔ مگر ہم تو خانہ کعبہ کا صرف استقبال کرتے ہیں۔ لفظ استقبال خود بتلا رہا ہے۔ کہ خانہ کعبہ کی طرف صرف توجہ کرتے ہیں۔ اسکی پوجا ہرگز نہیں کرتے۔ لہٰذا تمہاری بت پرستی اور ہمارے استقبال میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بت تمہارے مقصود ہیں۔ مگر ہمارا صرف رُخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے مقصود تو ذات خداوندی ہوتی ہے۔

پھر دیکھئے عبادت کے لیے نیت ضروری ہے۔ اس کے بغیر عبادت قبول نہیں۔ مگر استقبال قبلہ کے لیے نیت ضروری نہیں ہے۔ محض اس طرف رُخ کر لینا ہی کافی ہے۔ مشرکین بتوں کی پوجا نیت اور ارادے سے کرتے ہیں لہٰذا محض استقبال قبلہ عبادت کے زمرے میں نہیں آتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اول سے آخر تک نماز کے کسی لفظ سے بھی تعظیم کعبہ کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہاں تو ایک ایک لفظ سے اللہ تعالیٰ ہی کی حمد و ثنا اور تعظیم بیان ہوتی ہے۔ لہٰذا کعبہ شریف کی عبادت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ذرا اور آگے چلیے خانہ کعبہ کی دیواریں یا اُس کے پتھر مسلمان کا مقصود و منشا نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ اگر کسی وقت کعبہ کی دیواریں منہدم بھی ہو جائیں۔ العیاذ باللہ، تو بھی مسلمان نماز پڑھتے وقت اسی طرف رُخ کریں گے۔ گویا اُن کے نزدیک اینٹوں اور پتھروں کی کوئی حیثیت نہیں، بلکہ اُس جگہ کو مرکز تجلیات الٰہی سمجھ کر اُس طرف رُخ کیا جاتا ہے۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے میں بیت اللہ شریف کی تعمیر نو کے سلسلے میں جب ساری دیواریں گرا کر اُس جگہ پر قناتیں کھڑی کر دی تھیں تو نماز کے وقت رُخ اُسی طرف ہی کیا جاتا تھا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ بیت اللہ شریف صرف جہت ہے، وہ معبود نہیں ہے۔ بر خلاف اس کے بت پرست ہر اس طرف کو رُخ کر کے عبادت کریں گے جس طرف بت رکھے ہوں گے کیونکہ

بت اُن کے معبود ہیں۔ اور بتوں کی منتقلی پر اُن کا رُخ بھی اُسی طرف منتقل ہو جائیگا۔
لفظ بیت اللہ سے خود بخود واضح ہے کہ اِس سے مراد اللہ کا گھر ہے، نہ کہ خود اللہ رب العزت۔ اور یہ مکان یا جگہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات کا مرکز ہے، یہ ذاتِ خود معبود نہیں ہے۔ ایک اور بات بھی ہے۔ کہ جب کوئی کسی مکان کیطرف جاتا ہے۔ تو اس کا مقصود مٹی اور پتھر کا بنا ہؤا مکان نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصود و مطلوب اُس مکان کا مکین ہوتا ہے۔ لہٰذا استقبال قبلہ سے ہمارا مقصود اللہ تعالیٰ ہوتا ہے نہ کہ خانہ کعبہ۔ اور یہ ایک بنیادی اصول ہے۔ کہ مستحق عبادت وہ ذات ہو سکتی ہے۔ جو خود بخود ہو۔ اور جس چیز کا قیام و بقا دوسروں کا مرہونِ منت ہو، وہ عبادت کے لائق کیسے ہو سکتی ہے۔ اس خانہ کعبہ کو تو فرشتوں نے بنایا۔ آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا، پھر ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچا، یہ کیونکر معبود ٹھہرا۔
مولانا نانوتوی رح نے آخری بات یہ فرمائی۔ کہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی چیز کا عکس یا تجلی اُس چیز کا عین ہوتا ہے۔ اور یہ تصویر یا تجلی اُسی چیز کی سمجھی جائیگی جس کی وہ فی الواقع ہے۔ تو بھائی ہم کعبہ کو معبود نہیں مانتے بلکہ تجلی گاہِ معبود مانتے ہیں۔ اور اس طرف رُخ کر کے عبادت کرتے ہیں۔ تو گویا عین معبود حقیقی یعنی خداوند تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔
خانہ کعبہ کے مرکز تجلیات ہونے کو ایک دوسرے طریقے سے سمجھیے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی مثال ایسی ہے، جیسے سورج کی تجلی جو پوری کائنات پر پڑ رہی ہے۔ اور کائنات کیا ہے، یہ زمین ہے۔ اِس کے اُوپر کچھ فضا ہے اور پھر عدم ہے۔ یعنی آگے کچھ بھی نہیں۔ جب سورج کی تجلی عدم پر پڑتی ہے۔ تو زمین کی طرف واپس پلٹتی ہے۔ اور زمین پر بیت اللہ شریف مثل آئینہ کے ہے آپ دیکھتے ہیں۔ کہ جب سورج کی شعائیں آئینہ پر پڑتی ہیں۔ اور اس میں سورج کی چمک نظر آتی ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کی تجلیات خانہ کعبہ پر پڑتی ہیں، تو اس میں آکر اٹک جاتی ہیں۔ اور اسے مرکز تجلیات بنا دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے اس مرکز خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ خانہ کعبہ

کی طرف رُخ کرنے سے خشوع اور انجذابت پیدا ہوتا ہے۔

ذرا غور فرمایئے، جس طرح خداوند تعالیٰ جہت سے پاک ہے۔ اسی طرح روح جیسی لطیف چیز کو بھی جہت کی ضرورت نہیں۔ برخلاف اس کے جسم انسانی مادی چیز ہے۔ اور مادی چیز کا رُخ جس چیز کی طرف متعین کیا جائے گا وہ مادی ہو گی۔ لہٰذا مادی چیز ہونے کی بنا پر خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا ہے۔ کہ اس کے اندر ایک قسم کا جماؤ اور استقرار ہوتا ہے۔ مقصد یہ کہ ہم اُس تجلی الٰہی کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ اور اُس مالک الملک کی عبادت کرتے ہیں، جس ذات کی تجلی خانہ کعبہ پر پڑ کر اُس کی صفت بنتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ تجلی اسی مقام پر پڑ رہی ہے اور یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ پوری زمین کی ابتدا اسی مکہ مکرمہ کے مقام سے ہوئی تھی۔ یہ جگہ ساری زمین کی ناف ہے۔ سب سے پہلے اسی مقام سے پانی کا ایک بلبلہ اٹھا تھا جو پھیل کر زمین جیسی بڑی چیز میں تبدیل ہو گیا۔ اسی وجہ سے اس جگہ کو مقسم بلاد بھی کہا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ تجلیات اسی مقام پر پڑتی ہیں۔ لہٰذا یہ ہمارا قبلہ ٹھہرایا گیا۔

مسلمانوں کے قبلہ سے متعلق اعتراضات کے جواب حضرت مولانا نانوتویؒ کے علاوہ بعض دیگر علمائے کرام نے بھی دیئے ہیں۔ ان میں دہلی کے مولانا ابوالمنصورؒ ہیں۔ اور پھر مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ہیں۔ جو ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے مدرسہ صولتیہ کی بنیاد رکھی۔ جو گذشتہ ایک صدی سے دینی طلبہ کی آبیاری کے علاوہ حجاج کرام کی خدمات بھی سرانجام دے رہا ہے۔ آپ نے عیسائیت کے رد میں ایک مدلل کتاب لکھی۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے لندن کے سنڈے ٹائمز اخبار نے لکھا تھا۔ کہ اگر دنیا میں اس کتاب کو پڑھا گیا۔ تو عرصہ تک عیسائیت کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

آریہ سماج اور تثلیث

آریہ سماج ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے۔ ہندوؤں کے ۳۳ کروڑ دیوتا سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بت پرستی کے خلاف اعتراضات کا جواب نہ دے سکے اور گھبرا گئے ظاہر

ہے۔ کہ بت پرستی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لیے یہ لوگ بحث مباحثے میں مار کھا جاتے۔ چنانچہ انہوں نے تمام بتوں کا انکار کرکے تثلیث کا ایک نیا عقیدہ وضع کیا۔ اور کہا کہ بت وغیرہ کچھ نہیں، صرف تین چیزیں قدیم ہیں یعنی خدا، مادہ اور روح، حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات قدیم ہے۔ مادہ اور روح حادث ہیں یہ بدبخت بت پرستی کو ترک کرنے کے باوجود بھی مشرک ہی رہے، جس طرح نصاریٰ باپ، بیٹا اور روح القدس کی تثلیث میں مبتلا ہوتے، اسی طرح آریہ سماج بھی خدا، مادہ اور روح کی تثلیث کے قائل ہوئے۔

استقبال قبلہ میں اختلاف

الغرض! فرمایا اے نبی علیہ السلام، اگر آپ ان کے پاس ہر طرح کی نشانی بھی لے آئیں، تو اہل کتاب آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے۔ ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ قبلہ ہے۔ اور یہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہودیوں کا قبلہ بیت المقدس ہے اور نصاریٰ صخرۃ پتھر کی طرف رخ کرتے ہیں۔ اور ہر ایک اپنے اپنے قبلہ پر مگن ہے۔ یہ لوگ اس قدر تعصب میں مبتلا ہیں۔

فرمایا جس طرح یہ لوگ آپ کے قبلہ کا اتباع کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسی طرح وَمَآ اَنۡتَ بِتَابِعٍ قِبۡلَتَهُمۡ آپ بھی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ جب تک اللہ کا حکم تھا۔ آپ اس طرف رخ کرتے رہے۔ جب خداوند تعالیٰ کا دوسرا حکم آگیا۔ تو آپ نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کرلیا۔ اور بیت اللہ شریف کی طرف رخ کرلیا۔ اور ان کا اپنا حال بھی یہی ہے۔ وَمَا بَعۡضُهُمۡ بِتَابِعٍ قِبۡلَةَ بَعۡضٍ ؕ وہ بھی بعض بعض کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ ۙ بعد اس کے کہ آپ کے پاس قطعی علم آچکا ہے۔ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيۡنَ تو پھر آپ ناانصافوں میں سے ہوں گے دوسرے مقام پر شرک کے متعلق فرمایا لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ " یعنی فرض کرو اگر آپ سے شرک سرزد ہوگیا تو آپ کے عمال ضائع ہو جائیں گے آپ نقصان اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے

اس مقام پر فرمایا کہ اگر آپ نے لوگوں کو راضی کرنے کے لیے انکی بات مان لی بعد اس کے کہ آپ کے پاس قطعی حکم آچکا ہے۔ تو پھر آپ کے لیے یہ بڑی ناانصافی کی بات ہوگی۔

امام رومیؒ اور قبلہ

اس آیت کی روشنی میں کہ بعض لوگ بعض لوگوں کے قبلہ کی پیروی نہیں کرتے مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی میں قبلہ سے متعلق بڑے نکات پیدا کیے ہیں۔

فرماتے ہیں :۔

قبلۂ شاہاں بود تاج و کمر
قبلۂ اربابِ دنیا سیم و زر

بادشاہوں کا قبلہ تاج و تخت ہوتا ہے وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ سنہری ٹیکا انہیں کے پاس رہے اور دنیادار لوگوں کا قبلہ سونا چاندی یعنی مال و دولت ہوتا ہے۔

قبلۂ صورت پرستاں آب و گل
قبلۂ معنی شناساں جان و دل

صورت پرستوں کا قبلہ پانی اور مٹی کا بنا ہوا پتلا ہوتا ہے اور وہ اُسی بت پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ مگر معانی سے واقف حال لوگوں کا قبلہ جان اور دل ہے۔ وہ ہمیشہ، جان، دل، روح اور قبر کی صفائی کے لیے کوشاں ہوتے ہیں

قبلۂ زُہاد محرابِ قبول
قبلۂ بدسیرتاں کارِ فضول

عابد و زاہد لوگوں کا قبلہ قبولیت کا محراب ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی نیکیاں قبول ہوجائیں اور بدکردار لوگ فضول کاموں میں منہمک ہیں۔ ان کا قبلہ وہی ہے

قبلۂ تن پروراں خواب و خورش
قبلۂ انساں بدانش پرورش

پیٹ کے پجاریوں کا قبلہ کھانے پینے اور سونے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اسی فکر میں رہتے ہیں۔ مگر انسان بحیثیت انسان عقل و دانش کی پرورش کرتے ہیں۔ وہ اسی تگ و دو میں رہتے ہیں۔

قبلۂ عاشق وصالِ بے زوال
قبلۂ عارف جمالِ ذوالجلال

عاشق کا قبلہ وصل لازوال ہوتا ہے۔ یعنی وہ ایسی ملاقات کا خواہشمند ہوتا ہے جس کو کبھی زوال نہ آئے۔ اور عارف لوگوں کا منتہائے مقصود حق تعالےٰ کا دیدار ہے وہ ہمیشہ وہاں تک کی رسائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

قبلۂ اصحابِ منصب مال و جاہ
قبلۂ اہلِ سلوک اسبابِ راہ

منصب پر فائز لوگوں کا قبلہ مال و دولت اور عزت و عظمت ہوتا ہے جب کہ خدا تعالیٰ کے راستے پر چلنے والے لوگوں کا قبلہ اُس راستے کے اسباب ہوتے ہیں جن کے ذریعے وہ مطلوبہ منزل حاصل کرتے ہیں۔

قبلۂ حرص و امل باشد ہوا
قبلۂ قانع توکل بر خدا

حرص اور آرزو والے لوگوں کا قبلہ ان کی خواہش کی تکمیل ہوتا ہے اور قناعت کرنے والوں کا قبلہ اللہ تعالےٰ پر اعتماد اور بھروسہ ہوتا ہے۔

کتمانِ حق

فرمایا اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْکِتٰبَ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے یعنی یہود و نصاریٰ۔ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ وہ اس

کو یعنی پیغمبر اسلام علیہ السلام یا قرآن پاک کو اسی طرح جانتے ہیں۔ جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔ وَاِنَّ فَرِیْقًا مِّنْهُمْ لَیَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ اور بے شک اُن میں ایک گروہ حق کو چھپاتا ہے۔ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ حالانکہ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہیں

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ پیغمبر اور کلام پاک کو بیٹوں کی طرح جاننے کا مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح بیٹا گود میں ہونے کی وجہ سے اُس پر شک نہیں گزرتا، اسی طرح اہل کتاب حضور علیہ السلام کو اپنی ہی کتابوں میں موجود نشانیوں سے پہچانتے ہیں۔ کہ یہ آخری نبی ہیں۔ مگر تسلیم نہیں کرتے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا مقولہ ہے۔ کہ مجھے اپنے بیٹے کے متعلق شک ہو سکتا ہے۔ کہ شاید اس کی ماں نے خیانت کی ہو۔ مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے بارے میں تردد نہیں ہو سکتا۔ فرمایا اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ یہ حق آپ کے رب کی طرف سے ہے۔ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ۔ آپ شک اور تردد کرنے والوں میں نہ ہوں۔

وقف النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ
اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا
اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ
فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا
كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ
حُجَّةٌ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۖ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ ۖ
وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

ترجمہ: اور ہر ایک کے لیے ایک جہت ہے، وہ اس کی طرف اپنا رُخ
کرنے والا ہے۔ پس سبقت کرو نیکیوں کی طرف۔ تم جہاں بھی ہو گے، تم سب کو
اللہ تعالیٰ اکٹھا کر کے لائے گا۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۱۴۸﴾
اور جس جگہ بھی آپ کہیں نکلیں۔ پس اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔ اور بیشک
یہ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے غافل نہیں
ہے، جو تم کرتے ہو ﴿۱۴۹﴾ اور جہاں بھی آپ نکلیں پس اپنا رُخ مسجد حرام کی
طرف پھیر دیں۔ اور جس جگہ بھی تم ہو (اے اہل ایمان) پس پھیرو اپنے چہروں کو اس
کی طرف، تاکہ نہ ہو لوگوں کو تمہارے اوپر الزام اور حجت، مگر وہ لوگ جنہوں نے ظلم
کیا اُن میں سے۔ پس اُن سے نہ ڈرو، اور مجھ سے ڈرو، اور تاکہ میں تم پر اپنی
نعمت پوری کروں اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ ﴿۱۵۰﴾

ربط آیات

تحویل قبلہ کا حکم نازل کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے تبلا دیا۔ کہ بیوقوف لوگ یعنی متعصب یہود و نصاریٰ یہ ضرور اعتراض کریں گے کہ تحویل قبلہ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ مگر اے نبی کریم آپ ان کے اعتراضات کو خاطر میں نہ لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ بیت المقدس کا استقبال عارضی حکم تھا۔ اور کسی خاص مصلحت کے تحت دیا گیا تھا۔ مستقل قبلہ تو بیت اللہ شریف ہے جس کا حکم حضور نبی کریم علیہ السلام کی دلی خواہش کے پیش نظر دیا گیا۔ یہ تقرر کوئی نیا نہیں ہے، بلکہ سابقہ کتب سماویہ میں موجود تھا۔ کہ آخری دور اور آخری نبی کا قبلہ وہی خانہ کعبہ ہو گا، جو ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے۔ اور اس میں اہل کتاب کے لیے آزمائش کا سامان بھی تھا۔ کہ ان میں سے کون ہے۔ جو اللہ کے نازل کردہ احکام کی پیروی کر کے ابراہیمی قبلہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ لہذا حضور علیہ السلام کو تسلی بھی دی گئی کہ آپ ان کے بیہودہ اعتراضات کی پرواہ نہ کریں۔ بلکہ آپ صراط مستقیم پر گامزن رہیں۔ اور اس سلسلہ میں آپ کو کسی قسم کا شک یا تردد نہیں ہونا چاہیئے۔

ہر امت کیلئے جہت مقرر ہے

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک اصولی بات بیان فرمائی ہے۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا یعنی ہر امت کیلئے ایک جہت ہوتی ہے جس کی طرف وہ رخ کرتے ہیں۔ دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں ہو گی جس کی جہت مقرر نہ ہو۔ اب یہ جہت صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اور محرف بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم ہر امت کا قبلہ ضرور مقرر ہے۔ اور پھر آخری امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر فرمایا۔ جب یہ ایک اصول موجود ہے تو پھر اہل کتاب کو مسلمانوں کے قبلہ پر معترض نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسا کرنا سخت ناانصافی کے مترادف ہے۔

جہت فروعی چیز ہے

یہاں پر اس بات کی وضاحت بھی کر دی کہ استقبال قبلہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے ایک حکم ہے۔ اور فرعی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ کوئی ایسا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ جس پر انسان بہت اصرار کرے لہذا اس قسم کی معمولی بات پر جھگڑنا

انصاف پسند لوگوں کا کام نہیں ہے۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر آئے گا۔ کہ اصل مقصد تو عبادت الٰہی ہے۔ جہت کا تعین تو محض توجہ کے لیے ہوتا ہے وگرنہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے لیے ہیں۔ جہت کی وجہ سے امت میں مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ عبادت کے لیے وسیلہ یا شرط ہے

بنیادی چیز نیکی ہے

فرمایا اصل اور بنیادی چیز نیکی ہے۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ لہٰذا نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔ یعنی زیادہ سے زیادہ نیکیاں حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا تم جہاں بھی ہو گے، يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اللہ تعالیٰ تم سب کو اکٹھا کر لے گا اور پھر آخرت میں بھی سب کو اکٹھا کر کے سب کا محاسبہ کرے گا۔ یہ تو بعد کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کر کے سب کا رخ ادھر مقرر کر دیا۔ اور سب کو اس پر جمع کر دیا۔ فرمایا آگے چل کر نیکی ہی تمہارے کام آئے گی۔ لہٰذا نیکی میں سبقت حاصل کرو۔ حضور علیہ السلام نے حضرت علیؓ کو فرمایا، اے علی! تین چیزوں میں تاخیر نہ کرو "اَلصَّلٰوةُ اِذَا اَتَتْ" یعنی نماز کا وقت ہو جائے تو تاخیر نہ کرو۔ "وَالْجَنَازَةُ اِذَا حَضَرَتْ" اور جب جنازہ تیار ہو جائے تو جلد پڑھو، تاخیر نہ کرو۔ "وَالْاَيِّمُ اِذَا وَجَدَتْ لَهَا كُفُوًا" اور جب بے نکاح (مرد یا عورت) کا ہمسر مل جائے تو نکاح میں تاخیر نہ کرو۔ یہ سب نیکی میں سبقت کرنے والی باتیں ہیں۔

فرمایا جس طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب کو ایک قبلہ پر اکٹھا کر دیا ہے اسی طرح آخرت میں بھی سب کو جمع کرے گا۔ اور یہ اس کے لیے قطعاً محال نہیں کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کے احاطہ اختیار سے کوئی چیز باہر نہیں۔

استقبال قبلہ کے سہ گونہ احکام

اگلی دو آیات میں استقبال قبلہ کا تین دفعہ حکم دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ اور آپ جس جگہ نکلیں، اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔

فرمایا۔ وَإِنَّهُ لَلْحَقُّ مِن رَّبِّكَ اور بیشک یہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے غافل نہیں ہے جو تم کرتے ہو۔ دوسری بار پھر ارشاد فرمایا وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور آپ جہاں کہیں بھی نکلیں، اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں۔ اسی آیت میں پھر آگے فرمایا وَحَيْثُ مَا كُنتُمْ اور آپ لوگ جس مقام پر بھی ہوں فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ اپنے چہروں کو اسی کی طرف پھیر لیں۔

ایک ہی مقام پر تین بار استقبال قبلہ کا حکم دینے کی مختلف توجیہات ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ استقبال قبلہ کا پہلا حکم ان لوگوں کے لیے ہے۔ جو حدود حرم کے اندر رہتے ہیں۔ اور دوسرا حکم اُن کے لیے ہے جو ملک عرب میں اقامت پذیر ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تیسرا حکم عرب کے علاوہ باقی ساری دنیا کے رہنے والوں کے لیے نازل ہوا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلا حکم اس لیے دیا گیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی مرضی اور خواہش تھی۔ کہ قبلہ ابراہیمی ہی ہمارا قبلہ مقرر ہو۔ لہٰذا یہ حکم دیا گیا۔ فرمایا دوسرا حکم اس واسطے دیا گیا کہ سابقہ صحف میں اسکی پیش گوئیاں موجود تھیں۔ اور ان کی تصدیق کے لیے یہ دوسرا حکم نازل کیا گیا۔ پھر تیسری دفعہ استقبال کا حکم اس لیے دیا کہ لوگوں کو الزام کا موقع نہ ملے۔ کہ دیکھو! مسلمان ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا دین سچا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ یہ عنادی اہل کتاب اس قسم کے اعتراض کریں گے۔ لہٰذا ان کو رفع کرنے کے لیے فرمایا لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ تاکہ آپ پر لوگوں کا الزام یا کوئی حجت باقی نہ رہے۔ کبھی یہ نہ کہنے لگیں کہ جب قبلہ ہمارا تسلیم کرتے ہیں۔ تو ہمارا باقی دین کیوں تسلیم نہیں کرتے۔

فرمایا اس اتمام حجت کے باوجود بعض لوگ حجت بازی سے باز نہیں آئیں گے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ یہ اُن اہل کتاب

میں سے ظالم لوگ ہونگے جو اپنی بات پر اڑے رہیں گے اور تحویل قبلہ پر بیہودہ قسم کے اعتراض کرتے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے فرمایا کہ اہل کتاب تو صرف تحویل قبلہ پر ایک اعتراض کرینگے مگر مشرکین ہر دو صورتوں میں معترض ہونگے یعنی بیت المقدس کو قبلہ پکڑنے پر بھی اعتراض کرینگے اور اس کے بیت اللہ شریف کی طرف پلٹنے پر بھی معترض کے معترض رہیں گے۔

فرمایا اس قسم کے حجت بازوں کی آپ بالکل پرواہ نہ کریں۔ فَلَا تَخْشَوْهُمْ آپ اُن سے خوفزدہ نہ ہوں وَاخْشَوْنِي بلکہ آپ مجھ سے ہی خوف کھائیں۔ یہ لوگ محض تعصب کی وجہ سے حق کو چھپاتے ہیں۔ اور آپ پر طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں اُن کے اعتراضات سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا خوف جاگزیں ہونا چاہیے۔ جب اللہ کا خوف پیدا ہو جائیگا تو باقی تمام خوف خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

قبلہ تکمیل نعمت ہے

اللہ تعالیٰ نے قبلہ مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ اور تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں گویا بیت اللہ کا تقرر نعمت خداوندی کی تکمیل ہے۔ وہی بیت اللہ شریف جو تمام قبلوں سے افضل ہے۔ تجلی گاہ خداوندی اور پوری دنیا کے لیے مرکز ہدایت ہے وہاں پر کیے جانے والے عمل کا اجر و ثواب لاکھ گناہ زیادہ ہے۔ اسی لیے یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے ماننے والوں کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ اگلی آیتوں میں کتاب، نبی اور عبادت خانے کا ذکر بھی آئے گا۔ تو یہ اللہ تعالےٰ کا بہت بڑا احسان ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے۔ کہ جس طرح اللہ تعالےٰ نے بے مثال قبلہ مقرر کیا ہے۔ اسی طرح کتاب بھی بے مثال دی ہے اور دین بھی جامع اور کامل عطا کیا ہے گویا اللہ تعالےٰ نے ہر نعمت اس آخری امت کے لیے اٹھا رکھی ہے۔ منجملہ ان کے اللہ تعالےٰ نے انسان کو اپنی خلافت بخشی ہے۔ یہ بھی بہت بڑا انعام ہے۔ جو اولاد آدم کے علاوہ کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں ہوا

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً "خلافت نیابت الٰہی ہے۔ اس میں تقویٰ کا اظہار ضروری ہے۔ اور عدل و انصاف قائم کرنا بہت بڑی بات ہے۔ پھر یہ ہے۔ کہ خلافت کے لیے قانون اور شریعت کی ضرورت ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کی۔ یہ خلافت اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو بھی عطا کی یَاداوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ" مقصد یہی ہے کہ وَلِاُتِمَّ نِعْمَتِیْ عَلَیْكُمْ تاکہ تم پر تکمیل نعمت ہو جائے۔ بیشک اللہ نے خلافت جیسی نعمت عطا کی۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسری قوموں کی طرح مسلمانوں نے بھی اپنی نالائقی کی وجہ سے اسے خراب کر دیا۔ اور ملوکیت میں مبتلا ہو کر برائیاں اختیار کر لیں۔ ظلم و زیادتی کے مرتکب ہوئے۔ تاہم اللہ نے اپنی نعمت مکمل کر دی۔ یہاں اسی بات کی طرف اشارہ ہے

قبلہ ذریعہ ہدایت ہے

اللہ تعالیٰ نے تقرر قبلہ کی ایک اور وجہ یہ بیان فرمائی وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ تو اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے تمام ہی سامان مہیا کر دیے ہیں۔ جیسا کہ دعا میں درخواست کی جاتی ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ" اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ"۔ اسی طرح ابتدائے سورۃ میں فرمایا" ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ" یہ متقی لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔ گویا کتاب اللہ بھی ذریعہ ہدایت ہے۔ یہ کتاب تقویٰ اور عدل و انصاف اختیار کرنے والوں کی راہنمائی کرتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی" وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ" اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔ ان کی راہنمائی راہ راست کی طرف نہیں کرتا وہ اندھیروں میں ہی بھٹکتے رہتے ہیں۔

الغرض! جس طرح بعض دوسری چیزیں ذریعہ ہدایت ہیں۔ اسی طرح قبلہ کو بھی ذریعہ ہدایت فرمایا وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے یہ سارے سامان مہیا فرما دیے۔

كَمَآ اَرۡسَلۡنَا فِيۡكُمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡكُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡكُمۡ اٰيٰتِنَا
وَيُزَكِّيۡكُمۡ وَيُعَلِّمُكُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُعَلِّمُكُمۡ
مَّا لَمۡ تَكُوۡنُوۡا تَعۡلَمُوۡنَ ؕ ﴿۱۵۱﴾ فَاذۡكُرُوۡنِىۡٓ اَذۡكُرۡكُمۡ وَاشۡكُرُوۡا لِىۡ
وَلَا تَكۡفُرُوۡنِ ﴿۱۵۲﴾ ع ۱۸ / ۵

ترجمہ: جس طرح کہ ہم نے تم میں سے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا، جو تم پر ہماری آیتیں پڑھتا ہے، اور تم کو پاک کرتا ہے۔ اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ اور تمہیں وہ سکھاتا ہے، جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۱۵۱﴾ پس مجھے یاد کرو، میں تم کو یاد رکھوں گا۔ اور میرا شکریہ ادا کرو۔ اور تم ناشکر گزار نہ بنو ﴿۱۵۲﴾

ربط آیات

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہت قبلہ کے متعلق فرمایا کہ تم جہاں کہیں ہو، اپنا رُخ بوقت نماز بیت اللہ شریف کی طرف کر لو۔ مگر یہود و نصاریٰ جو ظالم لوگ ہیں اور بات بات پر بے جا اعتراض کرتے ہیں، اُن سے خوفزدہ نہ ہوں۔ اُن کے طعن و تشنیع اور اعتراضات کی پرواہ کریں۔ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ لہٰذا آپ ہر قسم کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر بیت اللہ شریف کو اپنا قبلہ اپنا لیں۔ فرمایا اس کی غایت یہ ہے کہ وَلِاُتِمَّ نِعۡمَتِىۡ عَلَيۡكُمۡ تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں۔ وَلَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ مقصد یہ کہ قبلہ کی طرف رُخ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کو زیادہ فضیلت والا قبلہ مقرر فرمایا ہے۔ جو کسی خاص قوم اور علاقے کے لیے نہیں بلکہ اقوام عالم کے لیے بین الاقوامی نوعیت کا قبلہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے کہ اس خطہ کو یہ شرافت بخشی ہے۔ کہ اس

جگہ عبادت اور ریاضت کا اجر و ثواب دوسرے کسی بھی مقام کی نسبت بہت زیادہ ہے یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اور پھر اس انعام کے دو حصے ہیں یعنی مادی اور روحانی۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک مادی انعام ہے اور قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا روحانی انعام ہے۔

اتمامِ نعمت اتمام نعمت کے متعلق حضرت علیؓ کی روایت میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ انسان کے لیے اتمام نعمت یہ ہے مَنْ دَخَلَ الْجَنَّةَ کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مقام ہے۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے اتمام نعمت یہ ہے۔ کہ انسان کا خاتمہ ایمان پہ ہو جائے۔ کیونکہ صحیح معنوں میں مومن وہی ہے جس کا خاتمہ بالایمان ہو۔ اسی لیے خود انبیائے کرام بھی یہی دعا کرتے رہے۔ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۔ یعنی اے مولا کریم مجھے اسلام اور ایمان کی حالت میں موت دینا اور میرا حشر صالح لوگوں کے ساتھ کرنا۔ اسی طرح خلافت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو عطا فرماتا ہے

بعثتِ رسول فرمایا كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ جس طرح ہم نے تم میں سے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا۔ یہاں پہ لفظ کَمَا تشبیہ کے لیے آیا ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کر کے تم کو فضیلت بخشی اور اتمام نعمت کیا۔ اسی طرح ہم نے تمہاری طرف عظیم الشان رسول بھیج کر تم پر احسان کیا اور اپنی نعمت کو کامل بنایا۔ رسول کا بھیجنا بھی اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے انعامات میں سے ہے دوسری جگہ قرآن پاک نے حضور علیہ السلام کے وجود مبارک کو نعمت سے تعبیر کیا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا کیا آپ نے قریش مکہ اور مشرکین عرب کو نہیں دیکھا۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے انعام کی ناقدری کی۔ گویا نعمت کو کفر کے ساتھ تبدیل کیا۔ مراد یہ ہے کہ خود حضور علیہ السلام جن کا وجود پاک اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اس کی ناقدری کی مقصد یہ کہ جس طرح ہم نے تمہاری طرف

تمہیں میں سے ایک رسول مبعوث کیا۔

کَمَا کا یہ کاف علت کے لیے بھی ہو سکتا ہے اس لحاظ سے کَمَا سے مراد یہ ہوگا۔ تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کروں اور تاکہ تم ہدایت کے راستے پر قائم رہو۔ اور اس طرح یہ کاف تشبیہ کا نہیں بلکہ تعلیل کا ہوگا۔ اور معنی یہ ہوگا کہ ہم نے تمہارے درمیان ایک عظیم الشان رسول اس لیے بھیجا تاکہ اتمام نعمت ہو جائے اور ہدایت کا راستہ بھی واضح ہو جائے۔ اس لحاظ سے یہ لفظ کَمَا بالکل اسی طرح ہے۔ جسطرح حضور علیہ السلام نے دعا میں سکھایا اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ كَمَا كَسَوْتَنِيْ کہ جب لباس پہنو تو یوں کہو۔ کہ اے اللہ تیرا شکر ہے۔ کہ تو نے ہمیں لباس پہنایا یہ لباس بھی تو نے ہی عطا کیا ہے گویا اس لحاظ سے یہ کاف تشبیہ کی بجائے تعلیل کے لیے ہے یعنی جو علت کا معنی دیتا ہے۔

یہاں پر بھی لفظ رسولاً بطور اسم نکرہ آیا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے۔ کہ ہم نے تمہاری طرف ایک عظیم الشان رسول بھیجا ہے۔ بڑا رسول بھیجا ہے۔ جو کہ مِنْكُمْ تم میں سے ہی ہے۔ اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں بھی گذر چکا ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یعنی اے ہمارے رب ہماری اولاد میں سے امت مسلمہ برپا کر اور پھر ان کے اندر ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرما۔

تلاوت اور تزکیہ

فرمایا ایک ایسا رسول يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا جو تمہارے سامنے ہماری آیتیں پڑھتا ہے۔ لفظ آیت مختلف معانی کے لیے آتا ہے۔ اس سے مراد معجزہ، نشانی، حکم یا فرمان ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہمارا مبعوث کردہ رسول ہماری آیات یعنی ہمارا کلام جو بذریعہ وحی نازل ہوتا ہے وہ پڑھ کر سناتا ہے۔

وَيُزَكِّيْكُمْ اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے یعنی پاک صاف کرتا ہے۔ رذیل اور گندی عادات سے بچا کر تمہارے اندر اچھے اخلاق اچھے اعمال اور اچھے عقائد قائم کرتا ہے

کتاب وحکمت کی تعلیم

یہ ایسا عظیم الشان رسول ہے۔ جو تلاوت و تزکیہ کے ساتھ ساتھ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اس تعلیم کا ذکر حضرت

ابراہیم علیہ السلام کی دُعا میں بھی آ چکا ہے وہاں بھی انہوں نے یہی دُعا کی تھی۔ کہ اے ہمارے رب اس امت مسلمہ میں ایسا رسول بھیج جو انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ وہاں پر تزکیہ کا ذکر کتاب وحکمت کی تعلیم کے بعد کیا تھا۔ مگر یہاں پر اس کا ذکر پہلے آیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس تقدم وتاخر میں بھی نکتہ پنہاں ہے۔ وہاں پر دُعا کا مقام تھا۔ کہ مولا کریم! ایسا رسول مبعوث فرما جو ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ اُن کا تزکیہ ہو جائے وہ ظاہری اور باطنی طور پر ہر لحاظ سے پاک صاف ہو جائیں اور یہ مقام عمل کا مقام ہے۔ تعلیم کتاب وحکمت کی غرض وغایت یہ ہے کہ انسان کا تزکیہ ہو جائے۔ اب جب کہ امت مسلمہ پیدا ہو چکی، عظیم الشان رسول مبعوث ہو چکا۔ تو اب کتاب وحکمت کی تعلیم کی اصل غرض وغایت یعنی تزکیہ کو پہلے بیان فرمایا کہ جس طرح ہم نے تم میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ہماری آیات پڑھتا ہے۔ تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔ اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

الغرض! ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا مقام تعلیم اور پیش گوئی کا مقام تھا۔ اور یہ عمل کا مقام ہے۔ لہٰذا کتاب وحکمت کی تعلیم کی غرض وغایت یعنی تزکیہ کو پہلے بیان فرمایا جب تک مقصد حاصل نہ ہو، عمل کا کچھ فائدہ نہیں۔ تعلیم اسی وقت مفید ہوگی۔ جب اس کا مقصد تزکیہ حاصل ہو جائے۔ تعلیم مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالذات تزکیہ ہے۔ جس کا تذکرہ اس مقام پر پہلے کیا ہے۔

اَن جانی چیزوں کی تعلیم

فرمایا کتاب وحکمت کی تعلیم کے علاوہ ہمارا رسول وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ۔ تمہیں وہ چیزیں بھی سکھاتا ہے۔ جو تم نہیں جانتے تھے۔ مثلاً لوگ وضو اور طہارت کا طریقہ نہیں جانتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں پیغمبر علیہ السلام کی تعلیم کے ذریعے سکھایا۔ لوگ غسل جنابت کے طریقہ سے ناواقف تھے۔ انہیں تعداد رکعات معلوم نہ تھیں۔ نماز اور دیگر عبادات کا طریقہ معلوم نہیں تھا۔ حلال وحرام کی تمیز نہ تھی۔ یہ سب چیزیں اللہ نے نبی کے ذریعے

سکھائیں۔ اسی کو فرمایا۔ کہ ہمارا رسُول تمہیں وہ چیزیں سکھاتا ہے۔ جو تمہارے علم میں نہ تھیں۔

حضرت جعفرؓ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ جب کچھ مسلمان قریش مکہ کی ایذارسانیوں سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ اور کفار نے وہاں بھی مسلمانوں کا پیچھا کیا تو حضرت جعفرؓ نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر کی اُس کا لب لباب یہ تھا۔ کہ اے بادشاہ! ہم بت پرستی کرتے تھے۔ ہمارے اندر ہر قسم کی برائیاں موجود تھیں۔ حلال وحرام کی تمیز نہیں کرتے تھے۔ ظلم وجبر کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ حق وانصاف کے تقاضوں سے ناآشنا تھے، اللہ تعالیٰ نے ہم میں نبی آخر الزماں مبعوث فرما کر سب سے پہلا حکم یہ دیا۔ کہ خدا کے ساتھ شرک نہ کرو، بت پرستی سے باز آجاؤ۔ صرف اُسی وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرو۔ حلال وحرام میں تمیز پیدا کرو۔ کسی کو ظلم کا نشانہ نہ بناؤ۔ اللہ کے نبی نے ہمیں عبادت کا صحیح طریقہ سکھایا۔ تہذیب وتمدن کے اصول بتلائے اور معیشت کے نکات سمجھائے۔

آپ نے عقائد کی اصلاح کے اصول بتائے۔ اور پھر پیش آنیوالے واقعات کو بیان فرمایا۔ مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ قبر کی زندگی، قیامت کو دوبارہ جی اٹھنا پلصراط پر سے گزرنا اور آخر میں محاسبے کی منزل، میزانِ عدل کا قیام اور پھر رب العزت کا آخری فیصلہ، یہ سب باتیں حضور علیہ السلام نے امت کو بتلادیں گویا انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی زبان سے کہلوایا اے لوگو! آؤ میں تم کو نہ بتلاؤں کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے کس کس چیز کو حلال اور کس کس کو حرام قرار دیا ہے۔ مطلب یہی ہے کہ میں تمہیں وہ چیزیں بتلاؤں، جو تم نہیں جانتے۔

اسی طرح حضور علیہ السلام نے مظالم سے بچنے کا طریقہ بتلایا۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام یہ ہے کہ اُس نے بہترین نظام حکومت قائم کرنے کے اصول بتلائے اور پھر انہی اصولوں کے مطابق نظام خلافت قائم ہوا۔ عرب

کے لوگ ہزاروں سال تک نظام حکومت سے نابلد رہے، حالانکہ دیگر اقوام مثلاً رومی اور ایرانی نظام حکومت سے بخوبی واقف تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا۔ کہ اپنے پیغمبر کے ذریعے نظام حکومت کی تعلیم دی۔ جسکی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں پرچم اسلام آدھی دنیا پر لہرانے لگا۔ یہ سب چیزیں وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

تہذیب اخلاق کے پانچ اصول ذکر، شکر، صبر دُعا، تعظیم شعائر اللہ

اِن انعامات کا تذکرہ بیان کر لینے کے بعد فرمایا، کہ جب میں نے اتنے بڑے بڑے انعامات تم پر کیے ہیں۔ تو پھر تمہارا بھی فرض ہے کہ فَاذْكُرُونِي مجھے یاد کرو۔ گویا یہاں سے تہذیب کا باب شروع ہوتا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی قباحتیں بیان کیں، پھر ملت ابراہیمی کی بنیاد کا ذکر کیا۔ خانہ کعبہ کے مرکز ہدایت ہونے کا بیان ہوا۔ پیغمبر علیہ السلام کا ذکر ہوا۔ کتاب کا بیان آیا۔ اور اب یہاں سے تہذیب اخلاق یا تہذیب نفس کے احکام شروع ہوتے ہیں۔ جن کی بدولت انسان میں تہذیب اور شائستگی پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں اس مقام پر دو اصول بیان ہوئے ہیں۔ اور باقی تین اصول آئندہ رکوع میں بیان ہوں گے۔

پہلا اصول ذکر الٰہی

تہذیب نفس کا پہلا اصول جو یہاں بیان ہوا، وہ ذکر الٰہی ہے۔ گویا ہمارا نصاب تعلیم اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ذکر زبان، عمل، قلب اور روح کے ذریعے ہوتا ہے۔ ذکر کا عام فہم طریقہ زبان کے ذریعہ سے ہے۔ انسان زبان کے ساتھ خدا تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہے۔ اس کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ تلاوت کلام پاک کرتا ہے۔ یہ سب ذکر کی زبانی صورتیں ہیں۔ ایک صحابی نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا، حضور! اَيُّ الْاَعْمَالِ اَفْضَلُ کونسا عمل افضل ہے۔ فرمایا لَا يَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ یعنی تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیئے۔ ایک دوسری روایت میں فرمایا افضل عمل ایمان باللہ ہے۔ کہیں فرمایا کہ نماز سب سے افضل عمل ہے اور کہیں جہاد فی سبیل اللہ کو افضل عمل قرار دیا تاہم یہ بھی ارشاد فرمایا کہ انسان کی زبان ہر وقت ذکر الٰہی سے تر رہنی چاہیئے۔ ذکر الٰہی ایک

ایسی عبادت ہے۔ جسکی کوئی حد نہیں، نماز، روزہ، جہاد وغیرہ سب محدود ہیں مگر ذکرِ الٰہی غیر محدود ہے اسی لیے فرمایا اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيرًا اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو۔ ایک اور روایت میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر کثرت سے یاد کرو، ذکرِ الٰہی میں اتنے محو رہو کہ لوگ دیوانہ کہنے لگیں۔ اور پھر ذکرِ الٰہی کا صلہ یہ ملیگا۔ کہ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ الغرض ذکرِ الٰہی کثرت سے کرو، کیونکہ اس کی کوئی حد مقرر نہیں۔

امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکمت کے مطابق جب کوئی شخص اللہ تعالےٰ کا ذکر اخلاص، نیک نیتی اور اچھی کیفیت کے ساتھ کرتا ہے۔ تو اُس کا رُخ حظیرۃ القدس کی طرف ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا تعلق روحِ اعظم کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے جو کہ حظیرۃ القدس میں ایک بڑی روح ہے۔ بنی نوع انسان کی یہ چھوٹی چھوٹی روحیں بڑی روح کے اعضا و جوارح ہیں۔ اس طرح گویا ذکرِ الٰہی کرنے والے کا تعلق براہِ راست خدا تعالیٰ کی تجلی اعظم کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ذاکر کی نفسیاتی کیفیت جسقدر روحِ اعظم کے مطابق ہوگی اُسی قدر اس کو قربِ الٰہی حاصل ہوگا۔ تو ظاہر ہے۔ کہ اس سے انسان کے اندر شائستگی پیدا ہوگی، جس کے بغیر وہاں داخلہ ممکن نہیں۔ اگر جسم اور روح قلب یا نفس میں کسی قسم کی نجاست ہوگی تو قربِ الٰہی نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ ملّت ابراہیمی کا اہم اصول ہے۔ جس سے انسان کو تہذیب نصیب ہوتی ہے۔

الغرض! فرمایا فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ پس تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھونگا۔ یعنی میں تمہیں اس ذکر کی بدولت اجر و ثواب عطا کرتا رہوں گا، تقرب نصیب کرتا رہوں گا حدیث شریف میں آتا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص مجھے اپنے جی میں یاد کریگا میں بھی اُس کو اپنے جی میں یاد کروں گا جس کو اللہ جلّ شانہٗ اپنے جی میں یاد کرے اسکی عظمت و فوقیت کس قدر قابلِ رشک ہوگی پھر فرمایا جو مجھے کسی مجمع میں یاد کرے گا، میں اس کا ذکر اس سے بہتر مجمع میں کروں گا۔ جو شخص میری طرف چل کر آئے گا، میں اُس کی طرف دوڑ کر آؤں گا۔ یہ سب ذکرِ الٰہی کی برکات ہیں حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے فرمایا، اے معاذ! جب بھی

نماز پڑھو۔ تو اس کے بعد یوں کہا کرو اَللّٰھُمَّ اَعِنِّیْ عَلٰی ذِکْرِکَ وَشُکْرِکَ وَحُسْنِ عِبَادَتِکَ یعنی اے اللہ! مجھے اپنا ذکر کرنے، شکر کرنے اور اچھے طریقے سے عبادت کرنے کی توفیق عطا فرما۔

دوسرا اصول شکر الٰہی

تہذیب نفس کا دوسرا اصول یہاں پر یہ بیان فرمایا وَاشْکُرُوْلِیْ اور میرا شکریہ ادا کرو وَلَا تَکْفُرُوْنِ اور میرے ناشکرگزار نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کرنے کی مختلف صورتیں ہیں شکریہ زبان سے بھی ادا ہوتا ہے اور عمل سے بھی ادا ہوتا ہے مثلاً جب کوئی انسان کھانا کھاتا ہے۔ تو زبان سے الحمد للہ کہتا ہے۔ گویا اللہ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اس سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے اولاد دی ہے۔ تو انسان عقیقہ کر کے اللہ کا شکرگزار بنتا ہے۔ اللہ کی نعمت کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اگر انسان کو حج نصیب ہو، تو قربانی کر کے شکریہ ادا کرتا ہے۔ اگر انسان کو نیا لباس میسر آجائے تو اس کا شکریہ یہ ہے۔ کہ پرانا لباس فی سبیل اللہ دیدے۔ حضور علیہ السلام کی عادت مبارک یہی تھی۔ جب نیا کپڑا پہنا، دعا کی اور پرانا کپڑا کسی محتاج کو دے دیا۔ اگر کسی کو اللہ نے دودھ دینے والا جانور دیا ہے۔ تو اس کا شکریہ یہ ہے۔ کہ اس کا دودھ کبھی کبھی محتاجوں کو بھی دے دیا کرے۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ اگر جانور نے کسی دن دودھ نہیں دیا تو پیر! دم کرانے کے لیے لے آتے ہیں۔ بھائی! تم نے اس کا دودھ محتاج کو دیکر اس کا شکریہ تو ادا ہی نہیں کیا۔ کرنے کا اصل کام تو وہ تھا۔ الغرض زبان، جوارح، مال اور عمل سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا تہذیب نفس کا دوسرا اصول ہے۔

فرمایا وَلَا تَکْفُرُوْنِ ناشکرگزار نہ بنو۔ ظاہر ہے کہ اگر حصول نعمت پر شکریہ ادا نہیں کیا تو گویا انسان نے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی۔ ایسا شخص اتصال حظیرۃ القدس سے محروم رہ گیا۔ لہٰذا اگر کامیابی کی خواہش ہے تو ہر نعمت پر اللہ کا شکریہ ادا کرے۔ اور کسی صورت میں بھی ناشکرگزار نہ بنو۔

درس پنجاہ و نہ (۵۹) آیت ۱۵۳ تا ۱۵۴

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو صبر اور نماز کے ساتھ مدد حاصل کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے (۱۵۳) اور نہ کہو ان لوگوں کے بارے میں مردہ جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں۔ بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم شعور نہیں رکھتے (۱۵۴)

گذشتہ سے پیوستہ

بنی اسرائیل کا شکوہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر کیا۔ پھر حضور علیہ السلام کی رسالت کا تذکرہ فرمایا۔ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور "كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ" اور ملت ابراہیمی کا ذکر فرمایا اور اس کے بنیادی اصول بیان کیے۔ بیت اللہ شریف کے قبلہ مقرر ہونے پر یہودیوں کے اعتراضات کا تذکرہ ہوا۔ اس کا مزید بیان آگے بھی آئے گا۔

"فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ" سے ایک نیا باب شروع ہوا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اسے اپنی حکمت میں تہذیب الاخلاق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس باب میں تہذیب الاخلاق کے بڑے بڑے اصول بیان ہوئے ہیں۔

بر سر عروج قوم کی پانچ منازل

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حکمت کے مطابق کوئی بھی قوم ترقی کی پانچ منازل طے کیے بغیر سر عروج نہیں پہنچ سکتی۔ ترقی یافتہ قوم کی پہلی منزل تہذیب الاخلاق ہے۔ اور دوسری تدبیر منزل۔ تدبیر منزل کے آگے چار قانون ہوتے ہیں۔ پہلا قانون شادی بیاہ سے متعلق ہے۔ جس میں میاں بیوی کے حقوق و فرائض آتے

ہیں، دوسرا قانون والدین اور اولاد کی اصلاح سے متعلق ہے۔ تیسرا قانون مالک اور مملوک کے تعلقات پر مبنی ہوتا ہے۔ اور چوتھے قانون میں اقربا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات اور ان کی اصلاح کی تدبیر ہوتی ہے۔

تہذیب الاخلاق اور تدبیر منزل کے بعد ترقی یافتہ قوم کی تیسری منزل تدبیر مدنیہ ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے شہر، بستی یا محلہ کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے۔ اس کے بعد چوتھی منزل اصلاح ملک سے متعلق ہوتی ہے۔ اور پانچویں منزل خلافت کبریٰ کی ہے جس کے ذریعے تمام جہاں کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو ارتفاق رابع کے اصول کے مطابق مبعوث فرمایا۔ اور اس سے مراد بین الاقوامی یعنی تمام عالم کی اصلاح ہے۔ الغرض جو قوم ترقی کے بام پر پہنچتی ہے، اُسے بہر حال یہ پانچ منازل طے کرنا پڑتے ہیں۔ ترقی کے آخری زینہ پر پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں اس قدر صلاحیت پیدا ہو جائے۔ کہ وہ حظیرۃ القدس یا بہشت بریں کا ممبر بن جائے۔ یہ انسان کی انتہائی ترقی کا مقام ہے۔ اگر وہ حظیرۃ القدس کی منزل تک نہیں پہنچ سکا تو وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔

گذشتہ درس میں تہذیب الاخلاق کے پانچ اصولوں کا تذکرہ اجمالاً آچکا ہے۔ ان میں سے دو اصول ذکرِ الٰہی اور سخاوت کا بیان گذشتہ رکوع میں آچکا ہے ظاہر ہے کہ ان پانچ اصولوں پر عمل کیے بغیر کوئی شخص مہذب نہیں کہلا سکتا موجودہ زمانے میں جس شخص کے لیے مہذب کا ہم معنی لفظ کلچرڈ (CULTURED) بولا جاتا ہے۔ وہ اسلام کے اصولوں سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ بلکہ صحیح معنوں میں کلچرڈ یا مہذب اُسے کہیں گے۔ جو اسلام کے قائم کردہ ان پانچ اصولوں پر پورا اترے گا۔

تہذیب الاخلاق کا تیسرا اصول صبر

آیت زیرِ درس میں تہذیب الاخلاق کا تیسرا اصول صبر بیان کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ط اے ایمان والو صبر اور نماز کے ساتھ استعانت پکڑو۔ صبر ملت ابراہیمی کا ایک اہم اصول

ہے۔ کنز العمال میں یہ حدیث موجود ہے، جسے امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اور دوسرے علماء نے بھی نقل کیا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے۔ کہ صبر کا معنی کسی چیز سے رُک جانا یا کسی شئے کو برداشت کرنا ہے اور اس کے تین مادے ہیں، صبر علی المصیبت، صبر علی الطاعۃ اور صبر عن المعصیۃ۔

صبر علی المصیبت یہ ہے۔ کہ اہل ایمان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے۔ کوئی حادثہ پیش آتا ہے۔ تو وہ اسے من جانب اللہ سمجھ کر اس پر صبر کرتے ہیں اور اس کے جواب میں "اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ" کہتے ہیں، ایسے شخص کا تعلق باللہ مضبوط ہوتا ہے۔ اسی لیے ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ وَمِنَ الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهٖ عَلَيْنَا مَصَائِبَ الدُّنْيَا حضور علیہ السلام نے امت کو یہ دُعا سکھائی۔ کہ اے اللہ یقین میں اس قدر درجہ عطا کر کہ دنیا کی مصیبتیں ہلکی ہو جائیں۔ ایسا شخص ہر تکلیف پر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے۔ اُسی کا ارادہ اور مشیت کام کر رہی ہے۔ وہ ہر تکلیف کو خوشی سے برداشت کرے گا، اُس پر جزع فزع نہیں کرے گا۔ نہ چیخے چلائے گا اور نہ کوئی واویلا کرے گا۔ یہ اس کے تعلق باللہ کی نشانی ہے۔ اس کی مزید تشریح یوں بیان فرمائی اَلصَّبْرُ عِنْدَ صَدْمَةِ الْاُوْلٰى کسی مصیبت کی ابتداء میں صبر کرنا ہی صبر کی علامت ہے۔ وگرنہ جب تکلیف کا سامنا کرتے ہوئے انسان تھک جاتا ہے اور تمام وسائل سے مایوس ہو جاتا ہے، تو پھر صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی اطاعت پر صبر کرنا صبر علی الطاعۃ کہلاتا ہے ظاہر ہے۔ کہ کوئی کام بھی بغیر حوصلہ اور برداشت کے انجام نہیں پا سکتا۔ گرمی سردی میں وضو کے لیے تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ بہت بڑی مشقت کا کام ہے۔ حج و عمرہ میں تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ غرضیکہ اطاعت کا کوئی بھی کام صبر کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

صبر عن المعصیت یہ کہ جب نفسانی خواہشات سامنے آئیں تو

انسان اُن پر کنٹرول کرے۔ اور اپنے نفس کو معصیت سے روکے۔ جو شخص حرص و ہوا کا بندہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہر نفسانی خواہش کے آگے جھک جاتا ہے۔ اور اس طرح معصیت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہی وہ موقع ہے۔ جب انسان صبر عن المعصیت کا دامن پکڑ لیتا ہے۔ اور کامیابی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالے کا ارشاد ہے اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ" یعنی اللہ تعالی صبر کرنے والوں کو بغیر حساب اجر عطا کرے گا۔

طبرانی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ صبر نصف ایمان ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے اَلصَّبْرُ مِنَ الْاِیْمَانِ بِمَنْزِلَةِ الرَّاْسِ مِنَ الْجَسَدِ صبر کا تعلق ایمان کے ساتھ ایسا ہے جیسا سر کا تعلق جسم کے ساتھ ہے۔ جسم سے سر علیحدہ ہو جائے تو جسم بیکار ہو جاتا ہے اسی طرح اگر صبر کا مادہ مفقود ہو جائے۔ تو ایمان کا کوئی فائدہ نہیں۔ صبر ایسا قیمتی اصول ہے۔ کہ اس کے متعلق فرمایا لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا صَبْرَ لَهٗ جس نے صبر کا دامن چھوڑ دیا، اُس کا ایمان باقی نہیں رہا۔ اس کا ایمان ڈانواں ڈول ہو گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ اے ایمان والو! صبر کے ساتھ مدد حاصل کرو۔ یعنی اس پر کاربند ہو جاؤ۔ کوئی مشکل درپیش ہو، اطاعت کا محل ہو یا معصیت سے رکنے کا موقع ہو، ہر حالت میں صبر کا دامن تھامے رکھو۔ تہذیب الاخلاق کا یہ تیسرا اصول ہے۔

تہذیب الاخلاق کا چوتھا اصول نماز

فرمایا اے ایمان والو! استعانت حاصل کرو صبر اور نماز کے ساتھ۔ ظاہر ہے۔ کہ جس شخص میں نماز کی روح پیدا ہو گی اس میں توحید کا اعلیٰ مقام پیدا ہو گا۔ ایسے شخص کا تعلق اللہ تعالے کے ساتھ درست ہو جائے گا۔ اُس کو بلند مقام حاصل ہو گا۔ نماز کے متعلق اللہ نے فرمایا "اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِکْرِیْ" میری یاد آوری کے لیے نماز قائم کرو۔ اس سے اخبات حاصل ہو گا۔ فرمایا "وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ" اپنے رب کی تکبیر بیان کرو "وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ" اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھو طہارت قائم رکھنا فرشتوں سے مشابہت رکھنا ہے۔ اور یہ نماز کے لیے

لے قرطبی صہ ۳۷۳/ ۱ (فیاض)

بمنزلہ شرط کے ہے۔ اَتٰیتِ شَوْا اِلٰی رَبِّہِمْ نماز میں اخبات پایا جاتا ہے۔ جو کہ بہت بڑی صفت ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہوتا ہے۔

نماز افضل العبادات ہے۔ جب انسان دنیوی امور میں پڑ کر اللہ سے غافل ہو جاتا ہے۔ تو نماز اس کا تعلق اللہ سے پھر قائم کر دیتی ہے۔ انسان کا تعلق حظیرۃ القدس سے جڑ جاتا ہے۔ نماز کو بار بار قائم کرنے سے انسان کی غفلت دور ہو جاتی ہے اور تعلق باللہ قائم رہتا ہے۔

فرمایا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا خوشنودی اور اعانت صابروں کے ساتھ ہے الغرض! ذکر، شکر، صبر، دعا اور تعظیم شعائر اللہ تہذیب الاخلاق کے بڑے بڑے اصول ہیں۔ ان میں سے ہر اصول اہم ہے۔ فرمایا یہود و نصاریٰ کے اعتراضات کی پرواہ نہ کریں فَلَا تَخْشَوْھُمْ وَاخْشَوْنِیْ آپ ان سے خوف نہ کھائیں۔ بلکہ صرف میرا خوف دل میں رکھیں۔ ان کے باطل اعتراض پر صبر سے کام لیں۔ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ صبر بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی حاصل ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا۔ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرو گے اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ یہ پختہ بات ہے۔ فلاح نصیب ہو جائیگی۔ جس شخص یا جماعت میں صبر کی روح پیدا ہو جائے گی۔ نماز پر استقامت ہو جائیگی وہ شخص یا جماعت کبھی شکست سے دوچار نہیں ہوگی۔ اسی طرح جب دشمن سے ٹکر لینے کا موقع آئے گا۔ تو جذبہ جہاد کام آئے گا۔ اور اس موقع پر اگر جان بھی چلی جائے، تو انسان فنا نہیں ہوتا بلکہ اسے دائمی حیات نصیب ہو جاتی ہے۔ انسان اس خلفشار کی زندگی سے نکل کر بلند تر زندگی میں داخل ہو جاتا ہے جو شخص اللہ کی رضا کی خاطر اور اس کے دین کی تقویت کے لیے مارا گیا، وہ شہید ہو گیا۔ اور کامیاب ہو گیا۔

شہادت فی سبیل اللہ

اسی لیے فرمایا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ط اللہ

کے راستے میں جان دینے والوں کو مردہ مت کہو بَلْ اَحْیَاءٌ بلکہ وہ زندہ ہیں اسمیں شک نہیں کہ انکا ظاہری جسم تو مر جاتا ہے۔ اس کی مادی حیات ختم ہو جاتی ہے۔ مگر شہید کو اگلے جہان میں اعلیٰ تر زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ انہیں انبیاء کرام علیہم السلام جیسی اعلیٰ زندگی نصیب ہوتی ہے۔ دنیا کی زندگی تو بہر حال ختم ہونے والی ہے۔ یہ تو مصائب و آلام کی زندگی ہے اس کے مقابلے شہید کو جو زندگی حاصل ہوتی ہے۔ وہ نہایت فائق اور اعلیٰ تر ہوتی ہے

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ انسانی جسم اگرچہ بالطبع فانی ہے۔ مگر بعض اوقات شہدا کے جسم بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اور ان پر زمانے کے تغیر و تبدل اور مٹی کا اثر نہیں ہوتا۔ انبیا علیہم السلام کے اجسام کے متعلق تو واضح طور پر موجود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے۔ کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے جسموں کو کھا جائے۔ مگر بعض اوقات شہدائے کے جسم بھی اللہ کے حکم سے محفوظ رہتے ہیں۔ چند سال پہلے تاتاریوں کے علاقہ میں چھ سات سو سال پرانے شہدا کے جسم بالکل صحیح و سالم برآمد ہوئے ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہیں۔ کہ اللہ چاہے تو شہدا کے اجسام کو بھی آنچ نہ آنے دے۔ تاہم یہ کلی اصول نہیں ہے۔ البتہ عالم برزخ میں شہدا کو اعلیٰ درجے کی زندگی نصیب ہوتی ہے، برزخ کی زندگی تو ہر نیک و بد اور مومن و کافر کو حاصل ہے۔ مگر شہدا کی زندگی نہایت اعلیٰ وارفع ہے سورۃ آل عمران میں آتا ہے کہ شہدا کو عیش کے سامان نصیب ہوتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کی خوراک حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں مردہ مت کہو۔ انہیں اعلیٰ درجہ کی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ مادی زندگی کے اعتبار سے انہیں مردہ بھی کہہ سکتے ہیں، مگر اپنی اعلیٰ وارفع اور دائمی زندگی کی بنا پر وہ زندہ جاوید ہیں۔

شعور کا فقدان

فرمایا وَلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ اے لوگو! تم شہدا کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ انہیں جو دائمی زندگی حاصل ہوئی ہے وہ اس جہاں سے الگ ایک دوسرا جہان ہے جو تمہارے فہم وادراک سے بالا ہے۔ آپ اس مادی جہاں کی چیزوں سے واقف ہیں۔ اس کی اشیاء آپ آنکھ سے دیکھ سکتے

ہیں کان سے سُن سکتے ہیں، عقل سے سمجھ سکتے ہیں۔ مگر اگلے جہان کی چیزوں کو نہ تم دیکھ سکتے ہو، نہ تمہارے کان اس کی سماعت کی تاب لا سکتے ہیں اور نہ تمہاری عقل انہیں سمجھنے کے قابل ہے اُس جہان کی چیزوں کو وہاں جا کر ہی دیکھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں۔ عذاب قبر سمجھ میں نہیں آتا حالانکہ یہ آنکھ اس قابل نہیں ہے۔ کہ عالمِ ملکوت کی چیزوں کو دیکھ سکے۔ یہ تمام چیزیں اگلے جہان میں موجود ہیں، مگر ہمیں نظر نہیں آتیں۔ اِن کا ادراک وہاں پہنچکر ہی ہوگا اب تو صرف آسمان نظر آتا ہے۔ مگر قیامت والے دن اوپر کی تمام اشیاء نظر آنے لگیں گی، اوپر کے تمام پردے کھول دیئے جائیں گے، عرش الٰہی نظر آجائے گا۔ جنّ اور فرشتے بھی نظر آئیں گے۔ اسی لیے فرمایا کہ تمہاری مادی نظریں اور دماغ اگلے جہان کی چیزوں کے ادراک کا شعور نہیں رکھتے۔

درس شصت (۶۰) آیت ۱۵۵ تا ۱۵۷

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ
الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ
اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ
﴿۱۵۶﴾ اُولٰۗىِٕكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۣ قف
وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

ترجمہ: اور البتہ ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ خوف، بھوک، مالوں ـــــ جانوں ـــــ اور پھلوں کے گھاٹے سے۔ اور آپ صبر کرنیوالوں کو خوشخبری سُنا دیں (۱۵۵) وہ لوگ جب انکو کوئی مصیبت پہنچتی ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ بیشک ہم اللہ کے لیے ہیں اور بیشک ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانیوالے ہیں (۱۵۶) یہی لوگ ہیں کہ ان پر عنایتیں ہیں ـــــ اُن کے رب کی طرف سے اور مہربانی ہے۔ اور یہی لوگ ہیں ـــــ ہدایت پانے والے (۱۵۷)

گزشتہ سے پیوستہ

ترقی کے لیے جن منزلوں کو طے کرنا پڑتا ہے، اس میں تہذیب اخلاق اور اس کے اصولوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے اللہ کے ذکر اور شکر کا تذکرہ ہوا۔ اور پھر تیسرے بڑے اصول صبر کا بیان ہے ۔ چوتھا اصول۔ دُعا ہے جس کا ذکر انا للہ وانا الیہ راجعون میں اجمالی طور پر کیا گیا ہے دراصل دُعا اور نماز کا تعلق بھی اسی سلسلہ سے ہے

صبر کی قوت

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے صبر کا بطور خاص ذکر فرمایا ہے اور اس کی فضیلت بیان فرمائی ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ۔ اس کے بعد اللہ اور اس کے دین کی خاطر قتل ہونے والے لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا کہ

اُن کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں اس کا شعور نہیں۔ یہ صبر کی عظمت ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں موت جیسی بڑی مصیبت کو بھی بخوبی برداشت کرتا ہے۔ تو یقین ہے کہ ایسے شخص کو حیاتِ جاوداں نصیب ہو جاتی ہے۔ اور یہ بڑی راحت والی زندگی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شہید کے لواحقین بھی یہ صدمہ برداشت کرتے ہیں جس کے بدلے میں انہیں زندگی میں عزت حاصل ہوتی ہے اور وہ ترقی کے منازل طے کرتے ہیں۔ گویا تہذیب الاخلاق کے ضمن میں صبر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لہٰذا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق موت جیسی بڑی مصیبت کو برداشت کیا وہ تہذیب الاخلاق کا مالک بن گیا۔

آزمائش مقتضائے ایمان ہے

موت جیسی بڑی مصیبت کے تذکرہ کے بعد زیرِ درس آیات میں اللہ تعالیٰ نے بعض چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کا ذکر فرمایا کہ ہم ان کے ذریعے بھی تمہیں آزمائیں گے فرمایا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے اور یہ آزمائش مقتضائے ایمان ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے مومن لوگ یہ تصور نہ کریں کہ وہ محض کلمہ پڑھ کر بغیر امتحان کے کامیابی حاصل کر لیں گے۔ بلکہ فرمایا ہم ضرور انہیں امتحان سے گذاریں گے۔ حضور علیہ السلام کا بھی ارشاد مبارک ہے۔ يُبْتَلَى الرَّجُلُ بِقَدْرِ دِيْنِهٖ آدمی کا امتحان اس کے دین کے مرتبہ کے مطابق ہوتا ہے۔ جس قدر اس کا دین مضبوط ہو گا اسی قدر اس کی آزمائش بھی کڑی ہو گی۔ اور اگر دین کمزور ہے۔ تو آزمائش بھی کمزور ہو گی، مگر آزمائش سے خالی کوئی نہیں۔ بہر حال ایمان کا تقاضا ہے۔ کہ آزمائش آئے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے۔ کہ وہ کسی شخص کی آزمائش کس طریقہ سے کرتا ہے۔ اس کے مختلف طریقے ہیں۔ جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

ذرائع آزمائش

فرمایا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ ہم تمہیں کسی نہ کسی چیز سے ضرور آزمائیں گے۔ اور وہ کون سی چیزیں اور کون سے ذرائع ہیں جن سے آزمائش ہوتی ہے

خوف

فرمایا مِنَ الْخَوْفِ منجملہ ان ذرائع کے ایک ذریعہ خوف ہے۔ یعنی تم پر یہ خوف

طاری کردیں گے۔ جس سے انسان مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ خوف بالعموم بیرونی اسباب سے ہوتا ہے مثلاً کسی بیرونی دشمن کا خوف مسلط کر دیں گے۔ جس سے زندگی کا لطف برباد ہو جائے گا۔ اہل مکہ کے متعلق سورۃ قریش میں فرمایا۔ کہ اللہ تعالےٰ نے قریش پر اتنا احسان فرمایا کہ "اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ" یعنی انہیں بھوک سے نجات دلانے کے ساتھ ساتھ انہیں خوف سے بھی مامون رکھا۔ وہ لوگ نہایت امن وامان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بیت اللہ شریف کے متولی ہونے کی بنا پر نہایت باعزت مقام حاصل تھا۔ اور وہ ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ تھے۔

خوف ایک ایسی چیز ہے۔ جس کی موجودگی میں زندگی کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت وحرفت ہر چیز خوف کی زد میں آکر اپنا مقام کھو بیٹھتی ہے۔ جنگ کے موقع پر دیکھ لیں۔ دھیان ہر وقت اسی طرف رہتا ہے۔ کہیں گولہ باری کا خطرہ ہے کہیں ہوائی حملہ ہو رہا ہے۔ سائرن بج رہے ہیں۔ لوگ پناہ گاہوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ عجیب افراتفری کا عالم ہوتا ہے پوری زندگی معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس سے ملکی معیشت تباہ ہو جاتی ہے زندگی کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ اور لوگ ہر آن نئی مصیبت کے منتظر رہتے ہیں۔ اسی کو فرمایا کہ ہم خوف کے ذریعے تمہاری آزمائش کریں گے۔

بھوک وَالْجُوْعِ آزمائش کا دوسرا ذریعہ بھوک ہے۔ انسانی زندگی کا انحصار اس کی خوراک پر ہے۔ غذا کا حصول انسان کا طبعی اور فطری حق ہے۔ انسانوں کے علاوہ حیوانات، کیڑے مکوڑے، چرند، پرند، خشکی اور پانی کے تمام جانداروں کی زندگی خوراک سے وابستہ ہے۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام جیسی مقدس ترین ہستیوں کے متعلق بھی اللہ تعالےٰ کا ارشاد ہے۔ "وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ" یعنی ہم نے انبیاء کے جسم بھی ایسے نہیں بنائے تھے جنہیں غذا کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ وہ بھی کھانا کھاتے ہیں۔ ان کو بھی بھوک کا احساس ہوتا ہے بھوک کی

وجہ سے بعض اوقات وہ بھی مضطرب ہو جاتے ہیں۔ غزوہ خندق کے موقع پر خود خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ بھوک کی وجہ سے ہم نے حضور علیہ السلام کو بے چین ہوتے ہوئے بھی دیکھا بعض اوقات بھوک کا اتنا غلبہ ہوتا کہ سیدھے بیٹھ بھی نہ سکتے بلکہ ٹیک لگانا پڑتی۔ الغرض! چونکہ خوراک ہر ذی جان کے لیے لازمی ہے۔ لہٰذا اس کے بغیر اس کا اضطرار بھی ضروری ہے۔ ________ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بسا اوقات ہم انسان وحیوان کی خوراک روک کر اور اسے بھوک میں مبتلا کر کے اسکی آزمائش کرتے ہیں۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ بھوک دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک اضطراری اور دوسری اختیاری۔ پانی اور خوراک کی قلت اضطراری بھوک ہے، اور اس کا مظاہرہ دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ قحط سالی کی وجہ سے خوراک پیدا ہی نہیں ہوتی یا کوئی بیرونی آفت مثلاً طوفان یا زلزلہ وغیرہ کے ذریعے اس کے ذخائر تباہ ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خوراک کا حصول ممکن نہیں رہتا اور لوگ آزمائش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قریبی زمانہ میں بنگال کا مشہور قحط واقع ہوا۔ آج سے تقریباً ۳۵ سال قبل اس قحط کی وجہ سے نوے لاکھ انسان لقمہ اجل بنے۔ چھوٹے چھوٹے سیلاب تو اکثر ساحلی علاقوں میں آتے رہتے ہیں۔ جس سے سینکڑوں اور ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ یہ اضطراری بھوک ہے اور آزمائش کے لیے وارد ہوتی ہے۔ بھوک کی دوسری صورت اختیاری ہے جیسے۔ اہل ایمان کے لیے ماہِ رمضان میں روزوں کی فرضیت، مسلمان خود اس بھوک کو اختیار کر کے آزمائش خداوندی پر پورا اترتے ہیں۔

جان و مال کا نقصان

فرمایا آزمائش کی تیسری صورت وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ یعنی مال وجان کا نقصان ہے۔ انسانی معیشت کا دارومدار انہی دو چیزوں پر ہے۔ انسان مال کے ساتھ کاروبار کرتا ہے۔ تجارت، حرفت یا زراعت کرتا ہے اور یہ امور انجام دینے کے لیے افرادی قوت کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اگر جان یعنی افرادی قوت اور مال یعنی روپیہ پیسہ، گائے بیل، بھینس، اونٹ بکری وغیرہ

میں کمی آجائے گی تو انسانی معیشت کو نقصان پہنچے گا۔ لہٰذا یہ بھی آزمائش کا ذریعہ ہے۔ اور اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔ کہ ہم جان و مال میں کمی کر کے بھی لوگوں کا امتحان لیتے ہیں۔ آفات ارضی و سماوی مال و جان میں نقصان کا ذریعہ ہیں۔ بسا اوقات مہلک وبائی امراض مثلاً طاعون، ہیضہ، تپ محرقہ وغیرہ انسانی زندگی کے اتلاف کا سبب بنتے ہیں۔ یا پھر زلزلہ، طوفان اور سیلاب وغیرہ کے ذریعہ جانی و مالی نقصان پہنچتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کا ذریعہ ہیں۔

ثمرات کی کمی

آزمائش کا چوتھا ذریعہ فرمایا وَالثَّمَرَاتِ پھل ہیں۔ کہ بعض اوقات پھلوں میں کمی کے ذریعے بھی آزمائش آتی ہے۔ کسی سال فصلوں میں غلہ یا درختوں پر پھل زیادہ آتا ہے، کسی سال کم آتا ہے۔ اور کسی سال بالکل نہیں آتا۔ غلہ اور پھلوں کی فراوانی یا کمی قبضہ قدرت میں ہے۔ لہٰذا یہ بھی آزمائش کا ایک ذریعہ ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خوف سے مراد دشمن کا خوف ہے۔ بھوک سے مراد اختیاری بھوک یعنی عبادت، ریاضت اور روزہ کا حکم ہے۔ اور مال و جان کی کمی سے مراد راس المال کی کمی ہے۔ جس کے ذریعے انسان کام کاج کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ پھلوں میں کمی سے مراد انسانی اولاد میں کمی ہے۔ اولاد انسان کا ثمر ہوتا ہے۔ بعض اوقات افزائش نسل انسانی میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پھل سے مراد درختوں کا پھل بھی ہے اسمیں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ تاہم امام شافعیؒ نے پہلی تاویل کو اختیار کیا ہے یعنی ثمرات میں کمی سے مراد نسل انسانی میں کمی ہے۔ اور اس کی تصدیق حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام فرماتے کہ جب کسی کا بیٹا فوت ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ قَبَضْتُمْ رُوْحَ ابْنِ عَبْدِیْ کہ تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی ہے فرشتے عرض کرتے ہیں کہ یا مولا کریم ہم نے تیرے حکم کے مطابق ایسا کیا ہے۔ پھر اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں اَخَذْتُمْ ثَمَرَةَ قَلْبِہٖ تم نے اس کے دل کا پھل لے لیا ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں۔ ہاں ہم نے لے لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ پھر

پوچھتے ہیں۔ کہ ایسا کہنے پر میرے بندے نے کیا کہا۔ فرشتے کہتے ہیں کہ بندے نے حَمِدَ وَاسْتَرْجَعَ تیری تعریف کی اور انا للہ کہا۔ اس پہ اللہ تعالے اس بندے سے راضی ہو کر کہتا ہے۔ کہ اس کے لیے بہشت میں ایک خاص کوٹھی اور ایک جگہ بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔ یہ اس بندہ مومن کا انعام ہے اس سے معلوم ہوا کہ ثمرہ سے مراد اولاد بھی ہے

عاملین کے لیے بشارت

اللہ تعالی نے ان مختلف قسم کی آزمائشوں کا ذکر فرمایا اور مقصود اس سے یہ ہے کہ ان آزمائشوں میں پورا اترنا یعنی ہر مصیبت پہ صبر وشکر کا دامن تھامے رکھنا ہی انسانیت کی معراج ہے جو شخص تکلیف آنے پر اسے برداشت کرتا ہے جزع و فزع یا کوئی خلاف شرع حرکت نہیں کرتا۔ صبر کا پورا پورا حق ادا کرتا ہے تو ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالے فرماتے ہیں وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ ایسے صابر وشاکر لوگوں کو خوشخبری سنا دو کہ فلاح و کامیابی اُن کے مقدر میں ہو چکی ہے۔ اور وہ کون لوگ ہیں جنہیں یہ بشارت دی جا رہی ہے۔ اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ جب اُن کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے قَالُوْٓا تو کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ہم سب خدا کا مال ہیں۔ اور پھر لوٹ کر اسی کے پاس جانا ہے مقصد یہ کہ ہم سب اللہ کی مخلوق ہیں ہماری جانیں اور مال اللہ ہی کا دیا ہوا ہے یہ سب اُسی کی مہربانی کا مرہون منت ہے، ورنہ ہمارا تو کچھ بھی نہیں ہے دوسری جگہ فرمایا لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ آسمان وزمین کی ہر چیز اللہ کی عطا کردہ ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی ہمارا تو صرف وہم وگمان ہی ہے۔ باقی ہر چیز اللہ کی ہے وہ مالک و مختار ہے اپنی ملکیت میں جب اور جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ اِنَّ لِلّٰهِ مَا اَعْطٰی وَلَهٗ مَا اَخَذَ وَكُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّى سب کچھ اُسی کا ہے۔ جب چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اٹھا لیتا ہے زندگی ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ وہ جب اور جتنی چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ جسم و جان اور موت وحیات کا مالک تو وہی ہے

لہٰذا جب کسی مومن کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ انا للہ کہہ کر اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یہ مال و دولت اسی کا عطا کردہ ہے، وہ جب چاہے لے لے۔ لہٰذا وہ کسی قسم کے نقصان پر چیخ و پکار یا واویلا نہیں کرتا، بلکہ صبر سے کام لیتا ہے۔ اور ایسے ہی صابرین کے لیے اللہ تعالیٰ نے بشارت دی ہے۔

مصیبت کے وقت رونا پیٹنا، نوحہ کرنا، بالوں کو نوچنا یا گالیں پیٹنا ہرگز ایمان کا جزو نہیں ہے حضور علیہ السلام نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت عہد لیا تھا۔ کہ رونا پیٹنا ناجائز ہے، نوحہ کرنا حرام ہے، ایسا ہرگز نہ کرنا، البتہ غم و اندوہ سے کسی کے آنسو بہ نکلیں تو یہ ایک فطری امر ہے اور درست ہے مگر چیخ و پکار کرنا خلاف طبع اور ناجائز ہے۔ اس سے بچنا چاہیئے۔

مصیبت کے وقت صبر کرنا اور انا للہ کہہ دینا گویا اللہ تعالےٰ کے فیصلہ پر رضامندی کا اظہار ہے کہ اللہ تعالےٰ نے میرے لیے جو کچھ پسند فرمایا ہے میں اس پر راضی ہوں۔ اگر اللہ ہم سے راضی ہو گیا، تو یہ اجر و ثواب کا باعث ہو گا۔ اور وہ ناراض ہو گیا۔ تو ہم یقیناً تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ کیونکہ لوٹ کر بھی اسی کے پاس جانا ہے اسی کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے اس کے علاوہ اور کوئی مقام نہیں چنانچہ صبر کا قانون بتلا رہا ہے کہ اللہ تعالےٰ کے فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیئے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں آسمان سے گر جاؤں، زمین پر ہلاک ہو جاؤں یہ بات میرے لیے اس بات سے بہتر ہے۔ کہ خدا تعالےٰ کے کسی فیصلہ کے متعلق میں یوں کہوں کہ یہ مجھے پسند نہیں۔ بلکہ اللہ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیئے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ جو خدا کے فیصلے پر راضی ہو جائے گا، اللہ تعالےٰ بھی اُس سے راضی ہو گا۔ اور جو شخص خدا کے کسی فیصلہ پر ناراض ہو گا، اللہ تعالیٰ بھی اُس سے ناراض ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص سے اللہ ناراض ہو گا، اُس کا حشر کیا ہو گا۔

امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں۔ کہ ان آیات سے واضح ہے کہ رضا بالقضا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیئے۔ اور صبر کا دامن نہیں

چھوڑنا چاہیئے۔ فرماتے ہیں۔ کہ ان آیات سے دو احکام مترشح ہوتے ہیں یعنی فرض اور نفل۔ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جانا فرض حکم ہے اور ہر مصیبت پر إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ کہنا نفلی حکم ہے۔ حضور علیہ السلام نے یہ دعا سکھائی اَللّٰهُمَّ أْجُرْنِي فِي مُصِيبَتِي وَاخْلُفْنِي خَيْرًا مِّنْهَا۔ یعنی اے اللہ! مصیبت میں مجھے اجر عطا فرما اور اس کا مجھے بہتر بدلہ عطا کر۔ یہ ایمان والوں کی نشانی ہے کہ وہ ہر مصیبت پر اس طرح کے کلمات کہہ کر راضی برضا ہو جاتے ہیں تکلیف خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، اس پر صبر کرنا اور کلمات خیر کہنا ایمان کی نشانی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے یا ٹھوکر لگ جائے تو اس پر بھی انا للہ پڑھنا چاہیئے تاکہ اللہ کی رضا پر راضی ہونے کی سند حاصل ہو جائے۔

صلہ صبر

فرمایا صبر کرنے والے اور اللہ کی رضا پر راضی ہونے والے لوگوں کا صلہ یہ ہے أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ایسے ہی لوگ ہیں جن پر رب تعالیٰ کی عنائتیں اور مہربانی ہے مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ صلوۃ سے مراد خاص رحمت اور مہربانی ہے۔ اور رحمت سے مراد عام مہربانیاں ہیں۔ شاہ رفیع الدین فرماتے ہیں کہ صلوات سے مراد وہ عنائتیں اور مہربانیاں ہیں جو انسانوں کو انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے پہنچتی ہیں۔ اور رحمت وہ مہربانی ہے جو انسانوں کو اللہ کے فضل سے پہنچتی ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کی حکمت کے مطابق صلوۃ جیسی بلند پایہ رحمت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندے کا اتصال حظیرۃ القدس جیسے بلند پایہ مقدس مقام سے ہو جاتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی تجلی اعظم پڑتی ہے۔ اس طرح گویا اس کا رابطہ خدا تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے اور اسے بڑی بلندی اور ترقی نصیب ہوتی ہے۔ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ انہیں یہ مقام اسی لیے حاصل ہوتا ہے کہ وہ صراط مستقیم کے راہی ہوتے ہیں۔ اور اسی سیدھے راستے پر چل کر اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں۔

اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۵۸﴾

ترجمہ: بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں پس جس شخص نے بیت اللہ شریف کا حج کیا یا عمرہ کیا، اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے۔ اور جس شخص نے خوشی سے نیکی کا کام کیا، تو بیشک اللہ تعالےٰ قدر دان اور سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۵۸﴾

صفا اور مروہ تہذیب الاخلاق کے تین اصول پہلی آیات میں بیان ہو چکے ہیں اور وہ ہیں ذکر الٰہی، شکر الٰہی، صبر اور دعا۔ اس آیت میں ایک اور اہم اصول شعائر اللہ کا بیان ہے۔ منجملہ دیگر شعائر کے اس آیت میں صفا اور مروہ کو خاص طور پر شعائر اللہ کہا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں (شعائر) میں سے ہیں۔ یہ دونوں پہاڑیاں بیت اللہ شریف سے متصل واقع ہیں۔ زیادہ اونچی نہیں ہیں۔ اُس زمانہ میں بھی یہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ بس ارد گرد کے خطے سے ذرا ابھری ہوئی تھیں۔ اب تو جغرافیہ ہی بدل چکا ہے ______ ان کا بیشتر حصہ کاٹ دیا گیا ہے۔ اور نشان کے طور پر تھوڑی تھوڑی چھوڑ دی گئی ہیں ان دونوں پہاڑیوں کی درمیانی جگہ پست ہے۔ جہاں پر سعی کی جاتی ہے اور جو حج و عمرہ کے ارکان میں سے ہے۔ لغوی طور پر صفا سخت قسم کی چکنی چٹان کو کہتے ہیں اور مروہ سفید رنگ کے پتھروں کو کہا جاتا ہے۔ شاید انہی خصوصیات کی بنا پر ان پہاڑیوں

کو یہ نام دیئے گئے۔

تہذیب اخلاق کا پانچواں اصول شعائر اللہ کی تعظیم ہے۔

یہاں پر صفا مروہ کو شعائر اللہ کہا گیا ہے قرآن کریم کے دوسرے مقام پر شعائر اللہ کی عظمت کے بیان میں فرمایا لَا تُحِلُّوا شَعَآئِرَ اللّٰہِ یعنی اللہ کے شعائر کی بےحرمتی مت کرو۔ بلکہ ان کی تعظیم کرو۔ اس کو شعیرہ اس لیے کہا جاتا ہے۔ کہ یہ اللہ تعالےٰ کی یاد کی علامت اور نشانی ہوتی ہے۔ اس کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ شعائر اللہ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے مترادف ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں اللہ کی یادآوری کا ذریعہ ہیں ان کو بت پرستی یا شرک اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ہم ان چیزوں کی تعظیم ان کی ذات کی وجہ سے نہیں کرتے ہیں بلکہ حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کی ہی تعظیم ہے۔ جن کو دیکھ کر اسکی عظمت اور یاد دل میں آتی ہے۔

شعائر اللہ میں مکان کے علاوہ کئی قسم کے افعال بھی داخل ہیں۔ مثلاً امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ مِنْ اَعْظَمِ شَعَآئِرِ اللّٰہِ چار چیزیں اللہ کے شعائر میں سب سے بڑی ہیں اور ان میں خانہ کعبہ، حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ، نماز اور قرآن پاک شامل ہیں اسی طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ تفسیر عزیزی میں فرماتے ہیں کہ شعائر اللہ میں عرفات بھی داخل ہے۔ جہاں نو ذوالحجہ کو لوگ جمع ہوتے ہیں۔ یہاں کا وقوف ہی حج کا رکن اعلیٰ ہے۔ لوگ غروب آفتاب تک وہاں قیام کرتے ہیں۔ اور خوب گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگتے ہیں۔ اسی طرح مشعر الحرام جسے مزدلفہ کہا جاتا ہے وہ بھی شعائر اللہ میں شامل ہے۔ منیٰ میں رمی جمار بھی شعائر اللہ میں داخل ہے۔ صفا و مروہ کا ذکر تو خود قرآن پاک نے کر دیا۔ علاوہ ازیں تمام مساجد رمضان کا مہینہ، اور اشہر الحرام (حرمت والے مہینے) یعنی رجب، ذی قعدہ، ذوالحجہ اور محرم الحرام یہ سب شعائر اللہ ہیں۔ یہ سب واجب الاحترام مہینے ہیں۔ اور ان میں گناہوں سے بچنا زیادہ ضروری ہے۔ ان میں عبادت کا اجر و ثواب بھی بڑھ جاتا ہے اور گناہ کا وزن بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ عیدالاضحیٰ، عیدالفطر، جمعہ، ایام تشریق، اقامت، ختنہ

نمازِ باجماعت، رمل، طواف، ہدی قربانی اور صفا مروہ کی سعی سب شعائر اللہ میں داخل ہیں۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ یعنی شعائر اللہ کی تعظیم دلوں کے تقویٰ کی بنا پر ہے جس کے دل میں خدا کا تقویٰ ہوگا، وہی شعائر اللہ کی تعظیم کرے گا۔

تفسیرِ عزیزی

تفسیر عزیزی شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی مشہور تفسیر ہے جو کہ فارسی زبان میں لکھی گئی۔ آپ کے والد ماجد امام شاہ ولی اللہؒ نے سب سے پہلے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا جس کا نام فتح الرحمن رکھا۔

اُس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ کابل سے لے کر برما تک سارا علاقہ مسلمانوں کے زیرِ نگین تھا۔ سرکاری زبان فارسی تھی۔ ساتھ ساتھ عربی کو بھی اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ اس وقت اُردو زبان اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور محدود تھی۔ البتہ مرہٹی اور تامل ناڈ زبانیں اپنے اپنے علاقوں میں مروج تھیں۔ ہندی کا بھی عام چرچا تھا۔ تاہم ان دو بزرگوں نے فارسی زبان کو ذریعہ ابلاغ بنایا۔ امام شاہ ولی اللہؒ کی کتابیں فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کی مشہور عالم تصنیف اصول تفسیر فارسی زبان میں ہے۔ ازالۃ الخفا بھی فارسی میں ہے موطا کی شرح ایک فارسی میں ہے اور ایک عربی میں۔ بمقصد بہر حال ابلاغ دین تھا جس میں آپ کے خاندان کو کما حقہ کامیابی حاصل ہوئی۔

الغرض! آپ کے زمانہ میں رائج الوقت زبان فارسی تھی۔ دفتری خط و کتابت بھی اسی زبان میں ہوتی تھی، جس طرح آجکل سکولوں، کالجوں دفتروں اور بیرون ملک انگریزی زبان کا چرچا ہے۔ اسی طرح اُس زمانے میں فارسی مروج تھی۔ لہٰذا آپنے زیادہ فارسی کے ذریعے ہی دین کی اشاعت کا کام کیا۔

شاہ ولی اللہؒ کا خاندان برصغیر پاک و ہند میں بڑا نورانی خاندان گزرا ہے آپ تمام مسلمانوں کے پیرو مرشد اور مربی تھے۔ برصغیر میں دینی تعلیم کا بیڑا آپ ہی نے اُٹھایا۔ آپ وقت کے فقیہ تھے۔ ان لوگوں نے تعلیم کے مراکز اور مدارس

قائم کیے۔ شاہ ولی اللہؒ اپنے والد ماجد کے مدرسہ رحیمیہ میں تعلیم و تربیت اور درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ آپ حج کے لیے حجاز مقدس گئے تو وہاں دو سال تک قیام کیا اور وہاں کے علماء سے علمی استفادہ کیا۔ واپس آکر پھر درس و تدریس کے سلسلہ میں منہمک ہوگئے۔

شاہ عبدالعزیزؒ نے لمبی عمر پائی ہے۔ آپ ساری عمر تدریس کے کام میں مشغول رہے۔ فتوٰی بھی دیتے رہے۔ آپ نے سنتِ جہاد کو دوبارہ زندہ کیا اور بڑے بڑے مجاہد پیدا کئے۔ آپ کے زمانہ میں برصغیر میں انگریز کا عمل دخل ہوچکا تھا۔ اسی زمانے میں آپ نے یہ تفسیر عزیزی لکھی۔ تفسیر عزیزی کے آخری دو پارے یعنی پارہ ۲۹ اور ۳۰ دو مختلف جلدوں میں ہیں۔ ابتداء میں سورۃ بقرہ کی نصف تک تفسیر لکھی تھی۔ کہ زندگی نے ساتھ نہ دیا اور یہ کام وہیں رہ گیا۔ یہ عظیم تفسیر حکیمانہ فلسفہ کے ساتھ لکھی گئی ہے جس میں اسلام کے حقائق کو خوب اجاگر کیا گیا ہے۔ حضرت انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں۔ کہ اگر تفسیر عزیزی مکمل ہو جاتی تو یہ سمجھا جاتا کہ قرآن پاک کا حق ادا ہوگیا ہے۔ اس وقت اس تفسیر کی صرف تین جلدیں موجود ہیں۔ تاہم یہ کمال درجہ کی چیز ہے۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہوچکا ہے۔

طواف وسعی

امام ابن جریرؒ نے مفسر قرآن حضرت قتادہؓ سے روایت نقل کی ہے۔ کہ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سنت ہے۔ حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے۔ کہ صفا مروہ کی سعی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کی میراث ہے۔ اُن سے یہ چیز بطور وراثت نقل ہوتی چلی آرہی ہے حضرت ہاجرہؒ پہلی شخصیت ہیں، جنہوں نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کی ام المومنین حضرت عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیت اللہ شریف کا طواف، صفا مروہ کی سعی اور رمی جمار اللہ کے ذکر کی اقامت کے لیے ہے۔ طواف تو بجائے خود نماز کی مانند ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے اَلطَّوَافُ حَوْلَ الْبَیْتِ مِثْلُ الصَّلٰوۃِ یعنی بیت اللہ شریف

کے گرد طواف کرنا نماز کی مثل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ نماز کے دوران گفتگو کی قطعاً اجازت نہیں جب کہ طواف کے دوران حسب ضرورت بات چیت کی جاسکتی ہے۔ تاہم بہتر یہ ہے۔ کہ کلام سے اجتناب کرے اور اللہ کے ذکر میں منہمک رہے۔ ذکر الٰہی کے لیے مختلف کلمات موجود ہیں۔ حضرت لاہوری رح کے بڑے فرزند مولانا حبیب اللہ رح طواف کے سات چکروں میں پورا قرآن پاک ختم کر لیتے تھے۔ اللہ نے اس قدر توفیق بخشی تھی۔ آپ بڑے ہی عبادت گزار تھے۔ طواف میں دو تین گھنٹے صرف کرتے تھے۔ اور شدید ترین گرمی میں بھی طواف کرتے رہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے۔ کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حج کے لیے آتے تو صفا و مروہ کے درمیان لبیک پکارتے ہوئے دوڑتے ادھر اللہ کی طرف سے بھی لبیک عبدی کی آواز سنتے۔ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے کہ تمہاری پکار پر میں بھی موجود ہوں۔ سعی کے دوران پڑھی جانے والی مشہور دعا رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَمُ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یعنی اے اللہ معاف فرمادے اور رحم فرما، تو عزت والا اور بڑے کرم والا ہے۔ اس کے علاوہ سعی کی اور بھی دعائیں منقول ہیں۔ جن میں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ اس کے علاوہ ایمان پر ثابت قدمی کی دعا ہے۔ یعنی اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ كَمَا هَدَيْتَنِیْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ لَّا تَنْزِعَ مِنِّیْ حَتّٰی تَوَفَّنِیْ عَلٰی ذٰلِكَ ۔ اے اللہ! جس طرح تو نے مجھے ایمان اور اسلام کی طرف ہدایت فرمائی ہے۔ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ اسے مجھ سے نہ چھیننا یہاں تک میری موت آجائے۔

صفا مروہ کی سعی کی حیثیت کے متعلق مختلف آراء ہیں مشہور روایت یہ ہے۔ کہ امام احمد رح کے نزدیک سعی سنت ہے البتہ امام شافعی رح اسے رکن کہتے ہیں۔ اگر حج میں سعی نہیں کی تو حج نہیں ہوگا۔ امام ابو حنیفہ رح اسے واجب کہتے ہیں

اگر سعی نہ ہو سکے تو دم دینا پڑے گا۔ جس سے اس کی تلافی ہو جائے گی واجب بھی بہت بڑا درجہ ہے۔ فرض کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ اَیُّھَا النَّاسُ اِسْعَوْا اے لوگو! صفا و مروہ کے درمیان سعی کرو اِنَّ اللّٰہَ کَتَبَ عَلَیْکُمُ السَّعْیَ اللہ تعالیٰ نے تم پر سعی کو ضروری قرار دیا ہے حضور علیہ السلام جب سعی کے لیے تشریف لاتے تو فرماتے اَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰہُ تَعَالٰی میں وہیں سے شروع کرتا ہوں جہاں سے اللہ تعالیٰ نے ابتدا فرمائی ہے یعنی صفا سے۔ کیونکہ آیت زیر درس میں اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ فرمایا گیا ہے گویا صفا سے ابتدا کی گئی ہے۔ الغرض! حضور علیہ السلام سعی صفا سے شروع کر کے مروہ پر ختم کرتے آپ کی یہ سنت مبارکہ آجتک جاری ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جسے محبوب سے محبت ہوتی ہے اسے اسکے متعلقات سے بھی محبت ہوتی ہے حج کے تمام شعائر منیٰ، عرفات، قربانی وغیرہ محبوب کے متعلقات ہیں۔ جب دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت جاگزیں ہوتی ہے۔ تو پھر وہ اس کے شعائر سے بھی محبت کرے گا ان کی تعظیم کرے گا۔ صبر اور شکر ادا کرے گا، یہی چیزیں تہذیب نفس کے حصول کی علامتیں ہیں

چاہ زم زم

چاہ زم زم کے اجرا کا واقعہ مشہور ہے۔ ابراہیم علیہ السلام بے آب و گیاہ وادی میں حضرت ہاجرہ رض اور اسماعیل علیہ السلام کو چھوڑ گئے۔ تھوڑی بہت کھجوریں اور چھاگل میں پانی تھا۔ جب پانی ختم ہو گیا تو مائی صاحبہ رض نے ادھر ادھر پانی کی تلاش شروع کر دی آپ کبھی صفا پہ جاتیں اور وہاں سے مایوس ہو کر مروہ پہاڑی پر پہنچ جاتیں بچہ پیاس سے تڑپ رہا تھا۔ جب آپ کی پریشانی انتہا کو پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت تامہ سے جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے اپنا پر زمین پر مارا، تو وہاں سے پانی جاری ہو گیا۔ یہ بڑا متبرک پانی ہے فاسی نے تاریخ مکہ میں روایت بیان کی ہے کہ یہ پانی کوثر اور سلسبیل سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ پانی کے اس چشمہ کو کئی حوادثات بھی آئے مگر بالآخر

لئے اسے کنواں کی صورت حاصل ہو گئی۔ جاہلیت کے زمانہ میں یہ کئی دفعہ بند ہوا اور کھولا گیا اب اس کنواں سے ساری دنیا سیراب ہوتی ہے۔ زائرین حرم خوب سیر ہو کر یہ پانی پیتے ہیں۔ اور جاتے وقت دنیا کے اکناف و اطراف میں یہ تبرک کے طور پر لے جاتے ہیں۔ اُس وقت سے لے کر آجتک اسکی آبیاری جاری ہے۔ اور انشاء اللہ تا قیامت جاری رہیگی۔ اس کا ذائقہ بھی عام پانیوں سے مختلف ہے۔ یہ پانی بیک وقت دوا، شفا اور غذا کا قدرتی مجموعہ ہے۔ سائنسدانواں کا کہنا ہے۔ کہ انسانی جسم کے لیے اس سے بہتر کوئی پانی دنیا بھر میں موجود نہیں ہے۔

صفا اور دعوتِ توحید

صفا کی یہ وہی تاریخی پہاڑی ہے۔ جس پر چڑھ کر حضور علیہ السلام نے قریش کو دعوت توحید دی۔ عربوں میں یہ طریقہ رائج تھا۔ کہ کسی سخت خطرے کے وقت بلند جگہ پر چڑھ کر وَاصَبَاحَاہُ کا نعرہ لگاتے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا۔ کہ دشمن آگیا ہے یا اور کوئی خطرہ ہے۔ لہذا سب لوگ اکٹھے ہو جائیں۔ اور پھر ایسا ہی ہوتا تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صفا پر چڑھ کر یہی نعرہ لگایا۔ قوم کے لوگ اکٹھے ہو گئے کہ کوئی خطرے کی بات ہو گی۔ جب سارے لوگ آگئے تو آپ نے فرمایا اگر میں تم سے یوں کہوں کہ صبح کے وقت اس پہاڑ کے پیچھے سے تمہارا دشمن حملہ آور ہو رہا ہے تو کیا تم میری بات کو تسلیم کر لو گے۔ سب نے بیک زبان ہو کر کہا مَا جَرَّبْنَا عَلَيْكَ كَذِبًا ہم نے کبھی آپ پر جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا۔ آپ ہمیشہ سچ فرماتے ہیں۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا اِنِّی نَذِیْرٌ لَّکُمْ اے لوگو میں تم کو اس بات سے ڈرانے کے لیے آیا ہوں۔ کہ تم پر سخت عذاب آنے والا ہے۔ اگر اس سے بچنا چاہتے ہو تو میری بات مان لو قُوْلُوْا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کلمہ طیبہ کا اقرار کر لو، فلاح پا جاؤ گے۔ ان لوگوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولہب بھی تھے۔ وہ اس بات سے بڑے سیخ پا ہوئے اور کہا تَبًّا لَّكَ يَا مُحَمَّدُ اے محمد! آپ کے لیے ہلاکت ہو اَلِهٰذَا جَمَعْتَنَا کیا تو نے اس لیے ہمیں جمع کیا تھا۔ ہم تو سمجھے تھے۔ کہ کوئی خاص بات

ہو گی، مگر تو نے ہمیں ایسی بات بتا دی۔

فتح مکہ کے روز بھی آپ اسی صفا پہ کھڑے ہوئے اور فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْجَزَ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ یعنی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے کی مدد فرمائی اور اس وحدہٗ لاشریک نے اکیلے ہی ان سب کو شکست دی۔ یہاں پہ اللہ کے وعدے سے مراد وہی وعدہ ہے۔ جب مشرکین مکہ حضور علیہ السلام کو طرح طرح کی تکالیف پہنچاتے تھے۔ اور آپ کو مکہ میں رہنے نہیں دیتے تھے۔ تو اللہ نے وعدہ فرمایا کہ یہ مکہ ایک دن فتح ہوگا اور یہ سب لوگ مغلوب ہو جائیں گے۔

بیت اللہ شریف میں شرک

بیت اللہ شریف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ وہی ابراہیم علیہ السلام جنہوں نے بت خانے کے تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔ مگر انہیں کے نام نہاد پیروکاروں یعنی مشرکین مکہ نے اسی کعبہ شریف میں جگہ جگہ بت رکھے ہوئے تھے۔ خانہ کعبہ کے سامنے بت تھے۔ اس کی دیواروں پر بت تھے۔ چاہ زمزم کے پاس بت رکھے تھے۔ صفا اور مروہ پر بت موجود تھے۔ غرضیکہ مشرکین نے ہر چیز کو بگاڑ دیا تھا۔ اور اس طرح خود خانہ کعبہ میں شرک کے مرتکب ہو رہے تھے۔

مشہور روایت کے مطابق صفا اور مروہ پر جو بت رکھے ہوئے تھے ان میں سے اساف مرد کا بت تھا اور وہ صفا پہاڑی پر تھا اور نائلہ عورت کا بت تھا اور وہ مروہ پر رکھا ہوا تھا۔ یہ مرد و زن مشرک تھے۔ انہوں نے خانہ کعبہ میں برائی کا ارتکاب کیا تھا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے پتھر کی صورت میں مسخ کر دیا۔ لوگوں نے ان پتھروں کو اٹھا کر باہر رکھ دیا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں کہ برائی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ان بتوں کی پوجا ہونے لگی اور یہ لوگوں کے معبود بن گئے پھر لوگوں نے ان میں سے ایک کو صفا پہ رکھ دیا اور دوسرے کو مروہ پر۔

سعی قدیم سنت ہے

جب اسلام کا دور آیا تو مسلمانوں کو صفا و مروہ کی سعی کرنے میں ہچکچاہٹ

محسوس ہوئی۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ سعی شاید اِن بتوں کی وجہ سے ہو۔ اُس دور میں اس سے ملتی جلتی اور بھی مثالیں موجود تھیں۔ مثلاً اوس اور خزرج قبیلہ کے لوگ جب حج کے لیے آتے تھے۔ تو منات نامی بت کے نام پر احرام مدینہ سے باندھتے تھے یہ بت کسی بزرگ کے نام سے موسوم تھا۔ اور سمندر کے کنارے مشلل کے مقام پر رکھا ہوا تھا۔ یہ لوگ خانہ کعبہ کا طواف تو کرتے تھے مگر صفا و مروہ کی سعی نہیں کرتے تھے۔ اس قسم کے نظریات اُس وقت موجود تھے۔

مُسلمانوں کے اس شک کو دور کرنے کے لیے قرآن پاک نے فرمایا اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ صفا اور مروہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اور یہ قدیم سلسلہ سے منسلک ہیں۔ ان کے درمیان دوڑنا ان بتوں کی تعظیم کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو محض اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس کی رضاجوئی کے لیے ہے۔ چنانچہ ان بتوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ خطہ عرب کے تمام بتوں کو توڑ دیا گیا۔ بیت اللہ شریف کو ان کی نجاست سے پاک وصاف کر دیا گیا۔ اور اس طرح مرکز اسلام سے ایک دفعہ پھر توحید کی صدا بلند ہونے لگی۔

اسی لیے فرمایا کہ صفا مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ پس جو کوئی حج یا عمرہ کرے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اس پر کوئی حرج نہیں ہے اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا کہ ان دونوں کا طواف کرے۔ یہی احکام حج میں سے ہے اور قدیم سنت ہے۔

فرمایا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا جس نے خوشی سے نیکی کا کام کیا فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ تو اللہ تعالیٰ قدردان اور جاننے والا ہے۔ یاد رہے کہ شکر سے فاعل کا صیغہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے تو اسکا معنی قدردانی ہوتا ہے یعنی اللہ بڑا قدردان ہے۔ اگر معمولی سی نیکی بھی خلوص نیت سے کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر بھی بڑے سے بڑا اجر عطا کرتا ہے۔ وعلیم سے مراد یہ ہے کہ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں حتیٰ کہ وہ انسان کی نیت اور باطنی ارادہ کو بھی جانتا ہے۔

درس شصت و دو (٦٢) — آیت ١٥٩ تا ١٦٣

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِن
بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ
وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ﴿١٥٩﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا
فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٠﴾ إِنَّ
الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ
وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿١٦١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ
عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿١٦٢﴾ وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ
ع ١٩ ١١ ٣ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٣﴾

ترجمہ: تحقیق وہ لوگ جو اُس چیز کو چھپاتے ہیں جس کو ہم نے واضح باتوں اور
ہدایت کے ساتھ اتارا ہے۔ بعد اس کے کہ ہم نے اسے لوگوں کے لیے کتاب میں بیان کر
دیا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے
والے بھی لعنت کرتے ہیں (١٥٩) مگر جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اپنے آپ کو سنوار لیا۔
اور انہوں نے بیان کیا۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن پر میں رجوع کرتا ہوں۔ اور میں رجوع
کرنے والا مہربان ہوں (١٦٠) بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے ایسی
حالت میں کہ وہ کفر کرنے والے ہیں۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ، فرشتوں اور
لوگوں کی لعنت ہے سب کی (١٦١) اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کے عذاب
میں تخفیف نہیں کی جائیگی۔ اور نہ اُن کو مہلت دی جائیگی (١٦٢) اور تمہارا معبود
برحق ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ بڑا مہربان نہایت رحم کرنیوالا ہے (١٦٣)

کتمانِ حق

گذشتہ آیات میں تہذیب الاخلاق کے پانچ اصول بیان ہو چکے ہیں۔ سابقہ درس میں منجملہ اُن کے تعظیم شعائر اللہ کا ذکر تھا۔ تہذیب نفس کے جملہ مسائل جس بات پر متفرع ہوتے ہیں، وہ مسئلہ توحید ہے۔ اس درس میں اسی مسئلہ کو بیان فرمایا گیا ہے اور اس سے پہلے مسئلہ کتمانِ حق کا بیان ہے۔ جیسا کہ گذشتہ دروس میں ذکر ہو چکا ہے۔ یہودیوں میں کتمانِ حق کی بیماری بدرجہ اتم موجود تھی۔ پہلی آیات میں آچکا ہے وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ" یعنی اے اہل کتاب تم جان بوجھ کر حق کو چھپاتے ہو۔ اسی طرح تحویل قبلہ کے متعلق فرمایا یَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ" یعنی یہ لوگ اس حقیقت کو اسی طرح پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنی اولاد کو مگر اس کے باوجود انکار کرتے ہیں۔ یہ اُن کے کتمان حق کی واضح مثالیں ہیں یہ ظالم لوگ جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے پیش گوئیوں کو چھپاتے تھے۔ اس کی بجائے لوگوں کے سامنے غلط سلط باتیں بیان کرتے تھے تورات میں رجم کا حکم موجود تھا۔ مگر یہودیوں نے اُسے چھپایا۔ اس کی تفصیل سورۃ مائدہ میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا۔ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ" کہ تم لوگوں کے سامنے حقیقت حال کی پوری پوری وضاحت کرو گے اور اُسے چھپاؤ گے نہیں مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ" ان لوگوں نے حقائق کو پس پشت ڈال دیا۔ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ" گویا کہ وہ بالکل نہیں جانتے۔

کتمانِ حق کی سزا

کتمانِ حق کی بیماری صرف یہودیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر عام قانون کے طور پر اعلان فرمایا إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی واضح باتوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ بعد اس کے کہ ہم نے اُسے کتاب میں وضاحت سے بیان کر دیا۔ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی بھی لعنت ہے۔ اور دیگر لعنت کرنے

والوں کی بھی لعنت ہے۔ ظاہر ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ میں تمام لوگ شامل ہیں جو اس آیت کے مصداق ہیں خواہ وہ کسی سابقہ امت سے ہوں یا نبی آخر الزمان کی موجودہ امت سے متعلق ہوں۔ ہر وہ شخص اس آیت کریمہ کا نشانہ ہے۔ جو حق بات کو چھپاتا ہے۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے مَنْ سُئِلَ عِلْمًا جس سے کوئی علم کی بات پوچھی گئی جسے وہ جانتا ہے۔ مثلاً کسی عقیدہ سے متعلق سوال ہے یا حلال و حرام کی وضاحت طلب کی گئی ہے فَکَتَمَہٗ تو صاحب علم شخص نے اُسے چھپا دیا۔ معاملہ کو ظاہر نہ کیا۔ یا اُس کی کما حقہٗ وضاحت نہ کی، وجہ خواہ کچھ بھی ہو اُسے کوئی نقصان کا خطرہ تھا یا اس کی مالی منفعت متاثر ہوتی تھی یا کوئی اور فاسد مقصد کارفرما تھا جس کی وجہ سے اس نے حق کو چھپا دیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا اُلْجِمَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ۔ قیامت کے دِن اُسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ چونکہ دنیا میں اُس شخص نے اپنی زبان سے حق کو ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس لیے قیامت کے دِن اُس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائیگی۔ اتنی سخت سزا دی جائیگی کہ اُس نے حق کو چھپایا تھا۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہمارے دور کے عظیم مفسر قرآن ہوئے ہیں آپ تعلیم یافتہ لوگوں کو چھ ماہ میں قرآن پاک سے کما حقہٗ واقف کرا دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا ملکہ عطا کیا تھا۔ حضرت مولانا لاہوریؒ، مولانا سلطان محمودؒ کھٹیلے والے حکیم فضل الرحمٰنؒ وغیرہم نے آپ ہی سے قرآن پاک پڑھا تھا۔ آپ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کے شاگردوں میں سے تھے۔ اور اِن میں بڑا مقام رکھتے تھے۔ انگریز آپ سے بہت خوفزدہ تھا۔ ہندوستان میں آپ کا داخلہ بند کر دیا تھا بلکہ سخت سزا رکھی تھی، لہٰذا آپ نے ۲۵ سال کا عرصہ جلاوطنی میں بسر کیا۔ آپ اپنے استاد محترم کا اشارہ پاکر کابل ہجرت کر گئے اور کابل کو انگریز کے پنجہ سے آزاد کرایا۔ مگر انگریز نے وہاں بھی آپ کو جمنے نہیں دیا۔ اور آپ کو روس جانا پڑا۔ وہاں پر صرف ایک سال کا عرصہ گزارا۔ اس کے بعد آپ ترکی چلے گئے اور چار سال وہاں

قیام کیا۔ آپنے ترکوں کو خواب غفلت سے جگایا اور انہیں باور کرایا کہ تم بے دینی کی آغوش میں جا رہے ہو۔ قرآن پاک کی چند سورتوں کا مطلب سمجھ لو تو بے دینی سے بچ جاؤ گے۔ مگر اُن لوگوں نے آپ کی دعوت کا خاطر خواہ جواب نہ دیا، لہٰذا آپ ترکی سے حجاز مقدس چلے گئے۔ آپ بارہ سال تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔ انگریز آپ کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہاں بھی آپ کی جاسوسی کی جاتی تھی۔ ایک دفعہ طواف کے دوران آپ نے دیکھا کہ جاسوس آپ کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے آپنے اُسے پہچان لیا اور سخت ڈانٹ پلائی۔ فرمایا تمہیں شرم نہیں آتی، یہاں بھی میرا پیچھا کر رہے ہو۔ خدا کا خوف کرو، کم از کم حرم پاک کا ہی احترام کرو۔ آپ زبردست انقلابی ذہن کے مالک تھے اِسی لیے تو انگریز آپ سے ڈرتا تھا۔ آپنے قیامِ پاکستان سے تین سال قبل وفات پائی۔ آپنے زندگی کے آخری ایام میں فرمایا تھا کہ میں نے انگریز کی جڑوں کو ہندوستان سے اکھاڑ دیا ہے اگر یہ چند سال کے اندر اندر اس ملک سے نہ بھاگا تو میری قبر پر آکر لات مارنا اور کہنا کہ عبید اللہ نے جھوٹ بولا۔ چنانچہ آپ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ اور انگریز تین سال کے اندر اندر ہندوستان کو خیر باد کہ گیا۔

کسی زمانہ میں برطانیہ، برطانیہ عظمیٰ کہلاتا تھا۔ یہ اتنی بڑی سلطنت تھی کہ اس پر کبھی سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ مقصد یہ کہ اس سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ کسی نہ کسی حصے پر سورج موجود رہتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں امریکہ، روس، جرمنی وغیرہ سب کمزور تھے۔ مگر اس کے ظلم کی وجہ سے اللہ نے اتنی بڑی حکومت چھین لی اور اب یہ اپنے اصل ملک میں محصور ہو کر رہ گیا ہے۔ تو یہی وہ انگریز تھا جس نے مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مولانا دینی طور پر محدّث ہونے کے ساتھ ساتھ سیاستدان بھی تھے آپ خود فرماتے ہیں۔ کہ قبول اسلام کے بعد ہم نے اٹھارہ سال تک شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کی خدمت میں رہ کر سیاست بھی سیکھی ہے اور دین بھی حاصل کیا ہے۔ آپ

امام شاہ ولی اللہؒ کی حکمت کے بڑے ماہر تھے۔ نہایت نیک سیرت انسان تھے نومسلم ہوکر اتنا شعور حاصل کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی۔ جفاکشی کا یہ عالم تھا۔ کہ آٹھ دس میل کا سفر پیدل طے کرکے نماز جمعہ کیلئے آتے تھے۔ جب کرایہ نہیں ہوتا تھا پیدل ہی چل دیتے۔ ایک دفعہ ملتان کے لیے سفر شروع کیا۔ مظفر گڑھ کے ریلوے سٹیشن پہنچے تو پاس صرف اتنے ہی پیسے تھے۔ جس سے ملتان کے لیے ٹکٹ خریدلیا۔ اتنے میں ایک اور مسافر نے سوال کیا۔ کہ سخت لاچار ہوں، ملتان جانا ہے مگر ٹکٹ کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ آپ نے خریدا ہوا ٹکٹ اُس سائل کو دیدیا اور خود پیدل ہی ملتان کے لیے چل دیے۔

بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ آپ آخر میں اشتراکی ہوگئے تھے۔ حالانکہ یہ غلط ہے البتہ آپ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھے۔ آپ نے اپنی تفسیر میں اشتراکیت کے سخت خلاف لکھا ہے۔ کیونکہ اُس دور میں اسلامی نظام سے ٹکر لینے والا اشتراکی نظام ہی تھا۔ آپ نے فرمایا تھا۔ کہ اشتراکی نظام کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے۔ ایک وقت ضرور آئے گا جب انہیں قرآنی پروگرام کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔ اسلامی پروگرام سے بہتر کوئی پروگرام نہیں ملیگا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا۔ کہ جو بھی قوم قرآنی پروگرام سے اعراض کریگی وہ کبھی فلاح نہیں پاسکتی۔ نہ دینی اعتبار سے کامیاب ہوسکتی ہے اور نہ ہی دنیوی لحاظ سے درجہ کمال حاصل کرسکتی ہے۔

تعلیم کی اہمیت

یہی مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہیں۔ جنہوں نے آیات زیر درس کے متعلق فرمایا۔ کہ میں اِن آیات سے یہ اصول اخذ کرتا ہوں کہ تعلیم جبری ہونی چاہیئے تاکہ تعلیم حاصل کرکے ترقی کی منازل طے کی جاسکیں، یورپی ممالک میں جہاں دنیوی تعلیم جبری ہے۔ وہاں مرد و زن کسی کو تعلیم سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاتا۔ سب کو لازماً تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ یہ اقوام دنیوی اعتبار سے ترقی یافتہ ہیں۔ مگر ہمارے ہاں تعلیم پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ دینی تعلیم تو ویسے ہی بالکل کمزور ہے۔ صرف ایک دو فیصد لوگ ہی دینی تعلیم حاصل

کرتے ہیں، دینوی طور پر بھی ہمارے پچاس فیصد لوگ گنتی تک نہیں جانتے۔ اُردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اور نہ ہی حساب سے کچھ واقفیت ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک مسلمان حصول تعلیم کے اصول پر عمل پیرا تھے، اور ترقی کی منازل بھی طے کرتے تھے۔ لہٰذا لازم ہے کہ کسی مرد اور عورت کو ضروریاتِ دین کی تعلیم سے بے بہرہ نہیں رہنا چاہیئے۔

اس مقام پر کتمانِ حق کے متعلق یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ کہ دیکھو جس قوم کے پاس بامِ عروج تک پہنچانے والی تعلیم موجود ہو، وہ اُسے لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی بجائے اُسے چھپائے تو ایسا شخص لعنت کا مستحق نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ اِس وقت دنیا جہنم کدہ بنی ہوئی ہے۔ جرائم کی بھرمار ہو رہی ہے۔ اور ہم خاموش بیٹھے ہیں۔ حالانکہ ہمارے پاس وہ تعلیم اور وہ پروگرام موجود ہے۔ جس سے جرائم کی بیخ کنی ہو سکتی ہے ______________ جس سے انسان کی ذہنی ترقی ہو سکتی ہے اور جس سے تہذیب الاخلاق پیدا ہو سکتا ہے مگر ہم اس تعلیم کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے تیار نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔ کہ سخت ضرورت کے باوجود جب اس تعلیم کو عام نہیں کیا جائے گا تو اس کا وبال لعنت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اسی لیے مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے فرمایا تھا۔ کہ ضروریاتِ دین میں سے سب سے پہلا نمبر تعلیم کا ہے۔ اُسے جبری طور پر نافذ کرنا چاہیئے۔

بینات اور ہدایت

اسی آیت میں اللہ تعالےٰ نے دو چیزوں یعنی بینات اور ہدایت کا ذکر کرکے فرمایا۔ کہ جو لوگ ان دو چیزوں کو چھپاتے ہیں، وہ اللہ اور لوگوں کی لعنت کے سزاوار ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ بینات سے مراد وہ واضح باتیں ہیں جو معمولی توجہ سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر، اس کی نعمتوں کا شکر اور صبر وغیرہ شامل ہیں اور ہدایت سے مراد ایسی باتیں ہیں جن کو سمجھنے کے لیے استاد کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، ایسی چیزیں آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں ان میں شعائر اللہ کی تعظیم بھی شامل ہے۔ اللہ تعالےٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان تمام

چیزوں کو ہم نے کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص انہیں چھپانے کی کوشش کرے گا، تو وہ لعنت کا مستحق ٹھہرے گا۔

کتمانِ حق کی بیماری مسلمانوں کے لیے بھی ویسی ہی خطرناک ہے جس طرح یہود و نصاریٰ کے لیے مہلک ہے۔ اہل کتاب نے کتاب اللہ سے اعراض کیا، اور دیگر خرافات میں لگ گئے لہٰذا ناکام ہوئے۔ ادھر بھی یہی حال ہے۔ مسلمانوں نے قرآن پاک کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور ٹونے ٹوٹکوں، بدعات اور شرک پر گزارہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا انجام بھی اہل کتاب سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

معافی کا پروانہ

فرمایا لعنت کی اس تعزیر سے وہی بچ سکیں گے اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا جنہوں نے توبہ کر لی، وَاَصْلَحُوْا اپنے آپ کی اصلاح کر لی۔ یعنی خود کو سنوار لیا۔ سابقہ فرائض و حقوق ادا کیے اور آئندہ کے لیے مستعد ہونے کا عہد کیا وَبَيَّنُوْا اور جس چیز کو چھپا رہے تھے اُسے واضح طور پر بیان کر دیا۔ فرمایا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ میں ایسے ہی لوگوں پر رجوع کرتا ہوں۔ وَاَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ اور میں رجوع کرنے والا مہربان ہوں مطلب یہ کہ جب کوئی شخص سابقہ کوتاہیوں اور غلطیوں سے تائب ہو کر راہِ راست پر آجائے تو میں اس کی تمام سابقہ لغزشیں معاف کر دیتا ہوں۔ مجھ سے بڑھ کر معاف کرنے والا رحیم و کریم اور کوئی نہیں۔ حتیٰ کہ میں کفر و شرک جیسے اکبر الکبائر کو بھی معاف کر دیتا ہوں۔

لعنت کے مستحقین

فرمایا اس کے برخلاف اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا جنہوں نے حق کو تسلیم کرنے کی بجائے اس کا انکار کر دیا۔ اور پھر اسی حالت میں وَمَاتُوْا اُن کو موت آگئی وَهُمْ كُفَّارٌ اور وہ کافر ہی رہے۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔ تو ایسے لوگوں پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اس لعنت میں وہ ہمیشہ گرفتار رہیں گے لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ اُن کے لیے تخفیف عذاب کا بھی کوئی

امکان نہیں وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ اور نہ ہی انہیں کوئی مہلت ملیگی۔ مقصد یہ کہ جو لوگ کفر کی حالت میں ہی مر جائیں گے وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ نہ تو ان کے عذاب میں کچھ کمی کی جائے گی اور نہ ہی اس عذاب کو کچھ دیر کے لیے مؤخر کر کے انہیں مہلت دی جائے گی۔ لعنت کا عذاب اس قدر سخت ہوگا۔

مسئلہ لعنت کے متعلق مفسرین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ کسی پر لعنت نہیں کرنی چاہیئے سوائے اس کے کہ یہ ثابت ہو جائے۔ اُس کا خاتمہ کفر پہ ہوا ہے۔ کسی کافر پر بھی اس کی زندگی میں لعنت نہیں کرنی چاہیئے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ موت سے پہلے تائب ہو جائے۔ ابلیس پہ لعنت کرنا جائز ہے۔ کیونکہ اُس کا کفر معلوم ہے۔ اس کے علاوہ برائی پہ لعنت درست ہے، جیساکہ صحابہ کرامؓ کو برا بھلا کہنے والوں کے متعلق فرمایا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلٰى شَرِّكُمْ تمہارے شر پہ خدا کی لعنت یا مثلاً برا کام کرنے والے پہ لعنت ہے لَعَنَ اللّٰهُ السَّارِقَ یعنی چور پہ اللہ کی لعنت ہو۔ یا لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ سَبَّ وَالِدَيْهِ اپنے ماں باپ کو گالی دینے والے پہ خدا کی لعنت ہو۔ اسی طرح فرمایا لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ غَيَّرَ مَنَارَ الْأَرْضِ مشترک زمین کے نشانات مٹانے والے پہ اللہ کی لعنت ہو۔ لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللّٰهِ غیر اللہ کے تقرب کے لیے ذبح کرنیوالے پر اللہ کی لعنت ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

معبود صرف ایک ہے

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے۔ کوئی اور معبودِ حق نہیں ہے۔ لہٰذا عبادت صرف اُسی کی کرو، کفر و شرک سے باز آجاؤ۔ لفظ الٰہ میں محبت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور اس کا معنی فریفتہ ہونا بھی ہے۔ اس لیے الٰہ کا معنی دلربا بھی کیا جاتا ہے۔ شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ نے اس کا ہندی ترجمہ من موہن بھی کیا ہے۔ غرضیکہ لفظ الٰہ میں محبت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اور محبوب حقیقی خدا تعالیٰ ہے۔ لہٰذا اس کی وحدانیت پر ایمان لانا چاہیئے اور خالص اسی کی عبادت کرنی چاہیئے اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بنانا

چاہیئے۔ یہ تمام مسائل کی بنیاد ہے۔ اگر تہذیب اخلاق اس بنیاد پہ قائم ہو گا، تو درست ہو گا، ورنہ نہیں۔ لہٰذا معبود وہ ہو سکتا ہے۔ جو مختار کل، قادر مطلق، علیم و خبیر نافع اور ضار ہو، جو مشکل کشائی کرنے والا ہو۔ ہمہ بیں، ہمہ داں اور ہمہ تواں ہو، وہ جو چاہے کرے۔ لَا رَآدَّ لِحُکْمِہٖ اور جس کے حکم کو کوئی ٹال نہ سکے۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اس کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے۔ اور وہ ایسا معبود ہے اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ رحمٰن سے مراد بے حد مہربان ہے اس کا بڑا فیضان ہے اور رحیم سے مراد خصوصی رحمت کرنے والا ہے، اہل ایمان کے لیے خصوصی رحمت کا اظہار قیامت کے روز ہو گا۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ رحمٰن و رحیم کا تعلق تجلی اعظم سے ہے۔ جیسے اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی یعنی رحمٰن کی تجلی عرش پہ پڑتی ہے۔ اور جس شخص کا تعلق اس تجلی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ وہ کامیابی کی منزل پا لیتا ہے۔ اسی لیے فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ تہذیب اخلاق یا تعظیم شعائر اللہ کا واحد مقصد یہ ہے کہ انسان کا تعلق اور رابطہ اللہ تعالےٰ کے ساتھ قائم ہو جائے۔

یہ بڑی اہم آیت ہے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ان دو آیتوں میں اسم اعظم ہے۔ یعنی وَاِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ۔ اور الٓمّٓ ۝ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝ اسم اعظم اللہ جل جلالہٗ کا وہ اسم پاک ہے۔ جس کی خاصیت یہ ہے۔ کہ جب اس نام کے ساتھ اُسے پکارا جائے تو وہ بندے کی دعا کو سنتا ہے اور اسے قبول کرتا ہے۔

درس شصت وسہ (۶۳) — آیت ۱۶۴

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ
وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ
اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا
وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾

ترجمہ: بیشک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات اور دن کے اختلاف میں، اور کشتیوں میں جو کہ چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے فائدہ کی چیزیں اور جو پانی اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف سے اتارا ہے جسکے ذریعے زمین کے خشک ہوجانے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اور اس زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیئے ہیں۔ اور ہواؤں کے پھیرنے میں، اور بادل جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر کیے ہوئے ہیں، ان سب چیزوں میں عقلمند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں ﴿۱۶۴﴾

گذشتہ سے پیوستہ

پہلے خانہ کعبہ کے مرکز ہدایت اور قبلہ ہونے کا بیان ہوا۔ اس کے بعد ملّتِ اسلام کے اہم ترین اصول یعنی ذکرِ الٰہی، شکرِ الٰہی، صبر اور تعظیم شعائر اللہ کا ذکر ہوا۔ پھر کتاب اللہ کی تعلیم اور اس کی ضرورت و اہمیت بیان کرتے ہوئے، اُن لوگوں پر وبال کا ذکر کیا۔ جو تعلیم کو چھپاتے ہیں۔ اور پھر آخر میں ان تمام چیزوں کی بنیاد توحید اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کا بیان ہوا۔ اور پھر آگے توحید کے دلائل کے طور پر دس چیزوں کا ذکر فرمایا ہے

کسبِ معاش

تہذیب الاخلاق کے بعد سوسائٹی کا دوسرا اہم مسئلہ کسبِ معاش ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے۔ کہ ہر شخص کو اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ گزر اوقات

کے لیے معاش کا کوئی نہ کوئی ذریعہ اختیار کرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سے کوئی انسان لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ اس بات کا ذکر فرمایا ہے۔ کہ ہم نے تمہیں زمین میں اپنا نائب مقرر کیا۔ اور تمہارے لیے معیشت کے مختلف سامان پیدا کیے۔ حضور علیہ السلام کی حدیث پاک میں بھی آیا ہے۔ کہ رزق حلال کی طلب فَرِیْضَۃٌ مِّنْ بَعْدِ الْفَرَائِضِ اللہ کے مقرر کردہ فرائض کے بعد یہ بھی ایک فریضہ ہے اور چونکہ وسائل معاش اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے۔ کہ رزق حلال کی تلاش کے ساتھ ساتھ عبادت بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی کرے۔ دوسرے مقام پر آتا ہے "فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ" روزی اللہ کے پاس تلاش کرو۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ کوئی رزاق ہے اور نہ کوئی معبود ہے۔ آیت زیر درس میں اللہ تعالیٰ نے اُن انعامات کا ذکر کیا ہے۔ جنہیں اللہ نے وسائل معاش بنایا ہے۔ اور انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ کہ جب اللہ جل جلالہٗ نے تم پر اتنے بڑے بڑے انعامات کیے ہیں کہ جن کے بغیر تمہاری گذر اوقات ہی ممکن نہیں، بلکہ زندگی کا دار ومدار ہی ان چیزوں پر ہے تو پھر تم اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو کیسے معبود بنا لیتے ہو وسائل معاش کے ان انعامات میں تمہارے لیے توحید الٰہی کے واضح دلائل موجود ہیں

آسمانی کُرّے

اس آیت میں بیان کردہ دس احسانات میں سے اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے تخلیق آسمان کا ذکر فرمایا اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ یعنی آسمانوں کو پیدا کرنے میں صاحب عقل لوگوں کے لیے واضح نشانات موجود ہیں۔ تخلیق آسمانی کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے وہ تمام احسانات جتلائے ہیں جو آسمان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اِن میں وہ تمام کرے شامل ہیں جو آسمان کی فضاؤں میں موجود ہیں اور باقاعدہ گردش کر رہے ہیں۔ پورا نظام شمسی جس سے کرہ ارض والے مستفید ہو رہے ہیں۔ آسمانی نظام کا ایک حصہ ہے۔ آسمانی کروں میں سورج، چاند اور زمین بڑے اہم کرے ہیں۔ جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ پھر یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے

نہ صرف انہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ انہیں ایک خاص رفتار سے گردش میں لا کر نسل انسانی کی تمام ضروریات زندگی فراہم کر دی ہیں۔ نوع انسانی کے لیے روشنی اور حرارت سورج کی مرہون منت ہے۔ اگر انسان کو یہ چیزیں میسر نہ ہوں۔ تو نہ کوئی کام ہو سکے اور نہ خوراک کے لیے غلہ، سبزیاں اور پھل پک سکیں۔ اور پھر یہ ہے کہ سورج ۳۶۵ دن میں ایک خاص رفتار سے اپنا چکر پورا کرتا ہے۔ جس سے موسموں کا تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان گرما، سرما، بہار اور خزاں ہر موسم سے مستفید ہوتا ہے۔ پورے چوبیس گھنٹے کا چکر بھی دن اور رات کی تخلیق کا باعث ہے جس کی وجہ سے انسان کی روزمرہ زندگی میں باقاعدگی پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ موجودہ زمانے کی سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ سورج اور چاند زمین کے گرد چکر نہیں لگاتے بلکہ زمین ان کے گرد چکر لگاتی ہے اور خود بھی اپنے محور کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ تاہم جس طریقہ سے بھی ہے آسمانی کروں کا یہ نظام اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما کر انسان پہ احسان عظیم کیا ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کا انحصار اس نظام کے ساتھ وابستہ ہے۔

زمین کے بعد چاند اپنی منزل ۲۸ یا ۲۹ دن میں پوری کرتا ہے۔ بعض سیارے دو سال میں اپنا چکر پورا کرتے ہیں۔ ماہرین فلکیات کا کہنا ہے۔ کہ ثوابت سیارے ایسے ہیں جو اپنا چکر ۲۵ یا ۲۶ ہزار سال میں مکمل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورج کے متعلق خاص طور پہ فرمایا کہ یہ ضیا ہے۔ اسی طرح چاند کی دھیمی دھیمی روشنی کے ذریعے اللہ تعالیٰ پھلوں میں رس پیدا فرماتے ہیں۔ اسی طرح سمندر کے مد و جزر کا تعلق بھی چاند کے بڑھنے گھٹنے کے ساتھ وابستہ ہے۔ غرضیکہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق آسمانی کا ذکر کر کے اس سے وابستہ نظام اور اس سے انسانی مفاد بیان فرمایا ہے۔

زمین — اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں اللہ تعالیٰ نے جس دوسرے احسان کا ذکر کیا ہے وہ تخلیق زمین ہے۔ زمین کے ساتھ انسانی زندگی کی بقا کس حد تک وابستہ ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ انسانی ضرورت کی ہر چیز زمین سے پیدا

ہوتی ہے۔ غلہ، سبزی، پھل، نباتات، جمادات، ہر چیز کا منبع زمین ہے۔ انسانی زندگی کی اہم ترین چیز پانی بھی زمین کے کھودنے سے نکل آتا ہے۔ اس کے علاوہ معدنیات کے وسیع ذخائر مثلاً سونا، چاندی، کوئلہ، تانبہ، نمک، گندھک، تیل وغیرہ سب زمین کی پیداوار ہیں۔ لوہے کا تو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر قرآن پاک میں تذکرہ کیا ہے "وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ" ہم نے بے حد زور والا لوہا پیدا کیا۔ اسمیں لوگوں کے لیے بڑے بڑے فائدے رکھے ہیں۔ اس زمانے کو تو لوہے کا زمانہ (IRON-AGE) بھی کہا جاتا ہے۔ دیکھ لیجئے آج کی دنیا میں لوہا کتنا اہم عنصر ہے۔ ریل، موٹر، جہاز بحری ہو یا ہوائی، چھوٹے چھوٹے اوزار سے لے کر بڑی بڑی مشینری تک تمام کے تمام لوہے کے محتاج ہیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے ذخائر بھی زمین ہی میں رکھے ہیں۔ اس کو کام میں لانے کے لیے اسے نرم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے ایندھن بھی کوئلے کی صورت میں زمین ہی سے پیدا کیا ہے۔

قرآن پاک میں پہاڑوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ پہاڑوں کے ساتھ بھی انسانی زندگی کے بہت سے مفاد وابستہ ہیں۔ جن میں پتھر، چشمے، جڑی بوٹیاں اور معدنیات شامل ہیں۔ اور یہ پہاڑ بھی اللہ تعالیٰ نے زمین پر ہی پیدا کیے ہیں۔ کہیں فرمایا "جَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ" زمین میں بوجھل پہاڑ جگہ جگہ رکھ دیے کہیں فرمایا۔ "وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا" پہاڑوں کو زمین میں میخوں کی طرح گاڑ دیا۔ الغرض پہاڑ بھی زمین ہی کا حصہ ہیں اور زمین ہی سے تمام ضروریات زندگی وابستہ ہیں اور بالآخر مرنے کے بعد زمین ہی اسے اپنی آغوش میں لیتی ہے۔

رات اور دن کا تغیر

شب و روز کے تغیر و تبدل کے متعلق فرمایا۔ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ یعنی دن رات کے تغیر میں بھی قدرت الٰہی کے واضح نشانات موجود ہیں۔ عقلمند لوگ سمجھتے ہیں۔ کہ دن رات کی تبدیلی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے کس قدر منفعت رکھی ہے۔ دن کے وقت انسان کام کاج کر کے اپنی

روزی پیدا کرتا ہے۔ اور پھر جب دن بھر کے کام سے تھک جاتا ہے تو آرام کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے آرام کے لیے رات بنا دی تاکہ وہ آرام و سکون حاصل کر کے اگلے دن کی مشقت کے لیے پھر سے کمربستہ ہو جائے اگر ہمیشہ دن ہی رہتا یا ہمیشہ رات ہی چھائی رہتی تو گذر اوقات میں کس قدر مشکلات آتیں۔ سورۃ قصص میں فرمایا ذرا دیکھو تو سہی اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَاءٍ اگر اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لیے رات کو ہی قائم رکھتا تو کون ہے اللہ کے سوا جو تمہارے پاس روشنی لائے مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات میں اختلاف پیدا کر کے انسان پر احسانِ عظیم کیا ہے

بحری جہاز

اس کے بعد فرمایا وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ دریا اور سمندر میں چلنے والی کشتیاں اور جہاز بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ جن سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں یہ بھی ایسی چیزیں ہیں جن میں عقل و شعور رکھنے والے لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ دریائی اور سمندری راستے زمانہ قدیم سے نقل و حمل کے معروف راستے ہیں۔ جوں جوں دنیا نے ترقی کی ہے۔ ان ذرائع میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔ بادبانی کشتیوں کی جگہ بڑے بڑے مال بردار جہاز معرض وجود میں آئے ہیں۔ جن کے ذریعے لاکھوں ٹن مال ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔ خشکی اور ہوائی ذرائع کی نسبت بحری ذرائع سے نقل و حمل آج بھی سستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی ایک کونے میں پیدا ہونے والی چیز دنیا کے دوسرے کونے تک بآسانی پہنچ رہی ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کشتی نوح کا ذکر کر کے اسے ہمیشہ کے لیے نمونہ بنا دیا ہے

لاکھوں ٹن وزنی بحری جہاز جدید ٹیکنالوجی اور علم ریاضی کے مرہون منت ہیں مگر ان فنون کی حقیقی ایجاد در اصل حضرت ادریس علیہ السلام کے ہاتھ سے ہوئی آپکو اخنوخ کہا گیا ہے تفسیر مدارک والے نے لکھا ہے کہ قلم کے ساتھ لکھنے کا سلسلہ بھی سب سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام سے شروع ہوا کپڑے سینے کا ہنر اور مشینری بھی ان کے ہاتھوں سے ایجاد ہوئی۔

ستاروں سے متعلق معلومات، علم حساب اور ناپ تول کے اوزان بھی انہوں نے رائج کیے مختلف مواقع پہ استعمال ہونے والا اسلحہ بھی حضرت ادریس علیہ السلام کے ہاتھوں سے ظہور میں آیا۔

پانی کا نزول

نشانات قدرت ہی کے بیان میں فرمایا وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا جس کے ذریعے مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ انسان اور جانوروں کے لیے خوراک کی پیداوار کا انحصار پانی پر ہے۔ اگر پانی نہ ہو تو کوئی چیز پیدا نہ ہو۔ آسمان سے نزول آب سے مراد بارش ہے۔ قرآن پاک میں بار بار آتا ہے۔ کہ دیکھو ہم کس طرح بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ چلاتے ہیں اور پھر ان کے ذریعے خشک زمین پہ بارش برساتے ہیں۔ جس کے ذریعے ہم کھیتیاں اگاتے ہیں جو تمہارے اور تمہارے جانوروں کے لیے خوراک بنتی ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ کہ کھیتی باڑی کا کام جدید طرز پہ ہونے لگا ہے۔ آلات زراعت میں ترقی ہوئی ہے۔ ذرائع آبپاشی کی سہولتیں میسر آئی ہیں۔ نئی قسم کی کھادیں دریافت ہوئی ہیں جن سے پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ تمام چیزیں انسانی معیشت سے متعلق ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ ان میں عقل مند لوگوں کے لیے واضح نشانات ہیں۔

جانوروں کی نسل کشی

نزول آب کے بعد فرمایا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ یہ اللہ تعالیٰ کے واضح دلائل میں سے ہے کہ اس نے زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے۔ ذرا غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے اتنے جانور پیدا فرمائے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی زندگی کا جانوروں کے ساتھ گہرا تعلق ہے خصوصاً وہ مویشی جن کا گوشت، دودھ، کھال اور ہڈیاں لوگ استعمال کرتے ہیں انہیں انسانی معیشت میں بڑا عمل دخل ہے اونٹ گائے، بھینس، بھیڑ بکریاں، نہ صرف دودھ مہیا کرتے ہیں۔ بلکہ یہ انسانی خوراک کا بھی حصہ ہیں۔ اسی طرح گھوڑے، اونٹ اور گدھے وغیرہ باربرداری

اور سواری کے کام آتے ہیں۔ مرغ، بیٹر، اور مچھلی خوراک کا حصہ ہیں۔ مرغی کے انڈے انسانی خوراک کا اہم جزو ہیں۔ شکاری جانور بھی انسان کے لیے خوراک مہیا کرتے ہیں۔ اب تو صید الحیوانات ایک مستقل سلسلہ اور پیشہ بن گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں اسباب معاش میں داخل ہیں اور اللہ نے انہیں نشانات قدرت کے طور پر بیان فرمایا ہے

ہواؤں کی گردش

آگے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی اور نشانی ہوا کا ذکر ہے۔ فرمایا وَتَصۡرِيۡفِ الرِّيٰحِ ہواؤں کی گردش بھی صاحب عقل لوگوں کے لیے نشان راہ ہے۔ ہر ذی جان کے لیے ہوا اس قدر ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر انسان و حیوان چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہوا ہمیشہ گردش کرتی رہتی ہے کبھی مشرق سے مغرب کی طرف اور کبھی مغرب سے مشرق کی طرف چلتی ہے۔ کبھی اس کا رُخ شمالاً جنوباً ہوتا ہے۔ جو انسانوں اور جانوروں کے لیے سکون کا باعث ہوتا ہے۔ جب ہوا کی گردش رُک جاتی ہے۔ تو لوگ گرمی میں تڑپ جاتے ہیں۔ پرانے زمانے میں ہوا کے ذریعے بادبانی کشتیاں چلتی تھیں، اسی کے ذریعے لوگ بھوسے سے غلہ علیحدہ کرتے تھے۔ ہوا ہی بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے کا باعث بنتی ہے اور دُور دُور تک بارش ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تسخیر ہوا کا قانون بھی انسان کو سمجھایا۔ پانی سے بھاپ بنتی ہے جس سے ریل گاڑیاں چلتی ہیں اور ملوں میں بڑے بڑے کام لیے جاتے ہیں۔ بڑی سے بڑی مشینری حرکت میں آتی ہے جس کے ذریعے انسانی مفاد کی بے شمار چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ دخانی جہاز بھی بھاپ سے چلتے ہیں۔ یہ سب تسخیر ہوا کے کرشمے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے تیز ہوا یعنی آندھی کے وقت کے لیے دعا سکھائی اَللّٰهُمَّ اِنِّيۡٓ اَسۡئَلُكَ مِنۡ خَيۡرِهَا وَخَيۡرِ مَا فِيۡهَا اے اللہ میں ہوا اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی خیر مانگتا ہوں۔ وَاَعُوۡذُبِكَ مِنۡ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِيۡهَا اور میں تیری ذات

کیساتھ ہوا کے شر سے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ دوسری جگہ فرمایا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهَا رِيَاحًا وَلَا تَجْعَلْهَا رِيحًا اے اللہ! ہوا کو ریاح یعنی خوشگوار بنا اور اس کو ریح یعنی عذاب نہ بنا۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں لفظ ریح استعمال ہوا ہے تو وہاں سزا کا ذکر ہے۔ جیسے فرمایا کہ ہم نے قوم عاد پر بانجھ قسم کی ہوا بھیجی اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ۔ یہی ہوا بعض اوقات بڑی نرم اور خوشگوار ہوتی ہے۔ فرمایا نُصِرْتُ بِالصَّبَا میری مشرق سے چلنے والی خوشگوار ہوا سے مدد کی گئی ہے۔ اللہ نے مجھ پہ مہربانی فرمائی ہے۔ اسی تند و تیز ہوا نے غزوہ خندق کے موقع پہ کفار کے خیمے اکھاڑ دیے، سامان درہم برہم کر دیا اور انہیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اسی طرح قوم عاد مغرب کی طرف سے چلنے والی گرم ہوا کا شکار ہوئی اور تباہ و برباد ہو گئی وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ تو ہر حال ہواؤں کا چلنا بھی نشانات قدرت میں سے ہے اور عقلمند لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے۔

مسخر بادل

فرمایا وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ زمین و آسمان کے درمیان تسخیر شدہ بادل بھی لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ صاحب عقل لوگوں کے لیے نشانات ہیں۔ بادلوں کی تسخیر کا مطلب یہ ہے۔ کہ یہ مکمل طور پہ اللہ تعالےٰ کے دست قدرت میں ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے ان سے کام لیتا ہے جس رُخ پہ چاہے انہیں موڑ دیتا ہے۔ اور جہاں اُسکی مشیت ہوتی ہے ان سے بارش برسا دیتا ہے۔ جس سے فصلوں میں بہار آجاتی ہے۔ کھیتیاں ہری بھری ہو جاتی ہیں مگر جب انہیں بادلوں سے وافر پانی بہا دیا جاتا ہے۔ تو بڑے بڑے طوفانوں کا پیش خیمہ ہوتے ہیں اور تباہی اور بربادی کا باعث بنتے ہیں۔ جب اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ تو انہی سحاب مسخر سے اولے برسنے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پکی پکائی فصلیں کوڑے کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ بھی نشانات قدرت میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ سفید، سیاہ اور سرخ بادلوں کے ذریعے

اپنی منشا کے مطابق مختلف قسم کے کام لیتا ہے

نشانات قدرت

یہ تمام چیزیں اللہ تعالےٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ یہ تمام چیزیں ممکنات میں سے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔ اللہ کے سوا ان کو پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ تمام چیزیں اپنے جسم، مفاد، اغراض اور بقا میں خود محتاج ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ثبوت ہیں۔ اس کے ساتھ اللہ تعالےٰ نے اسباب معاش بھی سمجھا دیے۔ یہ تمام چیزیں اس کی قدرت کے نشان ہیں مگر ان لوگوں کے لیے جو صاحب عقل ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہیں۔ مگر جو لوگ غور و فکر کی اہلیت سے محروم ہیں۔ انہیں قدرت کے یہ بڑے بڑے نشان بھی کچھ فائدہ نہیں دیتے ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا "يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ" کہ لوگ اللہ کی نشانیوں سے گزر جاتے ہیں مگر وہ ان سے غافل رہتے ہیں۔ قدرت کی دلیلیں ان پر کچھ اثر نہیں کرتیں۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے "اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ" پر یہاں دس دلائل بیان فرمائے ہیں اور ساتھ یہ بات بھی سمجھا دی کہ تہذیب اخلاق کے بعد دوسرا مسئلہ کسب معاش کا آتا ہے۔ اور معاش کے تمام اسباب خدا تعالےٰ کے پیدا کردہ ہیں لہذا عبادت بھی صرف اسی کی کرنی چاہیے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ
كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ
ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ
اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾
وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا
تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ
عَلَيْهِمْ ؕ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾

ترجمہ: اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو خدا کا شریک بناتے ہیں۔ ان سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے کرنی چاہیئے اور جو ایمان دار ہیں وہ اللہ کے لیے محبت میں زیادہ شدید ہیں اور اگر دیکھیں وہ لوگ جنہوں نے ظلم کیا جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ بیشک ساری قوت اللہ ہی کے لیے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے (۱۶۵) جب کہ بیزار ہو جائیں گے وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی ان لوگوں سے جنہوں نے پیروی کی اور وہ عذاب کو دیکھ لیں گے اور ان کے اسباب منقطع ہو جائیں گے (۱۶۶) اور وہ لوگ جنہوں نے پیروی کی کہیں گے کہ کاش اگر ہمارے لیے دنیا میں پلٹنا ممکن ہو تو ہم بھی ان سے بیزاری کا اعلان کریں۔ جیسا کہ یہ آج ہم سے بیزار ہوئے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ دکھلائے گا ان کو ان کے اعمال حسرت دلانے کے لیے اور وہ دوزخ کی آگ سے نکلنے والے نہیں ہوں گے (۱۶۷)

خدا کا مدمقابل ٹھہرانا

گذشتہ آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن انعامات کا ذکر فرمایا جو اسباب معیشت کی صورت میں بنی نوعِ انسان پر کیے۔ اس احسان کا تقاضا یہ تھا۔ کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو پہچانتے اور خالص اسی کی عبادت کرتے۔ مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو نِدّ یعنی مدمقابل بناتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ند کی مذمت میں پہلے بھی آ چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ" اللہ تعالیٰ کے مدمقابل اور شریک نہ بناؤ۔ کیونکہ تم بخوبی جانتے ہو کہ خالق، مالک اور رازق صرف وہی ہے۔ مسبب الاسباب بھی وہی ذات ہے۔ لہٰذا دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہرانے کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔

فرمایا جب لوگ غیروں کو اللہ کا مدمقابل تسلیم کر لیتے ہیں۔ تو پھر کرتے یہ ہیں کہ يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ اُن سے اُس درجہ کی محبت کرتے ہیں جس درجہ میں اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہیئے۔ اور یہی خرابی کی جڑ ہے یہیں سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے۔ جب غیر اللہ کی محبت اللہ کی محبت سے تجاوز کر جاتی ہے۔ یا اُس کے برابر آ جاتی ہے تو پھر تمام وہ صفات غیر اللہ میں بھی تسلیم کر لی جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور پھر غیر اللہ سے بھی اُسی طرح حاجت روائی اور مشکل کشائی کا مطالبہ ہوتا ہے جو اللہ جل جلالہٗ سے ہونا چاہیئے۔ اسی لیے فرمایا کہ بعض بدبخت ایسے بھی ہیں۔ جو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ اور پھر اُن سے ایسی ہی محبت کرتے ہیں، جیسی محبت اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے ہونی چاہیئے۔

محبت الٰہی

فرمایا شرک کی اِس نجاست کے برخلاف وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ اہل ایمان کا گروہ ایسا بھی ہے۔ جن کے دل میں شدید ترین محبت صرف اللہ ہی کی ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو مدمقابل ٹھہرا کر اُن کو اللہ کی محبت

میں برابر کا شریک نہیں بناتے۔

قیامت تو ابھی دور کی بات ہے۔ قرآن پاک شاہد ہے۔ کہ مشرکین بعض اوقات دنیا میں ہی اپنے معبودوں کی محبت کو ترک کر دیتے ہیں، جب ان کی کشتی طوفان میں پھنس جاتی ہے، تو قرآن پاک کہتا ہے "دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" تو جعلی معبودوں کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کو پکارنے لگتے ہیں۔ اور پھر آخرت میں تو بیزاری کا اعلان کر ہی دیں گے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ اس کے برخلاف اہل ایمان کی اللہ تعالےٰ کے ساتھ محبت ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ انہیں خواہ تنگی ہو یا راحت خوشحال ہوں یا کسی مصیبت میں مبتلا ہوں، تندرست ہوں یا بیمار ان کی محبت الٰہی کسی حالت میں بھی زائل نہیں ہوتی۔ باقی رہی انبیاء، اولیاء اور بزرگان دین کی محبت تو ایسی محبت اللہ ہی کے حکم سے ——— ہوتی ہے، ان ہستیوں سے محبت بالذات نہیں ہوتی بلکہ محبت بالذات صرف خدا تعالےٰ سے ہی ہوتی ہے۔

محبت کی اقسام

محبت کی مختلف قسمیں ہیں جیسے طبعی محبت، عقلی محبت اور شرعی محبت وغیرہ طبعی محبت کی مثال ایسی ہے۔ جیسے عاشق اپنے معشوق کیساتھ محبت کرتا ہے یا خاوند کو بیوی سے اور والدین کو اولاد اور دیگر اقرباء سے محبت ہوتی ہے۔

عقلی اور شرعی محبت کی مثال حضور علیہ السلام کی دعا سے ملتی ہے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْٓ اَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُّحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ يُّقَرِّبُنِیْٓ اِلٰى حُبِّكَ یعنی اے اللہ! مجھے اپنی محبت عطا کر اور اس کی محبت عطا کر جو تجھ سے محبت کرتا ہے اور ایسے عمل کی محبت عطا کر جو مجھے تیری محبت کے قریب کر دے۔ اور آخر میں یہ بھی آتا ہے وَاجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَّفْسِیْ وَاَهْلِیْ وَمَالِیْ ——— وَمِنَ الْمَآءِ الْبَارِدِ اور اے اللہ! اپنی محبت کو میرے نفس، میرے اہل، میرے مال ——— اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنا دے یہاں پر ٹھنڈے پانی کا بطور خاص ذکر فرمایا، ٹھنڈا پانی گرم ممالک میں ایک عظیم نعمت ہوتا ہے جسکے ذریعے انسان راحت

حاصل کرتا ہے۔
حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ جس شخص کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت باقی تمام چیزوں سے زیادہ ہو گئی، اُس کا ایمان کامل ہو گیا لیکن قرآن پاک نے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اللہ اور رسول کی محبت کے مختلف مدارج ہیں۔ اللہ کی محبت اصالتاً اور بالذات ہے اور رسُول کی محبت اللہ ہی کے حکم سے ہوتی ہے۔ نبی کے ساتھ اُمتی کی محبت کو نیکی کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے۔ سورۃ ممتحنہ میں جہاں عورتوں سے بیعت لینے کا ذکر آتا ہے۔ فرمایا اُن سے عہد لیں کہ وہ شرک نہیں کریں گی۔ چوری اور زنا کا ارتکاب نہیں کریں گی، اولاد کو قتل نہیں کریں گی، بہتان نہیں باندھیں گی "وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ" اور نیکی کے کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی اور بعض مقامات پر مطلق رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دے دیا جیسے "مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ" جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے گویا اللہ ہی کی اطاعت کی۔ دوسری جگہ فرمایا "أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ" اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ تاہم اطاعت اور عبادت میں فرق ہے۔ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو سکتی ہے۔ اور اطاعت رسول کی بھی اسی طرح فرض ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی فرض ہے۔
ترمذی شریف کی حدیث میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے اَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا يَغْذُوكُمْ مِنْ نِعَمِهٖ لوگو! اللہ سے محبت کرو کہ اُس نے تمہیں نعمتیں عطا کی ہیں۔ وہ منعم حقیقی ہے۔ تمہارا اپنا وجود اور اس کے علاوہ جتنی بھی چیزیں ہیں سب اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں لہٰذا اُس سے محبت کرو۔ پھر فرمایا اَحِبُّونِي لِحُبِّ اللّٰهِ خدا تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے میرے ساتھ بھی محبت کرو۔ میں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کا راستہ اور اس کا پیغام پہنچایا ہے۔ اس کا کلام اور اس کی شریعت تم کو دی ہے۔ اور پھر فرمایا کہ میری وجہ سے میرے اہل بیت کے ساتھ بھی محبت کرو۔

محبت کی مختلف وجوہات

کسی کے ساتھ محبت کرنے کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ مثلاً اگر کوئی جمال

کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ جمیل بالذات ہے لہٰذا اصلی اور ذاتی محبت اُسی کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ حسن و جمال خود خدا کی صفات میں سے ہے۔ اس لیے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اصلی محبت اُسی سے ہو۔ محبت کی ایک وجہ کمال بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کمال بالذات ہے۔ اور باقی چیزوں میں کمال اللہ تعالےٰ کا عطا کردہ ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے بھی محبت کے لائق ذاتِ خداوندی ہی ہے اسی طرح محبت کی وجہ احسان بھی ہے۔ جس کے ساتھ احسان کرو، وہ محبت کرتا ہے اور سب سے بڑا محسن خود خدا تعالےٰ ہے۔ لہٰذا مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے محسن کے ساتھ محبت رکھے۔

بعض اوقات محبت کا معیار نفع اور نقصان ہوتا ہے کسی نے نفع پہنچایا ہے یا نفع کی توقع ہے تو اُس سے محبت پیدا ہو گئی۔ کسی سے اس لیے بھی محبت کی جاتی ہے کہ اس کے بغیر نقصان کا خطرہ ہے۔ حقیقی نافع اور ضار تو اللہ تعالےٰ ہے۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی اللہ تعالےٰ کے ساتھ محبت ہونی چاہیئے۔

محبت کا ایک اور معیار ضروریات زندگی کی تکمیل بھی ہے۔ انسان کا مال و متاع، گھر بار، زن و اولاد سب ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ لہٰذا ان سے بھی محبت کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ محبت بھی محبت بالذات نہیں، یہ تو اللہ تعالےٰ نے محض ذرائع پیدا کیے ہیں۔ امیر ہو یا حاکم، رفیق ہو یا دوست، برادری ہو یا کوئی ادارہ، یہ تو محض اسباب ہیں، ورنہ ضروریات کا حقیقی بہم پہنچانے والا اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ لہٰذا محبت بالذات اُسی کو سزاوار ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اغیار کی محبت کو ایک سطح پر لے آئے گا۔ تو شرک کا مرتکب قرار پائے گا۔

محبت کی کسوٹی

یہ بات تو واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ ہی محبوب حقیقی ہے اس کے ساتھ محبت باقی تمام مخلوق کی محبت سے زیادہ ہونی چاہیئے۔ غیر اللہ کی محبت کو اللہ کی محبت کے مساوی بھی درجہ نہیں دیا جا سکتا ورنہ یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ

کی زد میں آجائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ یعنی اللہ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت کا دعویدار ہو تو اس کی جانچ کے لیے کونسی کسوٹی ہے۔ کہ اُس کا دعوٰے درست ثابت ہو جائے۔ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کسی کی محبت کی کسوٹی اطاعت ہے۔ جب اطاعت کا وقت آئے گا تو پتہ چلے گا۔ کہ محبت کا دعویدار اپنے محبوب حقیقی کی اطاعت کرتا ہے، یا کسی اور کی ظاہر ہے کہ جس شخصیت کی اطاعت کریگا، اُس کی محبوب ترین ہستی وہی ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک طرف خدا تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور دوسری طرف والدین، پیر یا استاد کا حکم ہے۔ تو ان میں سے وہ کس کو ترجیح دیتا ہے۔ اس مقام پر شرعی محبت کا تقاضا یہ ہے۔ وہ اپنے اللہ کی اطاعت کر کے اُس کے ساتھ شدید ترین محبت کے دعوے کو سچ کر دکھائے۔ اور اگر اُس نے اللہ تعالےٰ کے حکم کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے حکم کو ترجیح دی۔ تو ظاہر ہے کہ اُس کا محبوب حقیقی کے ساتھ محبت کا دعویٰ باطل قرار پائے گا۔ اور اس کی شدید ترین محبت اُسی کے ساتھ ثابت ہوگی۔ جس کی اُس نے اطاعت کی۔ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں جو کوئی بھی ملک آباؤ اجداد یا برادری کے رسم و رواج کی پیروی کرے گا، مشرک ہو جائے گا۔

بعض لوگ انبیاء، اولیاء، ملائکہ یا ارواح کی محبت کو خدا کی محبت کے برابر قرار دیتے ہیں۔ اُن سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسی خدا تعالےٰ سے محبت ہوتی ہے اسی لیے نذر و نیاز اور قربانی پیش کرتے ہیں یا نیاز مندی بجا لاتے ہیں۔ یا اُن کی یادگار بناتے ہیں تو ایسے لوگ بھی شرک میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ غیر اللہ کے ساتھ محبت کرنے کی اجازت ہے مگر ایسی محبت جو اللہ تعالےٰ کے حکم کے مطابق ہو اور اس کی محبت سے کم تر درجے پر ہو۔ محبت دراصل ایک میلان، تعلق اور خواہش کا نام ہے۔ طبعی محبت میں دنیاوی غرض کارفرما ہوسکتی ہے، مگر اللہ تعالیٰ سے محبت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ وہ عبادت، اطاعت اور اس کی رضا کے لیے ہو۔

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت یہ ہے۔ کہ جو اس کے ساتھ محبت کا دعویٰ کریگا، وہ اُس کے محبوبوں کے ساتھ بھی محبت رکھے گا۔ اور اس کے دشمنوں سے نفرت کرے گا۔ محبت کی دوسری علامت یہ ہے۔ کہ محب کو اللہ کی اطاعت اور عبادت کرنے میں روح کا کامل نشاط حاصل ہوگا۔ وہ خوشی کے ساتھ عبادت الٰہی میں منہمک ہوگا اور معصیت سے گریز کرے گا۔ اسی طرح وہ خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر جان و مال کی بازی لگانے میں بھی دریغ نہیں کریگا۔

غیر اللہ کی محبت

اب دیکھ لیجیئے کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ لوگ کس طرح غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ عیسائی مذہب والے اللہ تعالیٰ کی محبت کے مقابلے میں بزعم خویش خدا کے بیٹے، کنواری ماں اور روح القدس کی محبت میں مبتلا ہیں۔ یہی مشرکانہ محبت ہے۔ ہندو مت والے بھی محبوب حقیقی کی بجائے جنہیں وہ پرماتما یا ایشور کہتے ہیں، درگا دیوی اور لکشمی ماتا کی محبت میں مبتلا ہیں۔ سادھوؤں اور رشیوں سے محبت کی پینگیں بڑھا رہے ہیں۔ ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں۔ اسی طرح کلمہ گو مسلمان بھی غیر اللہ کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ یا علی مدد اور یا غوث اعظم کے نعرے لگائے جا رہے ہیں۔ کبھی پیر بابا کو مدد کے لیے پکارا جا رہا ہے اور کبھی خواجہ سے داد رسی کی جا رہی ہے یہ لوگ تو اللہ کے پیارے، محبوب اور صالح لوگ ہیں۔ اِن کو اللہ کا شریک ٹھہرا لیا ہے۔ یہی چیزیں ہیں جو ثابت کرتی ہیں۔ کہ ان لوگوں نے غیروں کی محبت کو اللہ کی محبت کے مساوی قرار دے لیا ہے اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے "فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ" خالصتاً اللہ ہی کو پکارو کہ وہی حاضر و ناظر مالک و مختار اور مدد کرنے والا ہے۔ مگر یار لوگ غیر اللہ کو بھی اللہ ہی کے ہم پلہ بنا کر شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اللہ والوں کا یہ طریقہ قطعاً نہیں ہے۔

اہل ایمان کا طریقہ

اہلِ ایمان کا ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کہ انہیں سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتی ہے۔ وہ کسی غیر اللہ

کی محبت کو اللہ کی محبت کے برابر نہیں جانتے۔ جہاں تک نبی کی محبت کا تعلق ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے۔ خدا نے حکم دیا ہے نبی سے محبت کرو نبی کی محبت نبی کی اطاعت میں مضمر ہے اور اطاعت عبادت نہیں ہوتی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اَکْرِمُوْا اَخَاکُمْ اپنے بھائی کا احترام کرو۔ میں تمہارا بھائی ہوں، لہٰذا میرا احترام کرو مگر عبادت صرف رب کی کرو وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ آج لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی محبت کے دعویدار بھی ہیں مگر مافوق الاسباب غیر اللہ کو بھی مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ حالانکہ زبان سے اقرار کرتے ہیں "اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ" مگر عمل اس کے خلاف ہے۔ انبیاء سمیت ساری کی ساری مخلوق محتاج اور عاجز ہے، قادر مطلق صرف اللہ کی ذات ہے۔ لہٰذا اہل ایمان کا طریقہ یہ ہے۔ کہ انہیں شدید ترین محبت محبوب حقیقی یعنی خداوند تعالیٰ کی ذات سے ہوتی ہے

اللہ ہی قادر مطلق ہے

فرمایا وَلَوْ یَرَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اور اگر ظالم لوگ دیکھیں گے اِذْ یَرَوْنَ الْعَذَابَ جب کہ وہ عذاب کو دیکھ لیں گے۔ اَنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ساری طاقت تو اللہ ہی کے لیے ہے۔ وَاَنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ الْعَذَابِ اور اللہ سخت گرفت کا بھی مالک ہے۔ مقصد یہ کہ غیروں کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے ہم پلہ گرداننے والوں پر یہ راز قیامت کے دن کھلے گا کہ وہ غلطی میں مبتلا تھے۔ جب یہ ظالم اپنی آنکھوں سے دوزخ کے عذاب کو دیکھ لیں گے۔ کہ آج اللہ کے سوا کسی دوسرے کی محبت کام نہیں آسکتی۔ آج تو ساری طاقتیں اور تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں، آج وہی قادر مطلق ہے، اسی کا حکم چلتا ہے۔ کاش کہ ہم نے دنیا میں اسی کی محبت کو اولیت دی ہوتی اور غیروں کی محبت کو اس کے برابر نہ سمجھا ہوتا تو آج ہمیں شدید عذاب دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

تابع اور متبوع

فرمایا اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا قیامت کے اس ہولناک وقت کو یاد کرو جب متبوع (جن کی پیروی کی گئی) اپنے پیروکاروں سے بیزار ہو جائیں گے۔ یعنی وہ لوگ جو دنیا میں مطاع مانے جاتے تھے۔ ان کے

مطیع اُن کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کر لیتے تھے، آج وہی پادری، رشی اور پیر اپنے مریدوں کو صاف جواب دے دیں گے کہ ہم نے تمہیں کب کہا تھا کہ ہمیں اللہ کا شریک ٹھہرالو۔ یہ بیہودہ کام تو تم اپنی مرضی سے کرتے تھے۔ ہم نے تو نہیں کہا تھا کہ ہمیں اللہ کا بیٹا بنالو، اس کا اوتار بنالو یا مشکل کشا اور حاجت روا بنالو۔ حتیٰ کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی سوال ہو گا کہ کیا آپ نے لوگوں سے کہا کہ مجھے اور میری ماں کو الٰہ بنالو۔ تو آپ جواب دیں گے۔ اے مولا کریم! یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ میں کوئی ایسی بات کہوں "مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ" جس کے کہنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ غرضیکہ تمام مطاع اس دن انکار کر دیں گے۔ وَرَأَوُا الْعَذَابَ عذاب سامنے نظر آئے گا وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ اور تمام اسباب منقطع ہو جائیں گے۔ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا اور پیروکار کہیں گے، افسوس کا اظہار کریں گے۔ لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً اگر ہمیں ایک دفعہ پھر دنیا میں پلٹنے کی اجازت مل جائے فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ تو ہم بھی ان راہنماؤں سے اسی طرح بیزار ہو جائیں۔ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا جیسا کہ یہ آج ہم سے بیزار ہو گئے ہیں یعنی اب ہمیں حقیقت حال کا علم ہو گیا ہے اب اگر یہ ہمیں دنیا میں مل جائیں تو ہم ہرگز انکی تابعداری نہیں کریں گے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق سورۂ احزاب میں آتا ہے کہ یا اللہ إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا ہم نے تو اپنے سرداروں اور بڑوں کا اتباع کیا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا انہوں نے ہمیں گمراہ کر دیا ہمیں سیدھے راستے سے بھٹکا دیا۔ کاش کہ ہم نے تیرے رسولوں کا اتباع کیا ہوتا ہم نے تو اپنے بزرگوں کی بات مانی اے مولا کریم رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ آج ان کو دوگنا عذاب دے کیونکہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور ہمیں بھی گمراہ کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا کہ تم نے دنیوی اغراض کے لیے معبود بنا رکھے ہیں، قیامت کے دن یہ سارا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ اور آج کے تمام دوست اس دن دشمن بن جائیں گے۔ پیار محبت اور الفت صرف وہی کام آئے گی، جو اللہ کی رضا کی خاطر کی گئی۔ اس کے علاوہ تمام ذرائع کٹ جائیں گے فرمایا كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ اس طرح اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال اُن کو حسرت بنا کر دکھائے گا وہاں پر

ان کا بیزاری کا اعلان کچھ کام نہ آئے گا۔ بلکہ اُن کے عذاب میں اضافہ ہی ہو گا وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ اُن کے لیے جہنم سے رہائی کی کوئی صورت نہ ہوگی، وہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔ وجہ بیان ہو چکی ہے کہ انہوں نے غیر اللہ کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے برابر قرار دیا، شرک میں مبتلا ہوئے اور باطل پرست لوگوں کا اتباع کیا۔

درس شصت و پنج (۶۵) — آیت ۱۶۸ تا ۱۷۱

يَاأَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ۖ وَلَا
تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿۱۶۸﴾
إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿۱۶۹﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ
قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ
لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿۱۷۰﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ
كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً
وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿۱۷۱﴾

ترجمہ: اے لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں ان میں سے کھاؤ۔ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ بیشک وہ تمہارے لیے صریح اور کھلا دشمن ہے (۱۶۸) بے شک شیطان تم کو برائی اور بے حیائی کی باتوں کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ تعالیٰ پر وہ چیزیں کہو جو تم نہیں جانتے (۱۶۹) اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم اُس چیز کی پیروی کرو، جس کو اللہ نے اتارا ہے۔ تو کہتے ہیں۔ بلکہ ہم اُس چیز کی پیروی کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگرچہ اُن کے باپ دادا نہ کسی چیز کو سمجھتے ہوں اور نہ وہ سیدھی راہ پر ہوں (۱۷۰) اور اُن لوگوں کی مثال جنہوں نے کفر کیا، اُس شخص کی سی ہے، جو آواز دیتا ہے۔ اُس کو کہ نہیں سنتا مگر بلاتا اور پکارنا، یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے (۱۷۱)

گذشتہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل اور شرک کا رد تھا اور یہ گذشتہ سے پیوستہ

بتلایا گیا تھا۔ کہ جو لوگ دوسروں کے ساتھ ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ کے ساتھ کرنی چاہیئے، وہ لوگ کفر اور شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی سزا اور عذاب کے مستحق بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے بُرے انجام سے خبردار کیا ہے اور بتلایا ہے کہ اُن کے اعمال اُن کے لیے حسرت کا باعث بنیں گے۔ قیامت کے دن ایسے لوگ افسوس کا اظہار کریں گے۔ مگر وہ افسوس اُن کے لیے کچھ مفید نہیں ہوگا اور نہ وہ کبھی دوزخ کی آگ سے باہر نکل سکیں گے۔

قانون کی پابندی

قرآن پاک کا یہ اسلوب بیان ہے۔ کہ موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے کبھی خطاب عام ہوتا ہے۔ جیسے "یَاۤ اَیُّهَا النَّاسُ" یعنی اے لوگو! اے بنی نوع انسان۔ اور کبھی خطاب خاص ہوتا ہے۔ جیسے "یَاۤ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یا یٰۤاَهْلَ الْکِتٰبِ" وغیرہ وغیرہ۔ آیت زیر درس میں خطاب عام ہے۔ اور تمام بنی نوع انسان کے لیے حکم دیا جا رہا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا اے لوگو! زمین کی حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو، اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ۔ وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔

دراصل یہاں پر حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم دے کر اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کو قانون کی پابندی کا درس دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں صرف انہیں استعمال کرو اور حرام خوری سے بچ جاؤ اگر تم اللہ کے قائم کردہ اس قانون کی پابندی نہیں کرو گے، تو اصل راستے سے بھٹک کر شیطان کے نقش قدم پر چلنے لگو گے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ ترقی کے مقام حظیرۃ القدس میں پہنچنے کی بجائے ظلمت کی انتہا گہرائیوں میں پہنچ جاؤ گے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر باب باندھ کر بات سمجھائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان مکلف ہے۔ اور مکلف سے مراد قانون کی پابندی کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت میں ملکیت

اور بہیمیت دونوں مادے رکھے ہیں اور اِن دونوں کا تقاضا یہ ہے۔ کہ انسان قانون کی پابندی کرے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کریگا، تو اس کے حصے میں ناکامی اور محرومی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

نسلِ انسانی متمدن نسل ہے۔ اور یہ دیہات، قصبوں اور شہروں میں مل جل کر رہتی ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ اس صورت میں کسی قانون کی پابندی اُس وقت تک نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتی۔ جب تک وہ اجتماعی صورت میں نہ ہو۔ قانون پر عملدرآمد بھی اسی حالت میں ممکن ہے جب کہ لوگوں کو قانون سے واقفیت ہو۔ اور اس کے لیے قانون کی تعلیم کا عام ہونا ضروری ہے۔ تاکہ معاشرے کا کوئی فرد قانون کے جاننے سے بے بہرہ نہ رہ جائے۔ جب یہ حجت پوری ہوجائے گی تو پھر قانون شکنی کرنے والے کے خلاف کاروائی بھی لازم ہوجائیگی، تاکہ معاشرہ اس قسم کے فساد سے محفوظ رہ سکے۔ قانون شکن کوئی فردِ واحد ہو یا جماعت وہ قانون کی مقرر کردہ تعزیر کی زد میں ضرور آئے گا۔ اور اگر کوئی دوسری باہر کی جماعت قانون کے نفاذ میں رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کریگی، تو اس کے خلاف اعلان جنگ کرنا ہوگا، تاکہ فتنہ و فساد کا دروازہ فوراً بند کیا جاسکے۔

حلال وحرام کی تمیز

حلال چیز وہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے شرعاً حلال قرار دیا ہے۔ اور پاکیزہ وہ چیز ہے۔ جو بذاتہ لذیذ بھی ہو۔ کیونکہ بدبودار چیز کو کوئی شخص کھانا پسند نہیں کرے گا، خواہ شریعت کے نزدیک وہ حلال ہو۔ کسی چیز کی پاکیزگی کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس کے ساتھ کسی کا حق متعلق نہ ہو۔ اگلی آیات میں حلال وحرام کی حکمت اور اُن اشیاء کی تفصیل آرہی ہے۔ مثلاً بکری حلال ہے۔ مگر خنزیر حرام ہے۔ اسی طرح اونٹ حلال ہے مگر شیر حرام ہے۔ بکری اور اونٹ وغیرہ کی حلت کے باوجود اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے۔ کہ وہ شرعی طریقے سے مذبوحہ ہو۔ ورنہ ایسے جانور کا گوشت استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں حکم موجود ہے "وَلَا تَاْكُلُوْا

مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ" یعنی جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو، اُسے مت کھاؤ، وہ حرام ہے۔ اس طرح جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، وہ بھی حرام ہے۔ مردار بھی حرام ہے۔ ایسی چیزوں کا استعمال جسمانی یا روحانی صحت کے لیے مضر ہوگا کیونکہ جن چیزوں کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے، اُن میں کوئی نہ کوئی خرابی ضرور ہوگی۔

"اُحِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ" کی حکمت اگلی آیتوں میں آرہی ہے۔ جو چیز غیر اللہ کے نام پر دی جاتی ہے، خواہ وہ مٹھائی ہو یا فروٹ، چاول ہوں یا گوشت اُن میں بظاہر تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی مگر اس میں روحانی نجاست پائی جاتی ہے، جو روح کو پلید کر دیتی ہے۔ لہٰذا ایسی چیز روحانی طور پر مضر ہوگی، ترمذی شریف میں ہے کہ طافی یعنی ایسی مچھلی جو خود مر کر پانی کے اوپر تیرنے لگتی ہے۔ وہ مکروہ ہے اس میں حکمت یہ ہے۔ کہ وہ جسمانی صحت کے لیے مضر ہے۔ جو کوئی کھائے گا بیمار ہو جائے گا۔ ہم نے خود دیکھا ہے۔ کہ ایک شخص نے ایسی مچھلی کا گوشت کھایا اور اور چوبیس گھنٹے کے اندر ہلاک ہوگیا۔ یہ گوشت اتنا زہر آلود تھا کہ اُس کا سارا خون پیپ میں تبدیل ہوگیا۔ ایسے ہی حوادث سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا، وہ کسی نہ کسی طور انسانی جسم کے لیے مضر ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔

حرمت کی ایک اور صورت دوسرے کی حق تلفی بھی بیان ہوئی ہے۔ ایک شخص چوری کی بکری لا کر ذبح کرتا ہے۔ وہ حلال جانور ہے۔ اُس پر اللہ کا نام بھی لیا گیا ہے۔ مگر چوری کے فعل نے اس میں خباثت کو جنم دے دیا ہے۔ کہ وہ کسی دوسرے شخص کا حق تھا۔ جو ضائع ہوگیا۔ اس لیے اس کا کھانا حرام ٹھہرا۔ رشوت اور سود کا مال بھی اسی زمرہ میں آتا ہے۔ کہ ایسا مال طیب نہیں رہتا بلکہ خبیث ہو جاتا ہے۔ اس لیے حرام ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ نبی نوعِ انسان کو اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ قا

کی پابندی کرنا چاہیئے۔ جن چیزوں کو اللہ نے حلال اور پاکیزہ کہا ہے انہیں کھانا چاہیئے اور حرام چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ کہ دعا فرمائیں۔ اللہ تعالےٰ مجھے مستجاب الدعوات بنادے یعنی اللہ میری ہر دعا کو قبول فرمائے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا اے سعد! اَطِبْ مَطْعَمَكَ اپنی خوراک کو پاک بنالو۔ یعنی طیب غذا استعمال کرو تَكُنْ مُسْتَجَابَ الدَّعْوَاتِ مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔ فرمایا اس ذات پاک کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب کوئی شخص حرام کا ایک لقمہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے۔ تو چالیس دن تک اس کی نیکی قبول نہیں ہوتی۔ الغرض اللہ تعالیٰ کے حلال وحرام کے قانون کی پابندی لازمی ہے اس کے برخلاف کرنا شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔

شیطان کا نقش قدم

حضرت مسروقؒ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کے رشتہ دار اور شاگرد ہیں۔ آپ تابعین میں سے ہیں، کسی نے آپ سے دریافت کیا۔ کہ اگر کسی نے بچے کو ذبح کرنے کی منت مانی ہو، تو اس کے متعلق کیا حکم ہے فرمایا بچے کی بجائے بکری ذبح کر دے تو اس کی نذر پوری ہو جائیگی کیونکہ بچے کو ذبح کرنا شیطان کے نقش قدم پر چلنے والی بات ہے اور شیطان ہمارا کھلا دشمن ہے۔ وہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک اور قیامت تک اپنی دشمنی کا اظہار کرتا رہے گا۔ اس کے عزائم واضح ہیں "اِنَّمَا يَدْعُوا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ" وہ اپنے لوگوں کو دعوت دیتا ہے۔ کہ وہ اُس کے گروہ میں شامل ہو کر جہنم میں داخل ہو جائیں۔ ابلیس کا انسانوں کے متعلق گمان تھا۔ کہ یہ اندر سے کھوکھلے ہیں، میں ان کو ہر طریقے سے اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ ابلیس نے اپنا گمان سچ کر دکھایا۔ لوگوں کی اکثریت اس کے تابع ہوگئی اِلَّا قَلِيْلًا سوائے ایک چھوٹی جماعت کے جنہوں نے شیطان کا اتباع نہ کیا، بلکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے قانون کی پابندی کی۔ وہ شیطان کے فریب سے محفوظ ہے۔

فرمایا شیطان کا کام یہ ہے۔ کہ اِنَّمَا یَاْمُرُکُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وہ تمہیں بُری باتوں اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ بُری باتوں سے مُراد فسق و فجور اور گناہ کے کام ہیں اور فحشاء سے مراد شہوت رانی کی باتیں ہیں۔ شیطان چاہتا ہے کہ اس قسم کی لغویات میں پڑے رہیں۔ اور خدائے عزوجل کے قانون کی طرف نہ آسکیں وہ یہ بھی چاہتا ہے۔ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کہ تم خدا تعالےٰ کے متعلق ایسی باتیں کہو، جو تم نہیں جانتے۔ یعنی بغیر جانے بوجھے اللہ تعالےٰ کے ساتھ ایسی باتیں منسوب کر دی جائیں جو اس کی شان کے شایان نہیں۔ چنانچہ دیکھ لیجئے یہ مشرک اور بدعتی لوگ اپنی تمام خرافات اللہ تعالیٰ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ کہ یہ افعال اس کے حکم سے کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالےٰ کی ذات پر افترا باندھنا ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا کہ لوگ بیت اللہ شریف کا طواف بالکل برہنہ حالت میں کرتے تھے۔ اُن کی توجیہہ بھی یہی تھی وَاللّٰہُ اَمَرَنَا بِھَا" یعنی اللہ نے ہمیں ایسا حکم دیا ہے حالانکہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اللہ تعالیٰ بے حیائی کا ہرگز حکم نہیں دیتا۔ شیطان نے اُن کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ جن کپڑوں کے ساتھ ہم گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں، اُن کے ساتھ طواف نہیں کرنا چاہیئے۔ لہذا انہوں نے مادر زاد ننگے طواف شروع کر دیا۔ سورۃ اعراف میں بھی آتا ہے۔ "اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰہِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" کیا تم اللہ کے ساتھ ایسی باتیں منسوب کرتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں۔

آباؤ اجداد کا اتباع

انہی لوگوں کے متعلق فرمایا وَاِذَا قِیْلَ لَھُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیزوں کی اتباع کرو یعنی اللہ تعالیٰ کے نافذ کردہ قانون پر چلو قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَیْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا تو کہتے ہیں۔ کہ ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کہتے تھے ہم تو اپنے بڑوں کے راستے کو نہیں چھوڑیں گے، ہم اُن کے عقیدے اور رسم و رواج کی پابندی کریں گے،

وہ بھی تو آخر عقل و شعور رکھتے تھے، کوئی بیوقوف تو نہ تھے اگر ان لوگوں کے آباؤ اجداد واقعی سمجھ بوجھ کے مالک ہوتے تو ان کے راستہ پہ چلنا نیکی کی بات تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی تو کہا تھا۔ "وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْ" میں اپنے آباؤ اجداد کی ملّت پہ ہوں۔ یعنی میں اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے طریقے پہ ہوں۔ جو کہ صحیح راستے پر تھے۔ اس کے برخلاف اگر آباؤ اجداد غلط راستے پر چل رہے ہوں تو پھر ان کی پیروی کرنا کس قدر حماقت اور بیوقوفی کی بات ہوگی۔ اسی لیے فرمایا اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآءُ ھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْئًا وَّلَا یَھْتَدُوْنَ۔ کہ اگر ان کے آباؤ اجداد نہ تو عقلمند ہوں اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہوں تو کیا پھر بھی یہ انہی کے راستے پر چلیں گے۔ مقصد یہ کہ معروف میں تو کسی کی پیروی کی جا سکتی ہے، مگر منکرات میں ایسا کرنا کسی طرح بھی روا نہیں ہے۔

بعض چیزیں ہماری سوسائٹی کو ورثے میں ملی ہیں مگر یہ خدا کے قانون اور پیغمبر علیہ السلام کے طریقے کے خلاف ہیں، محرّم کے مہینے میں بعض لوگ پان نہیں کھاتے۔ سرخ لباس نہیں پہنتے، کالا لباس پہننا ضروری سمجھتے ہیں، تاکہ اظہارِ غم ہو، یہ سب شیطانی طریقہ اور آباؤ اجداد کے راستے پر چلنے والی بات ہے بعض لوگ حضرت فاطمہؓ کے نام کی نیاز دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ کوئی مرد اس میں سے نہ کھائے۔ اسی طرح ۲۲ رجب المرجب کو حضرت امام جعفر صادق کے نام کی نیاز دیتے ہیں جسے کونڈے کا نام دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نیاز کا کھانا گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔ اور یہ سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے کھا لینا چاہیئے اس قسم کے تمام مفروضات پر عمل درآمد آباؤ اجداد کی پیروی کے مترادف ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح شاہ عبدالحقؒ کا توشہ حلوا ہوتا ہے مگر حقہ پینے والا یہ توشہ نہیں کھا سکتا۔ اس پر پابندی ہے۔ بوعلی قلندرؒ کی نیاز میں سویاں پکائی جاتی ہیں، عید کے موقع پر لوگ اس کی بھی پابندی کرتے اصحابِ کہف کی نیاز گوشت روٹی کی صورت میں دی جاتی ہے۔ اس کے بغیر

نیاز ادا ہی نہیں ہوتی۔

اسی طرح پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نیاز کے لیے گیارہویں تاریخ کی پابندی کی جاتی ہے۔ یہاں پہ یہ غلط عقیدہ راسخ ہو چکا ہے کہ اگر مقررہ تاریخ پہ گیارہویں نہ دی تو مال میں نقصان ہو جاتا ہے یا بھینس کا دودھ کم ہو جاتا ہے اس قسم کی تمام چیزیں اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَالَا تَعْلَمُوْنَ کی زد میں آتی ہیں۔ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ میں تو حکم یہ ہے۔ کہ اموات کے لیے دُعا کرو، ان کے لیے ایصالِ ثواب کرو، یہ ملّتِ ابراہیمی کا اصول ہے۔ ان کے لیے صدقہ اور استغفار کرو، اس میں کوئی پابندی نہیں، جب چاہو اجازت ہے۔ مگر ہمارے ہاں ایسی چیزوں پہ طرح طرح کی پابندیاں لگا کہ اسے بدعات میں شامل کر دیا ہے

صدقہ کا طریقہ

ہمارے ہاں صدقہ کے بہت سے خود ساختہ طریقے رائج ہو چکے ہیں۔ کئی ایک پابندیاں عائد ہو چکی ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ صدقہ کے لیے کالے جانور کی سِری ہونی چاہیئے۔ اس کے بغیر صدقہ ادا نہیں ہوتا۔ حضور علیہ السلام کا تو واضح ارشاد ہے تصدق بدرهمه بديناره جس کے پاس درہم ہے وہ درہم دے اور جس کے پاس دینار کی گنجائش ہے، وہ دینار صدقہ کر دے۔ مقصد یہ کہ جو چیز بھی میسّر ہے اس میں صدقہ دیا جا سکتا ہے مثلاً غلہ اجناس، کھجوریں، کپڑا کتاب وغیرہ ہر چیز صدقہ میں دی جا سکتی ہے۔ گوشت اور سری کی کوئی پابندی نہیں۔ یہ تو شیطانی شریعت ہے۔

حضرت ابو طلحہؓ حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ حضور! میرا یہ بہترین باغ ہے، میں اسے صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تیرے قرابت داروں میں جو غریب لوگ ہیں انہیں تقسیم کر دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح آپ نے حضرت سعدؓ کو صدقہ میں کنواں لگوانے کا حکم دیا۔ آج بھی صدقہ کے طور پہ نلکہ یا ٹیوب ویل لگوایا جا سکتا ہے۔ مسجد کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ دین کی تبلیغ پہ خرچ کیا جا سکتا ہے۔ نادار طالب علموں کی تعلیم کے

لیے صدقہ کا مال خرچ کیا جاسکتا ہے۔ پریشان حال مسافر کی مدد کی جاسکتی ہے۔ ایسی ہی بہت سی مدات ہیں جن پر صدقہ کا مال خرچ ہو سکتا ہے۔ مگر لوگوں نے کالے جانور کی کالی سری کو ہی صدقہ سمجھ لیا ہے۔ اس خول سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ اس لئے فرمایا کہ جو شریعت اللہ تعالےٰ نے نازل کی ہے۔ اس کا اتباع کرو، باپ دادا کے غلط اقدام کی اتباع مت کرو۔ کتنی بیوقوفی کی بات ہے۔ کہ بے عقل اور بے ہدایت آباؤ اجداد کے نقش قدم کو اصل دین سمجھ لیا گیا ہے

کافروں کی مثال

آگے اللہ تعالےٰ نے شیطان کے نقش قدم پر چلنے والے کفار کی مثال بیان فرمائی ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً ؕ کافروں کی مثال اُس چرواہے کی ہے۔ جو اپنے جانوروں کو آواز دیتا ہے۔ جو اُس کی چیخ اور پکار کو سُنتے تو ہیں مگر سمجھ نہیں سکتے اسی طرح کافر بھی اللہ کے نبی کی آواز تو سنتے ہیں مگر جانوروں کی طرح اُنکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ فرمایا صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، یہ لوگ عقل و شعور سے بھی عاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تین بڑی نعمتیں عطا کی ہیں یعنی قوت سماعت، قوت گویائی اور قوت باصرہ مگر لوگ ہیں۔ کہ ان قویٰ کو استعمال نہیں کرتے اور گونگے، بہرے اور اندھے بنے ہوئے ہیں یہ لوگ اللہ کی ان نعمتوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ نہ تو حق بات سننے کی تاب لاسکتے ہیں، نہ حقیقت کو دیکھ کر پرکھتے ہیں۔ اور نہ حق کی بات پوچھنے کے لیے بولتے ہیں۔ یہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو ضائع کر رہے ہیں۔

درس شصت و ششم (۶۶) — آیت ۱۷۲ تا ۱۷۳

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَاۤ اِثْمَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۷۳﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تم کو روزی دی ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر تم خاص اسی کی عبادت کرنے والے ہو ﴿۱۷۲﴾ بیشک اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام قرار دیا ہے، مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا گیا ہو۔ پس جو شخص مجبور ہو گیا اس حال میں کہ وہ نافرمانی کرنے والا نہیں ہے اور نہ زیادتی کرنے والا ہے، پس اس پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا مہربان ہے ﴿۱۷۳﴾

اکل حلال

گزشتہ آیات میں "یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ" کہہ کر پوری نوع انسانی کو خطاب کیا گیا تھا اب ان آیات میں خاص طور پر مومنوں سے خطاب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ اے ایمان والو پاک چیزیں کھاؤ، جو ہم نے تمہیں روزی دی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اکل حلال کا یہ وہی حکم اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو دیا ہے، جو اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کو دیا ہے۔ یعنی "یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا" یعنی اے رسولوں کی جماعت پاک چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال کرو۔ غرضیکہ تمام انبیاء اور اہل ایمان کو ناپاک چیزوں کے کھانے سے منع فرمایا

ہے۔ کیونکہ ایسی چیزیں کھانے سے انسان میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ پاک اشیاء کا کھانا اور ناپاک چیزوں سے پرہیز ایک ایسا عمل ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ وہ ایسا رسول ہے کہ "یُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ" لوگوں کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور خبیث اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو خبیث قرار دیا ہے۔ اُن کے استعمال سے یا تو جسمانی طور پر خرابی پیدا ہوگی یا روحانی طور پر۔ پاک چیز وہ ہے جس میں کوئی خباثت نہ ہو، خباثت ظاہری بھی ہوتی ہے اور باطنی بھی ہوتی ہے۔ ظاہری خباثت تو یہ ہے۔ کہ کوئی چیز ظاہری طور پر گندی ہو اور باطنی گندگی میں مال حرام از قسم چوری اور خیانت وغیرہ آتا ہے۔ اسی طرح روحانی گندگی یہ ہے۔ کہ اس میں کسی غیر کا حق شامل ہو۔ علامہ اقبال مرحوم نے بھی کہا ہے۔ کہ اکل حلال اور صدق مقال دین کی گرہ اور راز ہے۔ مسلم شریف کی حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی لمبا سفر کرتا ہے۔ جسم اور لباس گرد آلود ہے، بڑی تکلیف پاتا ہے وہ دعا کرتا ہے یَارَبِّ یَارَبِّ اے مولا کریم! میری دعا قبول کرلے مگر حضور فرماتے ہیں فَاَنّٰی یُسْتَجَابُ لَهٗ، اس کی دعا کیسے قبول ہوگی جب کہ مَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ جب کہ اس کا کھانا پینا حرام ہے۔ وَغُذِیَ بِالْحَرَامِ حرام غذا سے پرورش پاتا ہے۔ مقصد یہ کہ دعا کی قبولیت کے لیے اکل حلال بمنزلہ شرط کے ہے اسی طرح عبادت کی قبولیت کے لیے بھی لازم ہے کہ عابد حلال اور طیب چیزیں استعمال کرے

شکر الٰہی فرمایا اللہ کی عطا کردہ روزی میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔ اگر تم خالص اسی کے عبادت گذار ہو۔ شکر ادا کرنے کے کئی طریقے ہیں مثلاً زبان سے شکر ادا کرنا یہ ہے کہ اللہ کی حمد و ثنا بیان کرے۔ اعضاء کا شکر یہ ہے۔ کہ ایسے اعمال انجام دیے جائیں، جن سے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا اظہار ہو۔ اور دل سے شکر ادا کرنا یہ ہے

کہ دل میں یہ اعتقاد رکھے کہ مستحق تعظیم صرف خدا تعالےٰ کی ذات ہے۔ اس کے ساتھ اُس کا کوئی شریک نہیں ہے ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جنوں اور انسانوں کی ایک حالت یہ بھی ہے کہ اَخْلُقُ وَیُعْبَدُ غَیْرِیْ پیدا میں کرتا ہوں اور عبادت دوسروں کی کرتے ہیں۔ ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا اَرْزُقُ وَیُشْکَرُ غَیْرِیْ رزق میں دیتا ہوں، روزی میں پہنچاتا ہوں مگر شکریہ دوسروں کا ادا کرتے ہیں۔ اس مضمون کو امام رازیؒ اور بعض دیگر مفسرین نے بھی نقل کیا ہے۔

محرمات اربعہ

اکل حلال کا قانون بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر محرمات اربعہ یعنی چار حرام چیزوں کا تذکرہ کیا جن کا استعمال انسان کے لیے قطعاً جائز نہیں فرمایا اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ بیشک تم پر حرام ہے مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی غیر کا نام پکارا گیا ہو۔

مردار

محرمات میں پہلا نمبر مردار کا ہے۔ اس سے وہ جانور مراد ہے جو حلال ہو اور ذبح کرنے کے قابل ہو، مگر بغیر ذبح کیے مر جائے۔ ایسا جانور حرام کی فہرست میں آجائے گا، اس کا کھانا قطعاً ناجائز ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ مائدہ میں اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ وہاں پر بھی مذکورہ بالا چار محرمات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ محرمات میں مردار کی یہ صورتیں بھی شامل ہیں "وَالْمُنْخَنِقَۃُ وَالْمَوْقُوْذَۃُ وَالْمُتَرَدِّیَۃُ وَالنَّطِیْحَۃُ وَمَآ اَکَلَ السَّبُعُ اِلَّا مَا ذَکَّیْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَی النُّصُبِ وَاَنْ تَسْتَقْسِمُوْا بِالْاَزْلَامِ" یعنی وہ حلال جانور جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ سوائے اس کے کہ جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا۔ یا جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو، یا یہ کہ پانسوں کے ذریعے اپنی قسمت معلوم کرو۔ ایسی چیزوں کا کھانا مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے۔ مردار کے حرام ہونے میں حکمت یہ ہے

کہ اس کے گوشت کھانے سے انسان میں سستی اور کاہلی پیدا ہو جاتی ہے۔ کسی عبادت اور نیکی کے کام میں نشاط حاصل نہیں ہوتی۔

یہاں پر جس خون کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ وہ بہتا ہوا خون ہے۔ جو رگوں میں چلتا ہے اور ذبح کرتے وقت بہہ جاتا ہے۔ سورۃ انعام میں اسے دَمًا مَّسْفُوحًا یعنی بہایا ہوا خون کہا گیا ہے۔ یہ قطعی حرام ہے۔ اور اس کا استعمال جائز نہیں۔ البتہ رگوں کا خون بہہ جانے کے بعد جو خون گوشت میں رہ جاتا ہے، وہ حرام نہیں ہے اگر گوشت بغیر دھوئے بھی پکا کر کھا لیا جائے تو وہ پاک ہے۔ تاہم لطافت کا تقاضا ہے کہ اُسے دھو لیا جائے مگر اس کی حلت میں کوئی شبہ نہیں۔ البتہ جس جانور کو شرعی طریقہ سے ذبح کرنا ممکن نہ ہو، اُس کو ذبح کرنا شرط نہیں ہے۔ بلکہ اُسے اللہ کا نام لے کر زخمی کر دینا ہی کافی ہے۔ بھاگ جانے والے جانور کو اگر تیر چلاتے وقت یا نیزہ بھالا وغیرہ مارتے وقت اللہ کا نام لے لیا جائے تو وہ جانور حلال ہو گا، خواہ اُسے زخم جسم کے کسی بھی حصہ پہ آیا ہو۔ خون

حضرت مولانا شیخ الہندؒ لکھتے ہیں۔ کہ مردار وہ جانور ہے جو خود بخود مر جائے، یعنی جس پہ اللہ کا نام نہ لیا جائے۔ سورۃ انعام میں موجود ہے وَلَا تَاْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ جس پہ اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اس کو مت کھاؤ۔ ہاں جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے گا، وہ اُس نام کی برکت سے پاک ہو جائے گا۔ اور جس جانور کو شرعی طریقہ کے خلاف شکار یا ذبح کیا جائے وہ بھی مردار تصور ہو گا۔ مثلاً کسی جانور کو ذبح کرنے کی بجائے اُس کا گلا گھونٹ دیا جائے یا زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹ لیا جائے، تو ایسے گوشت کا کھانا جائز نہیں ہو گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ مَا اُبِیْنَ مِنَ الْحَیِّ فَھُوَ مَیْتَۃٌ زندہ جانور کا کوئی حصہ علیحدہ کر دیا جاوے تو وہ مردار ہی تصور ہو گا۔ اسی طرح لکڑی، غلیل یا بندوق سے مار جائے اور ذبح نہ کیا جائے۔ تو وہ مردار ہو گا ایک موقع پر مولانا مودودی صاحب نے فتویٰ دیا تھا کہ بندوق کا شکار بغیر ذبح

کیسے ہوئے جائز ہے، حالانکہ تمام فقہائے کرام اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں تاہم بعد میں انہوں نے رجوع کر لیا صحیحین اور نسائی شریف کی روایت کے مطابق صرف وہ جانور بغیر ذبح کے حلال ہے۔ جو تیر کے نوکدار حصہ سے زخمی ہوا ہو۔ اگر ویسے ہی تیر کی چوٹ سے مر جائے تو ایسا جانور موقوذہ شمار ہوگا اور حلال نہیں ہوگا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی عام چوٹ از قسم لکڑی پتھر وغیرہ کے لگنے سے موت واقع ہو جائے۔ بندوق کی گولی بھی ٹھوس ہوتی ہے۔ نوکدار چیز نہیں ہوتی، اس لیے بندوق کے ساتھ شکار کیا ہوا جانور بغیر ذبح کیے حلال نہیں ہوتا۔

لَمْ يُذْكَرِ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ میں وہ جانور آئے گا۔ جس پہ بوقت ذبح قصداً اللہ کا نام نہ لیا جائے۔ ہاں اگر ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہنا بھول جائے۔ تو وہ مردار نہیں ہوگا، اس کا کھانا جائز ہوگا۔ اگر قصداً تکبیر کو ترک کیا ہے۔ تو ایسا جانور مردار تصور ہوگا۔ البتہ حدیث شریف کے مطابق دو جانور اس حرمت سے مستثنیٰ ہیں اور ان کا کھانا جائز ہے۔ فرمایا اُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَتَانِ ہمارے لیے دو مردار حلال ہیں اَلسَّمَكُ وَالْجَرَادُ یعنی مچھلی اور ٹڈی۔ ان کا شکار کر کے بغیر ذبح کیے کھایا جا سکتا ہے۔ حضور نے انہیں جائز قرار دیا ہے۔

خون کی ایک قسم لبتہ یعنی جما ہوا خون ہے۔ اسے شریعت نے حلال قرار دیا ہے۔ فرمایا اُحِلَّتْ لَنَا دَمَانِ ہمارے لیے دو خون حلال ہیں اَلْكَبِدُ وَالطِّحَالُ یعنی جگر اور تلی۔ یہ دونوں اعضا منجمند خون ہیں مگر حلال ہیں۔

دم مسفوح یعنی رگوں سے نکلنے والے خون کی حرمت کی حکمت یہ ہے، کہ اسے استعمال کرنے والے آدمی میں درندگی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ شیر، ریچھ وغیرہ جو شکار کا خون پی جاتے ہیں

اس لیے ان میں درندگی کی صفات پائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی انسان بھی ایسا ہی خون استعمال کرے گا۔ تو اس میں بھی ایسی خصلتیں پیدا ہو جائیں گی۔ لہٰذا دم مسفوح کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ کہ ہر چیز کا خاصہ ہوتا ہے جو شخص سورج نکلنے تک

سوتا رہیگا وہ دن بھر خبیث النفس اور کسلان یعنی سست رہے گا۔ محدثین کرام فرماتے ہیں کہ ایسا شخص نیکی کے کاموں میں بے حد سست ہوگا۔ مگر برائی کے کاموں میں بڑا چست ہوگا۔ یہ زیادہ سونے کا خاصہ ہے۔ فرمایا اسی طرح مردار کھانے کا خاصہ یہ ہے۔ کہ ایسے شخص کو اچھائی کے کاموں میں نشاط نہیں ہوگی۔

حلال و حرام جانوروں کی حکمت: شاہ ولی اللہؒ یوں بیان کرتے ہیں کہ بھیمۃ الانعام میں سے جو مویشی اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے حلال قرار دیئے ہیں، وہ انسان کے ساتھ بڑی مناسبت رکھتے ہیں، انسان کے قریب رہتے ہیں، اس کی خدمت کرتے ہیں، لہٰذا ان کا گوشت اور دودھ بھی انسانی طبیعت کے موافق ہے۔ جیسے بکری، گائے بھینس اونٹ وغیرہ، ان کا گوشت کھانے اور دودھ پینے سے انسان میں اچھی خصلت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح جن جانوروں کو حرام قرار دیا ہے، مثلاً شیر، چیتا، کتا، بندر وغیرہ انسان سے مناسبت نہیں رکھتے، لہٰذا ان کا گوشت کھانے سے اُن جیسی خصلتیں پیدا ہوں گی۔ بلی اور کتے کا گوشت کھانے سے انسان میں ویسی ہی صفات پیدا ہو جائینگی لہٰذا شریعت نے ان سے منع فرمایا ہے۔

خنزیر کا گوشت

فرمایا دیگر حرام جانوروں کی طرح وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِیۡرِ خنزیر کا گوشت بھی قطعی حرام ہے یہاں پر ذکر صرف گوشت کا کیا ہے۔ مگر مراد یہ ہے۔ کہ جب اُس کا گوشت حرام ہے تو اس کی ہر چیز کا استعمال حرام ہے اس کی ہڈیاں، بال، چربی، لعاب وغیرہ، سورۃ انعام میں خنزیر کے متعلق آتا ہے اَنَّہٗ رِجۡسٌ یہ بالکل ناپاک ہے۔ اس کا استعمال بالکل حرام ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ قرب قیامت جب مسیح علیہ السلام نازل ہوگا تو آپ صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے۔ ان دونوں کاموں سے عیسائیوں کی تذلیل مقصود ہے۔ مسیح علیہ السلام صلیب کو توڑ کر یہ ثابت کر دیں گے کہ ان کے نام نہاد پیروکاروں کا یہ عقیدہ باطل تھا کہ انہوں نے مسیح علیہ السلام کو سولی پہ لٹکا دیا ہے۔ اسی طرح عیسائی خنزیر کا گوشت بڑے شوق سے کھاتے ہیں، خنزیر کو قتل کرنے کا مقصد بھی عیسائیوں کی اس بات پہ تذلیل ہے۔ کہ وہ خنزیر کے گوشت کو بکری کی طرح حلال سمجھ

کہ کھاتے ہے۔

امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ خنزیر کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ اس جانور میں ایسی خصلتیں پائی جاتی ہیں جو انسانی فطرت کے خلاف ہیں۔ اولاً یہ گندگی کھانے والا جانور ہے اور حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جلالہ جانور یعنی گندگی کھانے والا جانور کا کھانا مکروہ تحریمی ہے۔ حتیٰ کہ اگر حلال جانور مثلاً گائے بھینس اونٹ، بکری وغیرہ بھی گندگی کھانے لگ جائے تو اسے باندھ کر دس دن[1] تک گھاس کھلاؤ ورنہ اس کا دودھ اور گوشت مکروہ ہوگا۔ بعض اوقات گندگی کھانے کی وجہ سے جانور میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے جانور کا ذوق بھی بگڑ جاتا ہے۔ چونکہ خنزیر گندگی کھاتا ہے۔ لہٰذا اس کا اثر اس کے گوشت بلکہ ہر عضو میں سرایت کر جاتا ہے اس واسطے اس کا کھانا قطعی حرام ہے۔

خنزیر میں ایک اور قبیح خصلت بھی پائی جاتی ہے۔ جو کسی اور جانور میں نہیں ملتی یہ اس قدر بے غیرت جانور ہے کہ اس کے متعدد نر بیک وقت ایک مادہ سے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور جانور نہیں ہے۔ جو دوسرے نر کی موجودگی میں مادہ سے جفتی کرے۔ اگر کوئی دوسرا موجود ہوگا تو جب تک اُسے بھگا نہیں دے گا نفسانی خواہش پوری نہیں کرے گا۔ مگر خنزیر ہی ایک ایسا جانور ہے۔ جس کو دوسرے نر جانور کی موجودگی قطعاً ناگوار نہیں گذرتی اور یہ بے غیرتی کی انتہا ہے۔ چنانچہ اس جانور کا گوشت کھانے والی اقوام میں بھی اس خصلت کا پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔ انگریز اور سکھ خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں، دیکھ لیجئے دونوں قومیں اس قسم کی بے غیرتی کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے۔

اگرچہ خنزیر کی ہر چیز حرام ہے۔ تاہم اس مقام پر صرف گوشت کی حرمت دو وجوہ کی بنا پر بیان کی گئی ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے چونکہ یہاں پر ذکر کھانے کا ہو رہا ہے۔ کہ اے مومنو! حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ، تو کھانے کی مناسبت سے گوشت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس جانور کی باقی اشیاء یعنی ہڈیاں، چمڑا، چربی

[1] مرغی تین دن بکری چار دن اونٹ گائے دس دن (در مختار صفحہ ۵۲۸ ج ۴) (فیاض)

وغیرہ حرام تو ہیں مگر یہ کھانے کے کام نہیں آتیں بلکہ بعض دوسرے طریقوں سے انسانی استعمال میں آتی ہیں۔ گوشت کے ذکر کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا گوشت ہر حالت میں حرام ہے۔ خواہ وہ شرعی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ حلال جانور کی حرمت اس وقت ثابت ہوتی ہے۔ جب کہ وہ خود مر گیا ہو یا شرعی طریقہ سے ذبح نہ کیا گیا ہو مگر خنزیر کی حرمت ہر صورت میں قائم رہے گی خواہ اُسے شرعی طریقہ پر ہی کیوں نہ ذبح کیا گیا ہو۔ جس طرح باقاعدہ ذبح کرنے سے کتے کا گوشت جائز نہیں ہو جاتا، اسی طرح خنزیر کا گوشت بھی حلال نہیں خواہ اُسے شرعی طریقہ سے ہی کیوں نہ ذبح کیا گیا ہو۔ اس کا گوشت ہر صورت میں حرام ہی رہے گا۔ اسی لیے اُسے نجس العین کہتے ہیں۔

امام ابُو حنیفہؒ کا فتویٰ ہے کہ ہر جانور کی کھال رنگ دینے کے بعد پاک ہو جاتی ہے خواہ وہ جانور حلال مگر مردار ہو یا جانور ہی سرے سے حرام ہو، سوائے خنزیر کی کھال کے کہ یہ دباغت سے بھی پاک نہیں ہوتی۔ رہی انسان کی کھال، تو وہ احتراماً استعمال میں نہیں لائی جاتی مگر دباغت سے وہ بھی پاک ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ خنزیر ایسا جانور ہے۔ جس کی کوئی چیز بھی کسی حالت میں بھی قابل استعمال نہیں ہوتی۔ انسانی اخلاق پر اس کی غذا کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ انسان جس قسم کی غذا استعمال کرے گا، اس کے اخلاق کی تعمیر اس کے مطابق ہوگی۔ اگر کوئی شخص خنزیر یا کوئی دوسری حرام چیز استعمال کرتا ہے۔ تو اس کا اثر اس کے اخلاقیات یعنی طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت پر پڑے گا اور وہ شخص اپنے مقام کو قائم نہیں رکھ سکیگا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حلت و حرمت کا قانون نافذ کر کے انسانی اخلاقیات کی تعمیر کی ہے۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ وَ اشْکُرُوْا لِلّٰہِ اِنْ کُنْتُمْ اِیَّاہُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۷۲﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَمَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ ج فَمَنِ اضْطُرَّ غَیْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ ط اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۷۳﴾

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ، جو ہم نے تمہیں روزی دی ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرو اگر تم خاص اسی کی عبادت کرنے والے ہو ﴿۱۷۲﴾ بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر حرام کیا ہے مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبور ہو گیا اس حال میں کہ وہ نافرمانی کرنے والا نہیں ہے اور نہ زیادتی کرنے والا پس اس پر کچھ گناہ نہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا مہربان ہے ﴿۱۷۳﴾

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ درس میں حلال و حرام کی بحث آچکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں کو حلال قرار دیا ہے اور انہیں کھانے کی اجازت دی ہے۔ اور حرام چیزوں سے منع فرمایا۔ حلال اشیاء کی تفصیل قدرے بیان ہو چکی ہے۔ اسی سلسلے میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَطْیَبُ مَا اَکَلَ الرَّجُلُ مِنْ کَسْبِہٖ پاکیزہ چیز وہ ہے۔ جو انسان اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتا ہے۔ یعنی جو چیز محنت کر کے حاصل کی جائے۔ وہ پاکیزہ ہے۔ انسان کی اولاد کے متعلق فرمایا وَاِنَّہٗ مِنْ کَسْبِہٖ یعنی اولاد بھی انسان کی کمائی کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا ماں باپ کے لیے اولاد کی کمائی سے کھانا بالکل درست اور جائز ہے

حرام اشیاء میں سے مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کا ذکر ہو چکا ہے اور ان کی وضاحت بھی گذشتہ درس میں ہو چکی ہے۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے

دریافت کیا گیا، حضور! سمندری سفر کے دوران ہمارے پاس میٹھے پانی کا وافر ذخیرہ نہیں ہوتا۔ اگر ہم وضو بھی میٹھے پانی سے کریں تو پینے کے لیے پانی کی مقدار بہت کم رہ جاتی ہے ان حالات میں کیا ہم سمندر کے کڑوے پانی سے وضو کر سکتے ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا سمندر کا پانی پاک ہے اور اس کا مُردار حلال ہے۔ امام اعظمؒ نے اس مُردار سے مراد ہر قسم کی مچھلی لی ہے، خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی یا سانپ کی مانند ہو۔ امام صاحب کے نزدیک مچھلی کے علاوہ دیگر سمندری جانور حلال نہیں ہیں۔ تاہم دیگر آئمہ کرام باقی سمندری جانوروں کو بھی حلال قرار دیتے ہیں۔

خون کے متعلق بھی سابقہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ اس سے مراد دم مسفوح یعنی بہتا ہوا خون ہے، جو بوقت ذبح جانوروں کی رگوں سے نکلتا ہے۔ اس کے علاوہ دو بستہ خون یعنی جگر اور تلی حلال ہیں۔ انسانی جسم میں جگر خون تیار کرنے والی فیکٹری ہے اور تلی خون ذخیرہ کرنے کا ایک آلہ ہے۔ اس میں بیک وقت سات سو مکعب ملی میٹر خون جمع رہتا ہے جب کبھی کسی حادثہ میں انسانی جسم سے خون ضائع ہو جاتا ہے تو اس کمی کو پورا کرنے کے لیے تلی کا محفوظ خون حرکت میں آجاتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے انسانی جسم میں اس قسم کا خود کار انتظام پیدا کر دیا ہے۔ کہ خون کی کمی تلی کے اس ذخیرہ سے پوری ہو جاتی ہے۔

مسئلہ انتقال خون

موجودہ زمانے میں انتقال خون (BLOOD TRANSFUSION) یعنی جب کسی شخص کا خون بہت زیادہ مقدار میں بہ جائے تو اس کے جسم میں دوسرے شخص کا خون داخل کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ دراصل واضح مسئلہ یہ ہے کہ کسی انسان کے کسی بھی عضو کو کسی دوسری جگہ استعمال کرنا احترام انسانیت کے خلاف ہے۔ لہٰذا کسی فوت شدہ آدمی کی آنکھ یا کوئی اور عضو عطیہ میں دینا اور پھر اُسے دوسرے انسانی جسم کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ایک عورت کے بال بھی دوسری عورت اپنی زیب و زینت کے لیے استعمال نہیں کر سکتی۔ عورتیں، سوتی، اونی، ریشمی یا نائلون کے بالوں کو پراندہ وغیرہ کے طور پر استعمال کر سکتی ہیں۔ مگر کسی دوسرے انسان کے بال استعمال کرنا حرام ہے۔ قرآن پاک کا حکم ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىٓ اٰدَمَ ہم نے انسان کو باقی تمام مخلوق پر عزت بخشی ہے۔ لہٰذا

انسان کے کسی عضو کو دوائی کے طور پر بھی استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

انسان کا خون اگرچہ اعضا کی مانند تو نہیں ہے۔ مگر اعضا کی طرح محترم ضرور ہے لہٰذا اس کا استعمال بھی دوسرے اعضا کے استعمال کی طرح ناجائز ہے۔ اور عام حالات میں ایک شخص کا خون دوسرے کے جسم میں منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ ہاں ایک اضطراری حالت ایسی ہے۔ جس میں وقتی طور پر حرام چیز بھی جائز ہو جاتی ہے۔ اس کا ذکر آیت کے اگلے حصے میں آ رہا ہے۔ چونکہ انسانی اور حیوانی جسم و روح کا تعلق خون کے واسطے سے قائم رہتا ہے۔ اس لیے جب جسم میں خون کی مقدار اس قدر کم ہو جائے کہ جان بچانا مشکل نظر آئے تو ایسی مجبوری کی حالت میں انتقالِ خون کی اجازت ہو گی۔ اور وہ بھی اس مقدار تک کہ اس سے کم پر جان کو خطرہ ہو۔ بلا وجہ کئی کئی بوتل خون لگائے جانا جائز نہیں ہو گا۔ لہٰذا اس معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ انتقال خون دوائی سے بڑھ کر خوراک کی حد میں داخل نہیں ہونا چاہیئے۔

خنزیر کی حرمت کا بیان بھی گذشتہ درس میں آ چکا ہے۔ یہ جانور پچھلی ساری امتوں میں حرام رہا ہے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ عیسائیوں نے اسے بھیڑ بکری کی طرح استعمال کیا حالانکہ تورات کے سفر الاحبار میں صاف موجود ہے۔ کہ خنزیر نہ تو جگالی کرتا ہے۔ اور نہ ہی اس کا پاؤں پھٹا ہوا ہے لہٰذا یہ قطعی حرام ہے۔ سفرِ استثناء میں بھی خنزیر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

غیر اللہ کے نام پر

محرماتِ اربعہ میں سے پہلے تین کا بیان گذشتہ درس میں ہو چکا ہے۔ اب یہاں پر چوتھے حرام کا بیان آئے گا۔ اور وہ ہے وَمَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ یعنی تمہارے لیے وہ چیز بھی حرام ہے جس پر اللہ کے سوا غیر کا نام پکارا جائے۔ یعنی ایسا جانور یا کوئی دوسری چیز جسے غیر اللہ کے تقرب اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نامزد کیا جائے ایسی چیز میں مردار سے بھی زیادہ خباثت سرایت کر جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے۔ کہ لَوْ قَصَدَ

بِذَبْحِهَا التَّقَرُّبَ اِلٰی غَیْرِ اللّٰہِ جو شخص غیر اللہ کے تقرب اور خوشنودی کے لیے جانور ذبح کرے صَارَ مُرْتَدًّا وہ مرتد ہو جائے گا۔ اور اس کا مذبوح بھی مردار کی طرح حرام ہو گا۔ مثلاً کسی بت لات، عزیٰ کے نام پہ ذبح کیا ہے یا فرشتوں جنوں، انبیاء، بزرگ، پیر، فقیر کے نام پہ ذبح کیا ہے، سب حرام ہو گا۔ اس میں مجوسی بھی شامل ہیں کیونکہ وہ بھی آگ کے نام پہ تقرب حاصل کرتے ہیں۔

ذبح کے بارے میں مسلم شریف کی روایت موجود ہے۔ لَعَنَ اللّٰہُ مَنْ ذَبَحَ لِغَیْرِ اللّٰہِ جو اللہ کے سوا کسی غیر کے نام پہ ذبح کرتا ہے۔ اس پہ اللہ کی لعنت ہے۔ فقہائے کرام نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص حاکم کی آمد پہ اس کی تعظیم کے طور پہ جانور ذبح کرے گا، تو وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ میں داخل ہو کر حرام ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں اگر بوقت ذبح بسم اللہ اللہ اکبر بھی کہہ دیا، تو وہ حلال نہیں ہو گا، بلکہ مردار ہی رہے گا، وجہ یہی ہے۔ کہ اس نے ایک جاندار کی جان حاکم کے تقرب اور اس کی خوشنودی کے لیے لی ہے۔ حالانکہ جان کا لینا صرف اللہ ہی کے نام پہ ہو سکتا ہے۔ اور اگر جانور ذبح کرنے سے مقصود مہمان کی ضیافت کرنا ہو، تو پھر یہ جائز ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ تقرب اور ضیافت میں تفریق کرنا آسان ہے۔ کسی شخص سے کہا جائے کہ بھائی یہ جانور مت ذبح کرو بلکہ اس کی بجائے اتنی ہی مقدار میں گوشت لے کر پکا لو اور مہمان کی مہمان نوازی کر لو۔ اور اگر وہ شخص مان جائے تو یہ ضیافت ہو گی۔ اور اگر وہ کہے کہ میں تو جانور ہی ذبح کروں گا، تو اس کی نیت ضیافت کی نہ ہو گی بلکہ تقرب کی ہو گی اور یہی چیز حرام ہے

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ذبح کرتے وقت جو بسم اللہ اللہ اکبر کہا جاتا ہے اس میں اللہ اکبر کی بالکل وہی حیثیت ہے، جو نماز شروع کرتے وقت اللہ اکبر کی ہے اگر نماز میں ریاکاری کا مادہ ہو گا، تو وہ نماز حرام ہو گی۔ اسی طرح بوقت ذبح اگر نیت تقرب غیر اللہ کی ہو گی، تو وہ ذبیحہ بھی مردار کی طرح حرام ہو گا۔ ہاں اگر نفلی نماز تقرب الی اللہ کے لیے ادا کرے اور اس کا ثواب کسی دوسرے کو ایصال

کرے تو جائز ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ذبح تقرب الی اللہ کے لیے کرے، اور اس کا ثواب کسی دوسرے کو پہنچا دے، تو اس کی ممانعت نہیں۔

مَآ اُھِلَّ بِہٖ لِغَیۡرِ اللّٰہِ کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور مولانا نانوتویؒ نے اس کو وضاحت سے بیان فرمایا ہے اس سلسلہ میں مولانا نانوتویؒ کا ایک مکتوب بھی موجود ہے۔ فرماتے ہیں کہ ذبیح کے حلال ہونے کی علت وہ نیت ہے، جو خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہو، اور اس کے حرام ہونے کی علت وہ نیت ہے، جو غیر اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ زمانہ جاہلیت کے مشرک نیت سے بھی غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے تھے اور ذبح کرتے وقت نام بھی غیر اللہ کا لیتے تھے۔ مومنوں کا شیوہ یہ ہے۔ کہ وہ نیت سے بھی تقرب الٰہی چاہتے ہیں اور بوقت ذبح بھی اللہ اکبر کہتے ہیں۔ البتہ اس دور میں مبتدعین کا ایک تیسرا گروہ پیدا ہوا ہے۔ جو ذبح کرتے وقت تو اللہ ہی کا نام لیتے ہیں مگر نیت غیر اللہ کی خوشنودی کی ہوتی ہے۔ یہ شرک اور نفاق ہے۔ داتا صاحبؒ کی نیاز کے طور پر ذبح کیے گئے جانور پر اگر اللہ اکبر بھی کہ دیا جائے گا، تو وہ حلال نہیں ہو گا کیونکہ یہاں پر نیت میں فتور ہے یہ تو بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص خنزیر کو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے، یا یہی عمل کتے پر دہرائے، تو وہ حرام ہی رہیگا۔ ہاں کوئی شخص غیر اللہ کی نیاز سے توبہ کر لے، اور پھر اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے، تو جانور حلال ہو گا۔ کیونکہ عمل کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے

اُھِلَّ کا مفہوم

بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ اُھِلَّ لغیر اللہ کا مطلب یہ ہے۔ کہ بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا جائے، تو وہ چیز حرام ہو جاتی ہے اور اگر بوقت ذبح اللہ کا نام لیا جائے تو ذبیح حلال ہے۔ یہ غلطی ہے۔ اہلال کا معنی آواز کو بلند کرنا یا شہرت دینا ہے اسی لیے چاند نظر آجانے کو اہلال کہتے ہیں۔

اب اگر کسی جانور یا چیز کے متعلق شہرت دے دی جائے۔ کہ یہ چیز پیران پیر یا فرشتوں یا پیغمبر کی نیاز ہے۔ تو یہ اُھِلَّ لغیر اللہ میں [illegible] ل ہو کر شرک کا ارتکاب ہوا اور چیز حرام ہو گئی۔

تابعین کے زمانہ میں ایک مسئلہ پیدا ہوا تھا، جسے امام قرطبیؒ نے نقل کیا ہے مسئلہ یہ تھا کہ بچوں نے کھیل کھیل میں گڑیا اور گڈے کی شادی رچائی اور اس خوشی میں اونٹ ذبح کیا، تو اس اونٹ کا کیا حکم ہے، وہ جائز ہو گا یا ناجائز۔ امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہ ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ اونٹ گڑیا گڈے کے مجسمے کے نام پر ذبح کیا گیا ہے جو بُت کی مثال ہے۔ ہاں اگر یہی ذبح کسی مرد و عورت کے اصل نکاح کے لیے ہوتا تو درست تھا۔

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دور میں طعام متباریین کا مسئلہ پیدا ہوا۔ دو سرداروں میں اس بات پر مقابلہ ہو گیا۔ کہ ان میں سے کون مہمان نواز ہے۔ ایک سردار نے مہمانوں کے لیے دس اونٹ ذبح کیے تو دوسرے نے بیس کر دیے۔ پہلے نے سو اونٹ ذبح کیے تو دوسرے نے چار سو ذبح کر دیے۔ اسی طرح ایک سردار نے مہمان نوازی کے لیے دس من آٹا گوندھا تو دوسرے نے بیس من گوندھ دیا۔ پھر پہلے نے حوض بھر آٹا گوندھا تو دوسرے نے اتنی زیادہ مقدار میں آٹا گوندھا کہ جب اس میں گھوڑا دوڑایا گیا تو وہ پھنس گیا۔ حضرت علیؓ کی خدمت میں مسئلہ پیش ہوا کہ آیا اس قسم کا کھانا جائز ہے یا نہیں، تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سب کچھ ریاکاری کی بنا پر ہوا ہے۔ لہٰذا ایسا کھانا حرام ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا تقرب مطلوب نہیں بلکہ غیر اللہ کی خوشنودی مقصود ہے۔

بعض لوگ مکان بناتے وقت اس کی بنیادوں میں جانور کا خون ڈالتے ہیں۔ اس ذبیح سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جنات کے شر سے محفوظ رہیں۔ یہ بھی شرک ہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی نیاز کے طور پر جانور ذبح کر کے فقراء کو کھلایا جائے تو درست ہے۔

حالتِ اضطرار

چار محرمات کو بیان فرمایا کہ یہ سب انسان کے لیے حرام ہیں البتہ — ایک صورت ایسی بھی ہے۔ کہ یہ حرام مباح ہو جاتے ہیں فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ط جو کوئی اضطراری حالت میں ہو، مثلاً بھوک سے مر رہا ہے اور صرف محرمات میں سے کوئی چیز میسر ہے۔ تو ایسی صورت میں جان

بچانے کی خاطر ان اشیاء کا کھانا درست ہوگا۔ فرمایا یہ اس حد تک ہی جائز ہے کہ نہ تو بغاوت پر اتر آیا ہے اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے والا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ باغ سے مراد یہ ہے۔ کہ اضطراری حالت میں مباح چیز سے نہ لذت طلب کرے اور نہ اس کو حلال سمجھے۔ اور تعدی سے مراد یہ ہے کہ ایسی کوئی چیز کم از کم مقدار میں استعمال کرے جس سے اس کی بھوک دور ہو سکتی ہو۔ اور ضرورت سے زیادہ کھائے گا، تو عاد میں داخل ہو جائے گا۔ بعض دوسرے آئمہ فرماتے ہیں کہ باغ سے مراد بغاوت کرنے والا ہے اور عاد سے مراد معصیت کرنے والا ہے مثلاً ایک شخص چوری کی نیت سے جا رہا ہے اور اس پر اضطراری حالت وارد ہو گئی تو ایسے شخص کے لیے مباح نہیں ہوگا۔ وہ گناہ میں مبتلا ہے۔ اور ایسی حالت میں اگر اس کی موت بھی واقع ہو جائے تو کوئی پرواہ نہیں۔ بہر حال فقہائے کرام نے فرمایا ہے۔ کہ اضطرار تین حالتوں میں ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی حالت وارد ہو جائے، تو حرام کا کھانا مباح ہو جائیگا، اور جان بچانے کی حد تک جائز ہوگا۔ شدید بھوک لگ رہی ہو یا سخت بیماری ہو اور حرام کردہ چیز استعمال کرنے کے علاوہ کوئی اور صورت باقی نہ ہو۔ تیسری حالت اضطرار یہ ہے۔ کہ کوئی غالب مغلوب کو ایسی چیز کھانے پر مجبور کر دے، اور عدم تعمیل کی صورت میں جان کا خطرہ ہو، تو ایسی حالت میں بھی حرام چیز مباح ہو گی۔ فرمایا مجبوری کی حالت میں حرام کو استعمال کرتے پر کوئی مؤاخذہ نہیں اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے وہ کسی مخلوق پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

اس آیت میں صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یعنی مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر نامزد کی ہوئی چیز، حالانکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے جانور مثلاً کتا، بلی، ریچھ، بندر، لنگور، گدھا، کوا، چھپکلی، کیڑے مکوڑے وغیرہ حرام ہیں۔ شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں۔ کہ صرف چار چیزوں کی حرمت بیان کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان چار کے علاوہ باقی تمام چیزیں حلال ہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ یہاں

صرف اُن چیزوں کا نام لیا گیا ہے، جو عام طور پہ استعمال میں آتی ہیں۔ اور مقصود یہ ہے کہ ان چیزوں کو کبھی حلال نہ جاننا، یہ قطعی حرام ہیں۔ البتہ اس کے علاوہ بہت سی دوسری چیزیں بھی حرام ہیں جن کا ذکر قرآن پاک کے دوسرے مقامات پہ آتا ہے۔ حدیث پاک میں بھی بعض اشیاء کی حرمت بیان ہوئی ہے۔ لہٰذا ان چار کے علاوہ باقی سب چیزوں کو حلال سمجھنا درست نہیں۔

صرف چار چیزوں کی حرمت بیان کرنے کی ایک دوسری وجہ یہ ہے، کہ مشرک لوگ چار حلال چیزوں کو حرام سمجھتے تھے۔ اِن کا ذکر سورۂ مائدہ میں موجود ہے۔ کہ وہ لوگ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کو حرام سمجھتے تھے، مگر اللہ نے فرمایا، کہ ہم نے تو اِن چیزوں کو حرام نہیں کیا، تم نے ان کی حرمت کس شریعت سے نکالی ہے۔ اِن چار حلال چیزوں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ چار چیزیں قطعی حرام ہیں۔

درس شصت و ہشت (۶۸) — آیت ۱۷۴ تا ۱۷۶

اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْتُمُوْنَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ یَشْتَرُوْنَ
بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۙ اُولٰٓىٕكَ مَا یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا
النَّارَ وَ لَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ لَا یُزَكِّیْهِمْ ۖۚ وَ لَهُمْ
عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۴﴾ اُولٰٓىٕكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ
بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَاۤ اَصْبَرَهُمْ عَلَى
النَّارِ ﴿۱۷۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِیْنَ
اخْتَلَفُوْا فِی الْكِتٰبِ لَفِیْ شِقَاقٍۭ بَعِیْدٍ ۠ ﴿۱۷۶﴾

رکوع ۲۱ / ۵

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو اس چیز کو چھپاتے ہیں، جس کو اللہ نے کتاب میں نازل کیا ہے، اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت خریدتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نہیں کھاتے (بھرتے) اپنے پیٹوں میں مگر آگ۔ اور اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا۔ اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا ﴿۱۷۴﴾ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اور مغفرت کے بدلے عذاب کو خریدا ہے۔ یہ لوگ دوزخ کی آگ پر کس قدر صبر کرنے والے ہیں ﴿۱۷۵﴾ یہ اس وجہ سے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے کتاب میں اختلاف کیا، البتہ وہ ضد میں دور جا پڑے ہیں۔ ﴿۱۷۶﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے طیبات اور محرمات کا قانون بیان کیا ہے مشرکین کا رد کیا ہے۔ اور توحید کے دلائل بیان فرمائے ہیں۔ مزید براں اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرر کردہ قانون کی پابندی کا حکم دیا ہے اس سے پہلے

ملّتِ ابراہیمی کے اہم اصول ذکر، شکر، صبر
نماز، توحید پر یقین اور شعائر اللہ کی تعظیم کا بیان ہی آچکا ہے، ذرائع معاش کا بھی تذکرہ ہوا
کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح زمین و آسمان کے درمیان مختلف ذرائع معاش پیدا فرمائے ہیں
اور انہیں اللہ تعالیٰ نے توحید پر بطور دلیل پیش کیا ہے۔ اور گذشتہ دو درسوں میں
حلال و حرام پر بھی کافی گفتگو ہو چکی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا الخ یعنی ہماری نازل کردہ واضح باتوں کو چھپانے والے لعنت کے مستحق ہیں

کتمانِ حق پہ حقیر مفاد

آیات زیرِ درس میں کتمانِ حق کا دوبارہ بیان آرہا ہے۔ اور پھر اس سے حاصل ہونے والے حقیر مفاد کا تذکرہ ہے۔ ارشادِ ربانی ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ بے شک وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب میں نازل کردہ احکام کو چھپاتے ہیں وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا اور اس کے بدلے دنیا کا حقیر مال قبول کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ ایسے لوگ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھرتے۔

یہود و نصاریٰ کی طرف سے کتمانِ حق کے متعلق پہلے پارہ میں بھی بیان ہو چکا ہے وہ دنیا کے حقیر مفاد کی خاطر خدا تعالیٰ کے احکام کو چھپاتے رہے ہے کتمانِ حق ایک ایسا سنگین جرم ہے، جسکو اللہ تعالیٰ بتکرار بیان فرما رہے ہیں۔ اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی ہوتا ہے۔ کہ یہ بیماری اہلِ کتاب تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ یہی بیماری مسلمانوں میں بھی سرایت کر چکی ہے۔ معمولی دنیوی نفع کی خاطر عاقبت کو برباد کر لینے میں اب مسلمان بھی شریک ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس میں عقائد حقہ کو وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ دوسرے مقام پر آتا ہے۔ "نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ" یعنی ہم نے ایسی کتاب نازل فرمائی ہے۔ جو ہر چیز کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ اہم باتیں ہیں۔ جن کی اکثر ضرورت رہتی ہے۔ اور پھر ان باتوں کی تفصیل اور تشریح اللہ تعالیٰ نے نبی علیہ السلام

کے سپرد فرمائی۔ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ میں یہ حکم موجود ہے۔

شاہ رفیع الدینؒ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ پہلے پارے میں کتمانِ حق کا جو بیان ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اہلِ کتاب حضور نبی علیہ السلام کی بعثت کے متعلق جو پیشن گوئیاں موجود تھیں انہیں چھپاتے تھے۔ اور اس مقام پر کتمانِ حق کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام بابت حلال و حرام وغیرہ کو چھپاتے تھے۔ کتمانِ حق بلاشبہ کفر ہے۔ اسی لیے مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان مرد و زن کے لیے تعلیم جبری ہونی چاہیئے، تاکہ وہ حقوق و فرائض اور حلال و حرام کو پہچان سکیں۔ اسی لیے فقہائے کرام نے فرمایا ہے۔ کہ ضروریاتِ دین کا سیکھنا فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر مسلمان اس فرض کو پورا نہیں کریں گے، تو جہالت کی بنا پر کتمان کے مرتکب سمجھے جائیں گے۔

علمِ قرآن کی اشاعت

حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کا علم ہونے کے باوجود دوسرے لوگوں تک نہ پہنچانا ایسا ہے۔ جیسے کسی جنگل بیابان میں پانی کا چشمہ یا کنواں ہو، اور کوئی شخص اس پر زبردستی قابض ہو جائے۔ لوگ پیاس بجھانے کے لیے چشمے پر جاتے ہیں مگر وہ قابض شخص انہیں پانی نہیں پینے دیتا۔ جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہو جاتے ہیں، تو ایسی صورت میں کتنا بڑا مجرم سمجھا جائے گا۔ اسی طرح قرآنِ پاک کا عالم اگر دوسرے لوگوں کی آبیاری نہیں کرتا، تو وہ غاصب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس کچھ لوگوں نے شکایت کی کہ ہم فلاں بستی میں گئے، وہاں پر پانی موجود تھا، مگر ان لوگوں نے ہمیں پینے کے لیے پانی نہ دیا، جس کی وجہ سے ہمیں بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔ تو حضور علیہ السلام کے صحابی نے فرمایا ھلّا وضعتم فیھم السیف تم نے میانوں سے تلواریں کیوں نہ نکال لیں۔ یہ تو بڑا جرم ہے۔ کہ لوگ پانی کے بغیر مر رہے ہیں اور کوئی شخص پانی سے روکتا ہے۔

الغرضیکہ! قرآن پاک کا علم دوسروں تک نہ پہنچانا بہت بڑا جرم ہے۔

آج دنیا قرآنی تعلیم کے بغیر ہلاک ہو رہی ہے۔ مگر ہمارے علماء اسے عام کرنے کی بجائے اسے چھپا رہے ہیں اور اس کے بدلے میں بدعات جاری کر رہے ہیں۔ سائل سے پیسے لے کر غلط ملط فتوے جاری کر رہے ہیں، کہیں نذرانہ اور شکرانہ وصول کیا جا رہا ہے کہیں رسومات باطلہ کو رواج دیا جا رہا ہے۔ مُردوں کو بخشوانے کی فیس وصول کی جاتی ہے۔ تبرکات کے نام پر لوٹا جا رہا ہے۔ کہیں بہشتی دروازہ بنا دیا ہے کہ یہاں سے گزرنے والا سیدھا جنت میں جائیگا۔ کہیں قبور پرستی ہو رہی ہے۔ چڑھاوے چڑھائے جاتے اور وصول کیے جاتے ہیں۔ کہیں گیارہویں منائی جا رہی ہے، کہیں عرس ہو رہا ہے اور کہیں میلاد منایا جا رہا ہے۔ کہیں تیسرے اور دسویں کا ختم اور کہیں چالیسویں کا ختم ہے۔ لوٹنے کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو جاری ہے دین کے ابتدائی اصول کہاں کھو گئے۔ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا درس کون دیگا، مقام رسالت کو کون بیان کریگا، حلال و حرام کی تمیز کون بتائے گا، علماء نے ان بنیادی چیزوں کو چھپا لیا ہے اور خرافات کی تعلیم ہو رہی ہے۔ یہ کتمان حق نہیں تو اور کیا ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیزوں کو چھپاتے ہیں۔ اور اس سے حقیر مفاد حاصل کرتے ہیں اُن کی حالت یہ ہے کہ مَا يَاْكُلُوْنَ فِىْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھرتے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ جو شخص سونے چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے۔ وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ ڈال رہا ہے۔ مسلم شریف کے الفاظ ہیں۔ انما یجرجر فی بطنہ نار جھنم۔ اسی طرح یتیموں کا مال ناحق کھانے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ بھی اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ ڈال رہے ہیں۔ لہذا باطل رسوم کے ذریعہ لوگوں کا مال کھانا، شرک اور بدعات کا اجراء یہ سب پیٹ میں آگ بھرنے والی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ناراضگی

فرمایا ایسے لوگوں پر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہونگے

ان کی طرف مہربانی کے ساتھ توجہ کرنا تو درکنار وَلَا یُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کلام کرنا بھی پسند نہیں کریں گے، بلکہ اُن کی طرف غیظ وغضب کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ اللّٰہ اُن کا تزکیہ بھی نہیں کریں گے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں۔ کہ ان الموحدین لا یخلدون فیھا خدا کی وحدانیت پر ایمان رکھنے والے دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ گنہگار ہونے کی صورت میں دوزخ میں جائیں گے۔ مگر تزکیہ کے لیے۔ جب اپنے گناہوں کی سزا بھگت لیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ اُن کو پاک کر دیں گے اور وہ دوزخ سے نکال لیے جائیں گے۔ مگر یہاں یہ کتمانِ حق کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انہیں کبھی پاک نہیں کریگا، بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہیں گے وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ اور وہاں ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔

خسارے کا سودا

فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور مغفرت کے بدلے عذاب خرید لیا ہے۔ اگر یہ لوگ حق کو چھپانے کی بجائے اُسے ظاہر کرتے۔ خود بھی حق پہ عمل کرتے اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی عمل پیرا ہوتے۔ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے شامل حال ہوتی، ان کو گناہوں کی معافی ملتی اور یہ قیامت کے دن سرخرو ہوتے۔ مگر یہ لوگ تو خود دوزخ کو اختیار کر رہے ہیں۔ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ یہ دوزخ کی آگ پر کس قدر صبر کرنے والے ہیں۔ ان کا بڑا حوصلہ ہے جو دوزخ میں داخل ہوں گے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ یہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی ہے۔ مگر ان لوگوں نے اُسے چھپا لیا ہے۔ حق کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ۔ اور جنہوں نے کتاب میں اختلاف کیا۔ یعنی اپنی مرضی کا مطلب بیان کیا، جیسا کہ یہودیوں کا شیوہ ہے۔ کہ وہ مطلب بھی غلط بیان کرتے ہیں اور تشریح بھی غلط کرتے

ہیں۔ تو ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا لَفِی شِقَاقٍ بَعِیْدٍ وہ ضد میں دور جا پڑے ہیں ایسے لوگوں کے راہ راست پہ آنے کی کوئی توقع باقی نہیں رہی، وہ سزا کے مستحق ہیں۔ یہ حکم تاکیداً دوبارہ فرمایا۔ اس کے قوانین آگے بھی آئیں گے۔

درس شصت ونہ (۶۹) آیت ۱۷۷

لَیۡسَ الۡبِرَّ اَنۡ تُوَلُّوۡا وُجُوۡہَکُمۡ قِبَلَ الۡمَشۡرِقِ وَ الۡمَغۡرِبِ وَلٰکِنَّ الۡبِرَّ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ الۡکِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ ۚ وَ اٰتَی الۡمَالَ عَلٰی حُبِّہٖ ذَوِی الۡقُرۡبٰی وَ الۡیَتٰمٰی وَ الۡمَسٰکِیۡنَ وَ ابۡنَ السَّبِیۡلِ ۙ وَ السَّآئِلِیۡنَ وَ فِی الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ ۚ وَ الۡمُوۡفُوۡنَ بِعَہۡدِہِمۡ اِذَا عٰہَدُوۡا ۚ وَ الصّٰبِرِیۡنَ فِی الۡبَاۡسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیۡنَ الۡبَاۡسِ ؕ اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا ؕ وَ اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُتَّقُوۡنَ ﴿۱۷۷﴾

ترجمہ: نیکی یہ نہیں ہے۔ کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو۔ بلکہ نیکی تو اس شخص کی ہے۔ جو ایمان لایا اللہ پر، اور قیامت کے دن پر اللہ کے فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور اللہ تعالیٰ کے سب نبیوں پر۔ اور دیا اُس نے مال اُس کی محبت پر قرابت داروں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، اور مسافروں کو اور محتاجوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور اس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کرتا رہا۔ اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں جب کہ عہد کرتے ہیں۔ اور سختی اور تکلیف میں صبر کرنے والے ہیں اور لڑائی کے وقت بھی۔ یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں ﴿۱۷۷﴾

گذشتہ سے پیوستہ

بنی اسرائیل کی خرابیاں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کیا تھا۔ اور ساتھ خانۂ کعبہ کی تعمیر کا بیان تھا۔ اور اس کو قبلہ مقرر کیے جانے کی وجہ بیان فرمائی تھی۔ اس پر اہل کتاب کے اعتراض کا بھی ذکر ہوا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ملّتِ ابراہیمی کے اہم ترین اصول بیان فرمائے جن پر ہر شخص کا کاربند ہونا ضروری ہے۔ ان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر، شکر، صبر اور تعظیم شعائر اللہ

شامل ہیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے توحید کا ذکر فرمایا، اور مشرکین کا رد فرمایا، حلال و حرام کا قانون بیان فرمایا۔ پہلے پوری نسل انسانی کو تلقین فرمائی، اس کے بعد اہل ایمان کو خصوصی طور پر حلال و حرام کے قوانین اور محرمات کی تفصیل بیان فرمائی۔ اور پھر اللہ جل جلالہ نے اس بات کا بھی تذکرہ کیا، کہ اہل کتاب نے تحویل قبلہ کی سخت مخالفت کی تھی۔ کہ اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس سے بیت اللہ شریف کی طرف رُخ کرنے کا کیوں حکم دیا۔ یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے ذریعے بتلا دیں۔

استقبال قبلہ فروعی مسئلہ ہے

اہل کتاب نے تحویل قبلہ کے خلاف سخت پراپیگنڈا کیا۔ وہ کہتے تھے کہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرنا ہی اصل نیکی ہے۔ اور اگر اس طرف رُخ نہ کیا جائے تو کوئی نیکی اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوگی۔ اُن کے مطابق جب مسلمانوں نے قبلہ تبدیل کر لیا تو اُن کی ساری نیکیاں ضائع ہوگئیں۔ اہل کتاب نے قبلہ کو اس قدر اہمیت دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر اہل کتاب کے اس زعم کی تردید فرمائی ہے۔ اور واضح کیا ہے کہ استقبال قبلہ کوئی بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو ایک فروعی مسئلہ ہے۔ جسے اہل کتاب ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہے ہیں۔ جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا تھا، اُدھر کرتے رہے۔ اور جب اُس نے پسند فرمایا تو رُخ بیت اللہ شریف کی طرف ہوگیا۔ اس میں ایسی اچنبے کی کون سی بات ہے

نیکی کیا ہے

اس آیت پاک میں اسی چیز کو واضح کیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ نیکی صرف یہ نہیں کہ مشرق یا مغرب کی طرف رُخ کر لیا جائے۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بلکہ اصل نیکی اسی کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، قیامت پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور نبیوں پر، اور آگے نیکی کی دوسری باتیں بھی بیان کی ہیں۔ مفسر قرآن امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت قرآن پاک کی جامع ترین آیت ہے۔ کیونکہ اس ایک آیت میں کئی ایک مسائل آگئے ہیں۔ دینی مسائل کا زیادہ تر تعلق اصلاحِ عقیدہ، اخلاق یا تہذیب نفس سے ہے اور یہ سارے مسائل اس آیت میں موجود ہیں۔ گویا یہ آیت تمام دینی مسائل کا خلاصہ ہے۔

ان میں سب سے اہم مسئلہ ایمانیات کا ہے۔ جب تک عقیدہ درست نہیں ہوگا، کوئی عمل مقبول نہیں۔ یہود و نصاریٰ اور عرب کے مشرکین صحیح اعتقاد سے محروم ہیں اُن کا عقیدہ مشرکانہ ہونے کی بنا پہ باطل ہے۔ لہٰذا یہ سب نیکی سے یکسر محروم ہیں، مگر قبلہ کے مسئلہ پہ جھگڑا کرتے ہیں۔

ایمان باللہ

تو فرمایا نیکی یہ ہے۔ کہ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اُس کی ذات اور اُسکی صفات پہ ایمان لانا نیکی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات پہ ایمان ضروری ہے اسی طرح اُسکی صفات کو ماننا بھی لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار بھی اُسی طرح کفر ہے جسطرح اُس کی ذات کا انکار دہریت ہے۔ مثلاً مقدر کرنا اللہ تعالےٰ کی صفت ہے۔ لہٰذا تقدیر پہ ایمان لانا ضروری ہُوا۔ اس کے بغیر انسان مومن نہیں ہو سکتا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر اللہ تعالےٰ کی راہ میں سونا خرچ کرتا ہے۔ مگر تقدیر پر ایمان نہیں لاتا تو اس کی اتنی بڑی خیرات بھی مقبول نہیں۔

ایمان بالآخرۃ

ایمان باللہ کے بعد فرمایا، نیکی اس شخص کی ہے جو ایمان لایا وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ آخرت کے دِن پر۔ قیامت کے دِن پہ ایمان لانا جزوِ ایمان ہے۔ اس کے بغیر انسان دہریہ یا کافر ہوگا۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں۔ کہ ایمان بالآخرت میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں، جن کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ یا جنہیں حضور نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بیان فرمایا ہے۔ موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنا، حساب کتاب کا منعقد ہونا، نیکی بدی کا امتیاز، پلصراط سے گزرنا، دوزخ، جنت وغیرہ یہ سب چیزیں ایمان بالآخرت میں داخل ہیں۔ لہٰذا نیکی اُس شخص کی ہے جو ان سب چیزوں پہ ایمان لایا۔

ایمان بالملائکہ

ایمان بالملائکہ یعنی فرشتوں پہ ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ وَالْمَلٰٓئِکَۃِ یہ اللہ تعالیٰ کی نورانی مخلوق ہے جسے اللہ جل شانہٗ نے زمین و آسمان اور اس کائنات کی تخلیق سے لاکھوں سال پہلے پیدا فرمایا۔ اور یہ بھی نوعِ انسانی کی مصلحت کی خاطر اہتمام فرمایا۔ فرشتوں کی آگے دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم ملاء اعلیٰ والے فرشتوں کی ہے، جو حظیرۃ القدس میں ہیں۔ اور دوسرے ملاء سافل والے ہیں، جو ملاء اعلیٰ والوں کے معاون ہیں یہ تمام فرشتے اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے پر مستعد رہتے ہیں اور کائنات تک فیضان پہنچانے کا ذریعہ ہوتے ہیں چنانچہ ایمان بالملائکہ بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

ایمان بالکتاب

ایمان کے چوتھے جزو کے طور پر فرمایا وَالْكِتٰبِ یعنی کتاب پر ایمان لانا بھی مکمل ایمان کا ایک حصہ ہے۔ یہاں کتاب سے مراد جنس کتاب ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی کتابیں نازل فرمائی ہیں، سب پر ایمان لانا ضروری ہے "اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ" یعنی اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے جو کتاب بھی اتاری ہے۔ اس پر میرا ایمان ہے۔ کہ وہ برحق ہے۔ اور پھر کتب سماویہ کے سلسلہ کی آخری کتاب قرآن حکیم پر تفصیلی ایمان لانا ضروری ہے۔ پہلی کتابوں پر صرف ایمان لانا ضروری ہے، ان پر عمل کرنا ضروری نہیں کیونکہ ان میں سے بعض احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ البتہ آخری کتاب قرآن پاک پر ایمان بھی ضروری ہے اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے احکام قیامت تک کے لیے نافذ العمل ہیں۔ وَالنَّبِيّٖنَ اور اللہ تعالیٰ کے سب نبیوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

ایمان بالانبیاء

دیگر اجزائے ایمان کی طرح انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا بھی ضروری ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی رسول اور نبی مبعوث ہوئے ہیں، سب پر ایمان لانا ضروری ہے اس لحاظ سے "لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ" ہم کسی رسول میں فرق نہیں کرتے۔

الغرض ایمان کی تمام جزیات کا زبان سے اقرار کرنا اور دل سے تصدیق کرنا لازم ہے۔ ان میں سے کسی چیز کا انکار یا کسی چیز میں شک کرنا گمراہی کے مترادف ہے، اس کے بعد نیکی کے باقی اجزاء کا بیان ہے، جن کا تعلق تہذیب نفس سے ہے یا مال کے ساتھ ہے یا انسان کے بدن سے ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ

فرمایا مال کے لحاظ سے نیکی یہ ہے کہ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ کوئی شخص

مال کے ساتھ محبت ہوتے کے باوجود اُسے خرچ کرے۔ انسان کی مال کے ساتھ محبت ایک فطری امر ہے۔ دوسرے مقام پر خود قرآن پاک نے بیان کیا اِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ انسان مال کی محبت میں سخت ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اگر مال صرف کرتا ہے۔ تو یہ نیکی کا کام ہے۔ اس سے انسانی ہمدردی اور اجتماعیت کا سبق ملتا ہے عَلٰى حُبِّهٖ کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے۔ کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی بناء پر اس کی رضا کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔ تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مال کو کس جگہ خرچ کرنا ہے۔ تو فرمایا ذَوِي الْقُرْبٰى اپنے قرابت داروں پر خرچ کرتا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کی یہ اولین مد ہے۔ اپنے عزیزوں پر خرچ کرنے پر دوہرا اجر ملتا ہے۔ ایک اجر صلہ رحمی کا حاصل ہوتا ہے اور دوسرا صدقہ کا۔ قرابت دار اگرچہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ مستحق ہے۔ تو اس پر خرچ کرنا باعث اجر و ثواب ہے۔

خرچ کی دوسری مد کے متعلق فرمایا وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ یتیموں اور مسکینوں کی حاجت برآری بھی نیکی ہے۔ نابالغی کی حالت میں ہو اور باپ فوت ہو گیا ہے۔ کمانے والا کوئی نہیں رہا۔ یتیم ہو گیا ہے اس کی سرپرستی ضروری ہے۔ اس پر مال خرچ کرنا چاہیئے اور مسکین وہ ہے۔ جو محنت مزدوری کرتا ہے۔ مگر کوشش کے باوجود اس کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہوتیں، وہ بھی مستحق ہے ایسے شخص کی مالی اعانت یقیناً نیکی کا کام ہے۔ فرمایا وَابْنَ السَّبِيْلِ اور وہ مسافر بھی امداد کے مستحق ہیں۔ جو دوران سفر محتاج ہو جائیں، زادِ راہ ختم ہو گیا ہے۔ یا چوری ہو گئی ہے یا کسی تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہے۔ تو ایسے شخص پر خرچ کرنا بھی نیکی ہے۔ خرچ کرنے والا ثواب کا مستحق ہو گا۔ فرمایا وَالسَّآئِلِيْنَ محتاج بھی اعانت کے مستحق ہیں۔ ان پر مال خرچ کرنا بھی نیکی کا کام ہے۔ سائل کے لفظی معنیٰ مانگنے والے کے ہیں۔ مگر مراد محتاج ہیں۔ کیونکہ سوال برائے سوال درست نہیں ہے۔ جب تک کہ سائل

واقعی مستحق نہ ہو۔ بلاضرورت سوال کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اور پیشہ ورانہ گداگری کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ شرعی سائل وہ ہے۔ جو ہر لحاظ سے محتاج ہو۔ اور اس کیلیے سوال کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار باقی نہ رہے۔ ایسے شخص کو سوال کرنا جائز ہوگا، اور اُس سوال کو پورا کرنا نیکی کا کام ہوگا۔

انفاق کی ایک اور مد وَفِی الرِّقَابِ یعنی گردنوں کا آزاد کرنا ہے اس کا عمومی مفہوم غلاموں کی آزادی ہے۔ غلام خرید کر آزاد کر دیا جائے یا کسی مکاتب کا زر مکاتبت ادا کر کے اُسے آزادی دلائی جائے۔ اس کی ایک اور صورت یہ بھی ہے۔ کہ کسی مقروض کا قرض معاف کر کے یا اُس کا قرض ادا کر کے اس کی گردن چھڑائی جائے۔ اس آیت پاک کے مطابق ایسا کرنا بھی نیکی ہے اور باعث اجر و ثواب ہے۔ فرمایا نیکی

صرف مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لینا ہی نہیں، بلکہ اصل نیکی ایمان اور انفاق فی سبیل اللہ ہے

نماز و زکوٰۃ

پھر فرمایا کہ نیکی اس شخص کی ہے جس نے وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَی الزَّکٰوۃَ نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی۔ نماز کے ذریعے انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہوتا ہے۔ اور اسکی توجہ حظیرۃ القدس کی طرف ہو جاتی ہے۔ گویا فوز و فلاح کا اہم ترین ذریعہ نماز ہے، جو کہ بدنی عبادت ہے۔ اور بہت بڑی نیکی کی بات ہے۔

زکوٰۃ مالی عبادت ہے، اور یہ فرائض میں شامل ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ یعنی مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔ صرف زکوٰۃ کے ادا کر دینے سے مال کا مکمل حق ادا نہیں ہو جاتا، یہ تو فرض ہے اور صاحب نصاب ہر سال ادا کرتا ہے جب کوئی شخص نصاب کو نہیں پہنچ پاتا تو زکوٰۃ فرض نہیں رہتی۔ البتہ مال کے دیگر حقوق باقی رہتے ہیں جیسے فرمایا۔ وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ یعنی اس میں سائل اور محتاج کا بھی حق ہے۔ اس میں اہل و عیال اور قرابت داروں کا حق ہے۔

والدین کا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کو اکٹھا بیان فرمایا ہے۔ ایک بدنی عبادت ہے اور دوسری مالی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بتیس ۳۲ مرتبہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکوٰۃَ کا اکٹھا ذکر فرمایا ہے۔ یہ اتنے اہم فرائض ہیں، جن کے ذریعے ایک طرف اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف مخلوقِ خدا کے ساتھ روابط بڑھتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں امور کو نیکی میں شامل فرمایا۔ کہ نیکی اُس شخص کی ہے جو نماز پڑھتا ہے اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔

ایفائے عہد

نیکی کی ایک اور قسم ہے وَالْمُوْفُوْنَ بِعَہْدِہِمْ اِذَا عٰہَدُوْا۔ یعنی نیکی اُن لوگوں کی ہے کہ جب وہ وعدہ کرتے ہیں تو اُسے پورا کرتے ہیں۔ ایفائے عہد حسنِ اخلاق اور حسنِ معاشرت کا ایک بنیادی اصول ہے اللہ تعالےٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا۔ اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ اپنے عہد کو پورا کیا کرو۔ نیز ترہیب کے انداز میں فرمایا اَوْفُوْا بِالْعَہْدِ لوگو! اپنے وعدہ کا پاس کیا کرو۔ اِنَّ الْعَہْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا قیامت کے دن اس کی بازپرس ہوگی۔ وعدہ خواہ اللہ تعالےٰ سے ہو یا اُس کی مخلوق سے، اس کی وفا لازم ہے۔ جب کوئی شخص کلمہ طیبہ پڑھتا ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تو اللہ تعالےٰ سے وعدہ کرتا ہے۔ کہ تیرے احکام کی تکمیل کروں گا۔ مگر پھر جب اس وعدے کو پورا نہیں کرتا تو اس میں نفاق کی علامت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح کسی مخلوق سے وعدہ خلافی بھی نفاق کی علامت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ نیکی اُن لوگوں کی ہے جو اپنے وعدوں کو پورا کرتے ہیں۔

صبر کی عظمت

اس کے بعد فرمایا نیکی میں وہ لوگ بھی شامل ہیں وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ جو سختی اور تکلیف میں صبر کرتے ہیں۔ بَاْسَآءِ اس تکلیف کو کہتے ہیں جو انسان پہ باہر سے وارد ہو۔ مثلاً کوئی مالی یا جانی نقصان ہو جائے۔ زلزلہ یا طوفان آجائے اور ضَرَّآ وہ تکلیف ہے جو انسانی جسم کے اندر پیدا ہوا جیسے بیمار ہو گیا، پھوڑا نکلا۔ جسم کے کسی حصے میں درد ہونے لگا، وغیرہ وغیرہ۔ الغرض فرمایا کہ نیکی ان لوگوں کی ہے

جو اندرونی یا بیرونی پریشانی میں مبتلا ہو کر صبر کرتے ہیں وَحِيْنَ الْبَاْسِ اور وہ لوگ بھی نیکی والے ہیں کہ میدان جہاد میں پہنچنے والی تکلیف کو بخوشی برداشت کرتے ہیں۔ حتی کہ اپنی جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں مگر صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے صبر کی یہ تین مختلف صورتیں یہاں بیان کی ہیں۔ اور صبر ہمارے دین کا بنیادی اصول ہے۔ پہلے گزر چکا ہے۔ "اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ" یعنی صبر اور نماز کے ساتھ امداد حاصل کرو۔ تو یہاں پہ صبر کا بیان بھی آگیا۔

سچے لوگ

فرمایا جن لوگوں میں مذکورہ اوصاف پائے جائیں، نیکی ان لوگوں کی ہے۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا یہی سچے لوگ ہیں۔ وہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں۔ راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں ______ اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ ایفائے عہد اُن کا شیوہ ہے اور صبر کا دامن نہیں چھوڑتے۔ فرمایا اصل نیکی کے کام تو یہ ہیں۔ مگر یہود و نصاریٰ نے قبلہ کے مسئلہ کو جھگڑے کا سبب بنا رکھا ہے اصل نیکی کے کام کرنے والے ہی فائز المرام ہوں گے۔ اُن کی نیکی کی وجہ سے اُن کے بیگانے بھی اپنے بن جائیں گے۔ اور اگر اُن کا عقیدہ درست نہیں ہے۔ مال کی محبت میں مبتلا ہیں۔ حلال و حرام کی تمیز سے عاری ہیں، تو وہ سچے کیسے ہو سکتے ہیں۔ رشوت اور سود خور کیسے سچا ہو سکتا ہے۔ وہ تو ذرائع آمدن میں حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتا۔ قرابت داروں، محتاجوں اور غریبوں کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ وہ نیکی کے راستے پر گامزن نہیں ہے۔

متقی لوگ

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ اور یہی لوگ متقی ہیں۔ جو کفر اور شرک سے پاک ہیں۔ معاصی سے بچتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات میں گزر چکا ہے۔ کہ یہ کتاب هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ "یعنی تقویٰ پکڑنے والوں کے لیے ہدایت ہے اور متقین وہی لوگ ہیں جو مذکورہ صفات کے حامل ہیں اور لمبے چوڑے دعوے کر کے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا نہیں شروع کر دیتے۔ جن لوگوں کا نہ اخلاق اچھا ہے اور نہ وہ تہذیب نفس کے حامل ہیں مال کی محبت میں حد سے بڑھے ہوئے ہیں انکا تعلق باللہ درست نہیں ہے حقوق و فرائض ادا نہیں کرتے وہ متقی کیسے بن سکتے ہیں۔

درس ہفتاد (۷۰) — آیت ۱۷۸ تا ۱۷۹

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

ترجمہ:۔ اے ایمان والو! تمہارے اوپر قصاص فرض قرار دیا گیا ہے مقتولوں میں آزاد کے بدلے میں آزاد آدمی، غلام کے بدلے میں غلام، عورت کے بدلے میں عورت پس جس کو معاف کیا گیا اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ، پس دستور کے مطابق پیچھے لگنا ہے، اور اس کی طرف نیکی کے ساتھ ادا کرنا ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف ہے اور مہربانی ہے پس جس شخص نے اس کے بعد تعدّی کی، اُس کے لیے عذاب الیم ہے (۱۷۸) اور تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ اے عقل مندو! تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ (۱۷۹)

اسلام کا فوجداری قانون

گزشتہ آیت میں نیکی کی تعریف بیان کی گئی تھی۔ کہ نیکی کیا ہے۔ اور کیا نہیں ہے نیکی والے لوگوں کے متعلق کہا گیا تھا کہ یہی لوگ سچے اور متقی ہیں۔ اب ان آیات میں بعض تقویٰ والی باتوں کا ذکر ہے۔ اور ان میں سے ایک مقتولوں کے معاملہ میں مساوات ہے اور دوسرا مال کا قانون ہے۔ اور پھر اس کے بعد روزہ کا قانون بھی بیان ہوگا۔ ان سب کا تعلق تقویٰ سے ہے آیات زیر درس میں اللہ تعالیٰ نے اسلام کا فوجداری قانون بیان فرمایا ہے۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہے۔ کہ انسانی جان

ایک محترم چیز ہے اور اس کی حفاظت ضروری ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی جان تلف ہو جائے تو اس کے لیے قصاص کا قانون بتلایا گیا ہے۔ جس کا اجراء اور پھر اُس کی پابندی لازم ہے۔ اگر قصاص نہ ہو سکے، تو پھر خون بہا کا مسئلہ آئیگا۔ جسے دیت کہا جاتا ہے۔ اس مالی معاوضہ کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔

اسلام کا قانون بمقابلہ قانون جاہلیت

زمانہ جاہلیت میں قصاص کے معاملہ میں عدم مساوات اور ناانصافی پائی جاتی تھی۔ ادنیٰ اور اعلیٰ خاندان کے مقتول کا قصاص بھی مختلف تھا۔ اگر کوئی کمزور اور ادنیٰ خاندان کا آدمی اعلیٰ خاندان کے کسی فرد کو قتل کر دیتا تو مقتول کے ورثاء دوہرا قصاص طلب کرتے ایک مقتول کے بدلے میں دو افراد قتل کرتے یا عورت کے بدلے میں مرد کا قصاص لیتے یا غلام کے بدلے آزاد کو قتل کرتے حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے اس مقام پر بڑی اچھی تقریر لکھی ہے فرماتے ہیں زمانۂ جاہلیت میں یہود اور اہل عرب کا دستور تھا کہ عورت کے بدلے میں مرد کو، غلام کے بدلے میں آزاد کو اور ایک آزاد کے قصاص میں دو کو قتل کیا جاتا، یہ زیادتی اور ظلم تھا۔ جو زبردست زیردستوں پر روا رکھتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اس نے اونچ، نیچ، شریف اور رذیل، غلام اور آزاد اور عورت اور مرد کو قصاص کے معاملہ میں برابر قرار دیا۔ اسلام نے امیر اور غریب کے درمیان حائل دیوار کو گرا دیا اور قصاص کے معاملہ میں مساوات کا درس دیا، اسلام نے عالم اور جاہل بچے، جوان اور بوڑھے تندرست اور بیمار صحیح الاعضا اور لنگڑے لولے، اپاہج اور اندھے کے امتیاز کو یکسر ختم کر دیا اور سب میں مساوات قائم کر دی۔ اسلام نے انہیں بتلایا کہ قصاص کا معنیٰ ہی برابری ہے۔ لہذا قصاص کے معاملہ میں کسی انسان سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا، بلکہ سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوگا۔ یہ قانون قانونِ قصاص کہلاتا ہے

ارشاد ہوتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى اے اہل ایمان! تمہارے اوپر مقتولوں کے معاملہ میں قصاص یعنی برابری کو فرض کیا گیا ہے۔ قصاص کا معنیٰ ہی برابری ہے اور قتلیٰ مقتول کی جمع ہے مطلب یہ کہ ایک آزاد مقتول کے بدلے میں ایک ہی آزاد کو قتل کیا جائے گا۔

ایک کے بدلے میں دو کو تختۂ مشق نہیں بنایا جائے گا۔ اسی طرح غلام کے عوض میں غلام کو، عورت کے بدلے میں عورت کو مرد کے بدلے میں مرد ہی قتل ہو گا۔ قصاص کے معاملہ میں کسی قسم کی عدم مساوات روا نہیں رکھی جائے گی۔ قرآن پاک کے الفاظ میں اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فرمایا گیا ہے۔

قتل کی تین اقسام

حدیث اور فقہ کی کتب میں قتل کی تفصیلات موجود ہیں۔ قتل کی تین قسمیں ہیں، یعنی قتل عمد، شبہ عمد، قتل خطا۔ قتل عمد یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو آلۂ قتل کیساتھ ارادتاً مار ڈالے۔ مثلاً بندوق یا پستول سے فائر کر دے، چھرا یا نیزہ مار دے یا کوئی اور ایسا آلہ استعمال کرے جو عام طور پر قتل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ قتل کی یہ واحد صورت ہے جس میں قصاص ہے۔ باقی دو صورتوں یعنی قتل شبہ عمد اور قتل خطا میں خون بہا ہے قصاص نہیں۔ پھر قصاص میں بھی بعض استثناء ہیں۔ مثلاً باپ اپنے بیٹے یا بیٹی کو قتل کر دے تو قصاص نہیں لیا جائے گا۔ بلکہ معاوضہ اور تعزیر ہو گی۔ جس میں سزائے قید بھی ہو سکتی ہے اسی طرح اگر ماں اپنے بیٹے بیٹی کو یا پوتے پوتی کو یا نواسے نواسی کو ہلاک کر دے تو بھی قصاص نہیں ہو گا۔ برخلاف اس کے اگر بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

قتل شبہ عمد یہ ہے۔ کہ کوئی شخص قتل تو ارادتاً کرتا ہے۔ مگر ایسے آلے کے ساتھ جو عام طور پر قتل کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً لاٹھی، پتھر یا کوئی اور ایسی چیز ماری جس سے قتل واقع ہو گیا۔ تو ایسی صورت میں قاتل سے قصاص نہیں لیا جائے گا، بلکہ اس کے عوض خون بہا یا دیّت ہو گی۔

قتل کی تیسری صورت قتل خطا ہے۔ جس میں ارادہ قتل نہیں ہوتا بلکہ قاتل کی سہو سے کوئی شخص قتل ہو جاتا ہے۔ مثلاً شکاری نے شکار کو نشانہ بنایا مگر وہ کسی آدمی کو لگ گیا اور اس سے قتل واقع ہو گیا۔ یہ قتل خطا ہے اور اس کا مفصل بیان آگے قرآن پاک میں آئے گا۔

سزائے قتل

قتل کی تین اقسام میں سے پہلی قسم یعنی قتل عمد میں قصاص یعنی جان کا بدلہ جان ہے

اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو قتل کرے گا، تو اس کے بدلے میں وہ بھی قتل کیا جائے گا۔ باقی دو صورتوں یعنی قتل شبہ عمد اور قتل خطا میں دیت ہے قصاص نہیں۔ اب قصاص لینے میں بھی بعض پابندیاں ہیں۔ مثال کے طور پر مقتول کے چار وارث ہیں۔ اور قصاص لینا ان کا حق ہے نہ کہ حکومت کا۔ حکومت کا کام تو صرف حق دلانا ہے۔ اس کے لیے انتظام کرنا ہے۔ اصل حق تو ورثا کا حق ہے۔ جو کہ حکومت دلائیگی۔ فرمایا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا "ہم نے مقتول کے ولی کے لیے حق رکھا ہے" برخلاف اس کے انگریزی قانون میں مستغیث حکومت ہوتی ہے۔ اور پھر جرمانہ کی رقم بھی اپنے خزانہ میں داخل کرتی ہے۔ اسلامی قانون میں معاوضہ حاصل کرنے کا حق صرف وارثوں کو پہنچتا ہے۔

اسلامی قانون قتل میں یہ ایک اہم شق ہے۔ کہ قصاص صرف اسی صورت میں لیا جائے گا، جب کہ تمام وارثانِ مقتول اس پر رضامند ہوں۔ چار بیٹوں میں سے اگر ایک نے بھی قصاص سے دست برداری اختیار کی، تو قصاص ساقط ہو جائے گا اور قاتل کو دیت ادا کرنا ہوگی۔ اور اگر مقتول کے وارث نہ قصاص لیں اور نہ دیت طلب کریں بلکہ بالکل ہی معاف کر دیں تو بات ختم ہوگئی۔ اس کی جزا انہیں آخرت میں ملیگی۔ اور اگر وارثان قصاص کی بجائے خون بہا لینا چاہیں۔ تو قتل عمد کی صورت میں قاتل کو پورا معاوضہ ادا کرنا ہوگا۔ اس کی برادری پر کوئی تاوان نہیں ہوگا۔ البتہ قتل شبہ عمد اور قتل خطا میں جب دیت ادا کرنا ہوگی، تو قاتل کی ساری برادری ادائیگی کی ذمہ دار ہوگی۔ اگر کسی سرکاری ملازم سے ایسا فعل سرزد ہوگیا ہے۔ تو اس کے معاوضہ کی ادائیگی اس کے دفتر والے یا محکمہ والے کریں گے۔ اسے دیت علی العاقلہ کہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ دیت عاقلہ پر ہوتی ہے اور یہ تین سال کے اندر اندر قسطوں میں واجب الادا ہوتی ہے۔ اس میں سارے متعلقین شریک ہوتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنے حصے کی قسط ادا کرنیکا پابند ہوتا ہے۔ قاتل کی برادری کو تاوان ڈالنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے متعلقین کی تربیت اس طرح کریں۔ کہ اس طرح کے ناخوشگوار واقعات پیدا ہونے کی نوبت ہی نہ آئے۔

معافی کی صورت

فرمایا قصاص کا قانون تو یہی ہے البتہ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ جو کوئی اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا گیا۔ مقتول کے ورثاء خیال کریں کہ قاتل بھی ہمارا دینی بھائی ہے۔ اس کی وجہ سے قتل تو ہو گیا مگر برادرانہ تعلقات ختم نہیں ہونے چاہئیں۔ لہٰذا اگر ورثاء میں سے کسی ایک نے بھی معاف کر دیا تو مقتول پر قصاص ساقط ہو جائے گا۔ اور اس کے بدلے میں کیا ہو گا فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ پھر مالی معاوضہ ہے دستور کے مطابق کہ لاؤ بھائی معاوضہ ادا کرو وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ اور قاتل کو نیکی کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔ معاوضہ ادا کرنا ہی ہے۔ تو لڑ جھگڑ کر نہیں بلکہ نیکی اور بھلائی کے ساتھ دستور کے مطابق ادا کرنا چاہیئے۔ اور اس کا پیچھا کرنا چاہیئے۔ کہ صحیح طریقے سے ادا ہو جائے۔ اس میں کوئی مزید خرابی پیدا نہ ہونے پائے۔ اس طریقہ سے شریعت نے جانوں کی حفاظت کا قانون مقرر فرمایا ہے۔

فرمایا ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ یعنی اس میں تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ مطلب یہ کہ پہلی امتوں میں قتل کا بدلہ صرف قتل تھا دیت کا قانون موجود نہیں تھا۔ مگر نبی آخرالزمان علیہ السلام کی امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص مہربانی فرمائی۔ اور قاتل کی سزا میں تخفیف کر کے قصاص کے ساتھ ساتھ دیت کا قانون بھی نازل فرمایا۔ چنانچہ شریعت محمدیہ میں تین صورتیں مقرر کی گئی ہیں، مقتول کے ورثاء قصاص طلب کریں یا مالی معاوضہ قبول کر لیں یا بالکل ہی معاف کر دیں، یہ اُن کی صوابدید پر منحصر ہے۔ بہر حال یہ تخفیف اور اللہ کی مہربانی ہے۔

دیت

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی مقدار ایک سو اونٹ مقرر فرمائی ہے اگر اونٹوں کا تبادلہ نہ ہو سکے تو پھر دس ہزار درہم جو چاندی کا سکہ ہے یا ایک ہزار دینار جو سونے کا سکہ ہے، اس کا بدل ہو گا۔ اس سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اگر فریقین اجناس یا کپڑے کے لین دین پر رضامند ہو جائیں تو مقررہ مقدار سے زیادہ بھی لے سکتا ہے۔ یہ خون بہا کا قانون ہے اور اس کے بعد فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ جو کوئی زیادتی کا مرتکب ہو۔ یعنی مالی معاوضہ

طے کر کے وہ بھی لے لیا۔ اور پھر بعد میں قتل بھی کر دیا، تو ایسی صورت میں فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ تو ایسا کرنے والا دردناک عذاب کا مستحق ہوگا۔ اس سے مراد تو آخرت کا عذاب ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اس قسم کی زیادتی کرنے والے کے لیے کوئی معافی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس سے قصاص ہی لیا جائے گا اس دنیا میں بھی اُسے سزا ملیگی اور اگلے جہان میں بھی وہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔

قصاص میں زندگی ہے

یہاں پر اللہ تعالےٰ نے قصاص کا فلسفہ بھی بیان فرمایا وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ۔ یعنی اے صاحب عقل و خرد قصاص میں تمہارے لیے زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ایک آدمی قتل ہوگیا اور جب قصاص میں قاتل کو بھی قتل کر دیا گیا، تو ایک اور جان ضائع ہوگئی حالانکہ اللہ تعالیٰ اسے زندگی سے تعبیر فرماتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ قصاص کی عدم موجودگی میں لوگ بلاخوف و خطر قتل کے مرتکب ہوں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں۔ چھوٹی موٹی سزا بھگت لیں گے، جان تو بچ ہی جائے گی۔ برخلاف اس کے جب قصاص کا قانون موجود ہوگا۔ اور لوگوں کو علم ہوگا کہ قتل کے بدلے میں قاتل بھی قتل کیا جائے گا، تو وہ قتل جیسا بڑا جرم کرتے وقت سو دفعہ سوچے گا اور ایسے اقدام سے باز آجائے گا۔ انگریز کے بنائے ہوئے قانون میں یہی خامی ہے۔ ہر روز کتنے قتل ہو رہے ہیں۔ مگر چونکہ قاتل کو قرار واقعی سزا نہیں ملتی، ایک قتل کے بعد اُسے مزید شہ ملتی ہے۔ اور وہ بلاخوف و خطر وارداتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ چوری کا بھی یہی حال ہے اگر لوگوں کو حد جاری ہونے کا یقین ہو، تو پھر چوری کرنا اتنا آسان نہ ہو۔ سعودی عرب میں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ وہاں حدود اللہ جاری ہیں۔ قاتل اور چور بلادھڑک جرم نہیں کر سکتے جب سے خاندان ابن سعود نے حدود نافذ کیں ہیں، چوری کی کتنی سزائیں ہوئی ہیں۔ گذشتہ پچاس سال میں ایک سو لوگوں کے ہاتھ بھی نہیں کٹے ہوں گے۔ سزا کی دہشت ہی ایسی ہے۔ کہ سر عام سونا پڑا ہو یا رِیال کی بوری رکھی ہو، کوئی ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہ اسلامی قانون

پر عملدر آمد کی برکت ہے۔ اسی طرح اگر زنا کی حد سنگساری ہوگی اور مجرم کو سر عام سزا دی جائیگی، وہاں یہ جرم کیسے ہوگا۔ برخلاف اس کے جہاں ایسی عبرتناک سزائیں نہیں ہیں۔ وہاں جرائم میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے لوگو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ چند ایک کو قصاص میں قتل کرنے سے عام لوگوں کی جانیں بچ جائیں گی۔

عربی ادب کی کتاب "حماسہ" میں صحابہ کرامؓ کے زمانے کا ایک واقعہ ملتا ہے کہ کوئی شخص قتل ہوگیا قاتل با اثر آدمی تھا۔ اس کے بہت سے سفارشی تھے۔ حضرت سعیدؓ بن العاص بھی انہیں میں شامل تھے لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مقتول کا بیٹا قصاص کی بجائے دیت لینے پر راضی ہو جائے حتیٰ کہ سات گنا دیت تک کی پیشکش کی گئی۔ مگر بیٹا یہی کہتا رہا۔ کہ میں تو قصاص لیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ ظاہر ہے کہ جب قصاص کا قانون جاری ہوگا تو پھر اس جرم کا ارتکاب کوئی اِکّا دُکّا ہی کرے گا۔ اکثر لوگوں کی جان محفوظ ہو جائے گی۔ اسی لیے قصاص کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا یہ قانون اس لیے جاری کیا گیا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ تم متقی بن جاؤ اور ایسے گھناونے جرم کا ارتکاب نہ کرو گویا اس قانون کا اجرا حصول تقویٰ کا ایک ذریعہ ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۸۰﴾ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۗ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۸۱﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۸۲﴾ ع ۲۲

ترجمہ :- فرض کی گئی ہے تمہارے اوپر جس وقت کہ آئے تم میں سے کسی کے پاس موت، اگر اُس نے مال چھوڑا ہے، تو وصیت والدین کے حق میں اور قرابت داروں کے حق میں دستور کے مطابق۔ یہ لازم ہے پرہیزگاروں پر ﴿۱۸۰﴾ پس جس شخص نے اس وصیت کو تبدیل کیا اُسے سننے کے بعد، بیشک اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جو اس کو تبدیل کرتے ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۱۸۱﴾ پس جس نے خوف محسوس کیا۔ وصیت کرنے والے کی طرف سے ایک طرف مائل ہونے کا یا گناہ کا، پس اُس نے اُن کے درمیان صلح کرا دی، تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ ﴿۱۸۲﴾

حفاظت جان کا قانون

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ قصاص کا قانون تقویٰ کا ایک جزو ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ قانون جاری فرما کر انسانی جانوں کی حفاظت فرمائی ہے۔ اس کے بغیر انسانی جان کا ضیاع ایک معمولی چیز تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نافذ کر دیا کہ اگر عدل و انصاف کا دامن تھامے رکھو گے، تو جانیں

محفوظ ہو جائیں گی اور تم کو صحیح زندگی نصیب ہو گی۔ اس کے ساتھ قانون دیت بھی حفاظتِ جان ہی کا ایک حصہ ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کی حفاظت کے لیے قوانین نافذ کیے ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ قتل ناحق اکبر الکبائر میں سے ہے۔ یعنی سات بڑے گناہوں میں سے پہلا نمبر شرک کا ہے اور دوسرا قتل ناحق کا ہے۔ قَتْلُ النَّفْسِ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ حضرت عثمانؓ کی روایت میں آتا ہے کہ ایک تو جہاد میں جان کا اتلاف ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ صرف تین صورتوں میں جان کو تلف کیا جا سکتا ہے۔ اگر ان تین صورتوں کے علاوہ کسی کی جان لے گا تو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہو گا۔ پہلی صورت قصاص کی ہے۔ کسی شخص کو قتل کے بدلے میں قتل کیا جائے، تو وہ جائز ہو گا۔ دوسرا قتل اس مرد یا عورت کا جائز ہے۔ جسے زنا کے جرم میں سنگسار کیا گیا ہو۔ اور تیسرا قتل اس شخص کا جائز ہے۔ جو دین اسلام چھوڑ کر مرتد ہو جائے۔ الغرض گذشتہ درس میں حفاظتِ جان کا قانون بیان کیا گیا تھا۔

اسلام کا ضابطہ دیوانی

ضابطہ فوجداری کی طرح اسلام نے ضابطہ دیوانی یعنی مال کا قانون بھی عطا کیا ہے جس کی تفصیلات قرآن وسنت میں موجود ہیں اس سے پہلے قصاص یعنی فوجداری قانون کا بیان آچکا ہے۔ دیوانی قانون کی بنیاد کے متعلق قرآن پاک میں جگہ جگہ آیا ہے۔ "لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ خبردار کسی حرام یا مشکوک ذریعے سے مال مت حاصل کرو۔ اگر ایسا کرو گے، تو کمال سے محروم ہو جاؤ گے اور جب مال جائز طریقے سے حاصل کر لو، تو اس کو غلط اور ناجائز امور پر خرچ نہ کرو۔ اگر بیجا تصرف کرو گے تو ظالم اور گنہگار بن جاؤ گے۔ الغرض مالی امور کے متعلق بھی اسلام نے پورا ضابطہ عطا کیا ہے فوجداری قانون میں انسانی جان کے تحفظ کی ضمانت تھی، اس دیوانی قانون میں مال کے تحفظ کے اصول بتلائے ہیں۔ اور دونوں قوانین کا تعلق تقویٰ سے ہے۔

اسلامی قانون حکمت پر مبنی ہے

امام شاطبیؒ کا تعلق اندلس سے ہے۔ آپ مالکی مسلک کے بہت بڑے

امام گنے رہے ہیں۔ آپ نے "موافقات" نامی کتاب بھی لکھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ اسلام کا سارا قانون حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی کوئی شق حکمت سے خالی نہیں۔ اللہ تعالےٰ نے اس قانون میں بڑی بڑی باریکیاں اور حکیمانہ مصلحتیں رکھی ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی ایک ایک آیت میں اس قدر حکمتیں، مصلحتیں اور باریکیاں موجود ہیں۔ کہ دنیا کے تمام انسان مل کر سوچیں، تو ان کے برابر نہیں سوچ سکتے۔ آپ "فیوض الحرمین" میں لکھتے ہیں کہ بعض اوقات جب میں بعض آیات پر غور کرتا ہوں تو ان کی تہ میں مجھ پر بحرِ بیکراں جیسے وسیع انکشافات ہوتے ہیں۔ جو عام انسانوں کی سوچ و بچار سے باہر ہوتے ہیں۔

تحفظ نفس

اسلام نے جہاں دیگر تحفظات دیے ہیں، وہاں تحفظ نفس کی بھی ضمانت دی ہے۔ نسب بالکل محفوظ ہونا چاہیے۔ اس میں ___ غلط ملط نہیں ہونا چاہیے، برخلاف اس کے غیر اقوام میں تحفظ نسب کی کوئی گارنٹی نہیں۔ ڈاکٹر اسپنسر گذشتہ صدی کا بہت بڑا فلاسفر ہوا ہے۔ اب تو یورپ کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ اس وقت صرف چالیس پینتالیس لاکھ تھی وہ کہتا ہے کہ یورپی قانون پر لعنت ہو کہ پینتالیس لاکھ میں سے یقین کے ساتھ پینتالیس آدمی بھی حلال کے نہیں نکالے جا سکتے، یہاں کا قانون ایسا گندہ ہے مگر اسلام نسب کی حفاظت کرتا ہے قرآن و سنت میں اس کے متعلق بہت سے قانون موجود ہیں۔

اسی طرح دین کی حفاظت کا قانون بھی اسلام میں موجود ہے۔ اگلی آیات آرہی ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ دین کی حفاظت کے ہی قوانین تو ہیں۔ امام شاطبیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے عقل کے تحفظ کا قانون بھی عطا کیا۔ شراب جیسی قبیح چیز کو حرام قرار دے کر اسلام نے عقل کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے۔ شراب ایسی نشہ آور چیز سے عقل و خرد کیسے قائم رہ سکتی ہے۔

الغرض! اسلام نے تو بہترین حکیمانہ قوانین عطا کیے ہیں۔ مگر یہ خود ہماری نالائقی ہے۔ کہ ہم اِن سے مستفید نہیں ہونا چاہتے۔ ان سنہری اصولوں کو چھوڑ کر ہم غیروں کے گندے قوانین تلاش کر رہے ہیں۔ کبھی امریکہ کی طرف جاتے ہیں، کبھی یورپ کی

کی طرف دیکھتے ہیں کبھی ایشیا کا رُخ کرتے ہیں۔ کہ کہیں سے اچھا دستور مل جائے کوئی اچھا فوجی نظام حاصل ہو جائے یا کوئی اقتصادی نظام ہی میسّر آجائے۔ مگر وہاں پر لعنت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ قرآن وسنّت جیسے اعلیٰ وارفع قوانین کہیں سے نہیں ملیں گے۔

مولنا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس دور میں اسلامی تحریک کے خلاف سب سے بڑھ کر روسی ذہن کام کر رہا ہے۔ اس وقت اسلام کی مخالفت میں سب سے زیادہ اشتراکی نظام کار فرما ہے۔ مگر ایک وقت آئے گا جب یہ نظام بھی مجبور ہو کر قرآنی قوانین کے سامنے ہتھیار ڈال دیگا۔ ان کے پاس محض دعوے ہے، عملی طور پر کچھ نہیں اس لیے بالآخر انہیں اسلام کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔

تحفظِ مال

اسلام نے مال کا مکمل تحفظ عطا کیا ہے۔ اگر کسی جگہ کوئی خرابی موجود ہے تو اسے درست کرنے کا قانون بھی موجود ہے۔ اسلام نے مال کو ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے۔ البتہ اسے احسن طریقے سے خرچ کرنے کے اصول بتلائے ہیں اس کے متعلق مختلف قوانین گزر چکے ہیں۔ "وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ" یعنی مال کی محبت کے باوجود اسے خرچ کرو۔ زکوٰۃ کا مکمل قانون موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی "وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" ہمارے دیئے ہوئے مال سے خرچ کرو۔ اس سلسلے میں مکاتب غلاموں کی آزادی کا قانون دیا ہے۔ سورۃ نور میں آتا ہے "وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ" یہ مال اللہ کا دیا ہوا ہے اس نے ایسے ذرائع پیدا کر دیے ہیں۔ کہ تمہیں مال پہنچتا رہتا ہے۔ محنت کوئی کرتا ہے۔ مگر تمہیں وراثت میں سے بیٹھے بٹھائے مل جاتا ہے۔ اسے اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ ہر انسان فطری طور پر آزاد ہے اسے غلامی کے پھندے سے چھڑاؤ۔ ان پر اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرو۔ یہ نہ سمجھو کہ اس مال کے حقیقی مالک تم ہو۔ اصلی مالک تو اللہ تعالیٰ ہے۔ جس نے تم پر مہربانی کی اور ایسے وسائل تمہارے سپرد کیے۔ جن کے ذریعے مال تم تک پہنچتا ہے۔ پھر اس میں تصرف بھی وہ کرو جس کی

اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اگر اس کی مرضی کے خلاف خرچ کرو گے، تو جہنم رسید ہو گے۔

قانونِ وصیت

ان آیات میں وصیت کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ یعنی جب کسی کی موت کا وقت قریب ہو اور وہ مال چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ تو اس پر لازم ہے۔ کہ وہ والدین اور قرابت داروں کے حق میں وصیت کر جائے۔ اور یہ وصیت ہو بھی بالمعروف یعنی دستور کے موافق۔ فرمایا ایسا کرنا حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ یعنی متقیوں کے لیے ضروری ہے۔

وصیت کا مکمل قانون قرآن پاک کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔ یہ آیات اس قانون کی ابتدائی آیات ہیں، جنہیں سورۃ نساء کی آیات نے منسوخ کر دیا۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے ورثاء کے حصے مقرر نہیں کیے تھے، آیات زیر درس کے ذریعے وارثوں کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا تھا۔ تاکہ انہیں بھی میت کے ترکہ میں سے حصہ مل سکے۔ مگر سورۃ نساء کی آیات نازل ہونے سے ورثاء کے حصے مقرر ہو گئے اس لیے ان کے لیے وصیت کا قانون منسوخ ہو گیا۔ اب ورثا کے لیے وصیت نہیں ہے۔ البتہ غیر ورثاء کے لیے ایک تہائی مال تک وصیت کر سکتا ہے۔
حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے ورثا یعنی ماں باپ، بیوی، خاوند، اولاد وغیرہ کے متعلق فرمایا۔ إِنَّ اللَّهَ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار کو اس کا حق دے دیا ہے۔ اب لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ کسی وارث کے لیے وصیت روا نہیں ہے۔ انہیں وراثت سے مقررہ حصہ خود بخود مل جائے گا۔
بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ورثا کے لیے وصیت والی یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ کہ والدین کے لیے وصیت کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں۔ کہ خود ان کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آیا۔ کہ انہیں ماں کے حق میں وصیت کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور انہوں نے محسوس کیا۔ کہ واقعی یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات ورثاء کے لیے بھی وصیت ضروری ہو جاتی ہے آپ خود نو مسلم تھے۔ آپ کی والدہ آخر تک اپنے مذہب پر قائم رہی۔ فرماتے ہیں۔ کہ ایک دفعہ میں بیمار ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ موت کی صورت میں میری ماں کو میرے ترکہ سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، کیونکہ وہ غیر مسلمہ تھی اور مومن اور کافر کے درمیان وراثت نہیں چلتی۔ تو اُس وقت میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ ماں کے حق میں وصیت کردوں بہر حال یہ اُسی صورت میں ہوتا جب کہ ماں غیر مسلمہ ہونے کی وجہ سے وراثت کی حقدار نہ تھی۔ کیونکہ لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ نہ کافر مسلمان کا وارث ہے۔ اور نہ مسلمان کافر کا وارث ہے۔ ایسی صورت میں وصیت ہی کے ذریعے ترکہ تقسیم ہو سکتا ہے۔

انبیا کی وصیت

قرآن پاک میں وصیت کا قانون کئی جگہ بیان ہوا ہے۔ جہاں بھی ورثاء کے حصص کا بیان آتا ہے۔ تو ارشاد ہوتا ہے۔ کہ فلاں فلاں رشتہ دار کے لیے اتنا حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ مگر مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ۔ یہ ترکہ وصیت شدہ مال اور قرضہ ادا کر کے باقی تقسیم ہوگا۔ منجملہ وصیت کی دیگر اقسام کے انبیاء علیہم السلام کی بھی وصیت ہوتی ہے۔ مگر وہ مال کے متعلق نہیں ہوتی۔ پوچھنے والے صحابہ کرامؓ سے دریافت کرتے ہیں۔ کہ کیا حضور علیہ السلام نے کوئی وصیت کی ہے۔ صحابی جواب دیتے ہیں کہ آپ نے مال سے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی کیونکہ آپ کا ارشاد ہے مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ یعنی نبی جو چیز چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کے متعلق وصیت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اُن کا ترکہ صدقہ ہوتا ہے۔ اُسے ورثاء میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔

فرمایا البتہ نبی علیہ السلام نے وصیت ضرور فرمائی ہے۔ اور وہ قرآن پاک پر عمل کرنے کی۔ غلاموں کے متعلق حسن سلوک کی وصیت کی ہے۔ نماز پر مداومت اور

شرک سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا لَعَنَ اللّٰہُ الْیَھُوْدَ وَالنَّصٰرٰی یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو۔ انہوں نے انبیاء کی قبور کو سجدہ گاہ بنا لیا آپؐ نے امت کو تعلیم دی کہ تم میری قبر کے ساتھ وہ سلوک نہ کرنا جو یہود و نصاریٰ نے اپنے انبیاء کی قبور کے ساتھ کیا مگر آجکل قبروں کے ساتھ جو کچھ معاملہ ہو رہا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ بیرونِ ملک سے آنے والا ہر سربراہ مملکت سب سے پہلے جناح صاحب کی قبر پر چادر چڑھاتا ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ کی قبر کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ کوئی ریشمی چادر چڑھا رہا ہے، کوئی پھولوں کی چادر لے کر آیا ہے۔ کوئی پکی پکائی دیگ پیش کر رہا ہے۔ کوئی بکرا چھتر اندر کر رہا ہے۔ کوئی سجدہ کر رہا ہے، کوئی حاجت روائی کا طالب ہے۔ کوئی مشکل کشائی کے لیے دعائیں کر رہا ہے۔ یہ سب شرکیہ امور ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ڈرایا یُحَذِّرُ مِمَّا صَنَعُوْا ایسے کام مت کرنا مگر ہم اسی پر چل رہے ہیں۔

وصیت کی اقسام

وصیت کی کئی ایک قسمیں ہیں۔ منجملہ اُن کے مباح یا مستحب وصیت کا ذکر حدیث میں آتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے متعلق وہ وصیت کرنا چاہتا ہو تو اُسے چاہیئے۔ کہ وہ دو راتیں بھی نہ گذارے مگر وصیت اس کے سرہانے کے نیچے لکھی ہوئی موجود ہونی چاہیئے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں۔ کہ جب سے میں نے حضور علیہ السلام کی زبان مبارک سے یہ بات سنی ہے۔ اس وقت سے میں نے وصیت لکھ کر سرہانے کے نیچے رکھ لی ہے۔ وصیت کی یہ مستحب قسم ہے۔

بعض اوقات وصیت فرض ہو جاتی ہے۔ کسی شخص کو یقین ہے کہ اُسکی زندگی کے آخری ایام آپہنچے ہیں اور اب اس کے بچنے کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیتے۔ نیز اُس کے ذمے ایک دو سال کی زکوٰۃ واجب الادا ہے۔ تو ایسی صورت میں اس کے لیے وصیت کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اپنے مال سے

زکوٰۃ کی ادائیگی کی وصیت کر جائے۔ دگرنہ عدم ادائیگی کی صورت میں فرض کا تارک ہو کر گنہگاروں کی صف میں کھڑا ہوگا۔ اسی طرح کسی کی امانت موجود ہے۔ یا کسی کا قرض ادا کرنا ہے۔ تو اس کے لیے لازم ہے۔ کہ مرنے سے پہلے وصیت کر جائے کہ فلاں فلاں چیز کی ادائیگی کر دینا۔ اگر ایسا نہیں کرے گا۔ تو اس کا مال تو ورثاء ہضم کر جائیں گے، اور وہ خود دوسروں کا مقروض رہ جائے گا۔ اسی لیے اسلام نے مرنے والے کے متعلق یہ قانون وضع کر دیا کہ سب سے پہلے مرنے والے کے مال میں سے اس کے کفن دفن کا انتظام کیا جائے۔ یہ بنیادی ضروریات میں داخل ہے اس کے بعد اگر مرنے والے کے ذمہ قرضہ ہے۔ تو وہ ادا کیا جائے۔ پھر اگر کوئی وصیت ہے۔ تو کل مال کے ایک تہائی تک اُسے پورا کیا جائے۔ اس کے بعد بقیہ مال ورثاء میں تقسیم کر دیا جائے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ لوگ ان ضروری امور کی طرف تو توجہ نہیں کرتے۔ اس کی بجائے مرنے کے قل، تیجہ، ساتواں، دسواں اور چالیسواں کے چکر میں پڑ کر مرنے والے کا مال ضائع کرتے ہیں۔ جو کہ بالکل ناجائز ہے۔ اور اگر مرنے والے کے مال کی بجائے لواحقین اپنے مال سے خرچ کرتے ہیں۔ تو بھی محض رسومات کی خاطر ایسا کرنا فضول ہوگا کیونکہ شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اور اگر خدانخواستہ ایسی رسومات پر یتیموں کا مال صرف ہو رہا ہے تو یہ قطعاً حرام ہے۔ کھانے والے حرام کھا رہے ہیں۔ اس سے بچنا چاہیئے۔ اور جن چیزوں کا شریعت نے حکم دیا ہے انہیں پورا کرنا چاہیئے۔

وصیت کی ایک قسم "ناجائز" بھی ہے۔ اگر مرنے والا کسی ناجائز کام کی وصیت کرتا ہے تو ایسی وصیت ناجائز ہی کہلائیگی مثلاً کوئی شخص وصیت کر جائے کہ میرے مال میں فلاں قبر پر چادر چڑھا دینا یا فلاں مزار پر بکرا چڑھا دینا وغیرہ وغیرہ ناجائز وصیت ہوگی۔ اور ایسی وصیّت پر عمل کرنا روا نہیں ہے۔

بہر حال حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے فرمایا کہ کارِ خیر کے لیے ایک تہائی مال تک وصیت کرنے کی اجازت ہے۔ تاکہ مرنے والے کو آخرت میں

اس کا حصہ ملتا ہے مثلاً مسجد تعمیر کرا دے، مدرسہ بنوا دے، غیر وارث رشتہ داروں اور مستحقین میں تقسیم کر دیکھی وصیت کر جائے تو یہ جائز اور درست ہے۔ اور اگر کوئی شخص ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کر جائے تو یہ ورثاء کی اجازت پر موقوف ہو گا اگر وہ سب راضی ہو جائیں تو وصیت پر عمل ہو گا ورنہ صرف ایک تہائی پر عمل کرنا ہو گا اگرچہ اس کے لیے بھی وَالثُّلُثُ كَثِيْرٌ کے الفاظ آتے ہیں مگر اس حد تک جائز ہے۔ حضرت سعدؓ نے عرض کیا تھا کہ میرے پاس بہت سا مال ہے اور حقدار صرف ایک ہی بیٹی ہے۔ حضور! اگر اجازت دیں تو میں سارا مال صدقہ کر جاؤں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر عرض کیا آدھا مال دے دوں، فرمایا نہیں انہوں نے تیسری دفعہ پوچھا کیا دو تہائی مال کی وصیت کر دوں آپ نے پھر بھی اجازت نہ دی جب آپ سے ایک تہائی مال کی اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا۔ کہ اگرچہ یہ بھی زیادہ ہے۔ مگر اس کی اجازت ہے۔ مقصد یہ کہ وارثوں کو ترکہ سے زیادہ سے زیادہ حصہ ملنا چاہیئے۔

وصیت میں تبدیلی گناہ ہے

فرمایا فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ جس شخص نے اس وصیت کو تبدیل کیا اُسے سُننے کے بعد فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے۔ جو اس کو تبدیل کرتے ہیں مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص وصیّت کر کے فوت ہو جائے اور اس وصیت کو سُننے والے یا جاننے والے اس پر عمل درآمد کرنے کی بجائے اسے تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ تو اس کا وبال وصیت میں تحریف کرنے والوں پر ہو گا۔ کیونکہ وصیت کرنے والا تو اپنا فرض ادا کر گیا۔ اب اس پر عملدرآمد کے وقت کمی بیشی کرنے والے گنہگار ہوں گے۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ بیشک اللہ تعالیٰ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

وصیت میں تبدیلی کی کئی ایک صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً مرنے والا کسی ایسے شخص کو کوئی حصہ دے گیا، جسے وارث پسند نہیں کرتے۔ یا کسی کے کم حصے کو زیادہ یا زیادہ کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی طرف سے رد و بدل کرتے

ہیں۔ تو وہ لوگ گنہگار ہوں گے۔ کیونکہ جائز وصیت پر عمل نہیں کیا، وارثان کے حصص کی تقسیم وصیت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک نے بار بار تصریح کی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی وصیت کرنے والا وصیت صحیح طریقے سے نہیں کرتا۔ کسی کو حق سے زیادہ دے دیتا ہے اور کسی کو پورا حق بھی نہیں دیتا اور اس طرح پسماندگان میں تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو اس نازک صورت حال کو دیکھتے ہوئے۔ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا جو شخص ڈر گیا۔ وصیت کرنے والے کے ایک طرف جھک جانے سے یا کسی گناہ کے ارتکاب سے فَاَصْلَحَ بَیْنَھُمْ پس اس شخص نے فریقین میں صلح کرا دی فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ تو ایسے شخص پر کوئی گناہ نہیں۔

بعض اوقات کوئی بیٹا نافرمان ہوتا ہے اور وصیت کرنے والا اُسے جائیداد سے محروم کرتا ہے۔ تو یہ بات غلط ہے۔ اور کبیرہ گناہ ہے۔ وراثت بننا ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ اور جو حصہ اللہ نے ورثا کو دیا ہے۔ وہ نیکی بدی یا فرمانبرداری اور نافرمانی پر موقوف نہیں ہے۔ اس کا اچھا یا بُرا صلہ کسی اور طریقے سے دیا جا سکتا ہے۔ مگر وراثت سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ حق اُسے اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ ایسی ہی صورت میں فرمایا کہ اگر کوئی شخص درمیان میں آ کر صلح کرا دے۔ تو یہ اچھی بات ہے۔ اس سے دونوں کو فائدہ ہوگا۔ ورثاں کو اُن کا جائز حصہ مل جائیگا اور وصیت کرنے والا بھی سرخرو ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو گئی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا۔ کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

درس ہفتاد و دو (۷۲) | آیت ۱۸۳ تا ۱۸۴

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ
فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ
اُخَرَ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ
فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسا کہ اُن لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ ﴿۱۸۳﴾ چند گنے ہوئے دن ہیں۔ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو۔ پس دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرنا ہے۔ اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہیں ایک مسکین کا طعام فدیہ ہے پس جو شخص خوشی سے نیکی کرے گا، وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اور اگر تم روزے رکھو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو ﴿۱۸۴﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اِس سے پیشتر اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کی حفاظت کا قانون بیان فرمایا۔ پھر مال کی حفاظت کا قانون تبلایا۔ اور مال کے بیجا تصرف سے منع فرمایا۔ حق تلفی کو ناجائز قرار دیا اور بتایا کہ یہ بات تقویٰ کے خلاف ہے۔ ایمانیات کے ذکر کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسلام کا قانون فوجداری بیان فرمایا، اور قصاص اور دیت کا تذکرہ کیا اور فرمایا یہ اصول بیان کرنے کا مقصد یہ ہے۔ کہ تم اس پر عمل پیرا ہو کر تقویٰ حاصل کرو۔

فرضیتِ روزہ

آیاتِ زیرِ درس میں ارکان اسلام میں سے ایک اہم رُکن روزہ کا بیان ہے

جس طرح اس سے پہلے اصولوں کو تقویٰ کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ اسی طرح روزہ رکھنے کی غرض و غایت بھی تحصیل تقویٰ ہی بیان کی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے اہلِ ایمان کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں۔ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پہ فرض کئے گئے۔ اور مقصد یہ ہے لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کر لو۔

کُتِبَ کا لفظ فرضیت کے لیے آتا ہے۔ جیسے اس سے پہلے قصاص کے متعلق آیا تھا "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ" یعنی تم پہ قصاص فرض کیا گیا ہے اسی طرح وصیّت کے متعلق آچکا ہے "کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَیْرَاۨ الْوَصِیَّۃُ" اگر مال چھوڑا ہے۔ تو تم پہ وصیّت کرنا لازم ہے۔ اسی طرح یہاں پہ روزوں کے متعلق کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ یعنی تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔

روزہ کا مفہوم

روزہ کے لفظی معنے رُک جانے کے ہیں۔ عربی زبان میں اس کے لیے امساک کا لفظ بھی آتا ہے۔ تاہم صوم کا لفظ بھی رُک جانے کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے مثال کے طور پہ عرب کہتے ہیں۔ ؎

خَیْلٌ صِیَامٌ وَخَیْلٌ غَیْرُ صَائِمَۃٍ تَحْتَ الْعَجَاجِ وَخَیْلٌ تَعْلُکُ اللُّجُمَا

کچھ گھوڑے رُکے ہوئے ہیں یعنی خاموش ہیں کچھ حرکت کر رہے ہیں اور کچھ گرد و غبار کے نیچے لگام چبا رہے ہیں۔ شریعت میں روزہ کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے۔ اَلْاِمْسَاکُ عَنِ الْاَکْلِ وَالشُّرْبِ وَالْجِمَاعِ مِنْ طُلُوْعِ الْفَجْرِ اِلٰی غُرُوْبِ الشَّمْسِ طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور خواہشات نفسانی سے اپنے آپ کو روکے رکھنے کا نام روزہ ہے۔[۱]

روزہ نہار شرعی کے اندر ہوتا ہے۔ اور شرعی دن سے مراد پو پھوٹنے سے لے کر سورج غروب ہونے تک کا وقت ہے۔ اس دوران کھانے پینے

[۱] احکام القرآن للجصاص صفحہ ۲۲۳/۱ (فیاض)

اور نفسانی خواہشات سے باز رہنا اس نیت کے ساتھ کہ میرا روزہ ہے۔ یہی صوم ہے اور اسلام کے ارکان میں سے تیسرا رکن ہے۔ ارکان اسلام میں توحید و رسالت پر عقیدہ کے بعد نماز، پھر زکواۃ اور پھر روزہ کا نمبر ہے۔ چوتھا نمبر حج کا ہے اسی ترتیب سے پانچواں رکن جہاد ہے۔ اور اس کا ذکر بھی بعد میں آرہا ہے ان تمام ارکان کا تذکرہ سورۃ بقرہ میں اسی ترتیب سے آرہا ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے عَلَیْکُمْ بِالصَّوْمِ فَاِنَّہٗ لَاعِدْلَ لَہٗ روزہ کو لازم پکڑو کیونکہ روزہ جیسی کوئی اور عبادت نہیں۔

سابقہ امتوں کے روزے

الغرض! فرمایا اے ایمان والو! یہ روزے صرف تم پر ہی نہیں فرض کیے گئے بلکہ تم سے پہلے گذرنے والے لوگوں پر بھی اسی طرح فرض تھے۔ البتہ ان روزوں کی مقدار اور تعداد مختلف امتوں کے لیے مختلف رہی ہے۔ چنانچہ مشہور ہے۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام ایام بیض یعنی ہر ماہ کی تیرہ چودہ پندرہ تاریخ کا روزہ رکھتے تھے۔ اور یہ روزے امت محمدیہ کے لیے مستحب کا درجہ رکھتے ہیں حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے فرض تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی امت کے لوگ بڑے سخت مزاج اور اکھڑ تھے، ان میں بہیمیت کا عنصر زیادہ مقدار میں پایا جاتا تھا۔ اسے کم کرنے کے لیے اس امت کو سارا سال روزے رکھنے کا حکم تھا حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور دوسرے دن افطار کرتے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام دو دن روزہ رکھتے تھے۔ اور تیسرے دن افطار کرتے تھے اس امت آخر الزمان کے لیے اللہ تعالیٰ نے سال بھر میں ایک ماہ کے روزے فرض کیے۔ ان کے متعلق فرمایا اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ یہ گنتی کے چند دن ہیں۔ یعنی تین سو ساٹھ دن میں سے انتیس ۲۹ یا تیس ۳۰ دن کے روزے فرض قرار دیے گئے ہیں۔

روزہ باطنی عبادت ہے

امام طحاویؒ اپنی کتاب مشکل الآثار میں فرماتے ہیں کہ ہر عبادت میں ریا کا امکان ہے۔ صرف روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جس میں ریاکاری کا کوئی مسئلہ

نہیں۔ یہ باطنی عبادت ہے۔ اور اس کا تعلق ایک طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور دوسری طرف بندہ کے ساتھ۔ نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ ایسی عبادات ہیں۔ جنہیں دوسرے لوگ دیکھ سکتے ہیں، انہیں محسوس کر سکتے ہیں۔ اور زکوٰۃ سے مستفید بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر روزہ کے ساتھ ایسا معاملہ پیش نہیں آسکتا۔ اس کا تعلق صرف روزہ دار کی ذات سے ہوتا ہے۔ دوسرا شخص نہ اسے دیکھ سکتا ہے اور نہ محسوس کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص عام لوگوں کے سامنے تو نہیں کھاتا پیتا مگر درپردہ ایسا کر لیتا ہے۔ تو اس کا روزہ کہاں ہوگا، وہ لاکھ اعلان کرتا پھرے کہ میں روزہ دار ہوں مگر اس کی حقیقت کو وہ خود جانتا ہے۔ یا اللہ رب العزت جانتا ہے کہ وہ روزے دار ہے یا نہیں۔ اس کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ سے نہ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر عبادت کا بدلہ دیا جائیگا۔ مگر روزہ ایک ایسی عبادت ہے۔ جبکی جزا میں خاص طور پر خود عطا کروں گا۔ حدیث قدسی کے الفاظ ہیں۔ اَلصَّوْمُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ روزہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اسکی جزا دونگا۔

روزہ کے جسمانی فوائد

روزہ کے روحانی فوائد کے ساتھ ساتھ اس کے جسمانی فوائد بھی ہیں۔ صُوْمُوْا تَصِحُّوْا روزہ رکھو تاکہ تمہیں صحت نصیب ہو۔ یورپ کے بہت سے نامور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اسلام نے فاقہ کا جو طریقہ روزہ کی صورت میں مقرر کیا ہے، اس سے بہتر حفظانِ صحت کا کوئی اصول نہیں مختلف بیماریوں کے حملہ کی صورت میں بھی روزہ صحت مندی کا سبب بنتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص بلغمی مادہ کی زیادتی کا مریض ہو تو روزہ رکھنے سے بالکل تندرست ہو جائے گا۔ فاقہ کرنے سے بلغمی اور کئی دوسری رطوبتیں خشک ہو جاتی ہیں اور آدمی صحت یاب ہو جاتا ہے اسی لیے فرمایا کہ روزہ رکھو، صحت نصیب ہوگی اور سفر کرو غنیمت حاصل ہوگی۔ بسا اوقات اقامت میں آدمی کامیاب نہیں ہوتا مگر سفر کرنے سے اللہ تعالےٰ ایسے وسائل پیدا کر دیتا ہے۔ جو اس کی کامیابی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اور انسان تنگی سے نکل کر فراخی میں داخل ہو جاتا ہے۔

روزہ اور قانون کی پابندی

فرضیت روزہ کے لیے خطاب اہل ایمان سے ہوا ہے۔ یَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا گویا روزہ ایمان کا تقاضا بھی ہے جو شخص ایماندار ہونے کا دعویدار ہے۔ اُسے روزے کی فرضیت پر ایمان لانا ہوگا۔ ورنہ وہ اہل ایمان ہونے کا تقاضا پورا نہیں کرتا۔ علمائے کرام فرماتے ہیں روزہ کا ایک اہم فائدہ یہ ہے۔ کہ یہ قانون کی پابندی سکھاتا ہے روزہ کے ذریعے انسان ایک مقررہ وقت کے لیے حلال اکل وشرب سے بھی رُک جاتا ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے۔ کہ انسان قانون کا پابند ہو جائے۔ جب وہ قانون کی پابندی کے ذریعے حلال چیزوں سے رُک سکتا ہے۔ تو وہ حرام چیزوں سے بھی رُک جائے گا۔ کھانے پینے اور نفسانی خواہش کی تکمیل سے انسان کا نفس مزید پھلتا پھولتا ہے۔ اسے کمزور کرنے کے لیے اسلام نے روزہ کا قانون نافذ کیا۔ تاکہ نفس انسانی کو فاقہ کے ذریعے کمزور کیا جا سکے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ کا یہی مطلب ہے کہ انسان میں تقویٰ جیسی اچھی خصلت پیدا ہو جائے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ روزے کے ذریعے جب نفس کو مرغوبات سے روکنے کی عادت پڑ جائیگی۔ تو پھر اُسے شرعاً حرام چیزوں سے روکنا آسان ہو جائے گا۔ جب روزہ کی وجہ سے قوت نفس اور شہوت میں ضعف آئیگا، تو تم متقی بن جاؤ گے۔ روزہ میں یہ بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ کہ اس سے سرکش نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور شریعت کے احکام پہ پابندی ہونے لگتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں تو چالیس روزے رکھنے کا ذکر آتا ہے۔ اور نصاریٰ پر ایک ماہ کے روزے فرض تھے۔ مگر انہوں نے اس حکم میں تبدیلی پیدا کر لی۔ طبرانی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ عیسائیوں کا کوئی بادشاہ بیمار ہو گیا۔ گرمی کے روزے تھے۔ اس نے کہا۔ کہ اگر اللہ تعالےٰ نے تندرستی دی، تو ہم تیس کی بجائے چالیس روزے رکھیں گے۔ اسی طرح ایک اور بادشاہ بیمار ہوا تو اس نے کہا کہ تندرست ہو کر مزید سات روزے رکھوں گا۔ اس طرح انہوں نے روزوں کی تعداد سینتالیس تک پہنچا دی۔ اس کے بعد عیسائی علماء کا اجتماع ہوا۔ اور انہوں نے ۴۷

فیصلہ کیا کہ سینتالیس کی بجائے پورے پچاس روزے مقرر کر دینے چاہئیں۔ البتہ موسم گرما کی بجائے موسم بہار میں رکھ لیا کریں گے۔ تو اس طرح انہوں نے اپنی مرضی سے روزوں کی تعداد اور موسم میں تغیر و تبدل کر دیا۔

مولانا شیخ الہندؒ فرماتے ہیں۔ کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ روزوں میں تبدیلی نہ کرنا بلکہ ہر سال ماہ رمضان المبارک کے روزے رکھنا خواہ وہ گرمی میں آئیں یا سردی میں۔ بہار میں آئیں یا خزاں میں۔ چنانچہ قمری سال کے مطابق رمضان المبارک مختلف موسموں میں آتا رہتا ہے۔ متقی بننے کا مقصد یہ ہے۔ کہ انسانی نفس اس کے تابع ہو جائے اور احکام شریعت پر عمل آسان ہو جائے۔ فرمایا اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ یہ گنتی کے دن ہیں۔ یعنی پورے سال میں انتیس یا تیس دن کے روزے ہیں۔ ان کو احکام الٰہی جانتے ہوئے خوشی خوشی سے پورا کرو اور اپنے اندر تقویٰ جیسی عظیم خصلت پیدا کرو۔

مریض اور مسافر کا روزہ

فرمایا ماہ رمضان المبارک میں روزے رکھنے کا حکم تندرست اور مقیم کے لیے ہے، جسے روزہ رکھنے میں غیر معمولی مشقت نہ برداشت کرنی پڑے۔ البتہ ایسے لوگوں کے لیے روزے مؤخر بھی کیے جا سکتے ہیں۔ جو مقررہ ماہ میں روزہ رکھنے کے قابل نہ ہوں۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا پس جو کوئی تم میں سے بیمار ہو۔ اَوْ عَلٰى سَفَرٍ یا مسافر ہو فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ تو یہ گنتی دوسرے دنوں میں پوری کرے۔ مثال کے طور پر کسی شخص کو بخار آتا ہے ظاہر ہے کہ اس حالت میں خاص طور پر گرمی کے موسم میں وہ زیادہ دیر تک بھوک پیاس برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر روزہ رکھنے کی کوشش کرے گا تو بیماری میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ تو ایسی صورت میں اُسے اجازت ہے۔ کہ روزہ نہ رکھے۔ بلکہ رمضان کے بعد چھوٹ جانے والے روزوں کے بدلے روزے رکھ لے۔

اسی طرح مسافر کو بھی روزے مؤخر کرنے کی اجازت ہے۔ سفر آرام و سکون کا ہو یا مشقت طلب، ہوائی جہاز کا ہو یا بحری جہاز کا، ریل گاڑی کا ہو یا بس کا کسی

جانور کی سواری ہو یا پیدل سفر کر رہا ہے۔ اگر اُس کا جی نہیں چاہتا تو اُسے اجازت ہے کہ روزہ قضا کر لے۔ اُس پہ کوئی حرج نہیں۔ رمضان کے بعد روزے رکھ سکتا ہے تاہم یہ گنتی پوری کرنی پڑے گی۔ اس سے بچ نہیں سکتا۔ یہ ایک قسم کا نصاب ہے جسے ہر حالت میں مکمل کرنا ہوگا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی طالب علم کسی امتحان میں شریک ہوتا ہے مگر کسی ایک یا دو پرچے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ یا سرے سے وہ پرچے دیتا ہی نہیں۔ تو اُسے وہ نصاب بہرحال امتحان کی صورت میں پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اُسے ڈگری نہیں مل سکتی۔ اسی طرح جب تک چھوڑے ہوئے روزے پورے نہیں کرے گا، اس فرض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اُسے تقویٰ کی سند نہیں مل سکتی۔

روزہ کے بدلے فدیہ

فرمایا وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ اُن پہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔ مفسرین کرام نے اس حصۂ آیت کی مختلف تفاسیر کی ہیں۔ امام ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ حکم روزوں کا حکم آنے کے بعد ابتدائی ایک دو سال کے لیے تھا جب کہ لوگ اس مشقت سے ابھی مانوس نہیں ہوئے تھے۔ اُس زمانے میں اجازت تھی کہ جو کوئی روزہ نہ رکھے اور وہ اس قابل ہو کہ ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کو دن رات کا کھانا کھلائے، تو وہ ایسا کر سکتا تھا۔ جس سے اُس کا روزہ ادا ہو جاتا تھا، اس کے بعد جب اگلی آیت نازل ہوئی، تو مریض اور مسافر کے سوا روزہ رکھنا لازم قرار دے دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ اس کے فوائد بھی سمجھا دیے گئے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ اس آیت يُطِيْقُوْنَهٗ سے پہلے لفظ لا محذوف ہے اور مراد یہ ہے کہ فدیہ ادا کرنے کی رعایت ان لوگوں کے لیے ہے۔ لَا يُطِيْقُوْنَهٗ جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ اس ضمن میں دو قسم کے لوگ آتے ہیں، اولاً وہ لوگ جو بہت بوڑھے ہو گئے ہوں۔ شیخ فانی یا عجوزہ فانیہ یعنی بہت بوڑھا مرد ہے۔ یا بہت بوڑھی عورت ہے

دو چار گھنٹے بھی بغیر کھائے پیئے نہیں رہ سکتے تو ایسے لوگوں کے لیے حکم ہے۔ کہ اگر وہ مالدار ہیں تو روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

ثانیاً: ایسے بیمار لوگ جو لمبی بیماری میں مبتلا ہیں، تندرست ہونے کی چنداں امید نہیں کہ تندرست ہو کر روزہ قضا کر لیں گے، تو ایسے لوگ بھی روزہ کے بدلے میں اُس کا فدیہ ادا کر سکتے ہیں۔ البتہ اگر بعد میں تندرست ہو جائیں۔ تو انہیں روزہ رکھنا ہوگا، اس کے بغیر اُن کی فرضیت ادا نہیں ہوگی، البتہ ادا شدہ فدیہ کا انہیں علٰحدہ ثواب حاصل ہوگا۔ اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ روزہ کے بدلے میں فدیہ ادا کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ اس حالت میں روزہ نہ رکھے جب کہ پیٹ میں بچہ ہے۔ یا دودھ پینے والے بچے کی زندگی خطرہ میں ہے۔ تاہم مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا فتویٰ موجود ہے۔ کہ ایسی عورتوں کو روزہ معاف نہیں ہوگا۔ جب ان کی علت دُور ہو جائے۔ تو روزہ قضا کرنا ہوگا۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ یُطِیْقُوْنَہٗ لفظ اطاقة سے ہے اور یہ باب افعال سے ہے۔ اس کا معنی ہے جو لوگ روزے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یعنی روزے سے مانوس نہیں ہیں۔ اس کے عادی نہیں ہیں۔ وہ روزے کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس کی دوسری تفسیر یہ بیان فرمائی ہے کہ یہاں پر فدیہ سے مراد صدقہ فطر ہے۔ جو صاحب استطاعت پر واجب ہے۔ اور یہ روزوں کا کفارہ بنتا ہے۔ اس میں اور بھی کئی ایک مصلحتیں ہیں۔ بہر حال اسے صدقہ فطر پر محمول کیا گیا ہے۔ جس کی مقدار ایک مسکین کا دو وقت کا کھانا ہے یا ہر روزہ کے بدلے دو سیر گندم یا اس کی قیمت ادا کرے۔ گندم کی بجائے اگر باجرہ وغیرہ ہے۔ تو ایک صاع یعنی چار سیر ادا کرنا ہوگا اور گندم ہے تو نصف صاع یعنی دو سیر۔

روزہ رکھنا ہی بہتر ہے

فرمایا فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ اور جو کوئی خوشی سے نیکی

کریگا، تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ یعنی اگر شرعی عذر کے باوجود روزہ رکھتا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے اور روزہ رکھنے والے کے لیے بہتر ہے۔ وَأَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی اگر تم روزہ رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ روزہ رکھنے میں بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اسکے ذریعے نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ قانون کی پابندی کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے شریعت کے جملہ احکام کی تعمیل آسان ہوتی ہے۔ اور انسان کے لیے بلندیِ درجات کا ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو، تو تمہارے لیے روزہ چھوڑنے کی بجائے روزہ رکھنا ہی بہتر اور افضل ہے۔

درس ہفتاد وسہ (۷۳) — آیت ۱۸۵

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ
وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ
الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلٰى سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ
بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا
هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۸۵﴾

ترجمہ :- رمضان کا مہینہ وہ ہے جس کے اندر قرآن نازل کیا گیا ہے - وہ قرآن جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور ہدایت کی واضح اور روشن دلیلیں ہیں اور فیصلہ کرنے والی بات ہے۔ پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں حاضر ہو جائے پس اُس کو اسکا روزہ رکھنا چاہیے۔ اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو، پس دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ دشواری کا ارادہ نہیں کرتا۔ اور تاکہ تم گنتی پوری کرو۔ اور تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو۔ جیسا کہ اُس نے تمہیں ہدایت دی ہے

اور تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ ﴿۱۸۵﴾

گذشتہ سے پیوستہ

انسان کے متقی بننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے اصول بیان فرمائے ہیں۔ پہلا قانون قصاص کی پابندی ہے اور دوسرا اصول مال کے معاملہ میں عدم زیادتی ہے۔ تاکہ کسی شخص کی حق تلفی نہ ہو۔ تقویٰ کا تیسرا اصول مقررہ اوقات میں روزہ رکھنا ہے۔ یہ سب ایسے افعال ہیں، جن کی ادائیگی سے ایک مسلمان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے روزہ کی فرضیت بیان فرمائی۔ کہ ایمان والوں پر ایک ماہ کے روزے فرض کئے گئے ہیں۔ یہ چند گنے ہوئے دن ہیں۔ جو کہ پورے سال میں انتیس یا تیس دن ہیں اور جن میں روزہ رکھنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے عاشورہ کا روزہ فرض تھا۔ یہ روزہ حضور نبی علیہ السلام نے بھی رکھا اور دوسرے لوگوں سے بھی رکھوایا گیا، بلکہ بچے بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد جب رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم نازل ہوا، تو عاشورہ کے روزہ کی فرضیت ختم ہوگئی۔ البتہ عاشورہ کے دو روزے رکھنے کی اب بھی بڑی فضیلت ہے۔ اور یہ بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ یوم عرفہ کا روزہ بھی بڑے ثواب کا حامل ہے۔ مگر فرض نہیں ہے اسی طرح ایام بیض یعنی ہر ماہ کے درمیانی تین روزے مستحب ہیں۔ رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے بہت بڑے اجر کا موجب ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے، اور اس کے بعد چھ روزے شوال سے ملا لیے، وہ شخص ایسا ہے۔ جیسے پورے سال کا روزے دار ہو۔ تاہم فرضیت صرف رمضان کے روزوں کی ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ فرمایا۔

ماہ رمضان اور قرآن پاک

اب آیت زیر درس میں ماہ رمضان کے اُن گنے چنے دنوں کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ رمضان کا مہینہ وہ مبارک مہینہ ہے۔ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ جس میں قرآن پاک نازل ہوا۔ یہ بڑی برکتوں والا مہینہ ہے۔ اور سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اس میں قرآن پاک کا نزول ہوا۔ نزول قرآن کے سلسلہ میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ منجملہ اُن کے یہ ہے۔ کہ اس ماہ میں قرآن کریم کو نقل کر کے لوحِ محفوظ سے بیت العزت میں رکھا گیا جو کہ آسمان دنیا یعنی پہلے آسمان پر واقع ہے۔ امام جعفر صادقؒ کا قول ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے دو نعمتیں سب سے بڑی ہیں۔ ایک حضور علیہ السلام کا وجود مبارک اور دوسرا

قرآن پاک، کتابیں تو دنیا میں ہزاروں لاکھوں ہیں۔ مگر قرآنِ حکیم کوئی اور ہی چیز ہے۔

این کتاب نیست، چیزے دیگر است

بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس کا حکم دوسرے کلاموں جیسا نہیں ہے لوگوں کا مقولہ ہے کلام الملوک ملوک الکلام بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے مگر یہ کلام تو مالک الملک کا ہے۔ جو کہ شہنشاہِ مطلق ہے، اس کا کلام کس قدر قدر و منزلت کا حامل ہو گا۔ لہذا یہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے بہت بڑا انعام ہے۔

انسان بڑا ہی ناشکر گزار ہے۔ جس نے قرآن پاک جیسی بڑی نعمت کی قدر نہیں کی۔ جس قوم کے پاس یہ کلام ہو، وہ بھی بھٹکتی پھرے تو کتنی افسوس کی بات ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص کے پاس قرآن پاک جیسی نعمت موجود ہو، وہ اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے۔ خدا تعالیٰ کے ہاں وہ بڑی عزت والا ہے مگر افسوس کہ حاملِ قرآن نے اغراضِ فاسدہ اور غفلت کی وجہ سے اس کی کوئی قدر نہیں کی، خود تو اس سے مستفید نہیں ہو رہے ہیں۔ باقی دنیا کو بھی محروم رکھا ہوا ہے۔ مسلمانوں کے پاس اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت موجود ہے۔ مگر پھر بھی یہ ناشکر گزار ہیں۔

مختلف مہینوں کی وجہ تسمیہ

شہر کے معنی مہینہ کے ہیں اور اس کی جمع شہور آتی ہے۔ رمضان کا معنی تپش ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ فرضیت روزوں کے زمانہ میں گرمی کے موسم میں رمضان کا مہینہ آیا تھا۔ اس واسطے اسے رمضان یعنی گرمی یا تپش والا مہینہ کہتے ہیں۔ رجب سے مراد عزت والا یعنی معظم مہینہ ہے۔ جمادی الاولیٰ اور جمادی الآخری سردی کے موسم کے مہینے تھے۔ جمد کا معنی منجمد ہونا یا جم جانا ہے۔ اسی طرح شعبان کا معنی پراگندہ ہونا ہے۔ اس موسم میں قبائل ادھر ادھر پراگندہ ہو جاتے تھے ذی قعدہ، قعود یعنی بیٹھنے کے معنی میں آتا ہے۔ ذوالحج کا یہ نام اس لیے ہے کہ اس مہینہ میں حج ادا کیا جاتا ہے۔ محرم سے مراد حرمت والا مہینہ ہے۔ صفر

سے مراد خالی مہینہ ہے اسی طریقہ سے ربیع بہار کو کہتے ہیں۔ ربیع الاوّل اور آخر اسی مناسبت سے نام ہیں۔

الغرض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ رمضان کو یہ نام تپش کی وجہ سے ملا ہے۔ جب ہر چیز گرم ہو کر پگھلنے لگتی ہے، ہمیں پگھلنے اور پگھلانے کا معنیٰ بھی پایا جاتا ہے۔ اسکی ایک توجیہہ یہ بھی کی جاتی ہے۔ کہ روزے رکھنے سے مسلمان کو جسمانی طور پر تکلیف پہنچتی ہے، جب وہ اس تکلیف کو برداشت کرتا ہے تو اس کے گناہ پگھلنے لگتے ہیں۔ گویا یہ مہینہ گناہوں کو پگھلانے والا مہینہ ہے۔

مسئلہ خلق قرآن

ایک زمانہ میں مسئلہ خلق قرآن پیدا ہوا تھا۔ بعض گمراہ لوگوں نے قرآن پاک کے کلام اللہ ہونے کا انکار کیا۔ اس کے بجائے قرآن کو مخلوق کہا گیا۔ اور یہ فتنہ دو تین صدیوں تک قائم رہا، البتہ اور کئی قسم کے فتنے موجود ہیں۔ اس زمانے میں اس مسئلہ کی وجہ سے اللہ والوں نے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں۔ کئی علماء اسی مسئلہ کی وجہ سے سولی پر لٹک گئے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے چار حکومتوں کا زمانہ اسی ابتلاء میں گذارا۔ اُن پر مسلسل ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹے گئے۔ اُن سے قرآن پاک کے مخلوق ہونے کا فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر آپ نے ہمیشہ انکار کیا، فرماتے تھے۔ میرے پاس اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت ہے تم کوئی اور چیز لے کر آئے ہو تا کہ میں اس کے مطابق بات کروں۔ آپ نے ہزار مصائب برداشت کیے مگر قرآن و سنت کے خلاف فتویٰ نہ دیا۔

نزولِ قرآن

قرآن پاک کے رمضان المبارک میں نزول کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ سعید بن جبیرؒ، اور امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک کو ماہ رمضان کی ایک رات لیلۃ القدر میں لوحِ محفوظ سے بیت العزت میں اتارا۔ اور پھر وہاں سے پورے تیئس ۲۳ برس میں تھوڑا تھوڑا کر کے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، نزول قرآن کی اس رات کے متعلق خود رب العزت نے فرمایا لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ یہ تو ایک ہزار مہینوں سے

بھی زیادہ بہتر ہے۔ اگر یہ میسّر آجائے۔ تو اس ایک رات کی عبادت تراسی سال کی عبادت سے زیادہ افضل ہے۔ یہ بڑی فضیلت والی رات ہے۔

دیگر آسمانی کتابوں کی فضیلت کے متعلق بھی بہت سی روایات آئی ہیں۔ مثلاً طبرانی شریف کی حدیث میں ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کو نازل ہوئے۔ توراۃ چھ رمضان کو اور انجیل ۱۳ ر رمضان کو نازل ہوئی۔ قرآن پاک چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔ یہ تفسیری روایات سے معلوم ہوا ہے۔ بہرحال رمضان المبارک کو قرآن پاک کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ یہ وہ ماہ مبارک ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت بڑی نعمت عطا فرمائی۔

تلاوتِ قرآن

اس ماہِ مبارک کو قرآن پاک کے ساتھ بطور یادگار خصوصی لگاؤ ہے۔ اسی لیے حکم ہے۔ کہ اس مہینہ میں قرآن پاک کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کی جائے اگرچہ محض تلاوت منتہائے مقصود نہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے۔ کہ اس سے نصیحت پکڑی جائے اس کے بتلائے ہوئے اصولوں کی پیروی کی جائے اور اس کے احکام پر عمل کیا جائے۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ "مقصد از نزولِ قرآن محض تلفظ نیست" اگرچہ اس زمانہ میں محض تلاوت بھی غنیمت ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ قرآن پاک کا ایک ایک حرف پڑھنے سے دس دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ فرمایا جب کوئی شخص خلوصِ دل کے ساتھ تین حرف الٓمّٓ پڑھتا ہے۔ تو تیس ۳۰ نیکیوں کا مستحق ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے کلام کی اس قدر برکت ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ قرآن پاک کے علاوہ باقی جو بھی کلام یا اوراد ہیں، انہیں بغیر سمجھے پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ صرف کلام پاک ہی ایک ایسا کلام ہے۔ جسے سمجھ کر یا بے سمجھے ہر حالت میں پڑھنے سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس کے لیے صرف ایمان اور نیت صالحہ کی ضرورت ہے۔

قرآن ذریعہ ہدایت ہے

قرآن کیا ہے هُدًى لِّلنَّاسِ یہ لوگوں کے لیے ہدایت کا سامان ہے،

یہ ایسی ہدایت ہے۔ جو انسان کے لیے سب سے ضروری چیز ہے آپ نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ۔ اے اللہ! ہم کو سیدھے راستے پر چلا اور ہمیں سیدھا راستہ دکھا، تو سیدھا راستہ وہی ہے جو قرآن پاک دکھاتا ہے یعنی اس طرح اعتقاد رکھو، اس طرح عمل کرو اس طرح کے اخلاق پیدا کرو اپنے معاشرتی اور معاشی مسائل کو اس طرح حل کرو، قرآن پاک متن ہے حضور علیہ السلام کی حدیث اس کی شرح ہے یہ قرآن پاک کو کھول کر بیان کرتی ہے امام شافعیؒ شاہ ولی اللہؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ ہر صحیح حدیث قرآن پاک کی شرح ہے۔ صحیح احادیث کے بغیر قرآن پاک کو سمجھنا ممکن نہیں پرویزی اور چکڑالوی محض اس لیے حدیث کا انکار کرتے ہیں کہ قرآن پاک کی من مانی تفسیریں کر سکیں۔ اس طرح کرنا گمراہی کا دروازہ کھولنا ہے۔ کیونکہ احادیث کے بغیر انسان قرآن کی منزل کو نہیں پا سکتا۔ لہٰذا جب بھی دشواری پیش آئے قرآن پاک کی طرف رجوع کرو۔ هَلۡ مِنۡ مُّدَّكِرٍ کون ہے جو اس سے نصیحت پکڑے۔ خود مفتی نہ بن بیٹھو، بلکہ فَاسۡـئَلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ" اگر تمہیں خود علم نہیں تو اہل علم کے پاس جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے قسم اٹھا کر کہا، کہ قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کا کوئی شریک نہیں۔ حضور علیہ السلام کے بعد اپنے اس دور میں اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص مجھ سے زیادہ قرآن کریم جاننے والا ہے۔ تو میں سواری پر سوار ہو کر اُس کے پاس جاؤں، خواہ مجھے کتنا ہی لمبا سفر کرنا پڑے۔ صحابہ کرامؓ نے ایک ایک حدیث کی خاطر دو دو ماہ کا سفر کیا۔ ایک ایک مسئلہ معلوم کرنے کے لیے طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مگر اس مقصد سے ہٹ کر کوئی دوسرا استفادہ حاصل نہیں کیا۔ حتیٰ کہ وہاں سے کھانا تک نہیں کھایا۔ ناشتہ تک نہیں کیا۔ اور حصول مقصد کے بعد فوراً واپس لوٹ گئے۔ ڈر تھا کہ ایسا کرنے سے کہیں ہمارے اجر میں کمی نہ واقع ہو جائے۔ وہ لوگ اتنے محتاط تھے۔ خراسان سے حجاز یا حجاز سے خراسان تک ہزاروں میل کی مسافت محض کسی آیت کی تشریح معلوم کرنے کے لیے طے کرتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن کو مولوی محمد دین قندھاریؒ کے نام سے معنون کیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب نے قرآن پاک کی چند آیات کی تفسیر سمجھنے کے لیے قندھار سے رانچی تک کا سفر اختیار کیا۔ انہوں نے مولانا کے پرچے "الہلال" میں بعض آیات کی تفسیر پڑھی، تو کچھ شبہ پیدا ہوا جسے دور کرنے کے لیے آپ نے اتنا طویل سفر کیا۔ مولانا ان دنوں رانچی میں نظر بند تھے۔ اُس شخص نے اپنا مسئلہ حل کرنے کے بعد مسجد میں نماز ادا کی اور چلتا بنا۔ مولانا نے ہر چند کوشش کی۔ کہ اس کی کچھ خاطر مدارت کی جائے۔ اُسے واپسی کے لیے کرایہ ہی فراہم کیا جائے مگر اس شخص کا کوئی پتہ نہ چلا۔ مولانا اس کے تقویٰ سے اس قدر متاثر ہوئے۔ کہ اپنی تفسیر کو اُن کے نام سے معنون کیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ قرآن پاک لوگوں کے لیے ذریعہ ہدایت ہے۔ جو چاہے اس سے مقصد حاصل کر سکتا ہے۔

واضح اور فیصلہ کُن دلائل

فرمایا قرآن پاک سامانِ ہدایت ہی نہیں، بلکہ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ج اس میں ہدایت کے واضح دلائل موجود ہیں اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کُن بات بھی ہے۔ یہ کسی معاملہ کو ادھورا نہیں چھوڑتا، بلکہ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرتا ہے۔ کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے "لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ" تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ واضح بات کے بعد ہلاک ہو وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ" اور جو زندہ ہے۔ وہ واضح بات کے بعد زندہ رہے یعنی کسی انسان کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہنا چاہیئے۔ کہ اُسے حق و باطل کی پہچان نہیں ہو سکی۔ قرآن پاک ہر چیز کی خوب وضاحت کرتا ہے گویا قرآن پاک ہدایت بھی ہے اور فرقان بھی ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان المبارک میں تراویح ادا کی جائیں جن کے دوران قرآن پاک کی تلاوت ہو۔ اور پورے رمضان میں ہر مسلمان کے کان سے کم از کم ایک دفعہ قرآن پاک گزر جائے۔ یہ خدا تعالیٰ کی ہدایت کا پروگرام ہے اسے ہر گھر میں پڑھا جانا چاہیئے۔ اس کی اشاعت اور تعلیم عام ہو، تاکہ کوئی نفس اس سے محروم نہ رہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے

لیے رمضان کے روزے فرض کیے اور میں نے تمہارے لیے تراویح کو سنت قرار دیا۔ اس میں قرآن پاک کی زیادہ سے زیادہ تلاوت ہونی چاہیئے۔

روزہ لازم ہے

فرمایا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ جو کوئی تم میں سے ماہ رمضان المبارک کو پائے، تو اُسے روزہ رکھنا چاہیئے۔ گویا اس آیت کے ذریعے روزہ لازم قرار دے دیا گیا۔ اور اس سے پہلے روزہ کے عوض میں فدیہ کی جو رعایت دی گئی تھی، وہ ختم ہو گئی، اب سوائے عذر شرعی ہر عاقل بالغ کے لیے روزہ ضروری ہو گیا۔ عذر شرعی میں بیمار اور مسافر آتے ہیں۔ اور شرعی سفر تین دن کی مسافت ہے جو کہ ۴۸ میل بنتا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک کم از کم اس قدر سفر کرنا ہو تو روزہ قضا کر سکتا ہے۔ بعض علماء نے کم از کم مسافت ۳۶ میل بتائی ہے۔ البتہ ابوداؤد شریف کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ مَنْ كَانَ لَهُ حَمُولَةٌ جس کے پاس سفر کے لیے سواری موجود ہو، اس کے لیے بہتر ہے کہ سفر میں بھی روزہ رکھے اور اگر نہیں رکھ سکا، تو بعد میں قضا بہر حال لازم ہے۔

روزے کی قضا

فرمایا وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو، تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے۔ سال بھر میں ۲۹ یا ۳۰ دن کی گنتی پوری کرنا انسان کے اندر تقویٰ اور روحانیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بغیر تقویٰ کا ڈپلومہ نہیں ملے گا۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی طالب علم کو سند اُسی صورت میں ملتی ہے جب وہ امتحان میں پاس ہو جاتا ہے۔ لہٰذا حصول تقویٰ کے لیے روزوں کی گنتی پوری کرنا لازم ہے۔ خواہ یہ رمضان کے بعد ہی کرنی پڑے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اگر کسی شخص کے رمضان کے بعض روزے رہ جائیں اور وہ آئندہ رمضان تک اُن کی قضا نہ کر سکے۔ تو پھر ہر قضا روزہ کے ساتھ اُسے دو مُد غلہ بطور تاوان بھی ادا کرنا ہو گا۔ امام ابوحنیفہؒ کا فرمان ہے کہ تاوان ضروری نہیں ہے۔ اُسے روزوں کی قضا کرنی پڑے گی۔ خواہ آئندہ رمضان کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

اللہ آسانی چاہتا ہے

فرمایا یُرِیدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے۔ وَلَا یُرِیدُ بِکُمُ الْعُسْرَ اُسے تمہاری دشواری منظور نہیں۔ اس نے تمہاری آسانی کی خاطر تمہیں سہولتیں اور رخصتیں بھی دی ہیں۔ جیسا کہ حاملہ اور مرضعہ کو سہولت حاصل ہے۔ مقصد یہ ہے۔ کہ وَلِتُکْمِلُوا الْعِدَّۃَ تاکہ تم گنتی پوری کر لو۔ اور اس کے اثرات تمہارے اندر تقویٰ کی صورت میں ظاہر ہوں وَلِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰىکُمْ اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اُس نے تمہیں ہدایت دی ہے۔ بعض فرماتے ہیں۔ کہ اس سے وہ تکبیریں مراد ہیں۔ جو رمضان المبارک کے اختتام پر نمازِ عید پر پڑھی جاتی ہیں۔ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ اور تاکہ تم اللہ کا شکریہ ادا کر سکو۔ ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے۔ لِکُلِّ شَیْءٍ زَکٰوۃٌ ہر چیز کی زکوٰۃ ہوتی ہے وَزَکٰوۃُ الْجَسَدِ الصَّوْمُ اور جسم کی زکوٰۃ روزہ رکھنے سے ادا ہوتی ہے۔ اور اس طرح انسان اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس نے اس فریضہ کو پورا کیا۔ اور اس طرح تقویٰ اور روحانیت کو اپنایا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔

درس ہفتاد و چہار (۷۴) — آیت ۱۸۶

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾

ترجمہ: اور جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھتے ہیں، پس میں قریب ہوں۔ میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے پس چاہیئے کہ یہ لوگ میرا حکم مانیں اور چاہیئے کہ یہ مجھ پر یقین رکھیں۔ تاکہ یہ ٹھیک راہ پا جائیں (۱۸۶)

شانِ نزول

آیت زیر درس سے ماقبل اور مابعد آیات روزہ سے متعلق ہیں۔ پہلی آیت میں معذور لوگوں کو حاصل ہونے والی رعایت کا ذکر تھا۔ اور بعد والی آیت میں روزے کے احکام ہیں۔ اس درمیانی آیت میں اُس دُعا کا ذکر ہے۔ جو بندہ اپنے رب کے حضور کرتا ہے گذشتہ آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کا بیان تھا۔ اس ضمن میں بعض حضرات نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔ کہ اللہ تعالیٰ کو کس طرح پکارنا چاہیئے۔ کیا وہ انسان کے قریب ہے یا بعید۔ اگر قریب ہے تو اس کے ساتھ سرگوشی سے مناجات کریں۔ اور اگر وہ دور ہے تو زور سے پکاریں۔ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا! وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں، فَإِنِّي قَرِيبٌ تو میں ان کے بالکل قریب ہوں۔ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ میں دُعا کرنے والے کی دُعا کو سُنتا ہوں، جب وہ دُعا کرتا ہے اور مجھے پکارتا ہے۔

رمضان اور قبولیتِ دعا

روحانیت کے لحاظ سے رمضان کا مہینہ ایسے ہی ہے۔ جیسے سال بھر کے موسموں میں موسم بہار ہوتا ہے۔ جب ہر چیز اپنے جوبن پہ ہوتی ہے اسی طرح

رمضان شریف میں دوسرے مہینوں کی نسبت نیکی کی قدر و قیمت اور وقعت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ کہ نفل فرض کے برابر ہو جاتا ہے۔ اور ایک فرض ستر فرضوں کے اجر کے برابر ہوتا ہے۔ ترمذی شریف میں امام زہری کا قول ہے فرماتے ہیں تسبیحۃ فی رمضان خیر من الف تسبیحۃ فیما سواہ۔ رمضان المبارک میں اخلاص کے ساتھ کی گئی ایک تسبیح غیر رمضان کی ایک ہزار تسبیح سے بڑھ جاتی ہے۔ گویا یہ مہینہ تکمیل روحانیت کے لیے موسم بہار کا درجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا قبولیت دُعا کے لیے بھی یہ مبارک مہینہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے

دعا کی قبولیت میں زمان اور مکان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے رمضان کا مہینہ ایسا مبارک مہینہ ہے۔ جس میں دُعا زیادہ قبول ہوتی ہے۔ زمان کے لحاظ سے حضور نے جوف اللیل الآخر یعنی رات کے آخری حصہ کا ذکر فرمایا کہ قبولیت دُعا کا وقت ہوتا ہے جمعۃ المبارک کے متعلق بھی فرمایا کہ اس روز ایک ایسی گھڑی ہوتی ہے۔ جس میں دعا ضرور قبول ہو جاتی ہے۔ مکان کے لحاظ سے ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں کی گئی دعائیں لازمی قبول ہوتی ہیں جیسے مقامات مقدسہ منیٰ، عرفات، مزدلفہ، صفا و مروہ۔ بیت اللہ شریف، ملتزم حطیم وغیرہ۔

ایک حدیث میں یوں آتا ہے کہ جو شخص رمضان المبارک میں مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ناکام نہیں لوٹاتا۔ دُعا ہمارے دین کا اہم حصہ ہے۔ عبادت کا ایک اہم اصول ہے الدعاء ھو العبادۃ دُعا عبادت ہی ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ قرآن پاک میں آتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ" جو لوگ میرے سامنے دُعا کرنے سے تکبر کرتے ہیں۔ وہ ذلیل ہو کر دوزخ میں داخل ہوں گے۔ مستدرک حاکم کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں الدعاء نور المؤمن سلاح المومن، نور السمٰوٰت والارض، عماد الدین یعنی دُعا مومن کا نور ہے۔ مومن کا ہتھیار ہے۔ زمین و آسمان کا نور اور دین کا ستون ہے۔

آداب دعا

اللہ تعالیٰ کا ذکر آہستہ آواز سے کرنا چاہیئے۔ یا بلند آواز سے اس کا بیان آ چکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں بندے سے بالکل قریب ہوں۔ ایک موقع پہ سفر کی حالت تھی۔ صحابہ کرام حضور علیہ السلام کے ہم رکاب تھے۔ اور بلند آواز سے ذکرِ الٰہی یعنی تکبیر و تہلیل میں مصروف تھے آپ نے ارشاد فرمایا اِرْبَعُوْا عَلٰی اَنْفُسِکُمْ لوگو! اپنی جانوں پہ نرمی اختیار کرو۔ تم جس ذات کو پکار رہے ہو، وہ بعید نہیں ہے۔ وہ تو قریب ہے۔ لہذا بلند آواز سے چیخ و پکار نہ کرو۔ ترمذی شریف کی حدیث میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اور قرآن کریم میں بھی موجود ہے" وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ " ہم تو انسان کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ لہذا اُسے آہستگی سے پکارو اور اس کے سامنے آہستہ اور خاموشی سے دُعا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً " اپنے رب کو عاجزی سے پوشیدہ اور گڑگڑا کر پکارو۔

البتہ اونچی آواز سے دُعا کرنا بھی جائز ہے۔ لیکن بلند آواز اس جگہ پہ ہوگی جہاں کسی کو تکلیف نہ پہنچتی ہو۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ آواز بلند کرنے سے اگر کسی کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہو یا تلاوت متاثر ہوتی ہو تو پھر بلند آواز سے دُعا کرنا بھی مکروہ ہے۔ لہذا آہستہ آواز سے پکارنا ہی بہتر ہے اگرچہ با آواز بلند بھی روا ہے حضرت زکریا علیہ السلام کے بیان میں خود قرآن پاک کا ارشاد ہے اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا " جب کہ وہ چپکے چپکے اپنے رب کے سامنے دُعا کر رہے تھے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد بھی ہے۔ خَيْرُ الذِّكْرِ مَا يَخْفٰى بہتر ذکر وہ ہے جو مخفی ہو دوسری جگہ فرمایا خَيْرُ الذِّكْرِ الْخَفِيُّ وَخَيْرُ الرِّزْقِ مَا يَكْفِيْ بہترین ذکر وہ ہے جو پوشیدہ ہو اور بہترین روزی وہ ہے جو کفایت کر جائے۔

غرضیکہ مخفی ذکر میں ایک تو دوسرے کی ایذا رسانی نہیں ہوتی اور دوسرے

ریاکاری سے بچ جاتا ہے۔ لوگ بلند آواز سے ذکر و اذکار کرتے ہیں اور درود شریف پڑھتے ہیں۔ لاؤڈ سپیکر کھول کر اہل محلہ بیماروں اور دیگر عبادت گزاروں کے لیے ایذا رسانی کا باعث بنتے ہیں۔ دوسروں کی عبادت میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ یہ اچھی علامت نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے دوسروں کو تکلیف ہو رہی ہے۔ ایسی صورت میں آپ کی عبادت اللہ کی بارگاہ میں باعث گناہ ہو سکتی ہے۔

بہر حال ماہ رمضان سے متعلق دو آیات کے درمیان دُعا کا ذکر اس لیے ہوا۔ کہ اس ماہ مبارک میں دُعا زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ میرے بندے جب بھی مجھے پکاریں، میں قریب ہوں دعا کرنے والے کی دُعا سنتا ہوں اور اُسے قبول کرتا ہوں مگر دو شرائط کے ساتھ۔ ایک یہ کہ دُعا کرنے والا میرے حکم کو مانے اور دوسری یہ کہ وہ ایمان رکھتا ہو۔

خاندان شاہ ولی اللہؒ

شاہ ولی اللہؒ دہلوی کا خاندان برصغیر پاک و ہند کا مشہور خاندان ہے۔ اس خاندان کے علمی کارنامے ساری دنیا میں مشہور رہیں۔ آپ کے والد بزرگوار مولانا شاہ عبدالرحیمؒ بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ آپ ان پانچ سو علماء کی مجلس کے رُکن تھے جنہیں اورنگ زیب عالمگیرؒ نے فتاویٰ عالمگیری مرتب کرنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ سارے علماء بادشاہ سے تنخواہ پاتے تھے۔ مگر شاہ عبدالرحیمؒ کو یہ چیز کھٹکتی تھی۔ اُن کا ضمیر تنخواہ لینا پسند نہیں کرتا تھا۔ جب عالمگیرؒ نے آپ کا نام اُس مجلس سے خارج کر دیا۔ تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ کہ اُس نے انہیں اُس معاوضے سے بچا لیا جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے اس کے بعد آپ نے مدرسہ قائم کر کے درس و تدریس کا کام شروع کر دیا۔ آپ امام مجدد الف ثانیؒ کے مریدوں کے مرید تھے۔

شاہ ولی اللہؒ بارہویں صدی کے مجدد تھے۔ آپ نے دین اور علم کی تجدید کی آپ نے سب سے پہلے فارسی زبان میں فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن کے نام سے

سے قرآن پاک کا ترجمہ لکھا۔ اُس وقت فارسی ہی دفتری زبان تھی۔ لہٰذا اس زبان میں استفادہ کا زیادہ امکان تھا۔ اُس وقت اردو زبان ابھی ترقی کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ تاہم آپ کے فرزند ارجمند شاہ رفیع الدینؒ نے اُردو زبان میں قرآن پاک کا سب سے پہلا ترجمہ کیا۔ اگرچہ آج وہ زبان پرانی ہو چکی ہے۔ تاہم یہ لفظی ترجمہ کمال درجے کا ہے آپ نے قرآن پاک کی تفسیر و تشریح کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اور آپ کے ایک شاگرد نے آپ کے ارشادات نوٹ کر کے سورۃ بقرہ کا حصہ شائع بھی کیا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی تفسیر عزیزی بھی اپنی نوعیت کی بہترین تفاسیر میں سے ہے یہ تفسیر شاہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے نہیں لکھی، آپ تو نابینا ہو چکے تھے۔ اس لیے یہ خدمت آپ کے شاگردوں نے انجام دی۔ آپ تو زبانی تفسیر بیان کرتے تھے۔ ہفتہ میں ایک دن وعظ بھی کرتے تھے۔ جس میں ہزاروں لوگ شریک ہو کر فیضیاب ہوتے تھے۔ بعض اوقات غیر مسلم بھی اس پاکیزہ مجلس میں شریک ہوتے اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر جاتے، وعظ اتنا مؤثر ہوتا تھا کہ اپنا محاورہ درست کرنے کے لیے شاعر لوگ بھی مجلس وعظ میں بیٹھ جاتے۔ اُس زمانے میں مومن خان مومن بڑا مشہور شاعر ہوا ہے۔ صحیح العقیدہ آدمی تھا۔ شاہ صاحب کی محفل میں شریک تھا، کسی نے پوچھا آپ تو وعظ وغیرہ کے شائق نہیں ہیں، آپ کیسے تشریف لائے۔ تو وہ کہنے لگا کہ شاہ صاحب کی زبان کی شستگی حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتا ہوں۔ آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہم لوگ محاورہ میں استعمال کر کے اپنی شاعری کو چمکاتے ہیں۔

مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں۔ کہ اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو کہا جا سکتا تھا۔ کہ امت نے قرآن پاک کا حق ادا کر دیا ہے۔ غرضیکہ یہ تفسیر پُر مغز، با محاورہ اور حکمت آمیز تفسیر ہے۔ یہ تفسیر قرآن پاک کے آخری دو پاروں اور دوسرے پارہ میں كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ تک ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب وفات پا گئے اور یہ سلسلہ یہیں رُک گیا۔ بہر حال جتنا حصّہ بھی میسر ہے، حکیمانہ تفسیر کے لحاظ سے بہترین تفسیر ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ نے بھی قرآن پاک کا اُردو ترجمہ کیا۔ جسے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے مزید سلیس کیا ہے۔ مولانا شیخ الہندؒ کا ترجمہ جو میرے سامنے ہے، وہ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کی آسان صورت ہے۔ آپ نے ایڈورڈ روڈ دہلی کی اکبری مسجد میں بارہ سال تک اعتکاف کیا اور یہ ترجمہ لکھا۔ جو کہ بالکل بامحاورہ اور سلیس ترین ہے۔ تاج کمپنی اور دیگر اداروں نے اس کے بیشمار ایڈیشن شائع کیے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ نے بھی آج سے اسیؒ برس قبل قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر لکھی۔ آپ نے ترجمہ قرآن کو اور زیادہ آسان کرنے کی کوشش کی۔ اپنی نوعیت کی یہ بھی کمال درجے کی کاوش ہے۔ اس کے بعد اور بھی بہت سے حضرات نے قرآن پاک کے تراجم لکھے ہیں۔

قربِ خداوندی

الغرض! شاہ رفیع الدینؒ تفسیر رفیعی میں فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قربِ خداوندی کی کئی ایک صورتیں ہیں، مثلاً خدا تعالیٰ باعتبار ذات قریب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام موجودات میں کوئی ایک ذرہ بھی ایسا نہیں، جس کا قیام اور بقا خدا تعالیٰ کے وجود کے بغیر حاصل ہو۔ خدا تعالیٰ کی صفت قیومیّت کی وجہ سے ہر چیز کو وجود حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ وجود اور ذات کے اعتبار سے قریب ہے۔

علم اور قدرت کے لحاظ سے بھی خدا تعالیٰ قریب ہے۔ کیونکہ اُس کے علم، ارادے اور تاثیر کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ محبت اور حمایت کے اعتبار سے بھی قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ تجلی کے اعتبار سے بھی قریب ہے، جب انسان اللہ تعالیٰ کو اپنے دل میں یاد کرتا ہے، تو اُدھر سے تجلی پڑتی ہے اسی طرح عبدیت کے رابطہ کے اعتبار سے بھی خداوند تعالیٰ قریب ہے، انبیاء علیہ السلام کو بارگاہِ خداوندی کے ساتھ براہ راست رابطہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ رابطہ وحی کی صورت میں ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ کو انبیائے کرام کے تبلانے سے قربِ خداوندی حاصل ہوتا ہے۔ اور عام لوگوں کو رابطہ بندگی کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے

عام لوگ بندگی کے ذریعے اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اسکی عبدیت کا اقرار کرتے ہیں کہ ہم تیرے محتاج بندے ہیں، تو اُن کو بھی قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ یہ قرب کی مختلف صورتیں ہیں۔

بعض چیزیں قرب خداوندی کے منافی ہوتی ہیں، مثلاً شہوت قرب الٰہی سے محروم کر دیتی ہیں۔ جو شخص خواہشات میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اللہ تعالیٰ سے دور ہو گیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے شریعت میں ایسے احکام مقرر فرمائے ہیں جنکی بجا آوری سے بندوں کو اللہ کا قرب ملتا رہتا ہے۔ نماز ہی کو لے لیجیئے۔ یہ ایسی عبادت ہے جس کی ادائیگی سے دنیاوی خواہشات زائل ہو کر قرب خداوندی کا سبب بنتی ہے زکوٰۃ ادا کرنے سے مال کی محبت دل سے نکل جاتی ہے۔ ایسا شخص مال خرچ کرنے پر دلیر ہو جاتا ہے، جسکی وجہ سے اُسے قرب خداوندی حاصل ہوتا ہے۔ روزہ کے ذریعے انسان خور دونوش کی خواہشات پہ قابو پاتا ہے۔ اور قرب الٰہی حاصل کرتا ہے حج کا فریضہ ادا کرنے سے انسان کی خورش پوشی کی خواہش کو دھچکا لگتا ہے۔ کیونکہ احرام کی حالت میں ہر شاہ و گدا ایک ہی لباس میں ملبوس ہوتے ہیں۔ یہ بھی قرب خداوندی کی نشانی ہے۔ جہاد جیسی عبادت سے لذات اور تنعمات سب ختم ہو جاتے ہیں اور قرب الٰہی حاصل ہو جاتا ہے یہ قرب خداوندی کی مختلف شکلیں اور اس کے درمیان رکاوٹیں ہیں۔

قبولیتِ دُعا

دُعا کی قبولیت کے ضمن میں دو باتیں بڑی اہم ہیں۔ ایک بات دُعا کرنے کے متعلق ہے۔ اور دوسری اس کے مبادی کے سلسلہ میں ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ دُعا کی قبولیت رزق حلال کے ساتھ مشروط ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ حلال رزق کھاؤ گے تو دُعا قبول ہو گی۔ دوسری چیز یہ ہے کہ دل کی پوری توجہ ساتھ ہونی چاہیئے۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَقْبَلُ دُعَآءً مِّنْ قَلْبٍ لَاہٍ غَافِلٍ یعنی اللہ تعالیٰ اُسی دُعا کو قبول فرماتے ہیں جو عاجزی کے ساتھ دل کی گہرائیوں اور پوری توجہ کے ساتھ کی گئی ہو۔ جو

غافل ہے لہو و لعب میں مشغول ہے۔ اُس کی دُعا قبول نہیں کی جاتی۔ نیز یہ بھی آتا ہے کہ دُعا جب پورے یقین کے ساتھ کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرمائیں گے۔

حضرت یحییٰ معاذ رازیؒ بڑے پائے کے بزرگ ہوئے ہیں۔ ایک موقع پر فرمایا کَیْفَ اَدْعُوْكَ وَاَنَا اٰثِمٌ۔ یعنی پروردگار! میں تجھ سے کیسے دُعا کروں۔ کیونکہ میں تو گنہگار ہوں۔ پھر جلدی سے فرمایا کَیْفَ لَا اَدْعُوْكَ وَاَنْتَ کَرِیْمٌ میں تیرے سامنے کس طرح نہ دُعا کروں حالانکہ تو کریم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے وہ حیا کرتا ہے۔ جب اس کا بندہ دُعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس بات کو ناپسند کرتا ہے۔ کہ بندے کے ہاتھ خالی لوٹا دے لہٰذا اس کی دُعا ضرور قبول کر لیتا ہے اور حدیث شریف میں ایسی دُعا سے پناہ مانگی گئی ہے۔ جو قبول نہ ہو۔

دُعا کی قبولیت کا معنیٰ بھی سمجھ لینا چاہیئے۔ قبولیت دعا صرف اسی چیز کا نام نہیں کہ انسان جو مانگے فوراً مل جائے بلکہ کسی چیز کا حاصل ہونا تو حکمتِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اور بعض اوقات انسانی ذہن بالکل بچوں والی حرکات کر بیٹھتا ہے وہ اللہ سے ایسی چیز طلب کرتا ہے جو اس کی حکمت کے مطابق انسان کے لیے بہتر نہیں ہوتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ایسی چیز اس کے مقدر میں نہیں کرتا۔ انسان سمجھتا ہے کہ اُس کی دُعا قبول نہیں ہوئی۔ ________ حالانکہ اُس چیز کا نہ ملنا ہی اُس کی خیر خواہی میں ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی ناسمجھ بچہ اصرار کرے کہ آگ کا انگارہ اُس کے ہاتھ میں پکڑا دیا جائے۔ مگر کون عقلمند ہوگا جو بچے کی یہ خواہش پوری کریگا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کی دُعا قبول ضرور کرتا ہے مگر اپنی مصلحت کے مطابق۔ حضور علیہ السلام نے قبولیت دُعا کی تین صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ جب دُعا مصلحتِ خداوندی کے مطابق ہوتی ہے، تو وہ فوراً قبول کر لی جاتی ہے۔ اور بندہ کو اسکی مطلوبہ چیز دے دی جاتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے۔ کہ مطلوبہ شے تو بندہ کو نہیں ملتی مگر اُس دُعا کی برکت سے بندہ پر نازل ہونے

والی کوئی مصیبت ٹال دی جاتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ جب بندہ کی دُعا نکلتی ہے۔ تو وہ آنے والی مصیبت کے ساتھ ٹکراتی ہے۔ اور وہ اُسے نیچے نہیں آنے دیتی حتیٰ کہ صور اسرافیل پھونکا جائے۔ فرمایا دُعا کی قبولیت کی تیسری صورت یہ ہے کہ اُسے دُعا کرنے والے کے لیے ذخیرہ آخرت بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ قیامت کے دن دعاگو کو پتہ چلے گا۔ کہ دعاؤں کے کتنے ذخیرے اس کے لیے موجود ہیں۔ اُس دن بندہ خواہش کرے گا۔ کاش کہ دنیا میں اُس کی کوئی دُعا قبول ہی نہ ہوتی اور وہ سب کی سب اُس کے لیے آخرت کا ذخیرہ ہی بن جاتی۔

فرمایا جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق سوال کریں تو میں تو قریب ہوں میں ہر پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں۔ جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے۔ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي پس چاہیئے کہ وہ میرے حکم کی تعمیل کریں۔ وَلْيُؤْمِنُوا بِي اور چاہیئے کہ وہ مجھ پر یقین رکھیں مجھ پر ایمان کامل رکھیں لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ تاکہ وہ راہ پائیں۔ یعنی انہیں نیک راہ اُس وقت نصیب ہوگی جب وہ تعمیل حکم کریں گے اور ایمان لائیں گے۔

درس ہفتاد و پنج (۷۵) — آیت ۱۸۷

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِى الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

ترجمہ :۔ حلال قرار دیا گیا ہے تمہارے لیے روزہ کی راتوں میں اپنی عورتوں کے ساتھ بے پردہ ہونا۔ وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہیں۔ اور تم اُن کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ کہ تم اپنی جانوں کے ساتھ خیانت کرتے تھے پس اللہ نے تمہارے اوپر رجوع فرمایا ہے مہربانی کے ساتھ، اور تم کو معاف کر دیا ہے۔ پس اب ملو عورتوں سے اور تلاش کرو وہ چیز جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ صاف ظاہر ہو جائے تمہارے لیے سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے فجر سے۔ پھر پورا کرو روزہ کو رات تک۔ اور نہ ملو عورتوں سے اس حال میں کہ تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھنے والے ہو۔ یہ اللہ کی قائم کردہ حدیں ہیں پس اُن کے قریب نہ جاؤ۔ اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ متقی بن جائیں۔ ﴿۱۸۷﴾

گزشتہ سے پیوستہ

حصول تقویٰ کے کئی ایک ذرائع ہیں۔ منجملہ اُن کے روزہ بھی ایک ہے۔
اس سے پہلے روزے کی فرضیت اور اسکے لیے دنوں کے تعین کا بیان ہو چکا ہے اس کے بعد صدقہ فطر کا مسئلہ اور رمضان المبارک کی فضیلت کا بیان ہوا۔ پھر قرآن کریم کے نزول کا ذکر، اور رمضان کے مسائل کا تذکرہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی تکبیر بیان کرنے اور اس کا شکر ادا کرنے کا حکم ہوا۔

شانِ نزول

اِس آیت میں اللہ تعالےٰ نے روزے کے بعض دیگر مسائل بیان فرمائے ہیں۔
فرضیت رمضان سے پہلے یہود و نصاریٰ چوبیس (۲۴) گھنٹے کا روزہ رکھتے تھے اور سحری نہیں کرتے تھے۔ جب مسلمانوں پر رمضان کے روزے فرض ہوئے تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فَرْقُ مَا بَيْنَنَا وَبَيْنَ اَهْلِ الْكِتٰبِ اَكْلَةُ السَّحَرِ یعنی ہمارے روزے اور اہل کتاب کے روزے میں سحری کھانے کا فرق ہے۔ فرضیت رمضان کے ابتدائی عرصہ میں ہماری شریعت میں بھی یہ قانون تھا کہ رات کو نماز عشاء کے بعد یا ایک دفعہ سو جانے کے بعد کھانا پینا اور مباشرت منع تھی۔ عشاء کی نماز یا سونے سے پہلے پہلے کھانا پینا اور مباشرت جائز تھی۔
بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام کے ایک صحابی قیس بن صرمہ انصاریؓ کاشت کار تھے۔ دن بھر کی مشقت کے بعد گھر آئے تو بیوی سے کھانا طلب کیا۔ عورت نے خود روزہ رکھا ہوا تھا، گھر میں کھانا نہیں تھا۔ وہ اپنے پڑوس یا رشتہ داروں کے ہاں کھانا لینے چلی گئی۔ واپس آئی تو شوہر نیند کے غلبہ کی وجہ سے سو گیا تھا۔ اُسے سخت افسوس ہوا۔ کہ سونے کے بعد اٹھ کر اب کھانا کھانا جائز نہیں۔ لہذا صحابی رسول کو اگلے دن کا روزہ بغیر کھائے پیئے رکھنا پڑا۔ دوپہر تک صحابی رسول پر غشی طاری ہو گئی۔ سخت موسم اور مسلسل دو روز کے روزہ کی وجہ سے نڈھال ہو چکے تھے۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ جس میں آسانی پیدا کر دی گئی۔ اور رات کے وقت کھانا پینا اور عورت سے مباشرت جائز قرار دے دی گئی۔
بعض روایات میں آتا ہے۔ کہ خود حضرت عمرؓ کے ساتھ اس قسم کا

واقعہ پیش آیا تھا کہ اپنی بیوی سے مباشرت کر لی اور حضور علیہ السلام کے سامنے اس غلطی کا اعتراف کیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے افسوس کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اس قسم کے واقعات پیش آنے پر اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی دور کر کے اہل اسلام کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ اب رات کے وقت اختتام سحری تک کے لیے یہ پابندی ہٹالی گئی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ؕ حلال قرار دیا گیا ہے۔ تمہارے لیے رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے ساتھ بے پردہ ہونا۔ رفث کا معنیٰ عریانی اور بے حجابی کی بات کرنا ہے۔ اور مراد عورت سے ملنا، اُس سے مباشرت کرنا ہے۔

فلسفہ لباس

آگے عورتوں کو بمنزلہ لباس قرار دے کر لباس کی حکمت اور فلسفہ بھی بیان کر دیا هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ یہ عورتیں تمہارے لیے لباس کی مانند ہیں وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ اور تم اُن کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو گویا ان دو جملوں میں پوری ازدواجی زندگی کا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔ لباس انسان کے جسم کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح انسانی جسم اور لباس کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا۔ اسی طرح میاں بیوی کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا تم اپنی عورتوں سے مستفید ہو سکتے ہو۔ لباس کا دوسرا فائدہ یہ ہے۔ کہ اس سے انسان کو زینت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر لباس کی حکمت اور فلسفہ خود بیان فرمایا ہے۔ "وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا" یعنی ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ ستر پوشی کرتا ہے، جو فطری چیز ہے کہ اس کے بغیر انسان اور حیوان میں امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اور دوسرے یہ زینت کا باعث بھی ہے۔ اَلنَّاسُ بِاللِّبَاسِ لوگ لباس کے ساتھ ہی پہچانے جاتے ہیں، لباس کے بغیر کوئی زینت نہیں۔ چونکہ عورت مرد کے لیے زیب و زینت کی بنیاد ہے اس لیے عورت کو لباس کے ساتھ

مشابہت دی۔ اس کے علاوہ ایک تیسرا اخلاقی پہلو بھی ہے۔ عورت اس لحاظ سے لباس ہے۔ کہ یہ انسان کے عیوب کو چھپانے کا ذریعہ بھی ہے۔ انسان کو حیوان کے مقابلہ میں ایک تمدنی حیثیت حاصل ہے۔ ایک مرد اور ایک عورت آپس میں نکاح کرنے کے بعد اپنے فطری جذبہ کو پورا کرتے ہیں۔ اس لیے عورت اور مرد کو ایک دوسرے کے لباس سے تشبیہ دی گئی ہے۔

سابقہ لغزش کی معافی

اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی سابقہ لغزشوں کی کلیتاً معافی دے دی۔ فرمایا عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ اللہ جانتا ہے۔ کہ تم اپنی جانوں کے ساتھ خیانت کرتے تھے۔ یعنی تم میں سے بعض لوگ سونے کے بعد یا بعد از نمازِ عشاء اپنی بیویوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ جو کہ ممنوع تھا۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ پس اللہ تعالیٰ نے مہربانی کے ساتھ تم پر رجوع فرمایا ہے۔ تَابَ کا معنیٰ توبہ بھی ہوتا ہے اور رجوع کرنا بھی۔ جب بندہ کوئی غلطی کرتا ہے۔ تو وہ برائی یا لغزش سے واپس پلٹ جاتا ہے اور جب یہ لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بولا جائے۔ تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مہربانی کے ساتھ رجوع فرماتا ہے۔ اس مقام پر بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری لغزش کو جانتے ہیں۔ مگر انہوں نے کمال مہربانی سے تم پر رجوع فرمایا ہے وَعَفَا عَنْكُمْ اور تمہیں معاف کر دیا ہے نیز آئندہ کے لیے اجازت دے دی ہے فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ کہ اب تم عورتوں سے مل سکتے ہو یعنی ان سے مباشرت کر سکتے ہو۔

حصولِ اولاد

یہ اجازت دینے کے بعد ایک جملے کا اضافہ کر دیا وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ جو کچھ اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اُسے تلاش کرو۔ مقصد یہ کہ مباشرت سے مطلوب محض خواہش نفسانی کی تکمیل ہی نہیں بلکہ حصولِ اولاد ہے جو اللہ نے تمہارے مقدر میں کر دی۔ اور نکاح کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔ کہ نسلِ انسانی قائم رہے۔ چونکہ متعہ میں نسلِ انسانی کی بقا مقصود نہیں ہوتی اس لیے اس کی اجازت نہیں دی گئی۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے ہیں۔ کہ متعہ سے نسلِ انسانی

منقطع ہوتی ہے۔ کیونکہ متعہ کے ذریعہ پیدا ہونے والی اولاد مرد کی اولاد ہی تصور نہیں ہوتی نہ اس سے نسب ثابت ہوتا ہے۔ اور نہ مولود کو وراثت میں حصہ ملتا ہے۔ لہٰذا یہ غلط کام ہے نہ صرف انسانی حقوق تلف ہوتے ہیں بلکہ یہ تو انسانیت کی توہین ہے۔ لہٰذا نکاح کا مقصد نسل انسانی کی بقا ہونا چاہیئے

تکمیل روزہ

فرمایا وَكُلُوا وَاشْرَبُوا رات کو کھاؤ پیو اسکی اجازت ہے۔ اب کوئی پابندی باقی نہیں رہی سوائے اس کے کہ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ یہاں تک کہ صاف ظاہر ہو جائے سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس معاملہ میں غلطی لگی اور انہوں نے دھاگا سے عام قسم کی ڈوری مراد لیا۔ عدی بن حاتمؓ کا ذکر اس ضمن میں خاص طور پر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے پاس سفید و سیاہ رنگ کی دو رسیاں رکھ لیں تاکہ اُن کی شناخت تک کھا پی سکیں۔ جب اس بات کا ذکر حضور علیہ السلام سے کیا، تو آپ مسکرائے، اور فرمایا اِذًا وِسَادَتُكَ عَرِيْضٌ تمہارا تکیہ تو بہت لمبا چوڑا ہے کہ اسمیں رات اور دن کو لپیٹ رکھا ہے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ جب اس قسم کی غلط فہمی پیدا ہوئی تو اللہ تعالےٰ نے اگلے الفاظ مِنَ الْفَجْرِ اُتار کر معاملہ کو بالکل واضح کر دیا کہ دھاگے سے مراد عام ڈوری نہیں بلکہ اس سے مراد صبح کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے۔ جب رات کی سیاہی ختم ہو کر صبح کی سفیدی ظاہر ہو جائے، اس وقت تک تم کھا پی سکتے ہو اور اپنی بیویوں سے مباشرت بھی کر سکتے ہو۔ گویا روزے کی ابتدا صبح صادق سے ہوگی۔

ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ پھر رات تک روزے کو پورا کرو یعنی طلوع فجر سے لے کر رات کی آمد تک روزہ رکھو۔ رات سے مراد مطلق غروب آفتاب ہے نہ کہ سرخی یا سفیدی کا زائل ہونا جونہی سورج ڈوب گیا، رات ہو گئی۔ روزہ افطار کر لینا چاہیئے۔ مزید کسی چیز کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے

سحری کی برکات

اس سے یہ بھی اخذ کیا گیا ہے۔ کہ عام لوگ صوم وصال نہ کریں یعنی متواتر کئی کئی

دن کا روزہ نہ رکھیں بلکہ روزہ رکھتے وقت ہر روز سحری کھانا مستحب ہے۔ اور بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ اگر بھوک نہ بھی ہو تو ایک دو لقمے ہی کھا لینا چاہیئے۔ یا دو گھونٹ پانی ہی پی لینا چاہیئے تاکہ سحری میں شمولیت حاصل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ سحری کھانے والوں پر رحمت فرماتا ہے۔ اور اس کے فرشتے سحری کھانے والوں کے لیے مسلسل دُعائیں مانگتے ہیں۔ سحری کھانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے۔ کہ اہل اسلام اور اہلِ کتاب کے روزے میں واضح تفریق پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا سحری ضرور کھانی چاہیئے۔ یہ بڑی بابرکت چیز ہے۔

صومِ وصال

صوم وصال حضور علیہ السلام کا معمول تھا۔ آپ کئی کئی دِن بغیر سحری کھائے اور افطار کئے روزہ رکھتے۔ جب صحابہ کرامؓ نے بھی آپ کے اتباع میں صوم وصال شروع کر دیا، تو حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ مجھے تو اللہ تعالےٰ روحانی غذا دیتا ہے جس کی طاقت سے میں ایسا روزہ رکھ لیتا ہوں، مگر تم میں اتنی قوت برداشت نہیں ہے۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ روحانی طاقت خاص خاص آدمیوں میں ہوتی ہے ایسے لوگ صوم وصال رکھ سکتے ہیں۔ عام لوگوں کے بس کی یہ بات نہیں ہے۔ چونکہ عام لوگ اتنی مشقت برداشت نہیں کر سکتے، لہٰذا ان کے لیے صوم وصال مکروہ ہے

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا آخری روزہ چالیس دِن کا تھا اس کے باوجود اللہ تعالےٰ نے روحانی طاقت سے نوازا تھا۔ آپ بالائی منزل سے نیچے اتر کر مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتے، اللہ تعالےٰ کی توفیق سے اتنے لمبے روزے کے باوجود اُن کے فرائض میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ بعض دوسرے بزرگوں کے واقعات میں بھی صوم وصال کا ذکر ملتا ہے۔ بہر حال یہ خاص لوگوں کا شیوہ ہے، عام لوگوں کے لیے مکروہ ہے۔

اعتکاف فی المساجد

فرمایا کہ اپنے گھروں میں تمہیں اجازت ہے۔ کہ رمضان کی راتوں میں بیویوں سے مقاربت کر سکتے ہو مگر وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ؕ جب تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھنے والے ہو، تو پھر تم اپنی عورتوں

سے نہیں مل سکتے۔ اگر عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگانے سے بھی مادہ خارج ہو گیا تو اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ یہاں پہ مساجد کے ذکر سے یہ مراد نہیں کہ گھروں میں اعتکاف کی حالت میں ایسا کر سکتے ہو۔ بلکہ لَا اِعْتِکَافَ اِلَّا فِی الْمَسْجِدِ مسجد کے بغیر تو مرد کا اعتکاف ہوتا ہی نہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ مسجد بھی ایسی ہونی چاہیئے جہاں پنجگانہ نماز باجماعت کا انتظام ہو۔ تاکہ نماز کے لیے کسی دوسری جگہ نہ جانا پڑے۔ البتہ اعتکاف کے لیے جامع مسجد کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ معتکف کو نماز جمعہ کے لیے دوسری مسجد میں جانے کی اجازت ہے۔ ایسی صورت میں نماز جمعہ کے بعد اُسے فوراً واپس اپنی اعتکاف والی جگہ میں آجانا چاہیئے۔

عورتوں کا اعتکاف

عورتوں کے اعتکاف کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے۔ کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی مسجد میں اعتکاف کریں مگر امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ چونکہ عورت اور غلام پہ نماز باجماعت اور جمعہ فرض نہیں ہے۔ اس لیے وہ جہاں بھی اعتکاف بیٹھنا چاہیں ایسا کر سکتی ہیں۔ ان کے لیے اپنے گھر میں اعتکاف بیٹھنا بھی روا ہے۔ امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے شاگردان امام ابو یوسف اور امام محمدؒ اور امام زفرؒ فرماتے ہیں۔ کہ عورت کو اپنے گھر میں ایسی جگہ اعتکاف بیٹھنا چاہیئے جو اُس نے نماز کے لیے منتخب کر رکھی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے لَا تَمْنَعُوْا اِمَاءَ اللّٰہِ مَسَاجِدَ اللّٰہِ اللہ کی بندیوں کو مسجدوں میں جانے سے مت روکو وَبُیُوْتُھُنَّ خَیْرٌ لَّھُنَّ مگر اُن کے گھر اُن کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔ عورت کی گھر میں نماز مسجد کی نسبت زیادہ فضیلت رکھتی ہے لہٰذا عورت کو اعتکاف بھی گھر میں ہی بیٹھنا چاہیئے۔ ہاں اگر مسجد پُر امن ہو اور وہاں عورتوں کے اعتکاف بیٹھنے کا معقول انتظام ہو۔ تو مسجد میں اعتکاف بیٹھ سکتی ہے حضور علیہ السلام کی ازواجِ مطہرات مسجد میں اعتکاف کیا کرتی تھیں۔

حفاظت بر حدودِ شرعیہ

یہ مسائل بیان کرنے کے بعد فرمایا تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ یہ اللہ کی قائم کردہ حدیں ہیں۔ فَلَا تَقْرَبُوْھَا پس ان کے قریب مت جاؤ۔ یعنی حدوں

کو توڑنے کی کوشش مت کرو۔ بلکہ مومن کی شان تو یہ ہے۔ کہ وہ اللہ کی حدود کی حفاظت کرتا ہے۔ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰہِ ظاہر ہے۔ کہ اگر اِن حدود کو توڑو گے تو تقویٰ سے محروم ہو جاؤ گے۔ ترقی رُک جائے گی اور خرابیاں پیدا ہونے لگیں گی۔ لہٰذا اِن حدود کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اِن کی نگرانی کرو۔ اللہ تعالےٰ نے جگہ جگہ یہ قانون بتلا دیا ہے۔ فرمایا۔ کَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ اللہ تعالیٰ اسی طریقے سے اپنے احکام اور آیات لوگوں کو کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔ تاکہ وہ بچ جائیں۔ برائیوں سے کنارہ کش ہو کر متقی بن جائیں۔ ابتداء میں روزے کا مقصد بھی یہی بتایا تھا۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ پھر مالی حقوق کے متعلق بھی فرمایا حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ اور یہاں بھی آخر میں تقویٰ ہی کو بنیاد بنایا لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ ع ۲۳/۷

ترجمہ:۔ اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال اپنے درمیان باطل اور ناحق کے ساتھ اور نہ پہنچاؤ مالوں کو حاکموں تک تاکہ تم لوگوں کے مالوں سے ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھاؤ۔ اور تم جانتے ہو ﴿۱۸۸﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سے پہلے اعتکاف کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ اعتکاف کی حالت میں عورتوں سے مقاربت جائز نہیں۔ حدود اللہ کی حفاظت کا مسئلہ بھی بیان ہوا۔ تاکہ انسان کے اندر تقوی کی روح پیدا ہو جائے۔ روزہ کی مدت کا تذکرہ بھی آگیا کہ روزہ طلوع فجر سے لے کر غروب شمس تک کے لیے ہے۔ رات کو کھانے پینے اور عورتوں سے ملنے کی اجازت دے دی۔ الغرض اس پورے رکوع میں روزہ ہی کا بیان ہے۔ جس میں صدقہ فطر، نزول قرآن دعا، سحری کھانے اور اعتکاف کے مسائل شامل ہیں۔

ربط آیات

اس رکوع کے بعد اگلے رکوع میں حج کا ذکر ہے۔ "یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ" سے شروع کر کے مناسک حج کی ترتیب بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد جہاد کا مسئلہ ہے۔ مفسرین کرام کے لیے اشکال پیدا ہوا ہے۔ کہ درمیان میں مال کا تذکرہ کیونکر آگیا ہے۔ جب کہ ایک طرف روزے کا بیان ہے اور دوسری طرف جہاد کا مسئلہ ہے۔ بظاہر یہ مضامین آپس میں غیر مربوط معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت میں سابقہ مضمون کے ساتھ اس کا گہرا ربط ہے۔

حضرت مولانا شیخ الہند نے اس کی تشریح یوں بیان کی ہے کہ روزہ سے

مقصود طہارتِ نفس اور طہارتِ بدن ہے۔ اب اس آیت میں مالی تذکرے سے مراد مال کی طہارت ہے۔ اُس وقت تک مسلمان کا تزکیہ نہیں ہو سکتا جب تک روح وجسم کے علاوہ اُس کا مال بھی پاک نہ ہو۔ اس آیت میں حرام مال کھانے سے منع کیا گیا ہے۔ اور اسمیں یہ لطیف نکتہ پوشیدہ ہے۔ کہ روزہ کی حالت میں تو حلال چیز بھی اُتنے وقت کے لیے حرام ہو جاتی ہے۔ مگر حرام مال تو مدت العمر یعنی ہمیشہ کے لیے حرام ہے۔ گویا ایک مسلمان حرام مال کی طرف سے ساری عمر کے لیے روزے دار ہے۔ وہ اس کے قریب کیسے جا سکتا ہے۔ چنانچہ آیت زیر درس کو مسائل روزے کے ساتھ یہ مناسبت ہے۔

شیخ الہند کا ترجمہ قرآن

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ کو عالم اسلام میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ یہ میرے سامنے آپ ہی کا ترجمہ قرآن پاک ہے۔ آپ حضرات کے پاس جو ترجمہ ہے۔ یہ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ کا ہے۔ یہ دونوں تراجم دراصل شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کی آسان صورت ہے جو ان حضرات کے ہاتھوں انجام پائی۔ برصغیر میں سب سے پہلا بامحاورہ اردو ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ کا ہی ہے۔ تاہم اس میں آج سے اڑھائی سو سال پرانی اردو استعمال کی گئی تھی اور اس میں ہندی اور بعض دوسری زبانوں کے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جو آجکل کی اردو میں استعمال نہیں ہوتے۔ مثال کے طور پر شاہ صاحب نے "اللہ الصمد" کا ترجمہ "نرادھار" کیا ہے جو کہ خالص ہندی یا سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ اسی طرح "واجتنبوا الطاغوت" میں طاغوت کا ترجمہ "ہڑدنگا" کیا ہے۔

مولانا سید عزیر گلؒ

مولانا شیخ الہندؒ نے یہ ترجمہ مالٹا کی جیل میں قید کے دوران کیا تھا۔ آپ اور آپ کے پانچ ساتھیوں پہ بغاوت کا مقدمہ چلا تھا۔ اگرچہ آپ سزائے موت سے بچ گئے تاہم قید وبند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ آپ نے اس تنہائی سے یہ فائدہ اٹھایا کہ قرآن پاک کا ترجمہ آسان اردو میں پیش کر دیا۔ آپ کے پانچ ساتھیوں میں سے اس وقت صرف حضرت مولانا سید عزیر گلؒ فاضل دیوبند زندہ ہیں۔ مولانا شیخ الہندؒ

کی نواسی آپ کے نکاح میں تھی۔ اُس کے علاوہ سندھ کے انگریز کمشنر کی بیٹی مسلمان ہو کر آپ کے نکاح میں آئی اور تیس سال کی رفاقت کے بعد فوت ہوئی۔ مولانا عزیز گل ایک تاریخی انسان ہیں۔ سخاکوٹ ایجنسی میں اُن کی اپنی زمین ہے، وہیں آپ کی رہائش ہے۔ کافی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ تاہم اپنے زمانے میں بڑے بہادر اور دلیر آدمی تھے

مولانا وحید احمدؒ

مولانا شیخ الہندؒ کے ساتھیوں میں مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے بھتیجے مولانا وحید احمد مدنیؒ بھی تھے۔ آپ کے ایک شاگرد مولانا حکیم سید نصرت حسین صاحبؒ بھی آپ کے ساتھ مالٹا میں قید رہے۔ اور وہیں فوت ہوئے۔ انگریزوں نے اُن کے ساتھ بڑے ظلم کیے۔ اُن کی وفات کے بعد مولانا شیخ الہندؒ نے بڑی کوشش کی کہ حکیم صاحب کو دفن کرنے سے پہلے مسنون طریقے سے غسل دیا جا سکے۔ مگر انگریزوں نے اسکی اجازت نہ دی اور کہا۔ کہ اُن کی طرف سے دیا گیا غسل کافی ہے۔ بہرحال آپ نے تیمم کرا کے جنازہ پڑھا، اور ان کو دفن کیا۔

حضرت شیخ الہندؒ انگریز کے سخت مخالف تھے۔ اگر کوئی انگریز کے متعلق مسئلہ دریافت کرتا، تو فرماتے ابھی کسی اور عالم سے پوچھ لو، شاید میں مبالغہ نہ کر جاؤں کیونکہ مجھے انگریزوں سے سخت نفرت ہے۔ آپ خوب سمجھتے تھے۔ کہ انگریز نے اسلام کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ ترکوں کی سلطنت کو انگریز نے ہی درہم برہم کیا۔ مولویوں کی قلم اور زبان سے ترکوں کی خلافت پر کفر کا فتویٰ لگوایا۔ اور انہیں بدنام کیا۔

انگریز کی چال بازی

شخصی طور پر انگریز بڑی با اخلاق قوم ہے۔ آپ اُن سے تجارت کریں، کوئی اور لین دین کا معاملہ ہو، بڑے اچھے طریقے سے پیش آئیں گے، اسی لیے انگریز بڑا چال باز ہے۔ گذشتہ زمانے میں تجربہ کار لوگوں میں یہ محاورہ مستعمل تھا۔ کہ اگر جرمن ختم ہو جائے، تو دنیا سے مشینری ختم ہو جائے۔ کیونکہ جرمن لوگ مشینی ذہن کے لوگ ہیں۔ انہوں نے بڑی مشینری ایجاد کی ہے۔ حتیٰ کہ سلائی مشین بھی انہی کی ایجاد ہے۔ تو یہ محاورہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اگر دنیا سے انگریز قوم ختم ہو جائے تو چال بازی ختم

ہو جائے۔ اس قوم نے بڑی مادی ترقی کی ہے اور بڑے لمبے عرصہ تک دنیا میں حکومت کی ہے۔ اس کا ستارہ چھ سو سال تک بام عروج پر رہا، امریکہ اور روس تو انگریز کے بچے ہیں۔ جس طرح کسی زمانے میں رومیوں کا دنیا میں رعب و داب تھا، اسی طرح ماضی قریب میں انگریز کو عروج حاصل تھا۔ ان میں بڑے بڑے فلاسفر، سائنس دان انجنیئر اور قانون دان پیدا ہوئے ہیں۔ تاہم عیسائی ہونے کے ناطے اسلام کا ہمیشہ دشمن رہا ہے۔

شیخ سعدیؒ

شیخ سعدیؒ کا زمانہ ساتویں صدی ہجری ہے۔ آپ کی گلستان پڑھیے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ انگریز نے شیخ صاحب کو بھی قید کر ڈالا تھا۔ آپ کے ساتھ یہودی قیدی تھے۔ کہتے ہیں۔ کہ میں خندق کی تعمیر کے سلسلے میں گارہ اٹھا اٹھا کر لا رہا تھا۔ حلب کا کوئی رئیس آپ کا واقف تھا۔ اُدھر سے گزرا تو آپ کو پہچان لیا۔ پوچھا کیا بات ہے شیخ سعدیؒ نے کہا کہ میں تو لوگوں سے تنگ آ کر باہر جنگل میں نکل گیا تھا۔ تاکہ یکسوئی سے اللہ اللہ کروں، مگر شومئی قسمت کہ قید فرنگ میں مبتلا ہو گیا اُس رئیس نے انگریز کو فدیہ دے کر شیخ صاحب کو رہائی دلا دی۔

شیخ صاحب اپنے زمانے کے بہت بڑے شاعر تھے۔ فارسی کی غزل گوئی میں آپ کی مثال نہیں ملتی۔ آپ کی کتابیں گلستان اور بوستان بڑی مقبول ہوئیں۔ یہ ابتدائی جماعتوں کو اسی زمانہ سے پڑھائی جا رہی ہیں۔ آپ نے پاکیزہ زبان استعمال کر کے نصیحت آموز باتیں کی ہیں۔ جن میں مزاح کا رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے اس بات پر اعتراض کیا کہ آپ نے کتاب میں ہنسی مذاق کو بھی جگہ دے دی ہے تو آپ نے اس کے جواب میں کہا کہ میں نے اسمیں ظرافت اور خوش طبعی کو اس لیے جگہ دی ہے۔ تاکہ لوگ اُسے آسانی سے قبول کر لیں۔ بعض اوقات کڑوی گولی چینی میں بند کر کے کھلانی پڑتی ہے۔ تاکہ اس سے مریض کو شفا ہو۔ اسی اصول کے تحت میں نے نصیحت آموز باتیں ہنسی مذاق کے خول میں بند کر کے دی ہیں۔ تاکہ یہ لوگوں کے ذہن میں اتر سکیں۔

گلستان کے بارے میں انگریزوں کا مقولہ ہے۔ کہ یہ کسی ایک شخص کی تحریر معلوم نہیں ہوتی، بلکہ یہ کسی کمیٹی یا کمیشن کا کام ہے۔ اس میں اتنے تجربات اور نصیحتیں

ہیں، جو ایک آدمی کا کام معلوم نہیں ہوتا۔

بہر حال شیخ سعدیؒ کی قید و بند سے واضح ہوتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں بھی انگریز مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں تھیں مگر وہ باہم عروج پر تھے۔ فرانس اور برطانیہ تو اس وقت بالکل غیر متمدن تھے انہیں تو کپڑے پہننے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا پشت پر چمڑا باندھتے تھے۔ انگریز اس وقت بالکل پسماندہ تھا۔ انہیں مسلمانوں کی وجہ سے ترقی نصیب ہوئی۔ اندلس میں بھی مسلمانوں کا طوطی بولتا تھا۔ انگریز تو چودھویں صدی میں جا کر متمدن ہوئے ہیں انہوں نے سائنس میں ترقی کی اور پھر انہیں غلبہ حاصل ہوا۔

ترک سلطنت

اس زمانے میں مسلمانوں کی ترک سلطنت کو بڑا عروج حاصل تھا ترکوں نے بارہ سو سال تک عیسائی سلطنتوں کے ساتھ ٹکر لی۔ انگریز، جرمن، فرانسیسی، روسی سب اسلام کے ازلی دشمن تھے۔ ترکوں نے ہر ایک کے ساتھ خوب معرکے سر کیے بڑے بہادر لوگ تھے۔ حنفی مسلک کے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ علم کی طرف سے زیادہ تر تشنہ ہی رہے۔ مگر اسلام کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ تاہم کمال اتاترک جس کا آج کل ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے۔ اس کے اسلام کو نقصان بھی پہنچایا ہے۔ اس نے خلافت کو ختم کر دیا جو مسلمانوں کے زوال کا باعث بنا۔ مگر اس نے ترکی کو بڑی طاقتوں سے الگ کر کے اسے سازشوں سے بچا لیا۔ اس نے عربی زبان کو ملک سے بالکل نکال باہر کیا حتیٰ کہ عربی اذان بھی بند کر وا دی۔ اس نے غلطیاں بھی بہت کی ہیں مگر ترکی حکومت کا زوال عربوں کی وجہ سے آیا۔ یہ غدار نکلے۔ انگریزوں کے ساتھ مل کر ان کے آلہ کار بن گئے۔ اردن کے موجودہ فرمانروا کا دادا شریف حسین سیّد ہونے کے باوجود انگریزوں کا پٹھو تھا، اس نے ترکوں کو بہت نقصان پہنچایا انگریز نے ان کو وفاداری کی بناء پر چھوٹی چھوٹی ریاستیں دے دیں۔ ایک کو عراق میں جگہ دے دی۔ ایک کو اردن میں اور ایک یہودیوں کو فلسطین میں بٹھا دیا پھر اس نے شاہ سعودؒ کے ساتھ ساز باز کی۔ اس کی پوزیشن بدوؤں والی تھی، یہ مستقل مزاج

رہا، تاہم انگریز کے ماتحت ہی رہا۔ اب امریکہ کے زیرِ اثر ہے۔ اسی کی پالیسی پر گامزن ہے

سپر پاورز

جب انگریز زوال پذیر ہوا، تو امریکہ کو عروج حاصل ہونے لگا۔ دنیا میں اس کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ دوسری طرف روس نے غلبہ حاصل کر لیا۔ اب یہ دو طاقتیں دنیا کی متحارب قوتیں ہیں۔ یہ آپس کی سرد جنگ میں مبتلا ہیں۔ دنیا کے باقی ممالک دونوں میں سے کسی نہ کسی گروپ میں شامل ہو کر ان کے دستِ نگر ہیں۔ اب یہ سپر طاقتیں سازشوں میں مصروف ہیں۔ ان کی نگاہیں مشرق وسطیٰ اور اسلامی ممالک پر ہیں کہ ان کو کس طرح تقسیم کیا جائے۔ امریکہ کا ہر آنے والا صدر سابقہ پالیسی کو جاری رکھتے ہوئے اسرائیل کی پشت پناہی کرتا ہے اور اسرائیل مشرق وسطیٰ میں ناسور کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ یہ امریکہ برطانیہ اور فرانس کا مشترکہ پروردہ ہے۔ جس کی وساطت سے مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کیا جا رہا ہے۔

ہدایہ اور گلستان

حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ ہمارے اس آخری دور کے بہت بڑے محدث ہوئے ہیں۔ اُن کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ آپ ہمارے دور کے جید ترین محدث ہیں جنکی مثال نہیں ملتی۔ اللہ تعالےٰ نے ایسا کمال درجے کا حافظہ دیا تھا کہ جب کوئی کتاب ایک دفعہ دیکھ لی تو پوری زندگی یاد رہی، بھولتے نہیں تھے۔ بخاری شریف پوری کی پوری یاد تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے۔ کہ اگر کوئی کتاب دنیا سے ناپید ہو جائے تو میں اُسے دوبارہ لکھ سکتا ہوں۔ مگر دو کتابیں ایسی ہیں جن کو دوبارہ لکھنے پر میں قادر نہیں ہوں، اُن میں سے ایک ہدایہ ہے اور دوسری شیخ سعدیؒ کی گلستان ہے اس کے آٹھ باب ہیں اور تین سو صفحات پر مشتمل ہے، ہدایہ فقہ کی بلند پایہ کتاب ہے۔ صاحب ہدایہ نے اسے اسی ۸۰ جلدوں سے مختصر کر کے چار جلدوں میں محفوظ کر دیا ہے امام محمدؒ کی جامع صغیر اور ابوالحسنؒ کی قدوری ہدایہ کی اصل ہیں، یہ بہت اچھی شرح ہے انسان کا کوئی کام حتمی نہیں ہوتا، غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ سہو سے پاک تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ بہر حال صاحب ہدایہ نے یہ گراں قدر خدمت انجام دی ہے اور علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے شیخ سعدیؒ کی گلستان کو اس کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔

زوال کے اسباب

مولانا شیخ الہندؒ فرمایا کرتے تھے۔ کہ وسیع مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے زوال کے دو اسباب ہیں، قرآن سے دوری اور فرقہ بندی۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ دہلویؒ، اُن کے خاندان اور حضرت شیخ الہندؒ نے قرآن پاک کی تعلیم دینے میں زندگیاں کھپا دیں۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے حضرت لاہوریؒ کو قرآن پاک کی تعلیم سے آراستہ کر کے فرمایا تھا، احمد علی اپنی پوری زندگی قرآن کی تعلیم کے لیے وقف کر دو، اور پھر آپ نے اس نصیحت پر پورا پورا عمل کیا۔ ساری عمر لوگوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہے۔ چالیس برس میں آپ نے پانچ ہزار علماء کو قرآن کی تعلیم دی۔ آپ دوسری کتابیں عام طور پر نہیں پڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی مشکوٰۃ شریف یا حجۃ اللہ البالغہ کا درس دے دیتے تھے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ نے بھی قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر لکھی ہے۔ یہ بھی کمال درجے کا مفصل ترجمہ ہے۔ آپ سمجھتے تھے کہ لوگ قرآن سے دُور ہو گئے ہیں۔ انہیں قریب کرنے کی کوشش میں آپ نے یہ ترجمہ اور تفسیر لکھی۔

فرقہ بندی کی لعنت

حضرت شیخ الہند فرقہ بندی کو بہت بڑی لعنت سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ پارٹی بازی مسلمانوں کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہے اور اگر اسے دُور نہ کیا گیا تو مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ وہ ہمیشہ اتفاق و اتحاد کی دعوت دیتے تھے۔ انہوں نے علی گڑھ والوں کو قریب کرنے کی کوشش بھی کی۔ آپ نے مولانا شوکت علیؒ اور مولانا محمد علیؒ جوہر کو قریب کیا اور پھر علی گڑھ پارٹی کو ساتھ ملایا۔ تاکہ سب مل کر مسلمان قوم کی خدمت کر سکیں اور اس سلسلہ میں متحدہ پروگرام پر عمل پیرا ہو سکیں۔ حضرت مولانا محمود حسنؒ کو شیخ الہند کا خطاب مولانا محمد علی جوہر نے ہی دیا تھا جسے برصغیر کے تمام لوگوں نے تسلیم کیا۔ واقعہ بھی یہی ہے۔ کہ مولانا محمود الحسن نہایت نیک، متدین اور صالح آدمی تھے۔ خاموش رہ کر بڑے بڑے کام کرتے تھے۔ ہندوستان میں انگریز کی جڑوں کو انہوں نے ہی کھوکھلا کیا۔ اپنے شاگردوں اور مریدوں کے ذریعے دُور دُور تک جانے پہچانے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ غالب پاشا اور انور شاہ بھی سمجھتے تھے۔ کہ آپ

مسلمانوں کے بہت بڑے لیڈر اور ہمدرد رہیں۔ ہمیشہ آپ سے رابطہ رکھتے تھے۔

تحریک ریشمی رومال

۱۹۱۵ء میں ریشمی رومال کی تحریک چلی۔ یہ سکیم بھی حضرت شیخ الہندؒ کی تھی۔ آپ کی کوشش یہ تھی کہ کسی طرح انگریز کو ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے۔ اس وقت برصغیر کی آبادی چالیس کروڑ تھی۔ مگر پانچ چھ لاکھ انگریز حکومت کر رہے تھے کیونکہ طاقت اُن کے ہاتھ میں تھی۔ مگر مسلمانوں کی غداری کی وجہ سے یہ تحریک بھی کامیاب نہ ہو سکی، اس کا راز قبل از وقت فاش ہو گیا تھا۔ مقصد یہ کہ برصغیر کی آزادی کے سلسلے میں علماء کی جدوجہد تو پرانی ہے اُس وقت ہندوؤں کو تو خواب بھی نہیں آیا تھا کہ انگریزوں کو یہاں سے نکالنا ہے اور مسلم لیگ بعد کی پیداوار ہے۔ اُس زمانے میں اس کی بھی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس میں نواب قسم کے لوگ شامل تھے۔ آخر میں جب لوگ انگریز اور ہندوؤں سے تھک چکے تھے تو مسلمان مسٹر جناح کی قیادت میں یکجا ہو گئے اور بات بن گئی۔ اِن کی جدوجہد تو صرف پانچ سات سال کی ہے۔ جب کہ علمائے کرام کی تحریک حریت ڈیڑھ صدی پہ محیط ہے۔

تزکیہ مال

بہرحال بات حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن کی ہو رہی تھی۔ آپ نے سورۃ بقرہ اور سورۃ نساء کا حاشیہ بھی لکھا۔ باقی حاشیہ آپ کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا ہے۔ تو مولانا محمود الحسنؒ نے مختصر الفاظ میں بہت بڑی بات سمجھا دی کہ اس آیت میں طہارتِ مال کا بیان ہے۔ جب کہ اس سے پہلی آیات میں روزہ کا بیان تھا جس سے مقصود لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ یعنی نفس اور جسم کی طہارت تھا۔ ظاہر ہے۔ کہ ایک مسلمان کا اس وقت تک مکمل تزکیہ نہیں ہو سکتا جبتک اُس کا مال بھی پاک نہ ہو۔ تو اس آیت زیر درس میں مال کی پاکیزگی کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ کہ ایک مسلمان کو حلال اور پاکیزہ مال کھانے اور حلال بیوی سے متمتع ہونے سے صرف روزے کے دوران منع کیا گیا ہے۔ مگر حرام سے اُسے ہمیشہ کے لیے منع کر دیا گیا ہے۔ وہ ساری عمر ایسے مال کے کیسے قریب جا سکتا ہے۔ یہ تو تزکیہ کے اصول کے منافی ہے۔

اکلِ حرام

ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَأْكُلُوٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد پاک ہے۔ لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ اِلَّا بِطِيبِ نَفْسِهِ، کسی مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں۔ دوسرے مقام پر یہ بھی آتا ہے ایک دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً۔ سوائے اس کے کہ تجارت ہو کہ اس طریقے سے منافع کھانا جائز ہے۔ منافع بھی دوسرے کے لیے فائدہ ہی ہوتا ہے۔ اس کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ مگر ناجائز اور باطل چیز کسی وقت بھی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ ناجائز مال خواہ چوری کے ذریعے حاصل ہو یا خیانت یا دھوکا یا رشوت کے ذریعے یہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

رشوت

مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں۔ کہ رشوت سلطنتوں کو تباہ و برباد کرنے والی لعنت ہے۔ اس لعنت سے کوئی بھی محفوظ نہیں امریکہ ہو یا برطانیہ، اور آپ کا ملک تو صفِ اوّل میں ہے۔ اس کے بغیر کوئی جائز کام بھی نہیں کرایا جاسکتا۔ آپ رشوت دیے بغیر ریلوے سے سامان نہیں چھڑا سکتے۔ اس کے بغیر ڈاک خانے والے بات نہیں سنتے پولیس میں رپٹ نہیں لکھائی جاسکتی۔ محکمہ اوقاف مقدس محکمہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی اس لعنت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ انسانیت کی دو بڑی دشمن طاقتیں رشوت اور سود ہیں، اسلام نے ان دونوں چیزوں کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے۔ کہ ایک دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ۔

غاصبانہ قبضہ

اکلِ حرام کی ایک اور صورت غاصبانہ قبضہ بھی ہے، جیسا کہ پیپلز پارٹی کے زمانہ میں زمین اور کارخانے چھینے گئے، پچیس سال میں واجب الادا قیمتیں لگائی گئیں اور اصل مالکوں کو بے دخل کر دیا گیا۔ اس سے تو بھارت والے اچھے رہے جنہوں نے چھینا بیشک مگر طریقے سے۔ یکدم کسی کی زمین یا کارخانہ چھین لینا ظالمانہ طریقہ ہے اس کا درست طریقہ یہ تھا۔ کہ کوئی کمیشن بٹھایا جاتا جو تحقیقات کے بعد فیصلہ کرتا کہ کون سی جائیداد جائز ذرائع سے حاصل کردہ ہے اور کون سی ناجائز ذرائع سے۔

اگر کسی نے ناجائز طریقے سے جاگیر حاصل کر رکھی ہے۔ تو پھر وہ معاوضے کا قطعاً حقدار نہیں۔ وہ حقدار کو ملنی چاہیئے۔ اور اگر کوئی جائداد وراثت میں ملی ہے یا جائز ذرائع سے خریدی گئی ہے، تو پھر اس کا پورا پورا معاوضہ ملنا چاہیئے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ اسلامی ریاست اس جائداد کو حاصل کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ کسی جائیداد پر زبردستی قبضہ جمانا، یا ناجائز بیع کے ذریعے حصولِ جائداد بالکل درست نہیں یہ حرام ہے۔

آگے فرمایا وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ اور اسے مال کو حاکموں تک نہ پہنچاؤ۔ مقصد یہ کہ کوئی جائداد یا کوئی مال ناجائز طریقے سے حاصل کرنے کے لیے حکام وقت کی امداد حاصل نہ کرو۔ نہ اُن کو رشوت پیش کرو اور نہ اُن کے پاس سفارش لیکر جاؤ۔ اب تو حکام کے علاوہ یہ سلسلہ اُن کی بیگمات تک وسیع ہو گیا ہے۔ مٹھائی اور فروٹ کی ٹوکریاں پیش کی جاتی ہیں۔ کپڑے اور زیورات کے تحائف دیے جاتے ہیں۔ تاکہ کسی دوسرے کے مال پہ غاصبانہ قبضہ کیا جا سکے یہ سب حرام ہے اس سے منع کیا گیا ہے۔ مال حاصل کرنے کے لیے جھوٹا دعویٰ دائر کرنا یا کسی ایسے معاملہ میں جھوٹی گواہی دینا بھی اسی قبیل سے ہے۔ اور حرام کھانے کے مترادف ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ حکام کے پاس اس غرض سے مت جاؤ کہ لوگوں کا مال غلط طریقے سے کھا جاؤ۔ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ حالانکہ تم جائز اور ناجائز کو اچھے طرح جانتے بھی ہو، پھر غلط کام کرتے ہو۔ یہ قطعاً حرام ہے اس سے بچو۔

درس ہفتاد و ہفت (۷۷) | آیت ۱۸۹

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ
وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ
مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۸۹﴾

ترجمہ :- لوگ آپ سے نئے چاندوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے یہ اوقات ہیں لوگوں کے لیے اور حج کے لیے۔ اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے۔ کہ تم گھروں میں پشت کی طرف سے آؤ۔ لیکن نیکی تو اُس شخص کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ اور گھروں میں اُن کے دروازوں سے آؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ تاکہ تم فلاح پا جاؤ ﴿۱۸۹﴾

ربط آیات

قبل ازیں اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کے احکام بیان فرمائے۔ اور اُس کے بعد مال کے متعلق مسائل بیان ہوئے۔ اب اس آیت میں نئے چاند کے متعلق سوال اور اُس کا جواب دیا گیا ہے۔

بظاہر یہ دو مختلف چیزیں معلوم ہوتی ہیں مگر مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے کا رمضان کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ نیا چاند نکلنے پر ہی روزہ شروع کیا جاتا ہے۔ اور اگلا چاند نظر آنے پر ماہ رمضان ختم ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ اَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَصُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور دیکھ کر افطار کرو۔ اس لیے دونوں مسائل کو یکے بعد دیگرے بیان کیا گیا ہے کہ ان دونوں میں باہمی ربط ہے۔

شان نزول

دراصل یہ آیت ایک سوال کا جواب ہے، جو حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اس کرہ ارض کے لیے روشنی کے دو ہی ذرائع ہیں یعنی سورج

اور چاند۔ اب سورج ہمیشہ ایک ہی ہئیت میں رہتا ہے، اسمیں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی برخلاف اس کے چاند ہمیشہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اسی وجہ سے لوگوں نے سوال کیا تھا۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ط لوگ آپ سے نئے چاند کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہ یہ کیا چیز ہے۔ تو اس کے جواب میں اللہ تعالے نے فرمایا اے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام قُلْ آپ کہہ دیجئے یعنی ان کے سوال کا جواب یہ دیجئے هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ط یہ اوقات ہیں لوگوں کے لیے اور حج کے لیے۔

اس مسئلہ پہ امام بیضاوی نے اپنی تفسیر میں بحث کی ہے۔ بیضاء ایران کے ایک مقام کا نام ہے، جس سے نسبت کی بناء پہ آپ کو بیضاوی کہا جاتا ہے۔ آپ بہت بڑے فاضل اور صالح بزرگ ہوئے ہیں۔ آپ کی تفسیر بیضاوی عربی کی مشکل تفاسیر میں شمار ہوتی ہے۔ علم اصول میں بھی آپ کی ایک کتاب موجود ہے۔ تاہم تفسیر میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ آپ نے اپنی تفسیر میں صرف، نحو، علم کلام، اور علم قرات غرضیکہ تمام علوم کی روشنی میں قرآن کریم کا مقصد اور منشا بیان کیا ہے۔

آپ قاضی کے عہدے پہ فائز تھے۔ مگر اپنے پیر و مرشد شیخ محمد کتانیؒ کے حکم پہ یہ عہدہ چھوڑ دیا تھا۔ اور تحصیل علم میں لگ گئے۔ ان کے کہنے پہ ہی آپ نے قرآن پاک کی تفسیر کی، اس کو تحریری صورت میں پیش کیا اور پھر لوگوں کو اسکی تعلیم بھی دی۔ یہ زمانہ مسلمانوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اور علم ترقی کے منازل طے کر رہا تھا۔

سوال و جواب میں اختلاف

امام صاحب فرماتے ہیں۔ کہ سوال تو یہ تھا۔ کہ چاند کیوں گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ جب کہ سورج کی جسامت میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس میں کون سی حکمت کارفرما ہے۔ مگر جواب یہ دیا گیا کہ یہ لوگوں کے لیے اور حج کے لیے اوقات کا نظام ہے مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ اس قسم کا جواب علیٰ طریق اسلوب حکیم کہلاتا ہے اور حکیم جو ہوتا ہے۔ وہ موقع اور ضرورت کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کی مثال حدیث شریف میں موجود ہے کہ یہودیوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نو ۹ نشانیوں

کے متعلق دریافت کیا تھا تو آپ نے ۹ نشانیاں بتانے کی بجائے احکام عشرہ بیان فرما دیے۔ مقصد یہ تھا کہ مسئولہ نشانیاں معلوم کر لینے سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہو گا۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے فلاں فلاں معجزہ فلاں فلاں نشانیاں عطا کی تھیں، بلکہ تمہارا فائدہ اس بات میں ہے کہ تمہیں احکام شریعت معلوم ہو جائیں جن پر تم عمل کر سکو۔ لہذا ۹ نشانیوں کی بجائے حضور علیہ السلام نے یہودیوں کو اُن کے دس احکام بتا دیے ـــــــ بعض چیزیں غامض ہوتی ہیں اُن کے پیچھے پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تم وہ بات معلوم کرنے کی کوشش کرو جس میں تمہارا فائدہ ہے۔

یہ چاند کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے سوال کے جواب میں چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت بیان نہیں فرمائی، بلکہ اُس کے فوائد بتا دیے۔ کہ اس عمل سے اوقات متعین ہوتے ہیں اور دن مہینہ اور سال کا حساب ہوتا ہے۔ سورج سے اس قسم کا حساب رکھنا ایک عام سمجھ بوجھ کے انسان سے مشکل ہے کیونکہ وہ تو ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔ اگرچہ اس کی وجہ سے موسموں میں تغیر و تبدل آتا ہے، کبھی گرمی ہے، کبھی سردی ہے۔ بہار اور خزاں کے موسم آتے ہیں مگر سورج کی بظاہر شکل و صورت اور حجم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

اسی لیے فرمایا کہ تم چاند کی کمی کی حکمت کے چکر میں نہ پڑو۔ اس کا تعلق تو علم ریاضی سے ہے، جو اس علم کو حاصل کرے گا۔ اُسے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت معلوم ہو جائے گی کہ کس طرح سورج اور چاند کے درمیان کرہ ارض حائل ہو کر اس کا سبب بنتا ہے۔ تم اس کا فائدہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں لوگوں کو کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

چاند کی مختلف صورتیں

ہلال پہلے دن کے چاند کو کہتے ہیں جب وہ حجم میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ عربی لغت میں ہلال سے مراد آواز بلند کرنا ہے۔ جب پہلے دن چاند نظر آتا ہے، تو لوگ اسے دیکھ کر شوق سے آواز بلند کرتے ہیں کہ وہ چاند نظر آ گیا، اس لیے اسے

ہلال کہتے ہیں۔ وَمَآ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیْرِ اللّٰہِ میں بھی بیان ہو چکا ہے کہ جب کسی چیز کی نامزدگی غیر اللہ کے نام پر ہوتی ہے۔ تو اسمیں بھی آواز بلند ہوتی ہے۔ کہ یہ چیز فلاں بزرگ کے نام کی ہے۔ لہذا یہ شرک میں داخل ہو جاتا ہے۔

عرض یہ کہہ رہا تھا۔ کہ پہلے دن کا چاند ہلال کہلاتا ہے، اور پھر جب بڑھنے لگتا ہے تو اس کا نام قمر ہو جاتا ہے۔ اور پھر جب چودھویں تاریخ کو بالکل پورا ہو جاتا ہے تو اسے بدر کہتے ہیں، اور آخر میں جب ڈوب جاتا ہے تو اسے محاق کہتے ہیں۔ اس کے بعد دو ایک دن نظر نہیں آتا۔ اور آخر پھر سے نیا چاند بن کر سامنے آتا ہے جس کا مطلب یہ کہ گذشتہ مہینہ ختم ہوا اور نئے مہینہ کی پہلی تاریخ ہو گئی۔ اس طرح ایک مکمل سال پورے بارہ ماہ میں پورا ہوتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ توبہ میں بیان فرمایا ہے۔ اِنَّ عِدَّۃَ الشُّھُوْرِ عِنْدَ اللّٰہِ اثْنَا عَشَرَ شَھْرًا یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سال بھر کے مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔ گویا جب اللہ تعالیٰ نے زمین، آسمان، چاند سورج غرضیکہ پورا نظام شمسی قائم کیا تو مہینوں کی تعداد بارہ مقرر فرمائی۔

حرمت والے مہینے

پھر فرمایا کہ ان بارہ مہینوں میں "مِنْھَآ اَرْبَعَۃٌ حُرُمٌ" چار مہینے حرمت والے ہیں۔ ان مہینوں میں کوئی گناہ کرنا دوسرے مہینوں کی نسبت زیادہ بڑا جرم ہے۔ ان مہینوں میں لڑائی کی ابتدا نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ یہ چار ماہ اللہ کے ہاں بڑے باعزت مہینے ہیں۔ اگر غیر مسلم خود مسلمانوں سے جنگ کا آغاز کریں تو پھر انہیں بھی اجازت ہے کہ اپنا دفاع کریں ایسی صورت میں ان پر کوئی گناہ لازم نہیں آئے گا۔ اِن چار مہینوں میں ذی قعدہ، ذی الحج اور محرم اکھٹے ہیں۔ اور رجب کا مہینہ ذرا الگ ہے۔ یہ چار مہینے حرمت والے ہیں۔

اوقات کا تعین

الغرض! فرمایا کہ چاند کی حقیقت یہ ہے کہ اس سے مختلف امور کی ادائیگی کے لیے اور خاص طور پر حج کے لیے اوقات کا تعین ہوتا ہے۔ انسان کوئی مزدوری کرتا ہے، کسی چیز کے کرایہ کا معاملہ طے کرتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس

کے لیے اوقات کا تعین ہوگا۔ اسی طرح عبادات کو لے لیں۔ نماز کی ادائیگی کے لیے اوقات مقرر ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنی ہو، تو سال کا تعین کرنا ہوگا، روزہ کے لیے چاند کے اوقات کی ضرورت پڑے گی کہ اس کی ابتدا، اور انتہا چاند کے نکلنے پر ہی منحصر ہے۔ اور پھر ارکانِ اسلام میں سے حج چوتھا رکن ہے۔ یہ بھی مقررہ مہینہ کے مقررہ ایام میں ہی ادا کیا جاتا ہے حتیٰ کہ عورت کی عدت کے تعین کے لیے بھی چاند کا حساب ہی لینا پڑتا ہے اسی لیے فرمایا۔ کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں تمہارے لیے بہت سے فوائد ہیں۔

چاند کی تقویم

امام رازیؒ کی طرح امام ابوبکر جصاص رازیؒ بھی بڑے پائے کے عالم اور مفسر قرآن ہوئے ہیں۔ آپ کا زمانہ چوتھی صدی ۳۷۰ھ ہے۔ آپ امام ابوحنیفہؒ کے پیروکاروں میں سے تھے۔ انہوں نے احکام القرآن کے نام سے تفسیر لکھی ہے۔ تو یہ دونوں امام فرماتے ہیں مسلمانوں پر واجب ہے۔ کہ وہ تقویم چاند کے حساب سے رکھیں اگر مسلمان اس حساب کو ترک کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ بیشک سورج کی تقویم بھی رکھیں، اس میں ممانعت نہیں ہے۔ مگر چاند کے حساب کو بھی ضرور اپنے روزمرہ کے امور میں جاری رکھیں۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ نے چاند کا حساب رکھنے کا حکم دیا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اَہِلَّۃ سے مراد مہینہ لیتے ہیں۔ اور اس آیت کا معنیٰ یوں کرتے ہیں۔ کہ لوگ آپ سے مہینوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہ ان کا حساب چاند سے رکھا جائے گا یا سورج سے۔ تو اللہ تعالےٰ نے حکم دیا کہ چاند کے ذریعے حساب رکھنا مقدم، بہتر اور فطری ہے۔ چاند کے حساب سے ماہ و سال کا تعین تو ان پڑھ دیہاتی بھی کر سکتا ہے۔ جب کہ سورج کی تقویم کو یاد رکھنا مشکل کام ہے۔ سورج تو ہر روز یکساں طلوع ———— اور غروب ہوتا ہے۔ مہینہ کی ابتدا۔ اور انتہا کا تعین ایک آدمی کے لیے مشکل ہے مگر چاند کا حساب، بالکل واضح ہے۔ جس دن نیا چاند نکلے گا تو مہینہ کی ابتدا ہو جائے گی۔ لہٰذا چاند کی تقویم آسان ہے

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں۔ کہ عبادات کے معاملہ میں چاند کی جنتری کو حاصل،

اہمیت حاصل ہے۔ سورۃ بقرہ جامع سورۃ ہے۔ اس میں تمام عبادات کا ذکر آگیا یعنی اصلاح عقیدہ کے بعد نماز کا بیان آیا۔ پھر زکوٰۃ کا بیان ہوا، اس کے بعد روزہ کے احکام آئے اور اب اس آیت میں حج کا بیان بھی آگیا ہے۔ تو گویا تمام عبادات کا تعلق قمری تقویم سے ہے۔ اور ایک مسلمان کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں۔

حج کے لیے جلدی

اس آیت میں حج کا اشارتاً ذکر کیا ہے۔ آگے تفصیل آئے گی "اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُومٰتٌ" یعنی حج کے مہینے معلوم ہیں۔ اور ان کا تعین بلاشبہ چاند سے ہی ہوتا ہے۔ حج ایک فرض عبادت ہے۔ ہر صاحب استطاعت پر عمر بھر میں ایک دفعہ حج کرنا فرض ہے۔ اس کے علاوہ جتنی دفعہ حج کرے گا، اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔ نماز ہر روز پانچ دفعہ ادا کرنی ہوتی ہے۔ زکوٰۃ سال میں ایک دفعہ فرض ہے۔ اور روزے بارہ مہینوں میں ایک ماہ کے فرض ہیں۔ ارکان اسلام میں سے حج کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس میں مالی اخراجات کے علاوہ جسمانی مشقت بھی برداشت کرنا پڑتی ہے۔ لہٰذا جب کوئی مسلمان صاحب استطاعت ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ اس کو حج کرنے کی توفیق عطا فرماوے تو پھر اُسے چاہیئے کہ دیر نہ کرے بلکہ فوری طور پر ادائیگی کی کوشش کرے فَاِنَّهٗ لَا يَدْرِیْ کیونکہ اُسے علم نہیں۔ کہ آگے کس قسم کے حالات پیش آنے والے ہیں۔ لہٰذا اُسے اس فرض سے جلد سبکدوش ہو جانا چاہیئے۔ کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ انسان بیمار ہو سکتا ہے۔ مال ضائع ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان کو حج کے معاملہ میں دیر نہیں کرنی چاہیئے بلکہ اولین فرصت میں سفر حج پر روانہ ہو جانا چاہیئے۔ اور پھر اس فرض کی ادائیگی میں سستی کرنے والوں کے لیے وعید بھی بڑی سخت آئی ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جس شخص پر حج فرض ہو گیا اور اس کی ادائیگی میں کوئی امر مانع نہیں ہے اور وہ اس کے لیے کوشش نہیں کرتا تو ایسا شخص یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

اسلام کا پانچواں رکن جہاد ہے۔ یہ حج سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ اسمیں

جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلنا پڑتا ہے۔ اور اس کے ساتھ مال بھی خرچ کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس میں یہ دونوں عمل شامل ہیں۔ وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ یعنی مال اور جان دونوں چیزوں کے ساتھ جہاد کرو۔

رسومات باطلہ

حج کا ذکر آیا تو اسمیں بعض رسومات باطلہ کا ردّ بھی پایا جاتا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کا یہ دستور تھا۔ کہ جب کسی سفر پہ نکلتے، خواہ وہ حج کا سفر ہی کیوں نہ ہو۔ اور گھر میں کوئی چیز بھول جاتے تو پھر واپس آکر مکان کے دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ اُس کے پیچھے سے آتے تھے، خواہ انہیں دیوار توڑنی پڑے یا پھلانگنی پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی چیز سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا وَلَيْسَ الْبِرُّ اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا کہ تم اپنے گھروں میں پشت کی طرف سے آؤ۔ بلکہ اگر واپس آنے کی ضرورت پیش آہی جائے تو وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا تو دروازے کے راستے سے اندر داخل ہونا چاہیئے۔ فرمایا یہ کون سی نیکی ہے۔ کہ تم دیوار پھلانگتے پھرو۔ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ بلکہ نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈر گیا اپنے اندر خوف خدا پیدا کر کے اُس کے احکام کی پیروی کرو۔ یہی اصل نیکی ہے۔ جاہلیت کی رسوم باطلہ کو ترک کر دو۔ مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہاں بعض رسومات باطلہ کی تردید کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا اصول بیان فرمادیا ہے۔ کہ اصل نیکی تو تقویٰ ہے۔ جب تقویٰ پیدا ہو جائے گا تو تمام معاملات درست ہو جائیں گے۔ رسومات باطلہ خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ شرک، بدعت اور دیگر رسوم پر عمل کرنے سے نیکی نہیں آسکتی۔ نیکی تو تقویٰ کو اختیار کرنے سے آئیگی، لہٰذا اس کے لیے کوشش کرو۔

صراطِ مستقیم

حصول نیکی کے متعلق ایک مسلمہ اصول یہ ہے۔ کہ شریعت کے اصول پر چل کر ہی آدمی کامیاب ہو سکتا ہے۔ صراطِ مستقیم وہی ہے۔ جو شریعت نے قائم کیا ہے۔ اگر اس راستہ کو اختیار نہیں کرو گے تو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ کام کوئی بھی ہو، خواہ اس کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، ٹرسٹ سے ہو یا نظامِ حکومت

سے، ہر صورت میں کامیابی کا راز صراطِ مستقیم پر چلنے میں مضمر ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان اس اہم قانون کی خلاف ورزی کر کے ناکام ہوئے۔ انفرادی حیثیت سے لے کر نظامِ حکومت تک سب کی درستگی قرآن و سنت کا راستہ اختیار کرنے پر منحصر ہے۔ اسلام کے نفاذ کے لیے جب تک اسلام کا بتایا ہوا طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا، کامیابی نہیں ہو سکتی۔ پورے نظامِ حکومت کی تبدیلی محض بیوروکریسی کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے اسلام کا بتایا ہوا صراطِ مستقیم اختیار کرنا پڑے گا

فرمایا نیکی یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ تقویٰ کا قانون قرآن پاک میں بار بار بیان ہوا ہے۔ کہیں فرمایا هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنی یہ ہدایت متقین کے لیے ہے۔ اگر یہ تقویٰ اختیار کرو گے تو فوز و فلاح کے دروازے کھلیں گے۔ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ کامیاب ہو جاؤ۔

درس ہفتاد و ہشت (۷۸) — آیت ۱۹۰ تا ۱۹۳

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿١٩٠﴾ وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ
ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِّنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ
وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِندَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ حَتَّىٰ يُقَاتِلُوكُمْ فِيهِ ۖ فَإِن قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ ۗ
كَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿١٩١﴾ فَإِنِ انتَهَوْا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ
﴿١٩٢﴾ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ
لِلَّهِ ۖ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٩٣﴾

ترجمہ :- اور اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ اور زیادتی نہ
کرو بیشک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ﴿١٩٠﴾ اور انہیں جہاں
بھی پاؤ قتل کرو، اور اُن کو نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے۔ اور فتنہ مار ڈالنے
سے زیادہ سخت ہے۔ اور مسجد حرام کے پاس اُن سے مت لڑو۔ یہاں تک کہ وہ
خود تم سے اُس میں لڑیں۔ اور اگر وہ لڑیں تم سے پس مارو اُن کو۔ اس طرح بدلہ ہے
کفر کرنے والوں کا ﴿١٩١﴾ اور اگر وہ باز آجائیں پس بیشک اللہ تعالےٰ
بخشنے والا اور نہایت ہی مہربان ہے ﴿١٩٢﴾ اور لڑو اُن سے یہاں تک کہ
فتنہ باقی نہ رہے۔ اور اطاعت اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔ پس اگر یہ باز آجائیں
پس نہیں زیادتی مگر اُن لوگوں پر جو ظلم کرنے والے ہیں ﴿١٩٣﴾

جہاد کی قسمیں اسلام کے پہلے چار ارکان کا بیان سابقہ دروس میں آچکا ہے۔ اب یہاں سے
جہاد کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ لفظ جہاد ایک عام لفظ ہے اور یہ وسیع تر معانی میں

استعمال ہوتا ہے۔ اور قتال خاص ہے۔ جس سے مراد جنگ ہے۔ جہاد ظاہری اور باطنی طاقت کو دشمن کے مقابلے میں بقائے امن اور اقامت دین کے لیے خرچ کرنے کا نام ہے۔ حضور علیہ السلام نے جہاد کی کئی شکلیں بیان فرمائی ہیں۔ فرمایا جَاهِدُوا الْمُشْرِكِيْنَ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ یعنی مشرکوں کے خلاف اپنے مال جان اور زبان کے ساتھ جہاد کرو۔ یہ صحیح حدیث مسند احمد اور ابوداؤد شریف میں موجود ہے۔ جان و مال کے ساتھ جہاد کی صورت تو واضح ہے۔ کہ کلمہ توحید بلند کرنے کے لیے انسان مال خرچ کر کے دور دراز کے سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے۔ تیر و تلوار اٹھاتا ہے اور پھر اپنی جان تک کا نذرانہ پیش کر دیتا ہے۔ البتہ زبان کے ساتھ جہاد سے مراد اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ اور لوگوں کے شکوک و شبہات کو دور کرنا ہے تصنیف و تالیف کی ہے۔ دین کی کوئی کتاب لکھی ہے رسالہ ترتیب دیا ہے۔ بحث و مناظرہ کیا ہے۔ یہ سب چیزیں جہاد باللسان کا حصہ ہیں۔ حضور علیہ السلام کا مبارک فرمان ہے يُوْزَنُ مِدَادُ الْعُلَمَاءِ بِدَمِ الشُّهَدَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ یعنی دینی تصنیف و تالیف کا کام کرنے والے علماء کی سیاہی کا وزن قیامت کے روز شہیدوں کے خون کے ساتھ کیا جائے گا۔ یعنی اللہ کے راستے میں خرچ ہونے والی سیاہی شہداء کے خون کے برابر مرتبہ رکھتی ہے۔ یہ اتنا بڑا کام ہے اور شہید کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے يُغْفَرُ بِاَوَّلِ الْقَطْرَةِ یعنی شہید اپنے خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرنے سے پہلے معاف کر دیا جاتا ہے بخش دیا جاتا ہے۔ اُس کے تمام حقوق اللہ معاف ہو جاتے ہیں البتہ حقوق العباد کا بار اُس کے سر پر باقی رہتا ہے۔ کسی کے ساتھ لین دین کیا ہو، کسی کی ایذا رسانی کی ہو، دل دکھایا ہو، اُس کا معاملہ فریق ثانی کے ساتھ ہے۔ اس لیے ایسے حق کی معافی متعلقہ حقدار کے ذریعہ ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے کو اور بھی کئی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ وہ قبر کی آزمائش سے مامون ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ اُس کی سفارش بھی

قبول فرماتے ہیں۔ اور اس کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے۔ یہ جہاد بالسیف ہے جس کی تعریف میں خود اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ یعنی کبھی مومن کافر کو مار ڈالتا ہے۔ اور کبھی خود شہید ہو جاتا ہے۔

جہاد پر اعتراض

مسلمانوں کے مسئلہ جہاد پر بعض بے دین قسم کے لوگوں خصوصاً عیسائیوں نے اعتراض کیا ہے۔ کہ لوگوں کو تلوار کے ذریعے مرعوب کر کے دین میں داخل کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ تاہم اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو محسوس ہو گا کہ جہاد کا حکم فطرت کے عین مطابق ہے۔ بلکہ بعض اوقات یہ لازم ہو جاتا ہے جب دنیا میں فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائے، کسی کی جان و مال محفوظ نہ رہے تو پھر ایسے لوگوں کے خلاف جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا کے متمدن لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہونی چاہیئے۔ تو پھر انہیں فلسفہ جہاد کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا، کیونکہ اس کے بغیر ظلم و ستم کی بیخ کنی ممکن ہی نہیں۔

اقدامی اور دفاعی جہاد

جہاد دو قسم کا ہے اقدامی یعنی جارحانہ اور دفاعی یعنی مدافعانہ۔ مسلمان کے لیے عام حکم یہی ہے۔ کہ وہ جنگ میں پہل نہ کرے۔ بلکہ اگر دشمن حملہ آور ہو جائے تو اپنا دفاع کرے۔ مگر بعض اوقات اقدامی جہاد بھی ضروری ہو جاتا ہے شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ بعض نفوس شر پسند ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ دوسروں کے مال و جان کے نقصان کی تاک میں رہتے ہیں۔ اور معاشرے کے امن و امان کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے امن کی خاطر لوگوں کے جان و مال اور عزت و ناموس کی خاطر بعض اوقات جہاد میں جارحانہ انداز بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ اس شر و فساد کا قلع قمع کیا جا سکے جس نے معاشرے کے امن و امان کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایسے شخص کی مثال خطرناک پھوڑے سے دی ہے جس طرح انسانی جسم کی حفاظت کے لیے جسم کے گلے سڑے حصے کو کاٹ دینا ہی بہتر ہے یا جس طرح کسی پھوڑے کا اپریشن کر دینا مریض کی صحت کے

لیے ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح پورے معاشرہ کی حفاظت کی خاطر کسی ناپسندیدہ عنصر کے خلاف قتال بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اور ایسے شخص کو معاشرے سے کاٹ پھینکنا ہی معاشرے کے وسیع تر مفاد میں ہوتا ہے۔ لہذا اسلام نے دونوں قسم کے جہاد کی اجازت دی ہے۔ مسلمان دفاعی جنگ بھی لڑ سکتا ہے اور بوقت ضرورت حملے میں پہل بھی کر سکتا ہے

قتال کا حکم

اسلام کے تیرہ سالہ ابتدائی مکی دور میں اہل ایمان نے کفار کے ہاتھوں بڑی سے بڑی تکلیف برداشت کی مگر ہاتھ نہیں اٹھایا کیونکہ اللہ کا حکم تھا کُفُّوٓا اَیۡدِیَکُمۡ اپنے ہاتھ روکے رکھو۔ نماز قائم کرو اور جماعتی تنظیم کرو۔ پھر جب مدنی دور میں اسلام طاقتور ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ نے جہاد کی اجازت والی وحی اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ کہ وہ بھی دشمن کے سامنے ڈٹ جائیں، اللہ تعالیٰ اُن کی مدد کرنے پر قادر ہے چنانچہ اس کے بعد جہاد بالسیف کی ابتدا اور اللہ نے واضح حکم دے دیا۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ یعنی اللہ کے راستے میں اُن لوگوں سے لڑو، جو تم سے لڑتے ہیں

کفار کی طرف سے پہل

ظاہر ہے۔ کہ یہ دفاعی جنگ کا حکم ہے، اُن کی طرف سے پہل ہو گی تو اُن کے ساتھ جہاد کرنے کا حکم ہوا۔ اور ابتدا میں ایسا ہی ہوا۔ پہل کفار کی طرف سے ہی ہوئی۔ مشرکین نے تیرہ سال تک اہل ایمان کو مکہ میں ستایا، پھر ہجرت پر مجبور کیا۔ بہت سی جانوں کو تلف کیا حتیٰ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے درپے ہوئے۔ ہجرت کے بعد بھی کفار نے مسلمانوں کا پیچھا کیا۔ جنگ بدر، جنگ احد اور جنگ احزاب وغیرہ اس اس بات کے واضح شواہد ہیں۔

لارڈ ہیڈلے پہلی جنگ عظیم کے زمانہ میں لنڈن میں ہوا ہے۔ عیسائی مذہب رکھتا تھا۔ بعد میں اسلام کی دولت سے مشرف ہوا۔ بنیادی طور پر بیرسٹر تھا، پھر دین کا علم بھی حاصل کیا، اُس نے کہا تھا کہ غیر مسلم اقوام مسلمانوں کے مسئلہ جہاد کی وجہ سے انہیں بدنام کر رہی ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ جنگ کی ابتدا مسلمان نہیں کرتے بلکہ وہ تو اپنا دفاع کرتے ہیں۔ وہ اپنے دعویٰ کو جغرافیائی طور پر ثابت کرتا ہے کہ

دیکھو مسلمانوں کے ساتھ پہلی تین جنگیں کہاں لڑی گئیں۔ پہلی جنگ بدر کے مقام پر ہوئی جو مکہ سے سینکڑوں میل دور ہے۔ جب کہ مدینہ سے قریب ہے، پھر دوسری جنگ احد کے میدان میں ہوئی، وہ بالکل ہی مدینہ کے مضافات کا واقعہ ہے۔ کفار نے اتنی دور سے مدینہ پر چڑھائی کی۔ اور تیسری بڑی لڑائی جنگ خندق ہے۔ اس میں بھی کفار تین سو میل کا سفر طے کر کے حملہ آور ہوئے مگر اہل اسلام نے مدینہ کے اندر رہ کر اپنا دفاع کیا۔ لہٰذا مسلمانوں پر یہ الزام لگانا قطعاً ناروا ہے۔ کہ ان کا دین تلوار کے ذریعے پھیلا۔

زیادتی کی ممانعت

فرمایا جو تم سے لڑتے ہیں تمہیں بھی ان سے لڑنے کی اجازت ہے۔ وَلَا تَعْتَدُوْا مگر زیادتی نہ کرو۔ زیادتی نہ کرنے کا ایک مطلب تو یہ ہے۔ کہ جو کوئی تم سے لڑائی نہیں کرتا، تم اُس سے مت لڑو اور بے گناہوں کو قتل نہ کرو۔ مقصد یہ کہ تم سے تو لڑنے کے لیے میدان جنگ میں نوجوان آئے ہیں۔ تم ان کو مارو مگر ان کے بچوں، ان کے بوڑھوں اور ان کی عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ ایک جنگ کے دوران حضور علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک عورت مری پڑی ہے۔ آپ بہت ناراض ہوئے اور نَهٰى عَنْ قَتْلِ النِّسَآءِ وَالصِّبْيَانِ عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا کہ یہ زیادتی ہے۔ اسی طرح کوئی بہت بوڑھا ہے، معذور ہے، ہتھیار بھی نہیں اٹھا سکتا، یا اصحاب الصوامع میں سے ہے۔ کہ کٹیا میں بیٹھا رہتا ہے۔ دنیا سے کنارہ کش ہو کر عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ ایسے شخص پر ہتھیار اٹھانا تعدی کی بات ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔

خلفائے راشدین نے بھی اپنے اپنے عہد میں حکم دیا اُغْزُوْا فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ اللہ کے راستے میں جہاد کرو، مگر کسی بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کسی بچے پر ہاتھ نہ اٹھانا، کسی عورت کو تکلیف نہ پہنچانا اور جو لوگ دنیا سے الگ تھلگ گرجا یا کٹیا میں جا گزیں ہو گئے ہیں ان کو بھی قتل نہ کرنا جو کوئی تمہارے مقابلے پر لڑنے کے لیے آتا ہے اس سے لڑائی کرو، اور اس کو قتل کرو، بے گناہ پر زیادتی مت کرو۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک وصیت فرمائی تھی کہ کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا، سوائے

اس کے کہ کسی خاص ضرورت کے تحت ہو، محض غنیم کو نقصان پہنچانے کے لیے ایسا کرنا درست نہیں۔

جہاد کا مقصد

مفسرین کرام نے وَلَا تَعْتَدُوْا کا ایک اور مطلب یہ بیان کیا ہے۔ کہ جہاد صرف دین کی خاطر کرو، اس کے علاوہ جہاد کا اور کوئی مقصد نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر کوئی شخص شہرت حاصل کرنے کے لیے، بہادری دکھانے کے لیے یا مال و دولت اکٹھا کرنے کے لیے جہاد میں شریک ہوتا ہے، تو یہ زیادتی ہوگی۔ اسی لیے فرمایا زیادتی نہ کرو، بلکہ خالص دین کی سربلندی کے لیے جہاد میں حصّہ لو۔ گویا اسلام کا جہاد اتنا پاکیزہ ہے۔ کہ دین کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے اُسکی اجازت ہی نہیں دی گئی۔

اب اسلام کے جہاد پر اعتراض کرنے والے نام نہاد متمدن لوگوں کا حال ملاحظہ فرمائیں۔ دنیا کی خاطر لڑی جانے والی جنگ میں ہزاروں لاکھوں بے گناہ جانوں کو قتل کر دیتے ہیں، ہسپتالوں پر بمباری کر کے مریضوں تک کی پرواہ نہیں کرتے۔ دوسری جنگ عظیم میں چھ کروڑ کے قریب انسان لقمۂ اجل بن گئے۔ پہلی جنگ عظیم میں دو کروڑ کے لگ بھگ جانیں تلف ہوئیں۔ اندھا دھند بمباری سے کھیت تباہ ہو گئے، جانور ہلاک ہوئے، عورتیں اور بچے بھی اس ہلاکت کا شکار ہوئے۔ آخر یہ کون سی تہذیب اور کونسا تمدن ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ بیشک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنیوالوں کو پسند نہیں کرتا

جہاد کے اصول

اللہ تعالیٰ نے جہاد کے بھی کچھ اصول مقرر فرمائے ہیں، جن کے تحت ہی جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ فرمایا وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ یعنی جن لوگوں سے تمہیں جہاد کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اُن سے جنگ کرو۔ جہاں بھی انہیں پاؤ۔ وَاَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ اور تم بھی انہیں اس جگہ سے نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا تھا۔ مشرکین نے تمہیں مکہ سے نکلنے پر مجبور کیا تھا۔ اب یہ بھی اسی سلوک کے مستحق ہیں۔ اور یاد رکھو وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ج فتنہ تو قتل سے بھی زیادہ سخت ہے فتنہ سے مراد کفر و شرک کا غلبہ، بد نظمی، ظلم و زیادتی ہے۔ اگر یہ لوگ ان وجوہات کی بنا پر ایمان کے راستے

میں رکاوٹ بن جائیں تو یہ قتل سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ البتہ ایک اصول یاد رکھو وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ انہیں مسجد الحرام کے پاس قتل کرو یہ حرم پاک کے تقدس کا تقاضا ہے۔ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ یہاں تک کہ وہ خود تم سے مسجد حرام میں جنگ کریں۔ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ اگر وہ تم سے لڑائی کریں۔ فَاقْتُلُوْهُمْ تو تم بھی ان سے جہاد کرو۔ مقصد یہ کہ مسجد حرام کی حرمت و عظمت کا تقاضا ہے۔ کہ تمہاری طرف سے پہل نہ ہو۔ اور اگر وہ باز نہ آئیں، تو پھر تمہیں بھی دفاع کی اجازت ہے۔

جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا ہے اس خطے کو محترم بنایا ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کے درخت کاٹنا بھی جائز نہیں، خود رو گھاس نہیں کاٹی جا سکتی کسی جانور کو ایذا نہیں پہنچائی جا سکتی۔ شکار نہیں کیا جا سکتا بلکہ شکار کو چھیڑنا بھی جائز نہیں۔ یہاں پر لڑائی تو بالکل ہی حرام ہے۔ یہاں تک کہ کوئی دوسرا تم پر حملہ آور ہو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ فتح مکہ کے دن اللہ تعالیٰ نے دن کے کچھ حصہ کے لیے میرے واسطے حرم میں لڑائی کو حلال قرار دیا تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ مشرک آمادۂ جنگ ہوں اس کے بعد قیامت تک کے لیے اس خطہ پاک پر لڑائی کو حرام کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے مَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا یعنی جو کوئی حرم میں داخل ہو گیا اسے امن مل گیا۔

الغرض فرمایا۔ کہ مسجد حرام کے پاس اگر مشرک لڑائی کی ابتدائی کریں تو تمہیں بھی جواب دینے کی اجازت ہے۔ تم بھی انہیں قتل کرو کَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ کفار کا یہی بدلہ ہے۔ فَاِنِ انْتَهَوْا۔ اور اگر وہ لڑائی سے باز آجائیں اور صلح کر لیں۔ تو لڑائی کو طول دینے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر وہ ایمان قبول کر لیں تو معاملہ بالکل ہی صاف ہو گیا۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ ان کے تمام سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

فتنہ و فساد کی بیخ کنی

اب آگے جہاد کی حکمت بھی بیان فرما دی۔ وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى

لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ان کے ساتھ جنگ کرو حتیٰ کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے۔
جہاد کی اصل غرض و غایت بھی یہ ہے۔ کہ دنیا سے فتنہ و فساد جنگ و جدل بدامنی اور بدنظمی اور کفر و شرک کا قلع قمع کر دیا جائے۔ تاکہ غلبہ اسلام کے راستے میں کوئی رکاوٹ کھڑی نہ ہو سکے۔
وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ اور اطاعت صرف اللہ ہی کیلیے باقی رہے یعنی جو کوئی دین اسلام میں داخل ہونا چاہے اُسے کوئی شخص روکنے والا نہ ہو اور وہ بلاخوف و خطر دینِ حنیف کو اختیار کر سکے۔ فرمایا فَاِنِ انْتَهَوْا اگر یہ لوگ اس قسم کی فتنہ انگیزی سے باز آجائیں دین کے راستہ میں رکاوٹ نہ بنیں، زیادتی نہ کریں فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ تو اُن پہ کوئی زیادتی نہیں ہے۔ البتہ جو ظالم ہوگا۔ اس کے خلاف جہاد کیا جائے گا تاکہ دنیا میں عدل و انصاف کو قائم کیا جا سکے۔ اور فتنہ و فساد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کیا جا سکے۔ اللہ تعالےٰ نے جہاد کے احکام بھی بیان فرما دیے فریضہ حج کے بعد اسلام کا یہ ایک اہم رکن ہے۔

سَیَقُوْلُ ۲ — اَلْبَقَرَہ ۲

درس ہفتاد و نہ (۷۹) — آیت ۱۹۴ تا ۱۹۵

اَلشَّھْرُ الْحَرَامُ بِالشَّھْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ
اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْہِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی
عَلَیْکُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾
ع وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ ۚۖۛ
وَاَحْسِنُوْا ۚۛ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۹۵﴾

ترجمہ: حرمت کا مہینہ حرمت کے مہینے کے مقابل ہے۔ اور تمام حرمتوں کا بدلہ ہے۔ پس جس شخص نے تم پر زیادتی کی، تم بھی اس پر زیادتی کرو جیسی کہ اس نے زیادتی کی ہے تم پر، اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے ﴿۱۹۴﴾ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور احسان کرو بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ﴿۱۹۵﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کا حکم دیا تھا، اور اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ مشرکین کے برپا کردہ فتنہ و فساد کو فرو کرنے اور ظلم و زیادتی کو ختم کرنے کے لیے جہاد ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی وضاحت کی گئی ہے۔ کہ عام طور پر جہاد اپنے دفاع کے لیے کیا جائے، البتہ اگر اغیار کے ظلم و ستم کی بنا پر مخلوق خدا کی جان و مال اور عزت و ناموس خطرے میں ہو تو جنگ میں پہل بھی کی جا سکتی ہے،

حرمت والے چار مہینوں کا ذکر بھی اجمالاً آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق ارض و سما کے وقت سے ہی بارہ مہینوں کی تقویم مقرر کر رکھی ہے۔ جس میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔ ملتِ ابراہیمی میں یہ امر مسلم ہے۔ کہ ان چار مہینوں میں مشرک بھی لڑائی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ عام راہزن بھی کسی کا مال نہیں لوٹتے تھے اور تجارتی

قافلے پُرامن گزر جاتے تھے، ان مہینوں کا اس قدر احترام کیا جاتا تھا۔ یہ چار مہینے رجب ذی قعدہ، ذی الحج اور محرم ہیں۔

حدیبیہ کا واقعہ

انہی محترم مہینوں میں سے ذی قعدہ ۶ھ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کا ارادہ فرمایا۔ اس سفر میں چودہ سو کے قریب صحابہؓ آپ کے ہم سفر تھے۔ جب مکہ کے نزدیک حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مشرکین مکہ نے شہر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ حالانکہ ہدی کے جانور صحابہؓ کے ہمراہ تھے۔ جس کا مطلب یہ تھا۔ کہ یہ قافلہ عمرہ کے ارادہ سے آیا ہے، نہ کہ جنگ و جدال کی نیت سے۔ حرمت والا مہینہ تھا۔ صحابہؓ نے احرام باندھے ہوئے تھے، مگر مشرکین نے آپ کو عمرہ ادا کرنے سے روک دیا، آخر گفت و شنید ہوتی، جس کے نتیجہ میں صلح کا معاہدہ لکھا گیا۔ کہ اس سال مسلمان عمرہ ادا نہیں کریں گے، بلکہ آئندہ سال انہیں اجازت ہوگی۔ مگر تین دن سے زیادہ مکے میں قیام نہیں کریں گے۔ صحابہؓ اس معاہدہ کے حق میں نہ تھے۔ انہوں نے عرض کی کہ حضور کیا نعوذ باللہ آپ کا خواب غلط ہو گیا ہے آپ نے تو دیکھا تھا کہ ہم عمرہ ادا کر رہے ہیں حجامت بنوا رہے ہیں، مگر ہماری یہ حسرت تو پوری نہ ہو سکی۔ حضور نے فرمایا۔ کہ میرے صحابہ! فکر نہ کرو۔ خواب بالکل سچا تھا۔ ہم ضرور عمرہ کریں گے کیونکہ خواب میں یہ تو واضح نہیں تھا کہ ضرور اسی سال کریں گے۔ عمرہ آئندہ سال بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضور علیہ السلام اپنے صحابہ کے ہمراہ اگلے سال یعنی ۷ھ میں تشریف لائے اور عمرہ کیا۔ آپ کا یہ عمرہ، عمرۃ القضا کہلایا کیونکہ پہلے سال احرام باندھ کر اس فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکے تھے۔ اور بغیر عمرہ کیے احرام کھول دیے تھے۔

جنگ کی اجازت

۷ھ میں جب حضور علیہ السلام عمرہ کے لیے دوبارہ تشریف لائے۔ تو اس وقت بھی کفار مکہ کے بدعہدی کرنے اور عمرہ سے روک دینے کا امکان تھا مگر اللہ تعالٰی نے فرمایا کہ گذشتہ سال مشرکین نے محترم مہینوں کا ادب نہ کیا تو

درگزر سے کام لیا گیا۔ اب اگر ایسا کریں تو تمہیں لڑائی کی اجازت ہے۔ اُن سے پورا پورا مقابلہ کیا جائے اور انہیں ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے گا۔ اِس سال پھر ذی قعدہ کا حرمت والا مہینہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اب انہوں نے اس مہینہ کا احترام نہ کیا اور آمادہ جنگ ہوئے، تو تم پر بھی ایسا کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔

ادب کا بدلہ

فرمایا اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینے کے مقابل ہے۔ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ط اور تمام ادب والی چیزوں کا بدلہ ہے۔ حرمت والی چیزوں میں بیت اللہ شریف، مسجد الحرام تمام مساجد اور حرم کا پورا خطہ شامل ہے۔ لہذا ان تمام چیزوں کا احترام کرنا چاہیئے۔ ان میں جنگ و جدال اور فتنہ و فساد برپا نہیں ہونا چاہیئے۔ مسلمان تو بہر حال اِن کا احترام کرتے ہیں۔ البتہ اگر مشرکین ان کے ادب کو ملحوظ نہ رکھیں اور لڑائی پر آمادہ ہوں تو پھر مسلمانوں کو بھی اجازت ہے کہ ان کا بدلہ چکائیں۔ مطلب یہ کہ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ جو کوئی تم پر زیادتی کرے، فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ تو تم بھی اُس پر اسی طرح زیادتی کرو، جس طرح اُس نے تم پر کی ہے۔ یہی قانون اللہ تعالیٰ نے سورۃ نحل میں بھی بیان فرمایا ہے۔ اگر اُن کی تعدی کے عوض میں معاف کر دو، تو تمہیں بڑا اجر ملیگا۔ اور اگر بدلہ لینا ہے۔ تو پھر انہیں اسی قدر ایذاء پہنچاؤ، جس قدر انہوں نے تمہیں پہنچائی ہے۔ اُن سے زیادتی نہ کرو۔

خوفِ خدا

وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ کہ اُس کے قانون کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے۔ اور اگر تم خوف خدا کو دل میں جگہ دو گے تو پھر تمہیں خوشخبری ہو کہ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے۔ یعنی اُس کی رضا اور خوشنودی بھی ایسے ہی لوگوں کے حق میں ہوتی ہے، نہ کہ کافروں اور ظالموں کے ساتھ۔ بہر حال مسلمانوں کو حکم دیا کہ لڑائی میں تم ابتداء نہ کرو اور حرمت والے مہینوں کا پورا پورا احترام کرو۔ البتہ اگر مشرکین اس بات کی پرواہ نہیں کرتے تو پھر تمہیں بھی اپنا دفاع کرنے کی اجازت ہے۔ مگر وہ بھی اس حد تک جس حد تک

مد مقابل جائیں، زیادتی نہیں کرنا۔ یہ مسلمان کے لیے دائمی قانون ہے۔ برخلاف اس کے کفار و مشرکین نے ہمیشہ عہد کو توڑا یہودیوں اور عیسائیوں نے اللہ کے قانون کی پروا نہ کی اور ذلیل و خوار ہوئے۔ انہوں نے اللہ کا خوف نہ کھایا میدان جنگ کے علاوہ عورتوں اور بچوں کو تہ تیغ کیا۔ بوڑھوں پر ہاتھ اٹھایا۔ آج کی دنیا میں بھی امریکہ ہو یا برطانیہ روس ہو یا فرانس جب آتش انتقام بھڑکتی ہے۔ تو شہروں پر بمباری کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔ کتنے شہری ہیں جو لقمہ اجل بن جاتے ہیں کتنے بیمار ہیں جو جانبر نہیں ہو سکتے۔ آج کی دنیا کے یہ نام نہاد متمدن لوگ جب درندگی پر اتر آتے ہیں۔ تو پھر تمام انسانی قدروں کو روند ڈالتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ کہ یہ لوگ خوف خدا سے عاری ہیں۔

اپنے آپکو ہلاکت میں نہ ڈالو

جہاد جیسے اہم فریضہ کی ادائیگی کے لیے اخراجات کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ مال و دولت کے بغیر جہاد کا کوئی تصور نہیں، اس لیے یہاں پر حکم ہوا۔ وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اس آیت کو سمجھنے میں بعض صحابہؓ کو اشتباہ ہوا تھا اور حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے اس عقدہ کو حل کیا تھا۔ یہ وہی جلیل القدر صحابی ہیں۔ جنہیں مدینہ طیبہ میں حضور علیہ السلام کی میزبانی کا شرف اولین حاصل ہوا تھا۔ ہجرت کے موقع پر نبی علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ کہ میری اونٹنی مامور من اللہ ہے۔ یہ جہاں پہ بیٹھ جائے گی۔ اسی کے ہاں میرا قیام ہوگا۔ چنانچہ یہ سعادت حضرت ابو ایوب انصاریؓ کے حصہ میں آئی اور وہ آپ کا کجاوہ اٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔ جب تک مسجد نبوی اور آپ کا حجرہ تیار نہ ہو گیا، آپ اسی صحابی کے ہاں مقیم رہے۔ حضرت ابو ایوبؓ استنبول کے جہاد میں شریک ہوئے وہیں آپ کی وفات ہوئی اور استنبول کی دیوار کے قریب دفن ہوئے۔ حضور علیہ السلام نے اس جہاد کی پیش گوئی فرما دی تھی۔ کہ آخری زمانہ میں مسلمان استنبول جو ترکی کا دارالخلافہ ہے کو فتح کریں گے، پرانے زمانے میں اسے قسطنطنیہ کہتے

تھے۔ پھر جب دجال کا زمانہ قریب آئے گا تو اس علاقہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہو جائے گا اس کے بعد پھر مسلمان غالب آجائیں گے۔

الغرض اس جہاد کی کمان مشہور سپہ سالار خالدؓ بن ولید کے بھائی عبدالرحمٰنؓ بن ولید کر رہے تھے۔ میدان جنگ کا نقشہ کچھ یوں تھا۔ کہ سامنے دشمن تھا۔ اور مسلمانوں کے پیچھے دیوار تھی، گویا مسلمان گھرے ہوئے تھے۔ ایک مسلمان جذبہ جہاد میں کفار کی صفوں میں گھس گیا، بڑے زور شور سے حملہ کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح یرموک کی لڑائی میں حضرت زبیرؓ لاکھ سوا لاکھ کفار کی صفوں پہ تن تنہا حملہ آور ہوئے تھے۔ اسی طرح یہ گھوڑ سوار صحابی دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے اور پھر اُدھر سے حملہ آور ہو کر واپس آئے۔ اس موقع پر ایک شخص نے یہ آیت پڑھی وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ یعنی اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو تن تنہا اتنے بڑے لشکر میں گھس جانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ وہاں موجود تھے، کہنے لگے بھئی اس کا یہ مطلب نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ یہ آیت تو ہمارے یعنی انصار مدینہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جہاد کو ترک کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یعنی اگر تم نے جہاد سے منہ موڑ لیا۔ تو من حیث القوم زندہ نہیں رہ سکو گے۔ فرماتے ہیں۔ کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ہم نے مہاجرین کی میزبانی کی، پھر اسلام کی خاطر جنگیں بھی لڑیں، پھر جب دین کو کافی حد تک غلبہ حاصل ہو گیا۔ تو ہم انصار نے خیال کیا کہ ہم مالی لحاظ سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں لہٰذا اب ہمیں اپنے کاروبار اور زمینوں کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالےٰ نے بات سمجھا دی۔ کہ کاروبار میں مصروف ہو کر جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ کو ترک نہ کر بیٹھنا۔ اگر ایسا کیا تو ذلیل و خوار ہو جاؤ گے، ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ لہٰذا جہاد کے لیے ہر آن اور ہر لمحہ کمر بستہ رہو۔ مطلب یہ ہے۔ کہ دشمن کی صفوں میں گھس جانا

ہلاکت کا باعث نہیں بلکہ جہاد سے روگردانی کرنا ہلاکت کو دعوت دینا ہے۔ اگر جہاد ترک کر دو گے، آرام طلب بن جاؤ گے، تو دشمن تم پر غالب آکر تمہیں ہلاکت میں ڈال دے گا۔

فقہ حنفی

امام ابُوحنیفہؒ اور آپ کے جلیل القدر شاگردوں نے بھی اس مسئلہ پر بحث کی ہے امام صاحب تابعین میں سے ہیں۔ آپ کی ملاقات آٹھ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلّم سے منقول ہے۔ آپ کے علاوہ باقی تین آئمہ یعنی امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ میں سے کسی کو تابعی ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ پیشہ کے لحاظ سے امام ابُوحنیفہؒ تاجر تھے آپ کے کارخانہ میں کپڑا تیار ہوتا تھا، جبکہ آپ وسیع پیمانے پر تجارت کرتے تھے اللہ تعالیٰ نے مال بھی دیا تھا اور پھر اُسے خرچ کرنے کا حوصلہ بھی عطا فرمایا تھا خصوصاً غریب طلباء کی اس طرح مدد کرتے تھے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلتا تھا۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد شمار سے باہر ہے، جن میں بڑے قابل لوگ ہوئے ہیں۔ خصوصاً امام ابویُوسفؒ علم حدیث میں بڑی دسترس رکھتے تھے اور امام محمدؒ —— لغت دانی کے لحاظ سے بے مثال تھے۔ آپ امام شافعیؒ کے استاد تھے امام احمدؒ کا قول ہے۔ کہ جس مسئلہ پر امام ابُوحنیفہؒ، امام ابُویوسفؒ اور امام محمدؒ جمع ہو جائیں، تو پھر مخالفت نہیں ہو سکتی۔ ان تینوں کا اجماع گویا فقہ، حدیث اور زبان کا اجماع ہے۔ دنیا میں فقہ حنفی کی اس قدر پذیرائی امام صاحب کے قابل شاگردوں کی انتھک محنت کا نتیجہ ہے۔ امام ابویُوسفؒ اپنے دور میں ساٹھ لاکھ مربع میل پر محیط سلطنت خلافت کے چیف جسٹس تھے اُس وقت اسلامی مملکت ایک طرف خراسان تک اور دوسری طرف افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی۔ امام لیث ابن سعدؒ، امام مالکؒ کی طرح بڑے امام تھے مگر اُن کے شاگردوں میں کوئی قابل ذکر ہستی نظر نہیں آتی۔ امام شافعیؒ کے شاگرد بڑے قابل تھے، لہذا ان کا مسلک دُور دُور تک پھیلا۔ امام احمدؒ کے شاگردوں نے بڑی محنت کی جسکی وجہ سے آپ کا مسلک بھی پھیلا۔

قانونِ صلح و جنگ

امام محمدؒ نے سیر کبیر اور سیر صغیر دو مشہور کتابیں لکھی ہیں ان میں سیر کبیر اسلام کے قانون صلح و جنگ کے متعلق ہے۔ اسلام کے اس قانون کو سمجھنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی کتاب نہیں۔ اس میں احادیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم آثار صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں کی روشنی میں مسائل صلح و جنگ کو حل کیا گیا ہے۔ ان کے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش ہوا، کہ اگر کفار کی کثیر تعداد سامنے موجود ہو، تو اس کے ساتھ ایک تنہا مسلمان کو جنگ کرنا کس حد تک درست ہے۔ جب کہ اس کی جان تلف ہو جانے کا غالب گمان ہو۔ امام صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اگر ایسا کرنے سے دشمن کو نقصان پہنچ سکتا ہو، جس کا بحیثیت مجموعی مسلمانوں کو فائدہ ہو، تو اس قسم کی قربانی پیش کرنا روا ہے۔ اور اگر ایسا کرنے سے نہ کفار کو نقصان پہنچ سکتا ہو، اور نہ ہی اسلام کو فائدہ ہو، تو پھر محض جان کا ضیاع ہے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

انفاق فی سبیل اللہ

یہاں پر مطلق حکم ہے۔ وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ اللہ کا راستہ کون سا ہے۔ قرآن پاک میں اس کی مختلف مدات بیان کی گئی ہیں۔ مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ میں بھی یہی بات ہے خرچ کریں مگر کہاں۔ تو اس کی تشریح پہلے آچکی ہے۔ سب سے پہلے زکوٰۃ ادا کرو پھر حج و عمرہ کا خرچہ ہے۔ غرباء و مساکین پر خرچ کرو۔ اس کے بعد دفاع ہے اور اسی مد میں جہاد فی سبیل اللہ بھی آتا ہے۔ اور پھر اللہ کے راستے کی آگے کئی شاخیں ہیں۔ جیسے دین کی تعلیم کا شعبہ ہے تصنیف و تالیف کی مد ہے، مجاہدین کی اعانت ہے۔ ان سب امور پر خرچ کرنے کا حکم ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، محض زکوٰۃ ادا کر دینے سے سارے مالی حقوق ادا نہیں ہو جاتے بلکہ اِنَّ فِی الْمَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں حق باقی ہے۔ زکوٰۃ فرض ہے۔ اس کے بعد صدقہ فطر واجب ہے۔ قربانی بھی واجب ہے۔ اسی طرح اعزہ و اقارب پر خرچ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اخراجات سنت اور مستحب ہیں۔

راہ میں سب میں خرچ کرنا چاہیئے۔ اور سب سے بڑھ کر جہاد کی مد ہے اگر اہل اسلام اس مد میں خرچ نہیں کریں گے تو دشمن غلبہ پا جائے گا اور مسلمان ذلیل و خوار ہوں گے۔ اور پھر نہ صرف مال ضائع ہوگا بلکہ جانیں بھی تلف ہوں گی۔ آپ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ تاتاریوں کے حملوں کے بعد مسلمانوں کے قدم نہیں جم سکے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ مسلمانوں میں قربانی کا جذبہ باقی نہیں رہا۔ غیر مسلم اقوام زیادہ خرچ کرتی ہیں۔ اسلحہ سازی اور دوسری ٹیکنالوجی پر جو کچھ امریکہ اور روس خرچ کر رہے ہیں، اس کی مثال کہاں ملیگی۔

فضول خرچی

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائپوری کی ایک مجلس میں یہ خبر موضوع بحث بنی کہ نجد کے کسی امیر نے فرانس سے تین لاکھ ریال میں بنا بنایا حمام منگوایا ہے۔ آپ نے بڑے افسوس سے فرمایا، یہ مسلمانوں کی بدبختی ہے۔ کہ حمام پر اتنا خرچ کر دیا ہے۔ اگر اس رقم سے کوئی فیکٹری لگاتے تو ملک و قوم کا فائدہ ہوتا۔ حمام تو محض نمود و نمائش اور عیاشی کا سامان ہے۔ اس سے قوم کو کیا فائدہ پہنچا۔ اس زمانے کی بڑی بڑی عمارتیں اور ان میں تعیش کا سامان مسلمانوں کے کون سے کردار کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ بڑی بڑی قیمتی کاریں درآمد ہو رہی ہیں، غیر ملکی عورتوں سے شادیاں ہو رہی ہیں لاکھوں روپیہ ننگ و ناموس کے نام پر برباد کیا جا رہا ہے۔ مگر کیا مسلمان دنیا میں باعزت زندگی بسر کر رہا ہے۔ نہیں بلکہ بڑی طاقتوں کا دست نگر بن کر رہ گیا ہے۔ دنیا کے مختلف گوشوں میں انگریز نے کس قدر ذلیل کیا ہے روس اور امریکہ کیا کچھ کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس افرادی قوت ہے۔ بیشمار وسائل مہیا ہیں مگر سب عیاشی کی نذر ہو رہے ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کو ترک کر دیا گیا ہے۔ ایک فیصد بھی صاحب ثروت آپ کو نہیں ملیں گے جو اپنے مال کا معقول حصہ دین کی حفاظت اور اس کی بقا کے لیے خرچ کر رہے ہوں۔

تبلیغ دین

انگریزوں کی آمد سے پہلے ہندوستان میں نواب نجیب الدولہ تھے اپنے دور میں پانچ سو علماء کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا۔ یہ وظیفہ پانچ روپے سے لیکر پانچسو روپے تک تھا۔ اس وقت کے پانچ سو روپے آج کے پانچ ہزار سے

زیادہ حیثیت رکھتے تھے۔ یہ وظیفہ محض علم دین کی تحصیل کے لیے دیا گیا تھا اور وہ لوگ نواب کی کسی پالیسی کے پابند نہیں تھے۔ جیسا کہ آجکل بیوروکریسی کا شیوہ ہے کہ کسی کو چند ٹکے دیکر اُس کا دین ایمان تک خرید لیا۔ ایسا نہیں تھا۔

آج مسلمان تبلیغ دین کے لیے کتنی رقم خرچ کر رہے ہیں۔ عیسائیت کا راستہ بند کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے اربوں روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ کہیں سکول کے نام پر، کہیں کسی ہسپتال کی آڑ میں اور کہیں کسی اور رفاہی ادارہ کی صورت میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مگر سچے دین کا داعی مسلمان ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ خدا کا فرمان ہے خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ مگر ہم پر کوئی اثر نہیں۔ ایسی صورت حال میں دشمن غلبہ حاصل نہیں کرے گا، تو اور کیا ہوگا۔

احسان کرو

فرمایا، وَاَحۡسِنُوۡا یعنی مستحقین کے ساتھ احسان کرو۔ قرابت داروں غریبوں مسکینوں، بیواؤں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اگر اللہ کی رضا چاہتے ہو تو اللہ کے راستے میں خرچ کر کے احسان جیسے اہم اصول پر عمل کرو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ ظلم و زیادتی کرنے والوں، کفر و شرک اور بدعات کے مرتکبین کو کبھی پسند نہیں فرماتا۔

درس ہشاد (۸۰) — آیت ۱۹۶

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ
مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ
مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ
فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ ۫ وقفة
فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا
رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ
حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ
ع ۲۴ ۸ ۸ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۞۱۹۶

ترجمہ :۔ اور پورا کرو حج اور عمرہ کو اللہ کے لیے۔ پھر اگر تم روک دیے گئے تو جو میسر ہو قربانی کرو۔ اور اپنے سروں کو نہ منڈاؤ یہاں تک کہ قربانی اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو، پس فدیہ ہے روزے سے یا صدقہ ہے یا قربانی ہے۔ پس جب تم امن کی حالت میں ہو، تو پھر جس شخص نے فائدہ اٹھایا عمرہ کا حج کے ساتھ، پس جو میسر ہو قربانی سے جو شخص قربانی کا جانور نہ پائے پس وہ تین دن کے روزے حج کے ایام میں رکھے اور سات روزے جب تم واپس لوٹو۔ یہ دس روزے پورے ہیں۔ یہ حکم اس شخص کے لیے ہے جس کا گھر بار مسجد حرام کے پاس نہ ہو۔ اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ۞۱۹۶

گذشتہ سے پیوستہ

اس سے پہلے نئے چاند کے متعلق ذکر آ چکا ہے۔ کہ چاند اوقات اور

خاص طور پہ حج کے اوقات معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا قمری مہینے کی تقویم ضروری ہے۔ حج اور اس کے ساتھ جہاد کا بیان بھی آگیا ہے۔ قتال فی سبیل اللہ کی غرض و غایت بھی آگئی ہے کہ اس سے مقصود فتنہ و فساد کی بیخ کنی ہے۔ جہاد ہی کے ضمن میں انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر بھی آچکا ہے۔ اس کے بغیر جہاد کی تکمیل ممکن نہیں۔ اور اگر جہاد کا جذبہ ختم ہو جائے گا تو دشمن غالب آجائے گا۔ حرمت والے مہینوں کا بیان بھی آچکا ہے۔ کہ یہ کون کونسے مہینے ہیں۔ اور پھر ان میں قتال کے کیا احکام ہیں۔ مسلمانوں کو ان مہینوں کا پورا پورا احترام کرنے کا حکم دیا گیا، تاہم اگر کفار لڑائی سے باز نہ آئیں، تو پھر مسلمانوں کو بھی اس کا جواب دینے کی اجازت دی گئی ہے۔

حج اور عمرہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرہ کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے اور اس سفر کے دوران اگر احصار پیدا ہو جائے یعنی رکاوٹ کھڑی ہو جائے اور کوئی شخص حج و عمرہ کی تکمیل نہ کر سکے، تو اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ یہ مسائل بیان ہوئے ہیں حج اور عمرہ کے ارکان ملتے جلتے ہیں، تاہم ان کی ادائیگی کے اوقات مختلف ہیں۔ عمرہ کو حج اصغر بھی کہتے ہیں اور یہ سال بھر کے تمام ایام میں سوائے ایام حج کے ادا کیا جا سکتا ہے۔ حج مخصوص ایام یعنی ذی الحجہ کی آٹھویں تا تیرھویں تاریخ کو ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔ ان ایام کے علاوہ کسی اور تاریخ پہ حج ادا نہیں ہو سکتا۔ حج عمر بھر میں صاحب استطاعت کے لیے ایک دفعہ فرض ہے، البتہ عمرہ سنت ہے ہاں اگر ایک دفعہ اس کی نیت کر لے تو پھر واجب ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر عمرہ کا احرام باندھ لیا ہے، تو پھر لازماً اس کو پورا کرنا پڑے گا۔ اگر سفر کے دوران کوئی رکاوٹ پڑ جائے اور انسان عمرہ مکمل نہ کر سکے۔ تو اُسے بہر حال قضا کرنا ہو گا اب اُس کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ خود حضور علیہ السلام کا عمل موجود ہے۔ آپ نے صحابہ کرامؓ کے ہمراہ ۶ھ میں عمرہ کا سفر اختیار کیا مگر حدیبیہ کے مقام پہ کفار نے روک دیا اور بغیر عمرہ ادا کیے واپس جانا پڑا۔

آپ نے اگلے سال یعنی سنہ ۷ھ میں اس کو قضاء کیا۔ اس مقام پہ اللہ تعالےٰ نے حج اور عمرہ کا اکٹھا حکم دیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ جہاد کا حکم بھی ہے۔ حج کے بعد جو زیادہ مشقت طلب عبادت ہے، وہ جہاد ہے۔ اس میں مال اور جان دونوں کی بازی لگانا پڑتی ہے چونکہ حج میں بھی مال وجان دونوں چیزوں کا حصہ ہے۔ اس لیے حضور علیہ السلام نے عورتوں سے فرمایا تھا جِھَادُکُنَّ الْحَجُّ تمہارا جہاد حج ہے۔ یعنی تم پہ جہاد فرض نہیں ہے۔ تمہارے لیے حج ہی کافی ہے کیونکہ اس میں بھی جہاد کی طرح مال وجان کی ضرورت ہوتی ہے۔

ارشاد ہوتا ہے، وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ، حج اور عمرہ کو اللہ کی رضا کی خاطر پورا کرو۔ یعنی اگر سفر کے دوران تمہارا حج یا عمرہ مکمل نہیں ہو سکا ہے۔ تو اس کو بعد میں پورا کر لو، یہ واجب ہے حج کا لفظی معنیٰ قصد کرنے کا ہے۔ اور مراد اس سے مخصوص ایام میں افعال مخصوصہ کا قصد ہے جو کہ بیت اللہ شریف اور اس کے مضافات میں خالص نیت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ عمرہ کا معنیٰ فقط زیارت ہے۔ اور یہ حج کے مخصوص ایام کے علاوہ پورے سال میں کسی وقت بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔

لله کا مفہوم

لِلّٰہ کا عام فہم معنیٰ اللہ کی رضا کے لیے ہے۔ جس طرح دیگر عبادات نماز، زکوٰۃ، روزہ وغیرہ اللہ کی رضا کی خاطر ہی ادا کی جاتی ہیں۔ اسی طرح حج و عمرہ کے متعلق فرمایا کہ انہیں اللہ کی رضا کی خاطر پورا کرو، تاہم اس مقام پہ ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ حج و عمرہ جیسی مشقت طلب اور صبر آزما عبادت صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لیے ہونی چاہیئے اس میں غرور و تکبر اور فخر و تفاخر کا شائبہ تک نہیں ہونا چاہیئے حج پہ روانہ ہوتے وقت بینڈ باجے کا استعمال اور گلے میں ہاروں کے ذریعے تشہیر تفاخر کی نشانی ہے۔ عام طور پہ تو عزیز و اقارب ہی حاجی کو ہار پہناتے ہیں مگر خود ستائی کا پہلو خاص طور پہ اس وقت نمایاں ہوتا ہے۔ جب حاجی خود اپنے گلے میں ہار ڈال کر اپنی حیثیت کو نمایاں کرتا ہے حج سے واپسی پر بھی

یہی کچھ ہوتا ہے حاجی کو ہاروں اور اب خاص طور پر کرنسی نوٹوں کے ہاروں سے لادا جاتا ہے۔ اور اگر ہار پہنانے والا کوئی نہیں پہنچا تو اپنے پاس سے ہار نکال کر گلے میں ڈال لیا جاتا ہے۔ کہ حاجی کی پہچان ہو۔ یہ سب فخریہ چیزیں ہیں۔ ان کی وجہ سے رضا خالص اللہ کی نہیں رہتی بلکہ اس فعل میں دوسرے لوگوں کی رضا کو بھی شامل کرنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اور یہی چیز لفظ لِلّٰہِ کے مفہوم کے خلاف ہے۔

احصار کے مسائل

فرمایا حج اور عمرہ کو اللہ کی رضا کے لیے پورا کرو فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ پھر اگر تم روک دیے گئے۔ یعنی تم نے احرام باندھ کر حج یا عمرہ کا سفر شروع کر دیا ہے۔ اور راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو گئی تو اسے احصار کہتے ہیں۔ احصار کی تعریف کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک شرعی احصار صرف ایسی صورت میں شمار ہوتا ہے۔ جب حج و عمرہ کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جائے۔ اس کی مثال ۶ھ میں حضور علیہ السلام اور صحابہ کا واقعہ ہے۔ جب ان کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا گیا اور آپ بغیر عمرہ کیے مدینہ طیبہ کو لوٹ گئے۔ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کے مطابق دشمن کی رکاوٹ کے علاوہ بیماری یا حادثہ بھی احصار کا سبب بن سکتا ہے۔ کوئی ایسی بیماری لاحق ہو گئی ہے جس کی وجہ سے عازم حج سفر نہیں کر سکتا یا کوئی ایسا حادثہ پیش آ گیا ہے، سخت زخمی ہو گیا ہے، ٹانگ زخمی ہو گئی ہے کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہے۔ کسی درندے نے راستہ روک رکھا ہے۔ سیلاب آ گیا ہے یا کسی اور وجہ سے راستہ رک گیا ہے۔ یہ بھی شرعی احصار کی تعریف میں آئے گا۔

اس قسم کی صورت حال کے متعلق ارشاد فرمایا فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ جو میسر ہو قربانی کر دو۔ احرام باندھ کر حج و عمرہ سے محروم رہنے کی صورت میں قربانی واجب ہو جاتی ہے۔ ایک بکری یا گائے یا اونٹ جو بھی میسر ہو، قربانی کر دے اور احرام کھول دے۔ یہ قربانی کس مقام پر کرے، اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جس مقام پر کوئی رک جائے، وہیں قربانی کر کے احرام

سے باہر آجائے۔ البتہ امام ابُوحنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ قربانی حرم کی حدود میں ہونی چاہیئے اور اس کا طریق کار یہ ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے شخص کے ہاتھ قربانی بھیج دی جائے اور اس سے طے کر لیا جائے کہ فلاں دن فلاں وقت پہ قربانی حدود حرم میں کر دینا پھر جب ظن غالب ہو جائے کہ طے شدہ پروگرام کے مطابق قربانی ہو چکی ہے تو احرام کھول دے۔

قربانی اور حلق

اسی بات کے متعلق فرمایا وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ اور اُس وقت تک سر نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنے ٹھکانے پر نہ پہنچ جائے۔ اور ٹھکانہ اس کا حدود حرم ہے۔ جیسا کہ ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ یعنی قربانی کا محل بیت عتیق ہے سر منڈانے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اب احرام کھول سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی ترتیب ہی یہ ہے۔ کہ پہلے قربانی کرے، پھر سر منڈائے اور پھر احرام کھول دے۔

بعض دوسرے حضرات کہتے ہیں۔ کہ قربانی کا محل وہی جگہ ہے۔ جہاں رکاوٹ واقع ہوئی ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے۔ کہ ۶ھ میں جب آپ اور صحابہؓ حدیبیہ کے مقام پہ روک دیے گئے تھے، تو آپ نے وہیں قربانی کر کے احرام کھول دیا تھا اور واپس مدینہ طیبہ روانہ ہو گئے۔ جدہ سے مکہ جاتے ہوئے حدیبیہ مکہ سے ۲۲ کلومیٹر کے فاصلہ پہ ہے اسے آجکل شمیسیہ کہتے ہیں۔ یہ حد حرم ہے۔ نشان کے طور پہ وہاں سفید مینار بنا دیے گئے ہیں۔

امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی قربانی حدود حرم کے اندر تھی کیونکہ آپ حد حرم پہ ٹھہرے ہوئے تھے اور آپ نے حد کے اندر قربانی کی تھی لہذا قربانی کے ٹھکانا سے مراد حد حرم ہے۔ بہر حال حج یا عمرہ نامکمل چھوڑنے کی صورت میں اُس کی ادائیگی واجب ہو جاتی ہے اور اسکی قضا لازمی دینا ہوگی۔

احرام کی جنایات

جب کوئی حج یا عمرہ کا احرام باندھ لیتا ہے تو اُس پہ بعض پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں۔ مثلاً سلا ہوا لباس نہیں پہن سکتا خوشبو نہیں لگا سکتا، بال اور ناخن

نہیں کاٹ سکتا۔ بیوی کے پاس نہیں جا سکتا وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر مجبوراً کسی پابندی کو توڑنا پڑے۔ تو پھر اس کے عوض میں فدیہ دینا پڑتا ہے۔ یہاں پہ اسی مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا تم میں سے جو کوئی بیمار ہو۔ اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ پس فدیہ ہے روزے سے یا صدقہ ہے یا قربانی ہے۔ یعنی عذر کے ساتھ احرام کی پابندی توڑنے کی صورت میں ان تین جزاؤں میں سے کوئی ایک ادا کرنی ہوگی۔ تین روزے رکھے یا صدقہ میں تین صاع گندم ادا کرے یا کم از کم ایک بھیڑ یا بکری ذبح کرے۔ صدقہ کی صورت میں چھ مساکین کو نصف صاع گندم فی کس ادا کرنا ہوگا۔

حضرت کعب بن عجرہؓ نے احرام باندھا ہوا تھا۔ ہانڈی پکانے کے لیے آگ جلا رہے تھے اور آپ کے سر سے جوئیں نیچے گر رہی تھیں۔ حضور علیہ السلام کا گذر ہوا تو فرمایا تمہارے سر کے جانور تمہیں بہت ستاتے ہیں؟۔ عرض کیا حضور! واقعی بہت ستاتے ہیں۔ مگر میں نے احرام باندھا ہوا ہے، کیا کر سکتا ہوں حکم ہوا اگر سر منڈوانا ہے۔ تو ایک بھیڑ یا بکری کا دم دیدے یا چھ مساکین کو صدقہ دیدے یا تین دن کے روزے رکھ لے، اس جنایت کی تلافی ہو جائے گی۔

حج کی اقسام

حج کی تین قسمیں ہیں یعنی افراد، قران اور تمتع۔ افراد حج یہ ہے۔ کہ میقات سے صرف حج کا احرام باندھے اور حج کر کے احرام کھول دے۔ اس میں عمرہ شامل نہیں ہوتا۔ دوسری صورت قران ہے۔ کہ کوئی شخص میقات سے عمرہ اور حج کا مشترکہ احرام باندھے۔ عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام نہ کھولے بلکہ اسی احرام سے ایام حج میں حج کرنے کے بعد یعنی دس تاریخ کو احرام کھول دے۔ حضور نبی کریم علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقع پہ یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں۔ کہ صحیح بات یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قران کیا تھا کیونکہ احادیث میں واضح طور پہ آتا ہے کہ آپ تلبیہ میں کہتے تھے لَبَّيْكَ بِحَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ

اسی لیے امام ابُو حنیفہؒ قِران کو افضل قرار دیتے ہیں۔

تمتع اور قربانی

حج کی تیسری قسم تمتع ہے اور عام طور پہ یہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی حج کے مہینوں میں ایک ہی سفر میں عمرہ اور حج کا علیحدہ علیحدہ احرام باندھا جاتا ہے۔ میقات سے عمرہ کا احرام باندھا، مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ کیا اور احرام کھول دیا پھر آٹھ ذی الحج کو حج کا احرام باندھا اور دس تاریخ کو قربانی کرنے اور حجامت بنوانے کے بعد کھول دیا اور حج کے باقی ارکان پورے کر لیے۔ ایسی صورت کے متعلق اللہ تعالےٰ نے بعض احکام ارشاد فرمائے ہیں۔ فَاِذَآ اَمِنۡتُمۡ پس جب تم امن کی حالت میں ہو یعنی حج و عمرہ کی ادائیگی میں کوئی امر مانع نہ ہو۔ اور ایک ہی سفر میں فَمَنۡ تَمَتَّعَ بِالۡعُمۡرَةِ اِلَى الۡحَجِّ جس شخص نے فائدہ اٹھایا عمرہ کا حج کے ساتھ یعنی عمرہ اور حج دونوں ایک ساتھ کئے۔ اور یہی صورت قِران میں پیش آتی ہے۔ کہ کوئی شخص ایک ہی سفر میں حج و عمرہ دونوں سے فارغ ہونا چاہتا ہے تو فرمایا فَمَا اسۡتَيۡسَرَ مِنَ الۡهَدۡيِ پس جو میسّر ہو قربانی دی جائے۔

یہ قربانی دراصل دم ہے اُس نقصان کا جو اُسے حج و عمرہ ایک سفر میں پورا کرنے کی وجہ سے اٹھانا پڑا۔ اگر حج اور عمرہ کے لیے علیحدہ علیحدہ سفر اختیار کرتا، تو وقت بھی زیادہ دینا پڑتا، خرچ بھی دوگنا ہوتا اور محنت بھی زیادہ کرنی پڑتی۔ اور ظاہر ہے کہ ان کا ثواب بھی زیادہ ہوتا۔ اب ان چیزوں کی بچت کرنے سے اُس کے ثواب میں جو کمی واقع ہوئی یہ قربانی اُس کا نعم البدل ہے۔ اسی لیے امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ قربانی عام قربانی کے حکم میں نہیں آتی ہے۔ بلکہ یہ تو جزا ہے لہٰذا قربانی دینے والا اسے خود استعمال نہیں کر سکتا بلکہ ساری کی ساری صدقہ کرنی ہوگی حالانکہ عام قربانی میں سے ہر امیر غریب خود بھی کھا سکتا ہے۔ برخلاف اس کے امام ابُو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ دم شکر کا دم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سفر میں دو نعمتیں عطا کی ہیں یعنی عمرہ اور حج دونوں ادا کئے ہیں لہٰذا اس کا حکم عام قربانی کا ہے۔ اور اس میں خود بھی کھا سکتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی دے

سکتا ہے۔ البتہ ایسی قربانی کو حدودِ حرم کے اندر ذبح کرنا ضروری ہے۔

قربانی کا بدل

بعض صورتیں ایسی بھی پیش آسکتی ہیں۔ کہ انسان قربانی کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ ایسے ہی حالات کے متعلق فرمایا فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ جو کوئی قربانی نہ پائے فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ تو وہ ایامِ حج میں تین روزے رکھے وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ اور سات اس وقت جب تم واپس لوٹ جاؤ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ یہ پورے دس ہو گئے۔ یعنی جو شخص حج قران یا حج تمتع ادا کرے اور قربانی کرنے کے لیے اس کے پاس مال نہ ہو یا جانور نہ مل سکے، تو اس قربانی کا نعم البدل دس روزے ہیں۔ تین روزے تو واضح ہیں۔ کہ ایامِ حج میں رکھے جائیں گے یعنی ذی الحج کی سات، آٹھ اور نو کو رکھے جائیں۔ کیونکہ دس تاریخ کو روزہ رکھنا منع ہے۔ البتہ سات روزوں کے متعلق اختلاف ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ کہ واپس لوٹنے سے مراد حاجی کا اپنے وطن پہنچنا ہے، اور یہ روزے اُسے اپنے گھر آکر رکھنا چاہئیں۔ مگر امام صاحبؒ فرماتے ہیں۔ کہ واپس لوٹنے سے مراد حج سے واپسی ہے۔ جب ایامِ حج ختم ہو جائیں تو یہ سات روزے اگر قیام ہو تو حرم میں رکھے جا سکتے ہیں۔ یا راستے میں یا گھر واپس آکر ہر طرح درست ہے۔ دس روزے پورے کرنے سے قربانی کی تلافی ہو جائے گی۔ اور حاجی کا قران یا تمتع درست ہو جائے گا۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ ایامِ حج میں تین روزے لازمی ہیں۔ اگر یہ چھوٹ گئے تو پھر باقی سات رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اُسے بہر حال دم دینا پڑے گا۔

تمتع کی شرط

فرمایا حج تمتع اور قربانی کے مسائل کے متعلق شرط یہ ہے ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کہ تمتع کرنے والے کا گھر بار مسجد حرام کے پاس نہ ہو۔ یعنی حج تمتع اس شخص کے لیے روا ہے جو حدود حرم کا رہنے والا نہ ہو بلکہ آفاقی ہو۔ حدودِ حرم کے رہنے والے اور محلی تو جب چاہیں عمرہ کر سکتے ہیں۔ حدودِ حرم سے باہر جا کر احرام باندھیں اور مکہ مکرمہ آکر

عمرہ کے ارکان پورے کر لیں۔ حج کے لیے بھی یہ لوگ آٹھ ذی الحج کو احرام باندھ کر بآسانی حج کر سکتے ہیں۔ مگر دقت طلب مسئلہ تو بیرونی لوگوں کے لیے ہے اُن کے لیے عمرہ اور حج کے لیے علیحدہ علیحدہ سفر اختیار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا حج قران اور تمتع کی اجازت صرف ایسے ہی آفاقی لوگوں کو حاصل ہے۔

احکام کی پابندی

فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِن احکام کی پابندی کے لیے اللہ سے ڈرتے رہو کہیں خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ بعض اوقات انسان باریک احکام کو نظر انداز کر جاتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ وَاعْلَمُوْا اس بات کو اچھے طریقے سے سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑے گا۔ تو اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ اللہ تعالیٰ سزا دینے میں بڑا سخت ہے لہٰذا اُس کے احکام کی تعمیل کرو، تاکہ اُس کی خوشنودی حاصل ہو اور تم عذاب سے بچ جاؤ۔

درس ہشتاد و یک (۸۱) — آیت ۱۹۷ تا ۱۹۸ تقریباً نصف

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ وَلَا جِدَالَ فِى الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۚ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ

وقفۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ترجمہ:۔ حج کے چند مہینے ہیں، جو معلوم ہیں۔ پس جس شخص نے حج کو لازم کر لیا ان مہینوں میں، پس عورتوں کے ساتھ بے حجاب ہونا جائز نہیں ہے اور نہ گناہ کی بات اور نہ حج میں جھگڑا کرنا۔ اور جو کچھ کرو تم نیکی سے اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے، اور توشہ بنا لو۔ بیشک بہتر توشہ تقویٰ ہے۔ اور مجھ سے ڈرو، اے عقل مندو (۱۹۷) تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس بات میں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو

ربط آیات اس سے پہلے جہاد اور حج کا مشترکہ حکم بیان ہوا پھر احصار کا مسئلہ بیان ہوا۔ کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد اگر کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے یعنی بیماری لاحق ہو جائے یا دشمن کی وجہ سے راستہ غیر محفوظ ہو جائے تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیئے۔ اس ضمن میں احصار کا مسئلہ بیان ہوا۔ اس کے بعد تمتع اور قران کا بیان آیا کہ جسے حج اور عمرہ نصیب ہو جائے یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے ایسے شخص کو دم یعنی قربانی دینا ہوگی۔ اگر قربانی کی استطاعت نہیں ہے۔ تو دس روزے رکھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

ان آیات میں بھی حج کے مختلف احکام بیان ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مشرکین کی اس تحریف کا رد ہے جو انہوں نے حج سے متعلق زمانہ جاہلیت

میں پیدا کر لی تھی۔

حج کے مہینے

ارشاد ہوتا ہے اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ اشہر شہر کی جمع ہے مطلب یہ کہ حج کے مہینے معلوم ہیں۔ کہ یہ شوال، ذی قعدہ اور ذی الحج کے پہلے دس دن ہیں ویسے ذی الحج کا پورا مہینہ مجازاً حج کا مہینہ ہی شمار ہوتا ہے۔ اس کا معنی یہ ہوا۔ کہ حج کا احرام ان مہینوں میں باندھا جاسکتا ہے شوال سے پہلے حج کا احرام نہیں باندھا جاسکتا۔ اس مسئلہ میں فقہائے کرام کا اختلاف ہے۔ کہ اگر ماہ رمضان یا اس سے پہلے احرام باندھ کر حج کیا جائے تو حج ادا ہوگا یا نہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ کہ ایسے شخص کا حج نہیں ہوگا۔ البتہ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ حج کے مہینوں سے قبل احرام باندھ کر اگر کوئی شخص احرام کی پوری طرح حفاظت کرتا ہے تو اس کا حج تو ہو جائے گا۔ مگر اس میں کراہت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا حج کا احرام شوال سے پہلے نہیں باندھنا چاہیئے یہ مکروہ ہوگا۔

احرام کی پابندیاں

حج یا عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد محرم پر بعض پابندیاں عاید ہو جاتی ہیں جس طرح کوئی تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک عازم حج یا عمرہ کا احرام باندھ کر نیت کرتا ہے اور تلبیہ پکارتا ہے۔ تو وہ عملاً حج یا عمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اس پر احرام کی پابندیاں عاید ہو جاتی ہیں۔ یہاں پر اسی چیز کو بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ یعنی جس شخص نے ان مہینوں میں حج کو اپنے اوپر لازم کر لیا۔ یہاں پر فرض کا معنی لازم کرنا ہے یعنی احرام باندھ کر نیت کر لی اور تلبیہ پکارنا شروع کر دیا۔ لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ تو بعض چیزیں جو پہلے مباح تھیں وہ اب ممنوع ہو گئیں۔ جس طرح کوئی شخص روزہ کی حالت میں بیوی کے قریب نہیں جاسکتا اسی طرح حضورؐ نے فرمایا کہ احرام کی حالت میں بھی بیوی کے پاس نہیں جاسکتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص احرام باندھ کر وقوف عرفہ سے پہلے اپنی بیوی سے مقاربت کرلے تو اس کا حج فاسد ہو جائیگا اور آئندہ سال قضا دینا ہوگی۔ اور اس کے علاوہ ایک سالم اونٹ یا سالم گائے

بطور دم قربانی کرنا ہوگی۔ اسی طرح احرام کی حالت میں کوئی مرد سلا ہوا کپڑا حتیٰ کہ موزہ تک نہیں پہن سکتا۔ خوشبو نہیں لگا سکتا۔ سر اور منہ کو ڈھانپ نہیں سکتا۔ عورتیں سلے ہوئے کپڑے پہن سکتی ہیں مگر خوشبو نہیں لگا سکتیں۔ سر کو ڈھانپ لیں گی مگر چہرہ کھلا رہیگا اسپر کپڑا نہیں آنا چاہیئے۔ اگر کوئی عورت پردہ کرنا چاہے تو چہرہ پہ کوئی لکڑی وغیرہ رکھ کر اوپر نقاب ڈال سکتی ہے۔ جس سے کپڑا چہرے کو نہ لگے۔ احرام کی حالت میں شکار کرنا بھی منع ہے اس کے متعلق واضح حکم ہے۔ "حُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا" جب تک تم احرام میں ہو خشکی کا شکار نہیں کر سکتے بلکہ کسی جانور کو ذبح بھی نہیں کر سکتے۔ اگر کرو گے تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ لہذا اس کو کوئی دوسرا شخص بھی نہیں کھا سکتا گویا یہ سب چیزیں احرام کی حالت میں ممنوع ہیں۔

بے حجابی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی اپنے اوپر حج کو لازم کر لے، تو فَلَا رَفَثَ حج میں رفث نہیں ہے۔ لفظ رفث عام ہے۔ اس کا اطلاق معمولی بے پردگی سے لے کر مباشرت تک ہوتا ہے۔ عورت کے ساتھ بوس و کنار شہوانی باتیں اور مباشرت سب رفث میں آجاتا ہے غیر عورت کے ساتھ تو یہ چیزیں ہر وقت حرام ہیں۔ مگر احرام کی حالت میں یہ افعال اپنی بیوی کے ساتھ بھی جائز نہیں رہتے۔

نافرمانی

وَلَا فُسُوقَ احرام کی حالت میں فسق بھی جائز نہیں۔ اس سے مراد اطاعت سے باہر نکل جانا یا نافرمانی ہے۔ اگرچہ یہ چیزیں عام حالت میں بھی منع ہیں مگر جب کوئی حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھ لیتا ہے۔ قرآن کی ممانعت میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے حرم کے اندر کوئی گناہ کرنا عام جگہ کی نسبت زیادہ جرم ہے۔ یا جس طرح حرمت کے مہینوں میں کسی گناہ کا ارتکاب دیگر مہینوں کی نسبت زیادہ باعث وبال ہے۔ الغرض احرام کی حالت میں نافرمانی کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ فسق کا لفظ نفاق اور اعتقاد پہ بھی بولا جاتا ہے۔ عمل پہ بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کافروں، منافقوں اور عام گنہگار مومنوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا

ہے۔ مقصد یہ کہ احرام کی حالت میں کسی قسم کے گناہ کی بات نہیں ہونی چاہیئے۔ ہر طرح کے گناہ سے اجتناب کرنا چاہیئے۔

لڑائی جھگڑا

تیسری چیز فرمایا وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ سفر حج کے دوران لڑائی جھگڑا بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ چیزیں ویسے ہی بری ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اپنے بھائی کے ساتھ جھگڑا مت کرو۔ تاہم احرام کی حالت میں لڑائی جھگڑے کی قباحت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کہ یہ چیز حالت احرام کے منافی ہے۔ لہٰذا حج کے دوران اس قسم کی کوئی حرکت نہیں ہونی چاہیئے۔

سخت تنبیہ

یہ بات قابل غور ہے۔ کہ اس مقام پہ تینوں ممنوعات یعنی رفث، فسوق اور جدال کو بطور اسم استعمال کیا گیا ہے۔ حالانکہ چاہیئے تو یہ تھا کہ ان کو فعل کے طور پہ لایا جاتا فَلَا تَرْفُثُوا وَلَا تَفْسُقُوا وَلَا تُجَادِلُوا یعنی بے پردگی کی بات نہ کرو، نافرمانی نہ کرو اور لڑائی جھگڑا نہ کرو۔ مگر ایسا نہیں کہا گیا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ ان افعال کو اسماء میں بدلنے میں حکمت یہ ہے۔ کہ اسم میں فعل کی نسبت زیادہ تاکید پائی جاتی ہے۔ اور پھر ان اسما کو نفی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس معاملہ میں سخت احتیاط سے کام لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ حج کے سفر میں اجنبی لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور ہر ہر مقام یعنی منیٰ، مزدلفہ عرفات اور حرم شریف میں زبردست رش ہوتا ہے۔ خصوصاً بیت اللہ شریف میں مرد اور عورتیں اکٹھے طواف کرتے ہیں جسکی وجہ سے بعض اوقات ناخوشگوار حالات کا پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہوتا تو فرمایا کہ اس قسم کے غیر معمولی حالات میں بے پردگی، نافرمانی یا جھگڑے کا شائبہ تک بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ حج کے عظیم اور مقدس ارکان کی ادائیگی کے دوران ان بری باتوں کا تصور تک پیدا نہیں ہونا چاہیئے۔ اسم کو نفی میں لاکر گویا تاکید پیدا کی گئی ہے کہ ان باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ۔ تاکہ تمہارے حج میں کوئی نقص واقع نہ ہو جائے۔

حج مبرور

حضرت ابوبکرؓ کا اونٹ گم ہو گیا۔ آپ اپنے نوکر پہ سخت خفا ہوئے۔ کہ اس کی غفلت کی وجہ سے اونٹ گم ہوا۔ حتیٰ کہ اُسے مارنا شروع کر دیا۔ احرام کی

حالت بھی۔ حضور علیہ السلام نے دیکھا تو فرمایا کہ اِس احرام والے آدمی کا حال دیکھو کہ اس حال میں بھی نوکر کو مار رہا ہے۔ مقصد یہ تھا۔ کہ احرام کی حالت میں لڑائی جھگڑا، مار کٹائی گالی گلوچ کا تو امکان تک نہیں ہونا چاہیئے۔ لَا رَفَثَ لَا فُسُوقَ اور لَا جِدَالَ کا یہی معنیٰ ہے۔ حضور علیہ التحیۃ والسلام کا فرمان ہے۔ مَنْ حَجَّ جس شخص نے حج کیا فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ اور اس نے دوران حج نہ بے حجابی کی بات کی اور نہ نافرمانی کی، تو اسکی حالت ایسی ہے رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ گویا آج ہی ماں نے اُسے جنا ہے۔ جس طرح نوزائیدہ بچہ گناہ سے بالکل پاک ہوتا ہے اسی طرح اِن بُری باتوں سے بچنے والا حاجی گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اِسی حج کو حج مبرور کہا جاتا ہے۔ خود حضور علیہ السلام نے حج مبرور کی دعا کی اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَبْرُورًا وَّذَنْبًا مَّغْفُورًا اے اللہ میرے حج کو حج مبرور بنا دے اور میری غلطیوں کو معاف فرما دے ایسا حج نصیب فرما جس میں نہ کوئی گناہ کی بات ہو اور نہ ساتھیوں سے کوئی جھگڑا واقع ہو۔

شیخ سعدیؒ نے اپنی کتاب گلستان میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ حاجیوں کا قافلہ جا رہا تھا۔ اور اس میں شامل لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ کہ ہم فلاں جگہ خوب لڑے۔ گویا انہوں نے دادِ فسق دیا تو کسی شریف آدمی نے کہا " از من بگو حاجی مردم گزارا، حاجی تو نیستی شتر است، یعنی میری طرف سے آدمیوں کو کاٹنے والے حاجی سے کہ دیں کہ تو تو حاجی نہیں ہو سکتا، البتہ تیرا اونٹ حاجی ہو سکتا ہے جس پہ تو سوار ہے۔ تیرے اندر حاجیوں والی کوئی خصلت نہیں کیونکہ تو نے فسق وجدال کا ارتکاب کیا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے سخت تنبیہ کے انداز میں فرمایا۔ کہ حج کے دوران بے پردگی گناہ اور جھگڑا قطعاً نہیں ہونا چاہیئے۔ اس میں بڑے احتیاط کی ضرورت ہے۔ کہیں حج میں نقص نہ واقع ہو جائے۔

وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ اور تم جو بھی نیکی کا کام کرو گے اللہ تعالےٰ اُسے جانتے ہیں۔ یہاں اس بات کی ترغیب دی گئی ہے۔ کہ حج کے

دوران ہمیشہ نیکی اور بھلائی کی طرف راغب رہو۔ حاجی اللہ کا مہمان ہوتا ہے۔
اللہ تعالیٰ اس کی مہمان نوازی کرتے ہوئے اس کی دُعا قبول کرتا ہے۔ اور پھر
جن جن مقامات پہ حاجی جاتا ہے۔ وہ قبولیت کے مقامات ہیں۔ زمانہ یعنی حج کے
مہینے بھی قبولیت کے مہینے ہیں۔ لہٰذا حاجی کو چاہیئے۔ کہ وہ ہر وقت نیکی میں مصروف
رہے۔ فسق و فجور اور جنگ و جدال سے پرہیز کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے ہر فعل
بلکہ ارادے تک کو جانتا ہے۔

زادِ راہ

آیت کے اگلے حصے میں زمانۂ جاہلیت کی ایک باطل رسم کی تردید کی گئی ہے
امام جلال الدین سیوطیؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام نے لکھا ہے۔ یمنی لوگوں کا
حال یہ تھا۔ کہ حج کا موسم آتا تو بے سرو سامانی کی حالت میں چل دیتے۔ نہ کوئی سامان
لیتے نہ روپیہ پیسہ۔ بس ایک چادر کندھے پر ڈالی اور حج کے لیے روانہ ہو گئے
کہتے تھے ہم متوکل علی اللہ ہیں۔ اُس کے راستے پہ نکلے ہیں، وہ خود مدد کرے
گا۔ اور پھر حالت یہ ہوتی کہ راستے میں بھیک مانگنا شروع کر دیتے۔ اور اس طرح
زادِ راہ کے بغیر کسمپرسی کی حالت میں حج کا سفر کرتے۔ حالانکہ اللہ تعالےٰ نے
فرضیت حج کے لیے پہلی شرط ہی استطاعت کی لگائی ہے۔ "مَنِ اسْتَطَاعَ
اِلَیْهِ سَبِیْلًا" یعنی حج کے سفر پہ وہ شخص روانہ ہو، جو اس کی استطاعت
رکھتا ہو۔ اگر کسی کے پاس سفر کے اخراجات نہیں ہیں۔ تو اس پر حج فرض نہیں ہے
اللہ تعالےٰ کی طرف سے اُس سے باز پرس نہیں ہوگی کہ تم نے حج کیوں نہیں کیا
البتہ شوق ایک الگ چیز ہے، جو کہ ہر اہل ایمان کے دل میں موجزن ہوتا ہے
مگر بغیر توفیق کے حج فرض نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح نصاب کے
بغیر زکوٰۃ فرض نہیں۔ جس کے پاس نصاب کے برابر مال نہیں ہے وہ تنگ ہو کر
زکوٰۃ ادا نہ کرے بلکہ دوسرے احکام پہ عمل کرتا رہے۔ حج کے متعلق بھی یہی حکم ہے۔
اگر توفیق نہیں ہے۔ تو کوئی حرج نہیں۔ دوسرے احکام بجا لاؤ۔ نماز روزے
کی پابندی رکھو، والدین اور قرابت داروں کے حقوق ادا کرو جن کے متعلق باز پرس ہوگی

اسی لیے فرمایا وَتَزَوَّدُوْا زادِ راہ سے لیا کرو۔ توشہ بنا کر حج کا سفر اختیار کرو۔ آدمی کو چاہیئے کہ وہ برائی اور سوال سے بچے۔ توشہ بنانا اور اس کے لیے جائز ذرائع اختیار کرنا بالکل درست ہے۔ اسباب کو ترک کرنا درست نہیں۔ البتہ ان ذرائع اور اسباب پہ بھروسہ رکھنا توکل کے خلاف ہے۔ بھروسہ صرف اللہ کی ذات پہ ہونا چاہیئے۔ وہی ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والا ہے۔ بیماری کی صورت میں علاج کرنا درست ہے۔ مگر ڈاکٹر پہ بھروسہ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ شفا تو من جانب اللہ ہے۔ اگر اللہ چاہے گا تو دوائی میں تاثیر پیدا کر دے گا اور مریض صحت یاب ہو جائے گا، ورنہ لاکھ دوائیں استعمال کریں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اللہ چاہے تو پانی میں پیاس بجھانے کی تاثیر پیدا کر دے، اور اگر وہ نہ چاہے تو پوری نہر کا پانی پی کر بھی استسقاء کے مریض کی پیاس نہ بجھے۔ یہ اُس کے قبضۂ قدرت میں ہے معلوم ہوا کہ اسباب پہ کنٹرول ذاتِ خداوندی کا ہے مگر اسباب کو ترک کرنا روا نہیں ہے۔ لہٰذا حج کا ارادہ کیا ہے۔ تو سواری کا انتظام کرو، سامان ساتھ لو اخراجات کے لیے روپیہ پیسہ لے لو اور پھر توکل بہ خدا روانہ ہو جاؤ۔ بغیر زادِ راہ سفر پہ نکلنا تو ویسے ہی عزتِ نفس اور شرافت کے خلاف ہے۔ اس میں قباحتیں پیدا ہوتی ہیں انسان دوسروں پہ بوجھ بنتا ہے جو کہ بالکل جائز نہیں۔ لہٰذا فرمایا کہ زادِ راہ لے لیا کرو۔

گداگری حرام ہے

جو شخص خالی ہاتھ سفر پہ روانہ ہوگا، ظاہر ہے۔ کہ اُسے ضروریاتِ زندگی کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ حالانکہ گداگری اسلام میں حرام ہے اس میں شک نہیں کہ آج آدھی دنیا کے مسلمان دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ مگر یہ گداگری بہر حال حرام ہے شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ چوری، ڈاکہ وغیرہ کی طرح گداگری بھی ایک مضر پیشہ ہے اور حرام ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کسی آدمی کو سوال کرنا روا نہیں، سوائے خاص پریشانی کی حالت میں۔ آپ نے چند آدمیوں کو کچھ وقت کے لیے سوال کرنے کی اجازت دی مگر اُس وقت تک جب تک اُن کی حالت درست ہو

جائے۔ ہمارے ہاں تو لوگ ساری ساری عمر گداگری کو پیشہ بنائے رکھتے ہیں۔ جو کہ عزت نفس کے خلاف ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ قیامت کے روز گداگر اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوگا تو اس کے چہرے پر گوشت ہی نہیں ہوگا۔ عجیب شکل و صورت لے کر دربار رب العزت میں پیش ہوگا۔ وجہ یہ کہ دنیا کی زندگی میں مانگتا پھرتا تھا۔

تقویٰ بہترین زادِ راہ ہے

فرمایا توشہ لے لیا کرو فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ پرہیز گاری اختیار کرو۔ کیونکہ اگر یہ منزل حاصل ہوگئی۔ تو پھر سوال نہیں کرو گے سوال کرنا، بھیک مانگنا تقویٰ کی روح کے منافی ہے۔

وَاتَّقُوْنِ یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ۔ یعنی اگر تم صاحب عقل و شعور ہو تو مجھ سے ڈرتے رہو اور میری نافرمانی کے قریب بھی نہ جاؤ۔ بلکہ صحیح راستہ اختیار کرو، پہلے بھی گزر چکا ہے وَاْتُوا الْبُیُوْتَ مِنْ اَبْوَابِھَا "اپنے گھروں میں دروازوں کی طرف سے آؤ" سیدھا راستہ پکڑو گے تو منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے ورنہ راستے میں بھٹکتے رہو گے۔ فلاح نصیب نہیں ہوگی۔ مقصد یہ کہ حج کرنا ہے تو صحیح طریقہ اختیار کرو، رقم جمع کرو، سواری کا انتظام کرو۔ اگر یہ نہیں کر سکتے تو پھر صدقہ و خیرات اور زکوٰۃ کے مال سے حج کرنا کہاں کا تقویٰ ہے اللہ تعالیٰ نے ایسے کام کی تردید فرمائی ہے۔

تجارت جائز ہے

زمانہ جاہلیت میں لوگ حج کے موقع پر خرید و فروخت بھی کرتے تھے۔ جب اسلام کا دور آیا تو بعض مسلمانوں کو تردد پیدا ہوا۔ کہ تجارت کرنے سے ہماری عبادت میں فرق نہ آجائے۔ چنانچہ وہ لین دین سے اجتناب کی سوچنے لگے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّکُمْ اس بات میں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔ تجارت اور لین دین کا تبادلہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ کہ اس سے رزقِ حلال میسر آتا ہے۔ لہٰذا حج کے دوران خرید و فروخت جائز ہے البتہ اس بات کا خیال رہے۔ کہ حج پہ روانہ ہوتے وقت نیت صرف حج کی ہو تجارت کی نہیں

ہونی چاہیئے۔ وہاں جاکر ضروریات کی اشیاء خرید لے تو منع نہیں۔ اور اگر نیت ہی خرید و فروخت کی ہو تو پھر ایسا کرنا جائز نہیں۔ بعض لوگ جاتے ہی سامان خریدنے کے لیے ہیں۔ بعض سیر و تفریح کی غرض سے جاتے ہیں بعض لوگوں سے سنا کہ بھائی اس سال لندن جانا ہے۔ یا اس سال حجاز کی سیر کرنی ہے۔ یہ باطل نظریات ہیں۔ جب نیّت ہی سامان خریدنے کی ہے، تو پھر سونا بھی خریدیں گے اور کسٹم سے بچنے کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے بھی بنائیں گے اور اس طرح گناہ پر گناہ کے مرتکب ہوں گے۔ اگر حج کرنا ہے۔ تو نیّت خالص حج کی ہونی چاہیئے اس کے باوجود اگر ضرورت کی چیزیں خرید لی ہیں تو کوئی ممانعت نہیں۔

اس ضمن میں قرآن پاک نے دو اصطلاحیں پیش کی ہیں۔ ایک اصطلاح "رضوان" ہے۔ جس سے مراد امور آخرت کی طلب ہے۔ اور دوسری اصطلاح "فضل" ہے جس سے مقصود رزق حلال ہے۔ یہ دونوں چیزیں جائز ہیں۔

فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ ۪ وَاذۡکُرُوۡہُ کَمَا ھَدٰىکُمۡ ۚ وَاِنۡ کُنۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلِہٖ لَمِنَ الضَّآلِّیۡنَ ﴿۱۹۸﴾ ثُمَّ اَفِیۡضُوۡا مِنۡ حَیۡثُ اَفَاضَ النَّاسُ وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۹۹﴾

ترجمہ :- جب تم عرفات سے واپس پلٹو، پس یاد کرو اللہ تعالیٰ کو مشعرِ حرام کے پاس۔ اور اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں ہدایت دی ہے۔ اور اس سے پہلے تم گمراہوں میں تھے (۱۹۸) پھر تم بھی پلٹو، جہاں سے دوسرے لوگ پلٹ کر آتے ہیں اور اللہ سے معافی مانگتے رہو، بیشک اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا نہایت مہربان ہے (۱۹۹)

ربطِ آیات

آیت کے پہلے حصے میں سفرِ حج کے دوران تجارت کی اجازت دی گئی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں لوگ ایسا کرتے تھے مگر مسلمانوں کو تردد پیدا ہوا۔ کہ کہیں یہ چیز حج جیسے مقدس فریضہ کے منافی نہ ہو اور حج کے ثواب میں کمی کا باعث نہ بن جائے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس بات کی وضاحت فرمادی کہ سفرِ حج کے دوران اگر تجارت کرلی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ نیت خالص حج کی ہو اور ضمناً لین دین بھی ہو جائے یہ اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرنا ہے۔ اور جائز ہے۔

وقوفِ عرفہ

آیت کے اس حصہ میں وقوفِ عرفہ اور وہاں سے واپسی کے متعلق احکام بیان کیے گئے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ فَاِذَآ اَفَضۡتُمۡ مِّنۡ عَرَفٰتٍ پس جب تم عرفات سے واپس پلٹو فَاذۡکُرُوا اللّٰہَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ۔ پس یاد کرو اللہ تعالیٰ کو مشعر الحرام کے پاس۔

میدان عرفات میں وقوف کرنا حج کا سب سے بڑا رکن ہے۔ حضور علیہ السلام کا

ارشادِ گرامی ہے اَلْحَجُّ عَرَفَۃ حج دراصل نام ہی وقوفِ عرفہ کا ہے۔ لہٰذا جو شخص نو ذی الحج کو بعد از زوال سے لے کر دس تاریخ کی صبح صادق طلوع ہونے تک ایک لمحہ کے لیے بھی میدان عرفات پہنچ گیا اُس نے حج کو پا لیا۔ اور جو شخص ان اوقات میں وہاں نہیں پہنچ سکا۔ وہ حج سے محروم رہا۔ اُسے اگلے سال قضا کرنا ہوگا۔ کیونکہ وقوفِ عرفہ کا کوئی بدل نہیں۔ حج کے دیگر ارکان مثلاً طواف، قربانی، رمی جمرات وغیرہ میں تاخیر بھی ہو سکتی ہے اور کوئی چھوٹ بھی سکتا ہے۔ پھر اسکی تلافی دم، صدقہ یا روزے کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ مگر وقوفِ عرفہ ایک ایسا اہم رُکن ہے جس کی کوئی تلافی نہیں۔ میدان عرفات مکہ مکرمہ سے نو دس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ میدان تین اطراف سے پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے اندر جبل رحمت نامی پہاڑ ہے جس کے دامن میں حضور علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر وقوف فرمایا تھا۔ تاہم آپ نے واضح فرما دیا کہ وَقَفْتُ هٰهُنَا وَكُلُّ عَرَفَةَ مَوْقِفٌ یعنی میں نے یہاں قیام کیا ہے۔ مگر سارا عرفات مُوقف ہے۔ جہاں کسی کو جگہ ملے وقوف کر سکتا ہے سوائے بطن عُرنہ کے جو مسجد نمرہ کی پچھلی طرف ہے، وہاں وقوف جائز نہیں۔ چنانچہ آجکل پورا میدانِ عرفات حاجیوں سے بھر جاتا ہے۔ وقوفِ عرفہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ سے حج کا رکن چلا آرہا ہے۔ اسی طرح واپسی پر مزدلفہ کا وقوف اور پھر منیٰ میں ٹھہرنا سب حج کے لوازمات ہیں۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ قِفُوْا عَلٰی مَشَاعِرِكُمْ اپنے مشاعر پر ٹھہرو۔ اور پھر بتائے گئے طریقے کے مطابق اللہ کا ذکر کرو فَاِنَّكُمْ عَلٰى اِرْثٍ مِنْ اِرْثِ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ کیونکہ یہ تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت میں سے ایک ورثہ ہے۔

وقوفِ عرفات کے لیے آدمی کا احرام میں ہونا لازمی ہے۔ اگر بغیر احرام کے وقوف کیا ہے۔ تو وہ وقوف نہیں ہوگا اور حج باطل ہو جائے گا۔ احرام کی تعریف میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اسے رُکن کہتے ہیں اور بعض شرط کہتے ہیں۔ بہر حال جس طرح وضو نماز کے لیے شرط ہے۔ اور اسکے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

اسی طرح نماز کے لیے تکبیر تحریمہ بھی بمنزلہ شرط کے ہے۔ اس کے بغیر نماز درست نہیں۔ اسی طرح حج کے لیے احرام شرط ہے۔ اور اس کے بغیر حج ادا نہیں ہوتا۔

عرفات کے معانی

عرفات۔ جمع ہے عرفہ کی۔ اور عرفہ کا معنیٰ پہچان ہے۔ اس ضمن میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ اکثر تفسیروں میں اسے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حواؑ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ جب ان دونوں میاں بیوی کو زمین پر اتارا گیا تو حضرت حواؑ کو جدہ میں نازل کیا گیا۔ جدہ کے معنیٰ ہی دادی یا نانی کے ہیں۔ حضرت حوا تمام بنی انسان کی دادی یا نانی ہیں۔ اور حضرت آدم علیہ السلام کو جزائر شرق الہند کے ایک جزیرہ مالدیپ یا سرندیپ میں اتارا گیا یہ جزیرہ سری لنکا کے قریب ہے۔ زمین پر اترنے کے بعد دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی تلاش میں مکہ مکرمہ پہنچے اور پھر ان کی ملاقات اسی میدان عرفات میں ہوئی۔ اور انہوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اس لحاظ سے اُسے عرفات کا نام دیا گیا۔ اس دوران دونوں پر کیسا وقت گذرا اور کتنا عرصہ ہوا یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ عرفات کا معنیٰ پہچان اور عُرف کا معنیٰ نیکی ہوتا ہے اور عُرف گھوڑے کی گردن کے بالوں کو بھی کہتے ہیں۔ عَرف اگر عین کی فتح کے ساتھ ہو تو اس کا معنیٰ خوشبو بھی ہوتا ہے۔ اور عرف پہچان کو بھی کہتے ہیں۔ اسی سے معرفت ہے۔ تاہم اس مقام پر پہچان والا معنیٰ ہی زیادہ موزوں ہے۔ جب کوئی مسلمان ان جگہوں پر پہنچتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں فریضہ حج ادا کرتا ہے

حضور علیہ السلام کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اللہ کو یاد کرتا ہے۔ تو وہ خدا کو پہچان لیتا ہے۔ یہ تمام چیز اللہ تعالیٰ کی پہچان کے لیے ہی کی جا رہی ہیں۔ کہیں وقوف ہو رہا ہے۔ کہیں قربانی دی جا رہی ہے کہیں ذکر ہو رہا ہے اور کہیں نمازیں پڑھی جا رہی ہیں۔ کبھی دست بدعا بندہ اپنے رب کے حضور کھڑا ہے۔ اور گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا ہے۔ دعائیں کر رہا ہے۔ یہ سب معرفت الٰہی کے

پہلے ہی کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس مقام کو عرفہ کہا جاتا ہے۔

عرفات کی مصروفیات

میدان عرفات ایک سنسان میدان ہے۔ جو سارا سال غیر آباد رہتا ہے۔ تاہم ذی الحج کی نویں تاریخ کو سارے سال کی کسر نکل جاتی ہے۔ جب پورا میدان حاجیوں سے بھر جاتا ہے۔ ہر طرف مخلوق خدا نظر آتی ہے۔ عجیب منظر ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ شیطان جس قدر عرفہ کے دن ذلیل ہوتا ہے۔ اور کسی دن نہیں ہوتا۔ یہ اس لیے کہ وہ اللہ تعالے کی باران رحمت کو اترتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے

یوم عرفہ کی بعض خصوصیات ہیں۔ کہ ذی الحج کی نویں تاریخ ہو اور انسان احرام کی حالت میں ہو۔ امام حج کے پیچھے ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی ظہر کے وقت میں ادا کی جاتی ہیں زوال کے فوراً بعد امام حج کا خطبہ دیتا ہے۔ اس کے بعد اذان ہوتی ہے۔ پھر اقامت ہوتی ہے۔ اور ظہر کے دو فرض ادا کیے جاتے ہیں۔ پھر اقامت ہوتی ہے اور عصر کی نماز دو رکعت ادا کی جاتی ہے۔ دونوں نمازوں کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔ نیز دو دو فرائض کے علاوہ سنن نوافل وغیرہ بھی ادا نہیں کیے جاتے اس کے بعد جبل رحمت کے قریب وقوف ہوتا ہے۔ یہ بڑا قیمتی وقت ہوتا ہے غروب آفتاب تک انسان کھڑے ہو کر دعائیں کرتے ہیں۔ ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے ہیں۔ رو رو کر اللہ مالک الملک سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں۔ یہ وقوف عرفات ہے۔ پھر غروب آفتاب کے بعد یہاں سے نکل جانے کا حکم ہے ——— مغرب سے پہلے میدان سے نکل جانا درست نہیں

——— مشرکین مکہ کی بعض خرابیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ سورج ابھی کھڑا ہوتا تھا اور وہ عرفات سے نکل جاتے تھے۔ اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ میدان عرفات یا مزدلفہ کے راستہ میں نماز مغرب ادا کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نمازیں ایک ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ خواہ رات کا آخری حصہ ہی کیوں نہ ہو۔

عرفات سے واپسی

الغرض! میدان عرفات سے حاجیوں کی واپسی بعد غروب شمس مزدلفہ

کے لیے ہوتی ہے۔ اسی کو کہا گیا ہے۔ فَاِذَآ اَفَضۡتُم مِّنۡ عَرَفٰتٍ پھر جب تم عرفات سے واپس پلٹو۔ افاضہ دراصل طواف کے لیے واپس لوٹنے کو کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ خاص طور پر کثرت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لوگ کثیر تعداد میں گروہ در گروہ عرفات سے واپس آتے ہیں۔ اس لیے یہاں پر اَفَضۡتُم کا لفظ لایا گیا ہے۔ اور اسی لیے اس طواف کو طوافِ افاضہ یا طوافِ زیارۃ بھی کہتے ہیں۔

یہاں پر مشرکین کی ایک اور خرابی کی طرف بھی اشارہ ہے۔ کہ بعض لوگ تو غروبِ آفتاب سے پہلے ہی عرفات سے چل دیتے تھے۔ اور بعض عرفات تک پہنچتے ہی نہیں تھے۔ بلکہ مزدلفہ میں قیام کرتے اور واپس آجاتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس بات کی وضاحت فرما دی۔ کہ نویں ذی الحج کو سب لوگ میدانِ عرفات میں وقوف کریں۔ اور پھر وہاں سے غروبِ آفتاب کے بعد واپس پلٹیں۔ راستہ میں مزدلفہ کا قیام ہوتا ہے۔ اور پھر دس تاریخ کو بیت اللہ شریف کا طواف کیا جاتا ہے۔ سورۃ حج میں اسی طواف کے متعلق فرمایا وَلۡيَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ پھر چاہیئے کہ قدیم گھر کا طواف کریں۔ یہ وہی طواف ہے جو عرفات سے واپسی پر کیا جاتا ہے۔ اور یہ حج کا رکن ہے

وقوفِ مزدلفہ

عرفات سے واپسی پہ راستہ میں مزدلفہ کی منزل آتی ہے۔ جہاں پہ حاجی رات بسر کرتے ہیں۔ قرآنِ پاک نے اس جگہ کو مشعر الحرام یعنی حرمت والی نشانیاں کہا ہے یہاں پہ دو پہاڑیاں ہیں۔ جن کی درمیانی جگہ کو مشعر الحرام کہتے ہیں۔ فرمایا فَاذۡكُرُوا اللّٰهَ عِنۡدَ الۡمَشۡعَرِ الۡحَرَامِ پس مشعر الحرام کے نزدیک اللہ کا ذکر کرو۔ رات وہاں بسر کر کے اگلی صبح فجر کی نماز اوّل وقت ادا کر کے وہاں وقوف کیا جاتا ہے جسے وقوفِ مزدلفہ کہتے ہیں۔ وقوفِ عرفہ تو فرض ہے۔ مگر وقوفِ مزدلفہ واجب کے حکم میں آتا ہے۔ بہرحال نمازِ فجر کے بعد وہاں پہ وقوف کرنا اور دعائیں کرنا واجب ہے۔ حضور علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقع پہ ایسا ہی کیا تھا۔ اور پھر سورج نکلنے سے پہلے ہی وہاں سے منیٰ کی طرف چل دیے تھے۔ آج بھی حاجیوں کے لیے یہی حکم

ہے۔ کہ رات مزدلفہ میں قیام کریں۔ فجر کی نماز وہیں ادا کریں۔ اور پھر ذکرِ الٰہی میں مصروف ہو جائیں۔ اس کے بعد طلوعِ آفتاب سے قبل ہی منیٰ کو روانہ ہو جائیں۔ امام ابو حنیفہ رہ کے مطابق جو شخص مزدلفہ میں وقوف نہیں کرے گا اسے دم دینا ہو گا۔ کیونکہ یہ واجب کا درجہ رکھتا ہے۔ البتہ بیمار اور ضعیف حاجیوں کو اجازت ہے۔ کہ وہ مزدلفہ میں تھوڑی دیر قیام کے بعد رات کو ہی منیٰ کو چلے جائیں۔ اور صبح کی نماز منیٰ میں جا کر ادا کریں۔ حضور علیہ السلام نے حضرت سودہؓ جو بیمار تھیں اُن کو اور بعض دوسرے ضعیف اہل خاندان اور بچوں کو اجازت دیدی تھی۔ کہ وہ مزدلفہ میں رات کے وقت تھوڑی دیر وقوف کریں دعائیں کریں اور پھر منیٰ کے لیے روانہ ہو جائیں۔ تاکہ وہ عام لوگوں کے پہنچنے سے پہلے پہلے آسانی کے ساتھ رمی کر لیں کیونکہ رمی کرنا بھی بہت کٹھن کام ہے آپ نے ضعیف اور بیماروں کو اوّل وقت میں رمی کی اجازت مرحمت فرما دی۔

بہر حال حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مزدلفہ كُلُّهَا مَوْقِفٌ یعنی سارا مزدلفہ موقف ہے۔ جہاں کسی کو جگہ میسّر آئے ٹھہر جائے البتہ وادی محسّر جو منیٰ کی طرف ہے۔ وہاں نہیں ٹھہرنا چاہیئے۔ باقی ہر جگہ قیام کر سکتا ہے۔

ذکرِ الٰہی

فرمایا مشعر الحرام کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو كَمَا هَدٰىكُمْ جس طرح اُس نے تمہیں ہدایت دی۔ لفظ کما مشبہ بھی بن سکتا ہے اور تعلیلیہ بھی۔ اور زائدہ بھی بن سکتا ہے۔ جیسے یاد کرو اللہ کو لِاَنَّهٗ هَدٰىكُمْ اس لیے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے۔ یہ كَمَا تعلیلیہ ہے۔ اللہ نے تمہیں ایمان کی دولت بخشی ہے اس لیے اُس کو یاد کرو۔ اسی قسم کا کاف تعلیلیہ حضور علیہ السلام کی بعثت کے ضمن میں پہلے گزر چکا ہے۔ نیا کپڑا پہننے کی دُعا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی ہی سکھائی ہے اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كَمَا كَسَوْتَنِيْ اے اللہ میں تیری حمد بیان کرتا ہوں اس لیے کہ تُو نے مجھے کپڑا پہنایا ہے۔ تیری عطا کردہ اس نعمت پر تیرا شکر ادا کرتا ہوں۔ اسی طرح یہاں بھی کاف علّت استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، اس لیے کہ اُس نے تمہیں ہدایت بخشی ہے۔

اور اگر یہ کاف تشبیہ کا ہے۔ تو پھر اس کا معنیٰ یہ ہوگا۔ کہ اللہ تعالیٰ کا اُس طرح ذکر کرو جس طرح اُس نے تمہیں ہدایت دی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی یاد کے لیے وہ طریقہ اختیار کرو، جسکی طرف اُس نے تمہاری راہنمائی کی ہے۔ مقصد یہ کہ اُس کے بتلائے ہوئے طریقے کے مطابق ذکر الٰہی کرو۔ اپنے من گھڑت طریقے استعمال نہ کرو۔ اگر ایسا کروگے تو بدعت میں شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل نہیں ہوگی۔ ذکر عبادت الٰہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی عبادت ہو اس کے لیے وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے بنایا ہے۔ نبی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا مَنْ عَمِلَ عَمَلًا لَیْسَ عَلَیْهِ اَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ جس نے کوئی ایسا عمل کیا، جو ہمارے عمل کے مطابق نہیں تو وہ مردود ہے۔ ایسا عمل مقبول نہیں ہوسکتا۔ یہ شریعت کا بڑا اہم اصول ہے اور ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیئے۔ اپنی طرف سے نئے نئے طریقے ایجاد کرنا بدعت کو رواج دینا اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لینا ہے۔ ایسا کام کَمَا هَدٰكُمْ کی روح کے منافی ہے۔ لہٰذا بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ منجملہ دیگر شرعی طریقوں کے ایصال ثواب کا بھی ایک طریقہ ہے۔ اگر اُس کے مطابق عمل کروگے تو مفید ہوگا۔ اور اگر اپنی طرف سے نئے نئے طریقے گھڑوگے تو ثواب کے بجائے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی حاصل ہوگی۔

فرمایا اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے طریقے اختیار کرو، حقیقت یہ ہے وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ اور اس سے پہلے تم گمراہوں میں تھے۔ یہاں پر لفظ اِنْ شرطیہ نہیں جس کا معنی اگر ہوتا ہے۔ بلکہ اسے اِنْ مُخَفَّفَه مِنَ الْمُثَقَّلَه کہتے ہیں اور اس کا مطلب یوں ہوتا ہے وَاِنَّهٗ شان یہ ہے کہ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ تم اس سے پہلے گمراہوں میں تھے۔ یعنی کفر اور شرک میں مبتلا تھے۔ اُس نے تمہارے لیے نبی مبعوث کیا۔ کتاب اور شریعت اتاری تاکہ حق کو پہچان سکو، تم نے گھڑ گھڑ بت خانہ

بنایا ہوا تھا۔ اللہ کے گھر ـــــ کو بھی منبع توحید کی بجائے ـــــ بت خانہ میں بدل دیا گیا تھا۔ رسومات باطلہ کی بھرمار تھی۔ ننانویں فیصد لوگ ضلالت و گمراہی کے گڑھے میں گرے ہوئے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالےٰ نے تمہیں ہدایت سے نوازا۔ لہذا اُس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اس کا ذکر کرو۔

قریش مکہ کا تشخص

حج کے متعلق قریش مکہ اور اُن کے رشتہ داروں بنو خذاعہ اور بنو کنانہ نے اپنا علیٰحدہ تشخص قائم کر رکھا تھا۔ یہ لوگ نو ذی الحج کو مزدلفہ سے آگے نہیں جاتے تھے حالانکہ عرفات کی حاضری تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے رائج تھی۔ مگر یہ اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ سمجھتے تھے۔ اور کہتے تھے ہم احمس ہیں۔ دوسروں سے بلند تر ہیں اس لیے ہم عرفات میں نہیں جائیں گے۔ شیطان رجیم نے ان کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈال دیا تھا کہ میدان عرفات حدود حرم سے باہر ہے اور ہم خانہ کعبہ کے مجاور ہونے کے سبب حرم سے باہر کیوں جائیں۔

قریش کے اس باطل نظریے کو توڑنے کے لیے اللہ تعالےٰ نے ارشاد فرمایا
ثُمَّ اَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ پھر تم بھی وہیں سے پلٹو جہاں سے دوسرے لوگ پلٹ کر آتے ہیں یعنی عرفات سے۔ مزدلفہ سے واپس آجانے کا تمہارا نظریہ غلط ہے۔ تم بڑے نیکی سمجھ رہے ہو، حالانکہ یہ بالکل غلط بات ہے بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ ناس سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ اور آپ کے لیے جمع کا صیغہ لانے کی وجہ یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو پوری امت قرار دیا ہے۔ اِنَّ اِبْرٰهِيمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيفًا آپ مجموعہ امت کے قائم مقام ہیں۔ تمام امت کے خواص آپ میں پائے جاتے تھے۔

اس حکم کے ذریعے قریش کے تفاخر کی نفی کی گئی ہے اپنے آپ کو دوسرے انسانوں سے افضل اور برتر سمجھنا درست نہیں ہے۔ خاص طور پر عبادت و ریاضت کے معاملہ میں تو اونچ نیچ اور اعلیٰ و ادنیٰ کا تصور ہی غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو تمام لوگ برابر ہیں۔ اُس کے ہاں اگر کوئی برتری ہے تو محض تقویٰ کی

بنیاد پر۔ عدم مساوات شیطانی عمل ہے۔ حج کا عمل تو مساوات کی بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ وہاں پہ ہر امیر غریب، گورا اور کالا ایک ہی لباس اور ایک ہی وضع قطع، برہنہ سر لبیک لبیک پکارتے ہیں۔ وہاں پہ تفاخر کی بات ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ اسی طرح نماز بھی مساوات کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ آقا و غلام سب ایک ہی صف میں کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ تم بھی وہیں سے واپس پلٹو جہاں سے باقی لوگ پلٹتے ہیں اور اپنے لیے علیحدہ طریقہ نہ بناؤ۔

استغفار کا حکم

فرمایا جاہلیت کے طریقوں کو ترک کر دو اور وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰہَ اور اللہ تعالےٰ سے معافی مانگو۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس سے لغزشیں ہوتی رہتی ہیں۔ اُن کا ازالہ استغفار کے ذریعے ہوتا ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کُلُّکُمْ خَطَّاءُوْنَ تم سب خطا کار ہو۔ اور خَیْرُ الْخَطَّائِیْنَ التَّوَّابُوْنَ اور بہترین خطا کار وہ ہیں۔ جو سچے دل سے توبہ کر لیں۔ کیونکہ اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ کَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَہٗ ایسے لوگ خطاؤں سے بالکل پاک ہو جاتے ہیں۔ گویا کہ انہوں نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔ استغفار بہت بلند پایہ وظیفہ ہے۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ حضور ایک مجلس میں سو مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتے۔ اللھم اغفرلی وتب علی۔ استغفر اللہ۔ مجلس کے اختتام پہ جو شخص استغفار کرے گا۔ اس کی کوتاہیاں معاف ہو جائیں گی۔ یہ کلمات کہنے سے تمام مجلس کی خطاؤں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ سبحانک اللھم وبحمدک لا الہ الا انت استغفرک واتوب الیک۔ اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے ساری کوتاہیاں معاف فرما دیتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالےٰ سے ہر وقت استغفار کرنا چاہیئے۔ اسکی بخشش کے طلبگار بننا چاہیئے۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ بیشک اللہ تعالےٰ بخشنے والا اور بے حد مہربان ہے۔ وہ کسی معافی مانگنے والے کو محروم نہیں کرتا بلکہ اس کی توبہ کو قبول کر لیتا ہے۔

درسِ ہشتاد وسہ (۸۳)   آیت ۲۰۰ تا ۲۰۳

فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ
اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ؕ فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا
وَمَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ﴿۲۰۰﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ
اٰتِنَا فِى الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا
النصف عَذَابَ النَّارِ ﴿۲۰۱﴾ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ
وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۲۰۲﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِىْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ
فَمَنْ تَعَجَّلَ فِىْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ
فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ
اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۰۳﴾

ترجمہ :- جب تم ارکان حج کو پورا کر چکو پس یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جیسا کہ تم یاد کرتے ہو اپنے باپ دادا کو ۔ بلکہ اس سے زیادہ یاد کرنا چاہیئے ۔ پس لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں ۔ اے ہمارے پروردگار ! دے دے ہم کو اس دنیا کی زندگی میں ۔ اور اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے ﴿۲۰۰﴾ اور بعض وہ ہیں ، جو کہتے ہیں ، اے ہمارے پروردگار ! ہم کو دنیا میں بھلائی دے دے اور آخرت میں بھلائی دے دے ۔ اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا ﴿۲۰۱﴾ یہی وہ لوگ ہیں ۔ جن کے لیے حصہ ہے اُس سے جو انہوں نے کمائی کی ہے ۔ اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والا ہے ۔ ﴿۲۰۲﴾ اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کو گنتی کے چند دنوں میں ۔ پس جس شخص نے دو دنوں میں جلدی کی ، اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے ۔ اور جس نے تاخیر کی

اُس پر بھی کوئی گناہ نہیں، اس شخص کے لیے جو ڈرتا ہے۔ اور ڈرو اللہ تعالےٰ سے
اور جان لو کہ تم اُسی کی طرف اکھٹے کیے جاؤ گے (۲۰۳)

منیٰ کی مصروفیات

حج سے متعلق عرفات اور مزدلفہ کے احکام بیان ہو چکے ہیں۔ اب آخری مرحلہ منیٰ کے قیام کا ہے۔ اسی کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ پھر جب تم مناسک حج کو پورا کر چکو۔ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ تو اللہ کا ذکر کرو۔ مقصد یہ ہے کہ جب تم عرفات اور مزدلفہ کے مناسک ادا کر لو تو پھر منیٰ آکر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ کہ حج کے تمام ارکان منیٰ میں آکر ختم ہو جاتے ہیں۔ اور یہاں کا قیام حج کا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔

حج کے جملہ مناسک آٹھ ذی الحجہ کو احرام باندھنے سے شروع ہوتے ہیں اس دن حاجی منیٰ میں پہنچتے ہیں۔ اور سنت کے مطابق وہاں پہ پانچ نمازیں یعنی ظہر، عصر، مغرب، عشاء، اور نویں تاریخ کی فجر ادا کرتے ہیں۔ سورج نکلنے کے بعد عرفات کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ وقوفِ عرفہ حج کا رکنِ اعلیٰ ہے۔ وہاں پہ نویں تاریخ کو زوال کے بعد مسجد نمرہ میں امام حج کا خطبہ پڑھتا ہے۔ اُس کے بعد اذان ہوتی ہے۔ پھر تکبیر اور امام دو رکعت نماز ظہر پڑھاتا ہے۔ معاً بعد پھر تکبیر ہوتی ہے۔ اور دو رکعت نماز عصر ادا کی جاتی ہے۔ اس کے بعد غروب آفتاب تک میدان عرفات میں وقوف ہوتا ہے۔ پھر سرِ شام ہی واپس مزدلفہ کی طرف چل دیتے ہیں۔ اور مغرب اور عشاء کی نمازیں مزدلفہ میں آکر ایک ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ دسویں تاریخ کی نماز فجر اول وقت میں مزدلفہ میں ادا کر کے وہاں وقوف ہوتا ہے۔ ذکر و دُعائیں ہوتی ہیں۔ اور پھر طلوع شمس سے پہلے ہی منیٰ کے لیے روانگی ہوتی ہے۔

منیٰ پہنچ کر سب سے پہلے جمرہ عقبیٰ پہ رمی کی جاتی ہے۔ دس تاریخ کو صرف ایک ہی شیطان کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ اس کے بعد دوسری منزل قربانی کی آتی ہے یہ دونوں کام بڑے مشکل ہوتے ہیں۔ بے پناہ رش کی وجہ سے قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں۔ قربانی کے لیے حکومت نے قربان گاہ کے طور پر جگہ متعین کر دی ہے

تمام حاجی وہیں پر قربانی کرتے ہیں۔ یہ وہی مقام ہے۔ جہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے قربانی کی تھی۔ آج کل وہاں پر ہر قسم کے قربانی کے جانور مِل جاتے ہیں۔ لوگ وہیں سے جانور خرید تے ہیں اور وہیں ذبح کر دیتے ہیں۔ توانا آدمی قربان گاہ پہنچ جاتے ہیں۔ اور ضعیف حاجی اور عورتیں اس کام کے لیے دوسروں کو مامور کر دیتے ہیں۔

قربانی کے بعد اگلا کام حجامت بنوانا ہے۔ رش کی وجہ سے یہ کام بھی بڑی مشکل سے انجام پاتا ہے۔ بال منڈ ائے یا کترائے جاتے ہیں۔ اور پھر احرام کھول دیا جاتا ہے (لیکن عورت کے پاس جانا منع ہوتا ہے طواف تک)

طوافِ زیارت

حج کا اگلا رکن بیت اللہ شریف کا طواف ہے۔ اِسے طواف زیارت کہا جاتا ہے اور یہ فرض ہے۔ اسی طواف کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ"۔ پھر چاہیئے کہ اپنا میل کچیل صاف کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور قدیم گھر (بیت اللہ شریف) کا طواف کریں۔ یہ طواف بھی دس تاریخ کو ہی کیا جاتا ہے اگر کسی وجہ سے کوئی شخص آج کے دن طواف زیارت کے لیے مکہ مکرمہ نہ جا سکے تو گیارہ تاریخ کو کرے۔ اِسے بارہ تاریخ تک بھی بوجوہ مؤخر کیا جا سکتا ہے۔ اگر بارہ تاریخ کے بعد طواف کرے گا تو اُسے ساتھ دم دینا پڑے گا۔ اور یہ فرض ادا ہو جائے گا۔ یہ طواف چونکہ عازمین حج نے مقررہ اوقات میں لازمی کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اس موقع پر بھی بڑا سخت ہجوم ہوتا ہے۔ طواف کے بعد صفا و مروہ کی سعی بھی ہے۔ اس کے بعد مکہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں بلکہ واپس منیٰ آنا ہوتا ہے۔ گیارہ بارہ اور تیرہ ذی الحجہ ایام منیٰ کہلاتے ہیں۔ اِن ایام میں منیٰ میں قیام کیا جاتا ہے۔ البتہ معذور لوگوں کو استثنیٰ حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہیں وہ تمام مناسک حج جو مختلف مقامات پہ پورے کرنے ہوتے ہیں۔

خاندانی تفاخر

زمانہ جاہلیت میں ایام منیٰ کے دوران بہت بڑی منڈی یا میلہ لگتا تھا جس میں خرید و فروخت کے علاوہ مختلف قبیلے اپنے اپنے خاندان کی مدح سرائی کرتے اپنی اپنی خوبیاں بیان کرتے، بڑوں کے کارنامے دہراتے اور اس طرح اپنے

آباؤ اجداد کا نام زندہ رکھتے حضور علیہ السلام نے اس خاندانی تفاخر کی ممانعت فرمائی اور لوگوں کو تعلیم دی کہ خاندان پہ فخر کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ کُلُّکُمْ اَبْنَآءُ اٰدَمَ تم سب آدم کی اولاد ہو۔ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ اور آدم علیہ السلام مٹی سے پیدا کیے گئے۔ آپ کا سلسلہ تو مٹی سے ملتا ہے۔ تم کس بات پر فخر کرتے ہو۔ لَا فَخْرَ لِلْعَرَبِیِّ عَلَی الْعَجَمِیِّ اور کسی عربی کو عجمی پہ کوئی فخر نہیں وَلَا لِلْعَجَمِیِّ عَلَی الْعَرَبِیِّ اور نہ کسی عجمی کو عربی پہ فضیلت ہے۔ اِلَّا بِالتَّقْوٰی سوائے تقویٰ کے اور کوئی چیز فضیلت کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ یہ خاندانی اور نسلی تفاخر جاہلیت کی باقیات میں سے ہے۔ حضور علیہ السلام نے قریش کو مخاطب کرکے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ اَذْھَبَ عَنْکُمْ عُبِّیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ اے لوگو! تم سے اللہ تعالیٰ نے خاندانی نخوت اور غرور سب ختم کر دیا ہے۔ اور اللہ کے نزدیک عزت کا معیار صرف تقویٰ ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" اللہ کے نزدیک شرافت اور بزرگی والا انسان وہ ہے جو اُس سے زیادہ ڈرتا ہے۔ زیادہ متقی ہے۔ اللہ کے ہاں خاندانی تفاخر و برتری کی کوئی قیمت نہیں۔

ذکر الٰہی

اس تاریخی پس منظر میں اللہ تعالےٰ نے حکم دیا کہ جب تم حج کے باقی مناسک ادا کرچکو فَاذْکُرُوا اللّٰہَ تو منیٰ میں آکر اللہ کا ذکر کرو کَذِکْرِکُمْ اٰبَآءَکُمْ جس طرح اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کرتے ہو۔ اَوْ اَشَدَّ ذِکْرًا یا اُس سے بھی زیادہ ذکر۔ مقصد یہ کہ اس موقع پہ خاندانی قصیدہ خوانی کی بجائے اللہ تعالےٰ کی حمد وثنا بیان کرو جس نے تمہیں ہدایت دی۔ ایمان کی دولت سے نوازا اور پھر حج جیسی نعمت سے مشرف کیا لہٰذا جہاں تک ممکن ہو، اللہ تعالیٰ کا کثرت کے ساتھ ذکر کرو۔ اب دیکھ لیجئے مناسک حج بذات خود ذکر الٰہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ قربانی کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ شیطان کو کنکریاں مارتے وقت بھی یہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ جب نماز پڑھی جاتی ہے۔ تو تکبیرات تشریق بلند ہوتی ہیں۔ عرفات اور مزدلفہ میں اللہ کا ذکر کثرت سے ہوتا ہے۔ اور تلبیہ کے الفاظ

لبیک اللّٰھم لبیک تو ذکرِ الٰہی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

دنیا کی خواہش

آگے اللہ تعالیٰ نے دو قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا، پہلی قسم اُن لوگوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے صرف دنیا کی خواہش رکھتے ہیں فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا بعض لوگ یوں کہتے ہیں۔ کہ اے اللہ! ہمیں جو کچھ دینا ہے دنیا میں ہی عطا کر دے۔ ایسے لوگ آخرت کے طلبگار نہیں ہوتے۔ دوسرے مقام پر اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا کہ وہ کہتے ہیں عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ یَوْمِ الْحِسَابِ" یعنی جو کچھ ہمارا حصہ ہے وہ ہمیں یوم حساب سے پہلے ہی مل جائے۔ ہمیں آخرت کی کوئی فکر نہیں۔ مطلب یہ کہ ہمیں دُنیا کا مال و دولت جاہ و مرتبہ، آرام و آسائش، صحت اور تندرستی حاصل ہو جائے تو کافی ہے۔ اس قسم کے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ جو حج پر جا کر بھی دنیا ہی طلب کرتے ہیں۔ بیماری سے نجات، قحط سالی سے پناہ، اولاد اور کاروبار ہی چاہتے ہیں۔ اور آخرت کی کوئی پروا نہیں کرتے۔

فرمایا وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ دنیا کے طالبوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وہ لوگ جنت کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔ کیونکہ انہوں نے آخرت کی خواہش ہی نہیں کی۔

دنیا اور آخرت

فرمایا وَمِنْهُمْ انہی میں سے بعض ایسے بھی ہیں مَنْ یَّقُوْلُ جو کہتے ہیں رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر وَفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً اور ہمیں آخرت میں بھی بھلائی نصیب فرما۔ اور پھر دوزخ سے پناہ بھی مانگتے ہیں۔ وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔ دوزخ سے بچنے کا مطلب یہ ہے۔ دنیا میں گناہ اور برائی سے بچ جائے۔ اگر اس مقصد میں کامیاب ہو گیا تو آخرت میں دوزخ سے بھی بچ جائے گا۔ غرضیکہ جو نیک لوگ ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت دونوں کے طلبگار ہوتے ہیں۔

حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ کہ طلب دنیا مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالذات آخرت کی خواہش ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ ایمان اور اعمال صالحہ اصلی مقصود ہیں اور جو چیزیں ان کے حصول میں معاون ہوتی ہیں۔ وہ مطلوب بالتبع ہوتی ہیں، نہ کہ مطلوب بالذات۔ اور انسان حرام باتوں سے بچ جائے۔ اور پھر مباح باتیں تو مباح ہی ہیں مطلوب تو اللہ کی عبادت ہے، اس کی رضا ہے۔ ایمان اور اعمال صالحہ ہیں۔ جیساکہ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ دنیا اور مافیہا ملعون ہے۔ اِلَّا ذِکْرُ اللّٰہِ وَمَا وَالَاہُ سوائے اللہ کے ذکر اور اس کے ساتھ مناسبت رکھنے والی چیزوں کے۔ باقی تمام چیزیں خدا کی رحمت سے بعید ہیں۔

بعض لوگوں کو حسنہ کے لفظ سے شبہ ہوا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ دنیا کو اچھا کہا گیا ہے۔ لہٰذا اس کو بھی طلب کرنا چاہیئے مگر اس میں اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ بعض نیک لوگ بھی دنیا کی زندگی بڑی خستہ حالت میں بسر کرتے ہیں۔ اس کے متعلق مولانا فرماتے ہیں۔ کہ یہاں پر جس حسنہ کو دنیا میں طلب کیا گیا ہے۔ اس میں مُراد حالت حسنہ ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اے اللہ! ہمیں دنیا میں ایسی حالت نصیب فرما جو تیرے نزدیک اچھی ہے۔ اگر ہمارے لیے دولت مندی اور آسودگی کی حالت بہتر ہے تو وہ عطا کر اور اگر تیرے نزدیک فقر کی حالت اچھی ہے۔ تو وہ دے۔ اور آخرت کی اچھائی تو ظاہر ہے۔ کہ عذاب سے نجات، قرب خداوندی اور درجات کی بلندی سے موسوم ہے۔ سورۃ آل عمران میں اس کی وضاحت موجود ہے وَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّۃَ فَقَدْ فَازَ۔ جو آگ سے بچ گیا اور جنت میں داخل ہوگیا۔ وہ کامیاب ہوگیا۔

حضرت علیؓ سے منقول ہے۔ کہ دنیا میں حسنہ اچھی عورت کو بھی کہتے ہیں۔ جس کو دنیا میں اچھی بیوی مل گئی اس کو دنیا کی حسنہ یعنی بھلائی میسّر آگئی۔ برخلاف اس کے اگر واسطہ بُری عورت سے پڑ گیا تو یہ دوزخ کے عذاب کے برابر ہے۔ شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے۔ کہ اچھی صحت کا میسّر آنا، اچھا مکان اور اچھی سواری مل جانا دنیا کے اعتبار

سے سعادت مندی ہے۔ مسند احمد کی روایت میں ہے۔ کہ اچھی بیوی، اچھی سواری، اچھا مکان دنیا کے اعتبار سے انسان کی نیک بختی ہے۔ انسان کے لیے صحت بھی ضروری ہے۔ کہ عبادت اور دیگر امور کا مدار اسی پہ ہے۔ یہ سب چیزیں حسنہ ہیں۔ مگر بالتبع۔ مقصود بالذات ایمان باللہ، خدا کی عبادت اور اعمال صالحہ ہیں۔ جو چیزان کے تابع ہو کر آئیگی وہ حسنہ ہی کہلائے گی۔

ذخیرہ آخرت

فرمایا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا ان لوگوں کے لیے اس چیز میں سے حصہ ہے۔ جو انہوں نے کمایا۔ دنیا کی کمائی کے متعلق تو دوسرے مقام پہ اللہ تعالے کا ارشاد ہے "ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ" اُن کا علم، ان کا جزا فیہ تو دنیا میں ہی ختم ہو گیا، آگے اُن کے لیے کچھ نہیں۔ اور جو لوگ آخرت پہ ایمان رکھتے ہیں، اُن کے اعمال آخرت، کا ذخیرہ بنتے ہیں فرمایا اُن کے لیے حصہ ہے۔ جو انہوں نے کمایا، وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے جب قیامت برپا ہوگی۔ حساب کی منزل شروع ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ اس کو طے کر دیں گے۔

ایام تشریق

منیٰ کے احکام کے ساتھ فرمایا تھا فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اپنے آباؤ اجداد کی طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ اور غرور وتکبر کو چھوڑ دو۔ اب آگے ارشاد ہوتا ہے۔ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ۔ اللہ تعالیٰ کو یاد کرو چند گنتی کے دنوں میں۔ ان چند ایام سے مُراد ایام تشریق ہیں اور یہ چار دن ہوتے ہیں یعنی ذی الحجہ کی دسویں تا تیرھویں تاریخ۔ تشریق کا لفظی معنیٰ گوشت کو خشک کرنا ہے ان ایام میں قربانی کا گوشت وافر مقدار میں میسّر آتا ہے۔ اور لوگ آئندہ استعمال کے لیے خشک کر کے رکھ لیتے ہیں۔ اس لیے ان دنوں کو ایام تشریق کہتے ہیں۔

سورۃ حج میں فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ آیا ہے۔ اور اس سے مراد قربانی کے تین دن یعنی ذی الحجہ کی دسویں، گیارھویں اور بارھویں تاریخ ہیں۔ حضرت علیؓ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ وغیرہم سے منقول ہے کہ یہ دن يَوْمُ النَّحْرِ و

یَوۡمَیۡنِ بعدہ یعنی قربانی کا دن اور دو دن اُس کے بعد طے ہیں بمطلب یہی ہے کہ قربانی کے ایام معلومات ذی الحجہ کی دسویں تا بارہویں ہیں۔ اور ایام معدودات یعنی ایام تشریق دسویں تا تیرہویں ہیں۔

قیام منیٰ میں تخفیف

البتہ ان ایام میں اللہ تعالیٰ نے ایک دن کی رعایت عطا کر دی ہے جو شخص چاہے اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ فرمایا فَمَنۡ تَعَجَّلَ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ جو کوئی دو دن کے قیام کے بعد جلد مکہ معظمہ لوٹ جانا چاہے اس پر کوئی حرج نہیں۔ یوم نحر یعنی دس ذی الحج کے بعد صرف دو دن مزید یعنی گیارہ اور بارہ تاریخ کو منیٰ میں قیام کر کے واپس جا سکتا ہے۔ بارہ تاریخ کو رمی جمرات کے بعد منیٰ سے مکہ واپس آ جائے، اُس کا حج مکمل ہو گیا۔ وَمَنۡ تَاَخَّرَ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡہِ اور جو کوئی ایک دن کی تاخیر کرے یعنی تیرہ تاریخ تک منیٰ میں ٹھہر جائے اُس پر بھی کوئی حرج نہیں۔ ایسا کر سکتا ہے۔

یاد رہے کہ دس ذی الحج کو جمرہ عقبیٰ پر قبل از زوال رمی کی جاتی ہے۔ جب کہ گیارہ بارہ اور تیرہ تاریخ کو بعد از زوال تینوں شیطانوں کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر صبح کے وقت بھی رمی کر لے تو کی جا سکتی ہے۔ خیال رہے کہ جو شخص بارہ تاریخ کو واپس جانا چاہے، اُسے چاہیئے کہ غروب آفتاب سے پہلے پہلے منیٰ سے نکل جائے۔ اگر سورج وہیں غروب ہو گیا تو پھر رک جائے اگلے دن یعنی تیرہ تاریخ کو کنکریاں مار کر واپس آئے۔

قانون کی پابندی

فرمایا یہ رعایت اُس شخص کے لیے ہے لِمَنِ اتَّقٰی جس کے اندر تقویٰ پیدا ہو گیا یعنی خوف خدا سے کانپ گیا۔ کیونکہ حج کے پورے ارکان کی ادائیگی کا مقصد حصول تقویٰ ہے۔ جو کہ قانون کی پابندی سے حاصل ہوتا ہے۔ فریضہ حج ایک مشکل اور مشقت طلب عبادت ہے۔ اس کا اتصال جہاد کے ساتھ کیا گیا ہے حج کے عمل میں جہاد کی تربیت بھی پائی جاتی ہے۔ دوران حج احرام کی پابندی عائد ہوتی ہیں۔ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوۡقَ وَلَا جِدَالَ یہ حاجی کا امتحان ہوتا ہے۔ کہ وہ

قانون خداوندی کی کس حدتک پابندی کرتا ہے۔ قانون شکن کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اسی لیئے فرمایا۔ کہ جس عازم حج میں تقویٰ یعنی قانون کی پابندی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہ دو دن ٹھہر کر بھی چلا جائے۔ تو اسکا حج صحیح ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔

تقویٰ کیا ہے

فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈرتے رہو۔ چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو بھی خاطر میں لاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ امتحان میں فیل ہو جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ کہ متقی وہ ہے جو کفر، شرک اور معصیت سے بچ جائے، حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی پرہیز کرے۔ اللہ والے چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی فکر کرتے ہیں۔ کہ کہیں اللہ تعالےٰ کی نافرمانی نہ ہو جائے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ۔ یاد رکھو! ایک وقت آنے والا ہے۔ جب تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے اکٹھے جاؤ گے بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ ایک دن انسان کو اپنے رب کے حضور حاضر ہو کر جواب دینا ہے۔ اُس وقت حالت یہ ہوگی کہ مابینہ وبینہ ترجمان" اللہ اور بندے کے درمیان کوئی ترجمان بھی نہیں ہوگا۔ تَاْتِیْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ ہر شخص کو اپنی طرف سے اللہ کے سامنے براہِ راست جواب دینا پڑے گا۔

یہاں تک اللہ تعالیٰ نے حج کے احکام بیان فرما دیئے ہیں اس کے بعد منافقین کا تذکرہ اور بعض دوسری باتیں آئیں گی۔ حج کے تمام ضروری اجزاء اسی رکوع میں مکمل طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔

درس ہشتاد و چہار (۸۴) — آیت ۲۰۴ تا ۲۰۷

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿۲۰۴﴾
وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ
وَالنَّسْلَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿۲۰۵﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ
اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ
الْمِهَادُ ﴿۲۰۶﴾ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ
مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

ترجمہ :- اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں۔ کہ دنیوی زندگی کے متعلق اس کی بات آپ کو تعجب میں ڈالتی ہے۔ اور وہ اُس چیز پہ اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ جو اس کے دل میں ہے حالانکہ وہ شخص بہت جھگڑا کرنے والا ہے (۲۰۴) اور جب یہ شخص پیٹھ پھیر کر چلتا ہے تو زمین میں کوشش کرتا ہے۔ تاکہ اس میں فساد برپا کیا جائے۔ اور ہلاک کرتا ہے کھیتی کو اور نسل (مویشیوں) کو اور اللہ تعالیٰ فساد کو پسند نہیں کرتا (۲۰۵) اور جب اس شخص سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو۔ تو پکڑتا ہے اُس کو غرور گناہ کے ساتھ۔ پس اُس کے لیے جہنم کافی ہے۔ اور البتہ وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے (۲۰۶) اور بعض لوگ وہ ہیں۔ جو اپنی جانوں کو بیچتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی تلاش کے لیے۔ اور اللہ تعالیٰ شفقت کرنے والا ہے بندوں کے ساتھ (۲۰۷)

ربطِ آیات

حج کے بیان کے آخری حصے میں دو قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہوا، ایک گروہ وہ ہے۔ جو آخرت کا بالکل منکر ہے۔ ایسے لوگ محض دنیا کے طلبگار ہوتے ہیں اور اُن کی دُعا بھی یہ ہوتی ہے "رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا" یعنی اے اللہ! ہمیں

جو کچھ دینا ہے، اس دنیا میں ہی عطا کر دے۔ یہ لوگ یقیناً کافر ہیں۔ کیونکہ آخرت پہ یہ ایمان ہی نہیں رکھتے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو دنیا اور آخرت ہر دو کے طالب ہیں۔ وہ چاہتے ہیں۔ کہ ان کی دنیوی زندگی بھی خوشحالی میں بسر ہو، اور آخرت میں بھی نجات حاصل ہو جائے۔ اسی لیے وہ اللہ تعالیٰ سے یوں سوال کرتے ہیں۔ "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔ یہ ایماندار لوگ ہیں۔ گذشتہ آیات میں ان دو قسم کے لوگوں کا بیان آیا۔

مخلص اور منافق

اب ان آیات میں بھی دو قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہے۔ یہاں پہ مومن اور کافر کا تقابل نہیں، بلکہ مخلص اور منافق کا حال ہے۔ بظاہر یہ دونوں گروہ ایماندار ہیں۔ مگر ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ مخلص وہ لوگ ہیں۔ جو انتہائی درجے کے پکے سچے اور مخلص ہیں اور دوسرے گروہ ہیں۔ جو ظاہر میں تو ایمان والے ہیں مگر ان کے باطن میں کفر بھرا ہوا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جن کی بات دنیوی زندگی میں آپ کو پسند آتی ہے۔ جب بات کرتے ہیں، تو بڑے پتے کی ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ اونچے درجے کے لوگ ہیں مگر حقیقت میں یہ ان کی چرب زبانی اور مکاری ہوتی ہے۔ محض زبان سے آپ کے روبرو میٹھی میٹھی اور آپ کے لیے خوش کن باتیں کرتے ہیں، اور آپ کو وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔ وَیُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰی مَا فِیْ قَلْبِهٖ اور جو کچھ اس کے دل میں ہے، اس پر اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ اور قسمیں کھا کر کہتا ہے۔ خدا گواہ ہے۔ کہ مجھے آپ کے ساتھ بڑی محبت ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ کہ وہ سخت جھگڑا کرنے والا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ اَبْغَضُ الرِّجَالِ اِلَی اللّٰهِ الْاَلَدُّ الْخَصِمُ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین وہ لوگ ہیں، جو سخت جھگڑالو ہوتے ہیں۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہ آیت اخنس بن شریق کے متعلق نازل

ہوئی۔ یہ منافق تھا مگر حضور علیہ السلام کی مجلس میں اکثر حاضر ہوتا اور اپنے آپ کو بڑا محب ظاہر کرتا بڑے مؤدب طریقے سے پیش آتا۔ اور یاور کرانا چاہتا کہ میں آپ کا بڑا جاں نثار ہوں۔ اور پھر قسم کھا کر کہتا کہ میں آپ کی ہر بات پر جان قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر یہ شخص پرلے درجے کا منافق اور سخت جھگڑالو تھا۔

اصلاح قلب

اللہ تعالیٰ نے منافقین کی یہ ایک عام صفت بیان کی ہے۔ کہ بات بڑی دانشمندی کی کرتے ہیں۔ اور اس پر اللہ کو گواہ بھی بناتے ہیں یعنی قسم کھا کر بات کرتے ہیں۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَھُمْ جُنَّةً "یہ لوگ قسموں کو ڈھال کے طور پر استعمال کرتے ہیں تاکہ مسلمان انکی بات پر یقین کر لیں۔ مگر اللہ تعالےٰ نے واضح کر دیا وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ خود میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ معلوم ہوا کہ دل کی بات پر اللہ کو گواہ بنانا جھوٹی قسم کھانا ہے جب کہ زبان پر کچھ اور ہو، اور باطن میں کچھ اور۔ معلوم ہوا۔ کہ حق و باطل کا مدار قلب پر ہے۔ جب تک اس کی اصلاح نہ ہو، زبانی بات کا کچھ اعتبار نہیں، اسی لیے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ اگر وہ درست ہے۔ تو سارا جسم درست ہے۔ اور اگر وہ لوتھڑا خراب ہے۔ تو سارا جسم خراب ہے فرمایا اَلَا وَھِیَ الْقَلْبُ اس سے مراد دل ہے۔ جس کی درستگی پر سارے جسم کی درستگی کا انحصار ہے۔ اگر دل میں حسد، بغض، کفر، شرک اور نفاق کا فاسد مادہ موجود ہے۔ تو پھر اسکی اصلاح ممکن نہیں۔ حدیث شریف میں اس کی مثال اس زخم کے ساتھ دی گئی ہے۔ جس میں پیپ بھری ہوئی ہو۔ منافقین کا دل بھی اسی طرح غلاظت کی آماجگاہ ہوتا ہے۔ جب تک دل کی اصلاح نہیں ہوگی۔ اعمال درست نہیں ہو سکتے۔

فساد فی الارض

حضور علیہ السلام کی مجلس میں اَلسی چکنی چپڑی باتیں کرنے والے منافق کے کردار کا دوسرا پہلو بیان فرمایا وَاِذَا تَوَلّٰی جب وہ اس مجلس سے پیٹھ پھیر کر علیحدہ ہوتا ہے۔ سَعٰی فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْھَا پھر اسکی کوشش یہ ہوتی ہے کہ زمین پر فساد برپا کیا جائے۔

اور فساد سے مراد مسلمانوں کے خلاف سازش کرنا اور انہیں مالی وجانی نقصان پہنچانا ہے مزید برآں یہ شخص وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ کھیتی کو ہلاک کرتا ہے۔ اور وَالنَّسْلَ اور نسل کو ضائع کرتا ہے۔ کھیتی کو ہلاک کرنے کی صورت یہ ہے۔ کہ مسلمانوں کی تیار فصل کو نقصان پہنچایا جائے۔ پکی ہوئی کھیتی کو آگ لگا دی جائے۔ درختوں کا پھل ضائع کر دیا جائے۔ یا سرے سے درخت ہی کاٹ دیے جائیں۔ اور نسل کشی سے مراد مطلق نسل کشی بھی ہے جیسا کہ منافقین کا وطیرہ ہے۔ اور اس سے مراد مویشی بھی ہو سکتے ہیں۔ جنہیں ہلاک کر دیا جائے یا انہیں معذور بنا دیا جائے۔

فساد اصلاح کے مقابلے میں آتا ہے۔ اصلاح کا معنی درستگی اور فساد سے مراد بگاڑ ہے۔ اس کا بیان پہلے بھی آچکا ہے۔ ”وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ“ جب منافقوں سے کہا جاتا ہے۔ کہ زمین میں فساد نہ کرو تو جواب دیتے ہیں ”إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ“ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ہم کافروں سے محض اس لیے ملتے ہیں تاکہ صلح صفائی کا پہلو نکل سکے مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ مجھے فساد بالکل پسند نہیں۔ یہ منافق تو ادھر کی بات۔ اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر کر کے آپس میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا مقصد تو لڑائی جھگڑا کرانا ہے۔

فساد کی ایک اور صورت لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف بدظن کرنا ہے۔ اور سب سے بڑا فساد شرک اور کفر ہے۔ جو ان کے دلوں میں موجود ہے کفر اور شرک سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے جب کہ ایمان اور نیکی سے اصلاح کا پہلو نکلتا ہے۔ شرک و بدعات اور منکرات کے ذریعے ضمیر کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ شرائع الٰہیہ کو توڑنا فساد ہے۔ لوگوں کو غلط باتوں کی تلقین کرنا فساد ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ سب چیزیں فساد ہی کا حصہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔

تَوَلّٰی بمعنی حاکم

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ تولی کا ایک معنی پشت پھیرنا ہے۔ اور دوسرا معنی والی یعنی حاکم بن جانا بھی ہے۔ اگر یہ معنی لیا جائے۔ تو مطلب ہوگا کہ جب منافق آدمی حاکم بن

جاتا ہے۔ برسر اقتدار آجاتا ہے۔ تو زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنی من مانی کرے گا۔ لوگوں پر ظلم و ستم کا بازار گرم کرے گا۔ لاقانونیت کا دور دورہ ہوگا یا غلط قانون جاری ہوں گے۔

شیخ سعدیؒ کہتے ہیں۔

مدبیہ کہ قانون بدمی نہد تہ اجی برد تا باتش دہر

جو شخص بُرا قانون جاری کرتا ہے۔ وہ خود بھی جہنم رسید ہونے والا ہوتا ہے غلط قانون بنانا۔ اُس کو جاری کرنا اور پھر اس پر عمل کرنا لوگوں کے حقوق ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ یہ تو قتل و غارت کا بازار گرم کرنا اور سیاست کو خراب کرنے والی بات ہے۔ ایسے ہی قوانین عیاشی اور فحاشی کو تقویت دیتے ہیں بنافق حکومتیں یہی کچھ کرتی ہیں کسی کو قتل کرا دیا کسی کے خلاف مقدمہ کھڑا کر دیا۔ کسی کو ڈرایا دھمکایا یہی تو فساد فی الارض ہے۔ تعمیر اخلاق کی بجائے تخریب اخلاق کی باتیں کی جائیں، شراب نوشی کو عام کیا جائے تاکہ لوگوں کے ذہن ماؤف ہو جائیں۔ حلال و حرام کی تمیز اٹھ جائے راگ و رنگ اور ناچ گانے کی محفلیں منعقد ہوں۔ رشوت کا بازار گرم ہو۔ غنڈے بدمعاشوں کی سرپرستی ہو۔ تصویر سازی عام ہو جائے۔ اور بُرائی برائی نہ رہے۔ یہ سب فساد فی الارض کے مختلف حصے ہیں۔

جرائم کی سرپرستی

ایک اخباری خبر کے مطابق امریکی سپریم کورٹ کے نو میں سے سات ججوں نے فیصلہ دیا۔ کہ عریاں ڈانس کرنا جرم نہیں ہے۔ انہوں نے لکھا کہ عورتوں کا برہنہ رقص محض جذبات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اور آئین ساز اسمبلی اس کا احترام کرتی ہے۔ یہ اس قوم کا حال ہے۔ جو آج کی دنیا میں سب سے زیادہ مہذب تصور کی جاتی ہے اگر برہنہ رقص عیب نہیں تو دنیا میں بُرائی نام کی کون سی چیز ہے۔ وہ لوگ تو زنا کو بھی فیشن سمجھتے ہیں۔ برطانیہ نے لواطت کو قانوناً جائز قرار دے دیا ہے۔ اسی لیے بعض مفسرین نے یہاں لطیف نکتہ بیان کیا ہے کہ یُھْلِکَ الْحَرْثَ یعنی کھیتی تباہ کرنے سے مراد فعل زنا ہے جس کی وجہ سے کھیتی تباہ ہوتی ہے۔

منکوحہ عورت کے متعلق اللہ نے فرمایا۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ انہیں سے فصل یعنی اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اور جب زنا کیا جاتا ہے۔ تو کھیتی کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے اللہ تعالےٰ نے کسی شخص کو اپنی منکوحہ بیوی یا لونڈی کے علاوہ کسی دوسری عورت سے تمتع کی اجازت نہیں دی۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے متعلق فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ یہ لوگ زیادتی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لہذا اسے ہر لحاظ سے ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے۔ باقی رہا یُهْلِكَ النَّسْلَ تو اس سے مراد لواطت (SODOMY) بھی ہو سکتی ہے۔ جس سے نسل ضائع ہوتی ہے۔ ایسا فعل جانوروں سے بھی حرام ہے حتیٰ کہ جلق (MASTURBATION) کو بھی ملعون فعل قرار دیا گیا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو دین اخلاق اور ہر چیز کو تباہ کر دیتی ہیں۔

برطانیہ میں زنا کی وہ صورت حرام ہے۔ جو بالجبر (RAPE) کیا گیا ہو۔ اور اگر کوئی مرد اور عورت باہمی رضامندی سے اس فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔ تو قانون کی نظر میں کوئی جرم نہیں۔ ایسے امور میں پولیس کو مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح امریکہ میں برہنہ رقص بھی جائز ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب منافق برسر اقتدار آئیں گے۔ تو یہی کچھ ہو گا۔ اسی کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔

تکبر بڑا گناہ ہے

آگے ارشاد فرمایا وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اور جب ایسے منافق کو کہا جائے کہ اللہ سے ڈر جاؤ، ایسی باتیں نہ کرو، کسی کو ناحق قتل نہ کرو۔ گندے قانون جاری نہ کرو۔ جس سے لوگوں کے اخلاق بگڑتے ہوں تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں۔ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ تو اسی گناہ پہ تکبر کرتے ہیں۔ اتراتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ہمارا تو قانون ہی یہ ہے۔ اور فخریہ انداز میں کہتے ہیں۔ کہ ہم تو اس قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری اسمبلی کا ہماری اکثریت کا بنایا ہوا قانون ہے فرمایا ایسے لوگوں کا حال یہ ہو گا فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ کہ اُن کے لیے جہنم کافی

ہے ۔ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ اور یہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے ۔ اس قسم کے اعتقادی اور عملی منافقوں کا علاج جہنم کے گڑھوں میں ہوگا ۔ یہ لوگ اچھی بات کو قبول نہیں کرتے اور الٹا غرور اور تکبر کرتے ہیں اگر ان کو کہو کہ اسرائیل کی پشت پناہی نہ کرو ۔ لوگوں پر ظلم نہ کرو ان کی سلطنتوں کے تختے نہ الٹو ، مگر وہ حق بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہونگے یہ اعتقادی منافقوں کا حال ہے ۔

مسلمان مگر منافق

آج کا مسلمان اگر اعتقادی منافق نہیں تو عملی منافق ضرور ہے ۔ اس کے قول و فعل میں تضاد پایا جاتا ہے ۔ ظاہر اور باطن مختلف ہیں ، بڑے بڑے جلسے منعقد کریں گے ۔ حضور علیہ السلام کی سیرت کو کامیابی کا ذریعہ بتائیں گے ۔ قرآن پاک سے راہنمائی کے دعویٰ کریں گے ، مگر عملی طور پر صفر ہیں ۔ نہ قرآن پاک سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں ۔ اور نہ سیرت پاک کو اپناتے ہیں محض زبانی دعوے ہیں ۔ حکومتوں کا بھی یہی حال ہے ۔ دعوے یہ ہے کہ برائی کا خاتمہ ہوگا ۔ فتنہ و فساد کی بیخ کنی ہو گی ۔ معاشی اور معاشرتی اصلاحات ہوں گی ، مگر عملی طور پر کچھ نہیں کرتے ۔ یہ سب منافقت کی باتیں ہیں ۔

سعودی عرب میں اجرائے حدود

خاندان سعود کے برسر اقتدار آنے سے پہلے یہاں بھی چوری عام تھی اور ترکوں کے زمانہ سے چلی آرہی تھی ۔ جب ابن سعود جیسے بدو حاکم نے عنان حکومت سنبھالی تو اس سے چوری کی شکایت کی گئی ۔ اس نے کہا یہ تو کوئی مسئلہ نہیں ۔ میں صرف اڑھائی دن میں چوری بند کرکے دکھاتا ہوں ۔ اور پھر ایسا ہی ہوا ۔ جب حدود اللہ کا نفاذ ہوا اس پر عمل کرکے دکھایا تو چوری کیا ہر جرم نیست و نابود ہو گیا ۔ اب سعودی عرب والے چوری نہیں کرتے تاہم اقتصادی نظام کی بنیاد وہاں بھی سرمایہ داری پر ہے ۔ اب امریکہ بلکہ ساری دنیا کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ سعودی عرب ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں چوری نہیں ہوتی جہاں زنا کا ارتکاب نہیں ہوتا ۔ وجہ یہی ہے ۔ کہ وہاں حدود اللہ کا نفاذ ہے اور ان پر سختی سے عملدر آمد ہو رہا ہے

جاں نثاران اسلام

منافقین کے تذکرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے مخلص لوگوں کا حال بھی بیان فرمایا ہے ۔ ارشاد ہوتا ہے ۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ

اللّٰہِ ط اور لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے۔ جو رضائے الٰہی کی تلاش میں اپنی جان کو بیچتا ہے شرار کا معنی بیچنا اور خریدنا دونوں طرح آتا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں حضرت صہیب رومیؓ کی طرف اشارہ ہے آپ جب ہجرت پہ روانہ ہونے لگے تو مشرکین نے راستہ روک لیا۔ آپ نے کمان کو درست کیا ترکش سے تیر نکالے اور فرمانے لگے۔ اے قریش! تم مجھ سے واقف ہو کہ میں تیر انداز ہوں۔ جب تک میرے پاس ایک بھی تیر ہے۔ تم میرے قریب نہیں آسکتے۔ اور تلوار بھی میرے پاس موجود ہے۔ میں تمہارا ڈٹ کر مقابلہ کروں گا۔ بہتر ہے کہ تم میرا راستہ نہ روکو۔ میرا اتنا مال فلاں جگہ موجود ہے۔ جاؤ وہ لے لو۔ تمہارے لیے مباح کرتا ہوں۔ چنانچہ مشرکین نے اس پہ اکتفا کرتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ جب مدینہ پہنچے تو حضور علیہ السلام نے فرمایا اے ابو یحییٰ! تیری تجارت نفع مند ہے۔ وہ لوگ نہ مال کی پروا کرتے تھے۔ نہ جان کی۔ انہیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب تھی۔ کہ کسی طرح ایمان بچ جائے۔ یہی وہ لوگ تھے۔ جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی تلاش میں اپنی جان کو بیچتے تھے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان ضعفاء نے بڑی بڑی تکالیف برداشت کیں۔ عمارؓ کی والدہ سمیہؓ نے ایک عورت ذات ہوتے ہوئے اتنی بڑی قربانی دی۔ عمارؓ کا باپ یاسرؓ بھی شہید ہوا۔ اور ماں بھی شہید ہوئی۔ ظالم ابوجہل نے حضرت سمیہؓ کی دونوں ٹانگیں مختلف اونٹوں سے باندھ کر مخالف سمتوں میں چلا دیا اور اس طرح انہیں بے رحمی سے شہید کیا۔ حضرت خباب بن ارتؓ، حضرت بلالؓ اور اس قسم کے کتنے ضعفاء تھے جنہوں نے بڑی سے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ جان اور مال قربان کر دیے۔ مگر ایمان کو بچا گئے تاکہ اللہ کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔

فرمایا وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ شفقت کرنے والا ہے۔ جو لوگ اپنا مال اور جان اللہ کی رضا کی تلاش میں صرف کر دیتے ہیں تو اللہ بھی ان کو بے یارومددگار نہیں چھوڑ یگا۔ وہ تو بڑا ہی مہربان ہے۔ یہ بھی اس کی خاص مہربانی ہے۔ کہ ان کے دلوں کو نیکی کی طرف پھیر دیا۔ اور وہ ہر قربانی

کے لیے تیار ہو گئے ۔ چنانچہ ان کے حق میں نتیجہ بھی خوب ہی نکلے گا۔ وہ لوگ یقیناً مراتب عالیہ پر فائز ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ خاص مہربانی کرنے والا ہے ۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ﴿۲۰۸﴾ فَاِنْ
زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْکُمُ الْبَیِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ
اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ﴿۲۰۹﴾ ھَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیَھُمُ
اللّٰہُ فِیْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰٓئِکَۃُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ ؕ
۲۵ ع ۹ وَاِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۲۱۰﴾ ع

ترجمہ :- اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ بیشک وہ تمہارے لیے کھلا دشمن ہے ﴿۲۰۸﴾ پس اگر تم پھسل گئے بعد اس کے کہ تمہارے پاس واضح باتیں آگئی ہیں۔ پس جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے ﴿۲۰۹﴾ یہ لوگ نہیں انتظار کر رہے مگر اس بات کا کہ آئے اللہ تعالیٰ ان کے پاس بادلوں کے سائبانوں میں اور فرشتے بھی۔ اور فیصلہ کر دیا جائے معاملے کا۔ اور اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے سب کام ﴿۲۱۰﴾

مکمل اسلام

گذشتہ آیات میں منافقین کی مذمت اور مخلص ایمان والوں کی تعریف بیان کی گئی تھی کہ وہ اپنی جان اور مال ہر چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے قربان کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔ اب ان مخلص مومنین سے خطاب ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ کافۃ کا معنیٰ جمیعہ ہوتا ہے۔ یعنی انسان اپنے جسم کے لحاظ سے اور ادھر احکام شریعت کے لحاظ سے پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جائیں۔ وفاداری صرف اور صرف اسلام سے ہو، باقی تمام ادیان، بدعات، رسومات باطلہ

وغیرہ سے مکمل طور پہ علیحدگی ہو۔ کیونکہ یہ چیزیں اسلام کے منافی ہیں۔ اگر اسلام کے ساتھ ساتھ ایسی قبیح چیزوں کے ساتھ بھی تعلق قائم رکھیگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ ایسا شخص مکمل طور پہ اسلام میں داخل نہیں ہؤا۔ کافۃ کا دوسرا معنی یہ بھی ہے۔ کہ انسان کے ظاہر و باطن اور عقیدے اور عمل میں کسی قسم کا تضاد نہ ہو۔ جو کچھ دل کے اندر ہے زبان پہ بھی وہی آنا چاہیئے۔ اور جو عقیدہ ہے عمل بھی اُس کے مطابق ہو۔ زبانی دعویٰ کچھ ہو۔ اور عملی طور پہ اُسکی تردید ہوتی ہو۔ تو یہ اسلام میں مکمل طور پہ داخلہ نہیں ہوگا۔ اگر عقیدہ توحید کا ہو اور عمل میں شرک پایا جائے۔ زبان پہ اتباع سنّت کا دعویٰ ہو مگر رواج بدعات کو دیا جارہا ہے۔ تو یہ چیز کافۃ کے منافی ہوگی۔

شیخ الہندؒ اور ترجمہ قرآن

حضرت مولانا شیخ الہند محمود الحسنؒ برصغیر کے بلند پایہ مفسرِ قرآن ہوئے ہیں انہوں نے حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے ترجمہ قرآن پاک کو آسان بنایا۔ اُن کے زمانے میں جو الفاظ متروک زبان ہو چکے تھے انہیں آسان اور عام فہم الفاظ کے ساتھ بدل دیا۔ یہ بامحاورہ ترجمہ آپ نے اپنے اسیری کے دوران مالٹا جیل میں مکمل کیا۔ اور ساتھ دو سورتوں کا حاشیہ بھی لکھا مگر زندگی نے وفا نہ کی۔ چنانچہ بقیہ قرآن پاک کا حاشیہ آپ کے شاگرد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مکمل کیا۔ اس وقت برصغیر میں اردو زبان کا سب سے بہتر حاشیہ یہی ہے۔ جو مختصر اور صحیح ہے۔ تفسیریں اور حاشیے تو اور بھی بہت سے ہیں۔ کوئی لمبا کوئی مختصر عربی اور فارسی زبانوں میں بھی بے شمار حواشی موجود ہیں مگر یہ ترجمہ اور حاشیہ سب سے بہتر ہے۔ جو تمام عالمانہ خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں بدعات کا خاص طور پہ رد کیا گیا ہے۔

کہتے ہیں۔ کہ جب شیخ الہندؒ مالٹا سے بذریعہ بحری جہاز واپس آرہے تھے۔ تو سمندر میں طوفان آگیا۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب جہاز کے بچ نکلنے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ تو آپ نے ایک شاگرد کو جو ہمراہ تھا فرمایا کہ اس ترجمہ کو اپنے سینہ سے باندھ لو۔ اگر جہاز کی تباہی کی صورت میں تیرنا بھی پڑے تو اس ترجمہ کو ساتھ لیجانا۔ یہ مولانا عزیر گل سخاکوٹ پشاور کے رہنے والے تھے۔ اور تیرنا جانتے تھے۔ حضرت

شیخ الہندؒ کے ہمراہی پانچ شاگردوں میں سے مولانا عزیر گل ماشاءاللہ آج بھی بقید حیات ہیں۔ سمندری طوفان کے دوران اگر آپ کو کسی چیز کی فکر لاحق ہوئی تو وہ ترجمہ قرآن پاک تھا۔ جو آپ نے نہایت عرق ریزی سے لکھا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور جہاز صحیح سلامت طوفان سے بچ نکلا۔ الغرض حضرت شیخ الہند کو اس ترجمہ قرآن پاک کی اتنی فکر تھی۔ کہ اور کسی چیز کی پروا نہ کی۔ آپ کو صرف اسی گوہر نایاب کی فکر لاحق ہوئی۔

شیخ الہندؒ بڑے خدا پرست انسان تھے۔ محدث اور فقیہ تھے۔ انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔ انہیں ایک آنکھ دیکھنا بھی پسند نہ فرماتے آپ سمجھتے تھے۔ کہ مسلمانوں کے دین، مذہب اور قوم کو خراب کرنے والے انگریز ہی ہیں۔ مسئلہ کشمیر، فلسطین، قبرص، شام اور لبنان سب انگریز کے پیدا کردہ مسائل ہیں۔ یہ امریکہ تو کل کی پیداوار ہے۔ اصل فتنہ پرداز انگلینڈ والے ہیں۔ جو یہاں سے بھاگ کر امریکہ چلے گئے اور وہاں حکومت قائم کر لی۔ عیسائی خواہ امریکی ہوں یا برطانوی یا روسی انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی مخالفت کی۔ انہوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے ساتھ سازشیں کیں۔ ان کو ذلیل و خوار کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں سب پیروں اور مولویوں نے ترکی کے خلاف کفر کا فتویٰ دے دیا۔ یہ صرف حضرت مولانا شیخ الہندؒ تھے جنہوں نے انگریز کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا گیا۔

بدعات کی تردید

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ترجمہ قرآن میں کافۃ کا معنی یہی لکھا ہے کہ اسلام میں اس طرح داخل ہو جاؤ کہ تمہارا کوئی عمل احکام اسلام کے خلاف نہ ہو۔ اپنی عقل یا دوسرے کے کہنے سے دین میں کوئی چیز داخل نہ کرو کہ یہ بدعت ہے۔ مگر لوگ اسے اسلام کے نام کار ثواب سمجھ کر کرتے ہیں۔ کیونکہ بدعت نام ہی اس عمل کا ہے۔ جسے اچھا سمجھ کر دین میں اپنی طرف سے شامل کر لیا جائے۔ حالانکہ دین کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ اس کی مثال ایسے ہے۔ جیسے نماز اور روزہ افضل ترین عبادات میں سے ہیں۔ لیکن جب کوئی شریعت کی مقررہ نماز کے علاوہ

اب وفات پا چکے ہیں۔ فیاض

اپنی طرف سے کوئی نماز ایجاد کریگا تو وہ بدعت ہوگی مثلاً عید کے روز عید گاہ میں نوافل ادا کرنا اگرچہ نماز ہے مگر اسے بدعت کہیں گے۔ کیونکہ دین میں اسکی اصل نہیں ہے۔ اسی طرح ہر اٹھارہ روزہ رکھنا بھی بدعت میں شمار ہوگا۔ کیونکہ اپنی طرف سے دین میں شامل کیا گیا ہے۔

ایصال ثواب کی تمام رسوم بھی اسی قبیل سے ہیں۔ تیسرا، دسواں چہلم وغیرہ کار ثواب اور مردے کے لیے باعث اجر سمجھ کر کیا جاتا ہے مگر شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کی مدح سرائی کے لیے نعت خوانی اور محافل میلاد منعقد کی جاتی ہیں۔ اور مختلف مقامات پہ مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ شریعت کی منشا اور اس کے حکم کے بغیر ہوتا ہے۔ ملا علی قاریؒ اور دیگر فقہائے کرام لکھتے ہیں۔ کہ نماز جنازہ کی سلام پھیرنے کے بعد دعا نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ یہ جنازہ میں اپنی طرف سے اضافہ تصور ہوگا۔ یہ چیز شارع علیہ السلام سے ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح جب اقامت صلوٰۃ کے آخری کلمات لا الہ الا اللہ کہے جاتے ہیں۔ تو دوسرے لوگ محمد رسول اللہ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ بھی بہت بڑی نیکی اور ثواب کی خاطر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حضور علیہ السلام سے قطعاً ثابت نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آج کے مسلمان کو حضور علیہ السلام کے طریقے پر یقین نہیں آیا۔ لہذا اس میں اضافہ کر لیا ہے۔ اذان سے پہلے درود شریف بہت بڑی سعادت سمجھ کر پڑھا جاتا ہے۔ حالانکہ حضور علیہ السلام نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ اس قسم کی بدعات کا ارتکاب محض اپنی عقل کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔

نوافل کی ادائیگی بلاشبہ خیر کثیر ہے مگر اسکی جماعت ثابت نہیں۔ فقہائے کرام نے اسے بھی بدعت سے تعبیر کیا ہے۔ ہاں جن نمازوں کی جماعت حضور علیہ السلام سے ثابت ہے، وہ درست ہے۔ ان میں نماز تراویح، صلوٰۃ کسوف اور نماز استسقاء وغیرہ ہیں۔ مگر صلوٰۃ التسبیح کی جماعت کہاں سے آگئی۔ علمائے احناف اسے بھی بدعت قرار دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک میں درست نہیں ہے۔

حالانکہ یہ نماز ہے اور اعلیٰ درجے کی عبادت ہے۔

الغرض! خلاصہ ان آیات کا یہ ہے۔ کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ اور بدعات سے بچتے رہو اور اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا واقعی بعض لوگ مکمل طور پر اسلام میں داخل نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں اہل کتاب کی مثال موجود ہے۔ یہودی علماء میں سے حضرت عبداللہ بن سلامؓ کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی اور وہ اسلام لائے۔ بعض دوسرے یہودی بھی مشرف بہ اسلام ہوئے حضرت شیخ الہندؒ لکھتے ہیں۔ کہ اگرچہ وہ پورے اخلاص کے ساتھ مسلمان ہوئے تھے۔ مگر اُن کا خیال تھا کہ قرآنی احکام کے ساتھ ساتھ تورات کے احکام کی بھی رعایت ہونی چاہیئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس خیال کی تردید فرمادی کہ اسلام کے ساتھ ساتھ کسی اور شریعت یا دین کی رعایت اسلام میں مکمل داخلے کی نفی ہوگی۔ لہٰذا باقی تمام شرائع اور ادیان کو چھوڑ کر اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

تورات میں حکم موجود ہے۔ کہ ہفتہ کے روز سوائے عبادت الٰہی کے اور کوئی کام نہ کرو۔ گویا اس دن دنیوی کاروبار مکمل طور پر بند کرنے کا حکم تھا۔ حتیٰ کہ چولھا بھی گرم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نہ زراعت، نہ دکانداری اور نہ کوئی اور کام کرنے کی اجازت تھی۔ اسی طرح یہودیوں کے دین میں اونٹ کا گوشت کھانا اور دودھ پینا ممنوع تھا۔ تو نومسلم یہودیوں نے خیال کیا۔ کہ اسلام میں جمعہ کو افضل دن قرار دیا گیا ہے۔ ہم اسکو تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پرانے طریقے پر اگر ہفتہ کی تعظیم بھی روا رکھی جائے۔ اور ممنوعات کی پابندی کی جائے تو کیا حرج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی بات سے منع فرمادیا اور حکم دیا کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اب اسلامی احکام کے ساتھ دوسری شریعت کی پابندی روا نہیں ہے اگر اب بھی ایسا کیا جائے تو یہ فعل بدعت شمار ہوگا۔ کیونکہ شریعت محمدی نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔

ظاہر و باطن میں یکسانگی

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً ایک جامع آیت ہے۔ اسلام میں مکمل داخلہ صرف ظاہری اعمال تک ہی موقوف نہیں۔ بلکہ باطنی طور پر بھی اسلام کے احکام

پر پورا پورا یقین ہونا چاہیئے۔ ظاہراً تمام اعضا مثلاً ہاتھ، پاؤں، کان اور آنکھ احکام اسلام پر کاربند ہوں جس طرح بعض روایات میں آتا ہے کہ روزہ صرف بھوک اور پیاس برداشت کرنے کا نام نہیں بلکہ آنکھ، کان، زبان اور دیگر تمام اعضا و جوارح کا روزہ ہونا چاہیئے اسی طرح باطناً دل میں بھی پورا ایمان و یقین ہو کہ ان احکام کو پورے خلوص نیت کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اگر ایسی کیفیت پیدا ہو جائے، تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے کَآفَّۃً کا مفہوم پا لیا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے۔ ظاہر و باطن میں تضاد پایا جاتا ہے۔ کچھ حصہ اسلام کا لے لیا۔ اور کچھ بدعات کو بھی اپنا لیا۔ یا کوئی عبادت اسلام سے لے لی اور کچھ چیزیں کسی اور شریعت، یا مقامی رسم و رواج سے حاصل کر لیں تو اسلام میں مکمل داخلہ تصور نہیں ہو گا۔ آپ کو یاد ہے سابقہ حکومت نے نعرہ لگایا تھا کہ دین تو ہمارا اسلام ہے۔ مگر معیشت ہماری سوشلزم اور سیاست ہماری جمہوریت ہو گی۔ تو بتایئے یہ اسلام کی مکمل اتباع کیونکر ہو گی۔ یہ تو تثلیث بنا کر رکھ دی۔ یقیناً یہ اس آیت کریمہ کی نفی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو حکم دیتا ہے کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اور یہ کہتے ہیں۔ کہ ہم ایک تہائی اسلام کا لیں گے اور باقی دو تہائی کے لیے دوسروں کے دروازے پر جائیں گے۔ ہم نے اسی وقت کہہ دیا تھا۔ کہ یہ نعرہ اسلام کے سراسر منافی ہے۔ اگر دین اسلام ہے تو پھر معیشت اور سیاست بھی اسلام ہی سے کرنا ہو گی۔ ورنہ یہ قول و فعل میں تضاد اور ظاہر و باطن میں عدم یکسانیت ہو گی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد عالیہ کتب احادیث بخاری و مسلم وغیرہ میں مرتب شکل میں دستیاب ہیں ان میں نظام حکومت کا مکمل خاکہ موجود ہے۔ خلفاء راشدین کے نظام حکومت کی تفصیلات موجود ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کی ازالۃ الخفاء اور دیگر کتب میں دستور مملکت موجود ہے۔ مگر آپ اس کو چھوڑ کر غیروں کے نظام تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اسلام کے نام پر قائم ہونے والے ملک پاکستان میں ابھی تک انگریز کا قانون

نافذ ہے۔ قوانین دیوانی و فوجداری، تجارت و معیشت وغیرہ سب انگریزی قانون ہیں انگریز کے زمانہ میں ان قوانین کو قبول کرنا تو ہماری مجبوری تھی، اب کیا تکلیف ہے ہم اسلامی نظام کیوں نافذ نہیں کر سکتے۔ کیا کار پردازان حکومت کو اسلام کے قوانین و نظریات پر اعتماد نہیں ہے۔ اگر اعتماد ہوتا تو انگریزی قوانین پہلے دن سے تبدیل کر دیے جاتے۔

اسلام انقلابی مذہب ہے

اصل بات یہ ہے۔ کہ اس وقت اسلام کو انقلابی مذہب ہم خود اور ہمارے حکمران تسلیم نہیں کرتے۔ اسی لیے وہ اسلام کا نفاذ بتدریج چاہتے ہیں نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ جس طرح پہلے حکمران نفاذ اسلام کے بغیر چلے گئے۔ اسی طرح موجودہ حکومت بھی رخصت ہو جائیگی مگر اسلام نافذ نہیں ہوگا۔ اور اس کے بعد تیسرا آجائے گا وہ اپنا طور طریقہ اپنائیگا۔ ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت مگر لوگ اسلام کی برکات سے محروم ہی رہیں گے۔ جب تک اسلام کو انقلابی اقدام کے طور پر نافذ نہیں کیا جائے گا، کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس ضمن میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ دیکھیے۔ فتح مکہ کے روز حضور نے انقلابی اعلان فرمایا تھا کہ جاہلیت کی ہر رسم آج میرے پاؤں کے نیچے روند دی گئی ہے آج کے بعد کسی مشرک کو برہنہ حالت میں طواف کعبہ کی اجازت نہیں ہوگی۔ کسی غیر مسلم کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ آج کے بعد تمام سودی کاروبار بند کیے جاتے ہیں۔ یہ سب انقلابی مذہب کے انقلابی پروگرام تھے جو غلط پروگرام کی جگہ فی الفور نافذ کر دیے گئے۔ مقصد یہ کہ اگر عقیدہ اسلام کا ہے۔ تو پھر قوانین بھی اسلامی نافذ ہونے چاہئیں۔ جو ہر شعبۂ زندگی پر حاوی ہوں۔ ملکی مسائل معاشی ہوں یا معاشرتی عبادات ہوں یا رسم و رواج ہر معاملہ میں اسلام سے راہنمائی حاصل کرنا ہوگا۔ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر سے کام نہیں چلے گا۔ ہمارے پاس ہر شعبہ کے لیے قوانین موجود ہیں، ضرورت صرف عمل کی ہے۔ اسلام کی عملداری میں انگریز کی جمہوریت چلے گی نہ سوشلزم کی اقتصادیات ہوں گی اور نہ کارل مارکس کی اشتراکیت کا کوئی حصہ ہوگا۔ بلکہ پورے کا پورا نظام اسلامی ہوگا۔ حتیٰ کہ دیوانی اور فوجداری قوانین

بھی وہی نافذ ہوں گے جو اسلام نے عطا کیے ہیں۔ حق دار کی حق رسی انہی قوانین کے ذریعے ممکن ہے۔ اور ظالم کو ظلم کا بدلہ یہی قوانین دلا سکتے ہیں۔ یہی وہ قوانین ہیں، جن کے ذریعے دنیا میں امن وامان قائم ہو سکتا ہے۔ اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً کا یہی مطلب ہے۔

شیطان کے نقش قدم

یہودیوں میں بھی یہی خصلت پائی جاتی ہے۔ کہ وہ بھی اپنی کتاب پر مکمل ایمان نہیں رکھتے تھے۔ کسی حکم کو مانتے تھے اور کسی کا انکار کر دیتے تھے۔ جبھی تو اللہ تعالےٰ نے انہیں جتلایا اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ کیا تم کتاب کے کسی حصے کے ساتھ ایمان لاتے ہو اور کسی حصے کو نہیں مانتے۔ یہ تمہارا ایمان کیسا ہے۔ یہ تو سراسر منافقت ہے۔ اس روش کو چھوڑ کر پورے کے پورے ایمان میں داخل ہو جاؤ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ گویا بدعات پر چلنا شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اس کے بہکاوے میں نہ آجانا مطلب یہ کہ جو کوئی دین اسلام کا راستہ چھوڑ کر ہندوانہ رسم ورواج کو اپنائے گا۔ انگریزوں اور اشتراکیوں کا قانون اختیار کرے گا۔ وہ شیطان کے نقش قدم پر چلے گا۔ اور ظاہر ہے کہ دشمن ہمیشہ دشمنی کرتا ہے۔ وہ کبھی خیر خواہی کی بات نہیں کرتا۔ وہ تمہیں پستی کی طرف لے جائے گا۔ شیطان کا تو کام ہی یہ ہے۔ یَدْعُوْا حِزْبَہٗ لِیَکُوْنُوْا مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ وہ تو اپنا بڑے سے بڑا گروہ لے کر جہنم کی طرف رواں ہے۔ اور اپنے نقش قدم پر چلنے والوں کو اسکی طرف دعوت دے رہا ہے۔

وعید خداوندی

اللہ تعالےٰ نے اسلام کے مکمل نفاذ کی ترغیب دینے کے بعد اس سے روگردانی کرنے والوں کو وعید بھی سنائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْکُمُ الْبَیِّنٰتُ۔ اور اگر تم پھسل گئے بعد اس کے کہ تمہارے پاس نشانیاں آگئیں۔ فَاعْلَمُوْا تو یاد رکھو اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ

بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے۔ اور حکمت والا ہے وہ کمال قدرت کا مالک ہے اس کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔ اسکی حکمت کے مطابق دیر ہو سکتی ہے مگر گرفت سے بچاؤ ممکن نہیں۔ وہ تمہارے کیئے کا ضرور بدلہ دے گا۔ دوسرے مقام پر فرمایا قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ نیکی اور بدی کی واضح نشان دہی ہو چکی۔ اب تمہارا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان واضح ہدایات کے بعد نیکی یا بدی کا اختیار کرنا تمہارے بس میں ہے۔ اور اس پر جزا یا سزا دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے قسمہ ہے

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

اللہ تعالیٰ کے احکام نہ ماننے والوں کے متعلق یہ ارشاد ہوتا ہے۔ کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ انہیں کس چیز کا انتظار ہے۔ جسے دیکھ کر ایمان لائیں گے۔ هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا أَن يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ یہ لوگ محض اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے اُن کے پاس بادلوں کے سائے میں آئیں مطلب یہ کہ منکرین کی خواہش یہ ہے کہ جو چیز قیامت کو ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ آج ہی ہو جائے۔ بادلوں کے سائبانوں میں نزول اجلال تو قیامت کے روز ہو گا جب اللہ تعالیٰ خود نزول اجلال فرمائیں گے اور سائبان جو ہوں گے، وہ نار، نور اور پانی کے ہوں گے۔ ستر ہزار حجاب میں اللہ تعالیٰ نزول اجلال فرمائے گا۔ اردگرد فرشتے تسبیح پڑھ رہے ہوں گے۔ اُس وقت عدالت قائم ہو گی اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کا فیصلہ فرمائیں گے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں۔ کہ یہ سب کچھ آج ہی ہو جائے۔ بھلا قبل از وقت یہ کیسے ممکن ہے۔ دوسری جگہ فرمایا فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ قرآن پاک اللہ کی آخری کتاب ہے۔ اس کے آجانے کے بعد یہ اور کس کتاب کے منتظر ہیں۔ جس پر ایمان لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر خاتم النبیین تشریف لا چکے۔ اب ان کی راہنمائی کے لیے اور کون سا نبی آئے گا۔ جس کا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں اب کوئی شریعت، کوئی پروگرام نہیں جو باقی ہے۔ اور جس کا انتظار کیا جائے۔ الغرض فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا بادلوں کے سائبانوں میں نزول اجلال تو قیامت

کے روز ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی تجلی ستر ہزار پردوں کے اندر ظاہر ہوگی۔ کائنات کی ہر چیز درہم برہم ہو جائے گی۔ اور سخت ناراضگی کا ظہور ہوگا۔ چنانچہ اس وقت وَقُضِيَ الْاَمْرُ فیصلہ کر دیا جائے گا مگر یاد رکھو وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ تمام کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون اٹل ہے۔ اس کا مقرر کردہ ہر کام وقت پر ہوگا۔ اسی کے قانون کے مطابق انسانوں کو اس دنیا پر مہلت دی جاتی ہے۔ مگر آخری فیصلہ اور نزول اجلال قیامت کے روز ہی ہوں گے۔ یہ چیزیں قبل از وقت وقوع پذیر نہیں ہونگی۔

درس ہشتاد و شش (۸۶)

آیت ۲۱۱ تا ۲۱۲

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَیَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَاللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾

وقف لازم

ترجمہ: آپ بنی اسرائیل سے پوچھیں کہ ہم نے اُن کو کتنی واضح نشانیاں دیں۔ اور جو کوئی اللہ کی نعمت کو تبدیل کرے گا۔ اس کے بعد کہ وہ نعمت اُس کے پاس پہنچ چکی۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے (۲۱۱) مزین کی گئی ہے۔ دنیا کی زندگی اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا۔ اور وہ ٹھٹھا کرتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے۔ اور وہ لوگ جو ڈرتے رہے۔ وہ اُن کے اوپر (بلند) ہوں گے قیامت کے دن۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بغیر حساب کے روزی دیتا ہے (۲۱۲)

واضح نشانیاں

گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا تھا کہ اُس کے واضح احکامات آجانے کے بعد اُن کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ احکام الٰہی کی تعمیل ہونی چاہیئے واضح نشانات کے بعد بھی اگر کوئی شخص پھسل جائے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آسکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے بطور مثال ارشاد فرمایا ہے۔ سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ، آپ ذرا بنی اسرائیل سے دریافت کریں کَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ ہم نے اِن کو کتنی واضح نشانیاں عطا کیں۔ واضح یا کھلی نشانیوں میں تعلیم بھی آتی ہے۔ اور معجزات بھی آتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے توسط سے تمہیں کس قدر واضح معجزات عطا کیے۔ اِن کی تفصیل پہلے آچکی ہے

منجملہ اُن کے ابر کا سایہ کرنا، پتھروں سے بارہ چشمے جاری کر کے بنی اسرائیل کو سیراب کرنا، اُن کے لیے من وسلویٰ کی خوراک مہیا کرنا، دشمن کو آنکھوں کے سامنے ہلاک کرنا، بنی اسرائیل کے لیے سمندر میں راستے بنا دینا وغیرہ وغیرہ ایسے واضح نشان اور معجزات ہیں جو بنی اسرائیل کو عطا کیے گئے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کا انکار کیا۔ اور پے درپے غلطیاں اور کوتاہیاں کیں جن کا ذکر اس سورۃ مبارکہ میں آچکا ہے۔ اور جن کی تعداد کم وبیش چالیس ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر بار معاف فرمایا۔ بنی اسرائیل بہت بڑی قوم تھی۔ دنیا میں جاہ ووقار کی مالک تھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو اللہ نے علم وحکمت اور بادشاہی عطا کی۔ تمام دنیوی نعمتوں سے مالا مال کیا مگر اس کے باوجود جب ان کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تو اللہ تعالیٰ نے ذلیل وخوار کر کے عذاب میں مبتلا کر دیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے۔

وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ اللہ تعالیٰ کی نعمت کے پہنچ جانے کے بعد جو اسے بدل ڈالے فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ تو اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔

ابنیاء نعمت الٰہی ہیں

انبیاء علیہم السلام کا وجود بھی خدا تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہوتا ہے۔ اور عام لوگوں کے لیے معیار اور نمونہ ہوتا ہے۔ جسے دیکھ کر لوگ اپنے ظاہر وباطن کو درست کر سکتے ہیں۔ انبیاء کا وجود انسانوں کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو اسی نعمت سے تعبیر کیا ہے۔ "اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا" کیا تم نے مشرکین عرب کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کے ساتھ کفر کیا۔ اس نعمت سے مراد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے۔ آپ پہ ایمان لانے اور آپ کا اسوہ اختیار کرنے سے اعراض کیا۔ لہٰذا خود بھی جہنم میں گئے اور قوم کو بھی جہنم رسید کیا۔

علم اور عمل انسان کے لیے لازمی چیزیں ہیں۔ ان کے بغیر کامیابی ممکن نہیں علم اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ وحی حاصل ہوتا ہے۔ اور عمل انبیاء سے ملتا

ہے۔ انبیاء معیار ہوتے ہیں انہیں دیکھ کر اعمال درست کیے جاتے ہیں۔ قرآن پاک نے فرمایا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اللہ کے رسول تمہارے لیے اسوہ حسنہ ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پہ اس اسوہ کی ضرورت ہے۔ خوشی کا موقع ہو یا غمی کا، صلح کی حالت ہو یا جنگ کی، نبی کی ذات ہر حالت میں نمونہ ہوتی ہے۔ اور یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی نعمت کو تبدیل کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ایسے شخص کو اپنا انجام دیکھ لینا چاہیئے۔

انعامات کی ناقدری

جس طرح پیغمبر علیہ السلام کی ذات بابرکات انعام خداوندی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں نے اس نعمت کی بھی قدر نہیں کی۔ آپ ہر خطبہ میں سنتے ہیں خَيْرُ الْكَلَامِ كَلَامُ اللَّهِ تمام کلاموں سے بہتر اللہ تعالیٰ کا کلام ہے وَخَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم اور بہترین طریقہ حضور علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ مگر آج کون ہے۔ جو ان دونوں انعامات سے مستفید ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے لیے راہِ ہدایت ہیں مگر جب کسی خوشی غمی، قومی وملکی، سیاسی ومعاشرتی معاملات میں راہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہے، تو ان سے راہنمائی حاصل کرنے کی بجائے رسم ورواج کا سہارا لیتے ہیں۔ یا دوسرے غیر اسلامی ازموں کی طرف دیکھتے ہیں۔ کیا یہ انعامات کی ناقدری نہیں۔

گذشتہ چوبیس سال میں ہمارے پاس صرف ایک آدمی آیا ہے جس نے طلاق کے مسئلہ میں صحیح راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہنے لگا کہ ہمارے بچے اور بیوی میں تنازعہ ہے۔ دو سال سے مصالحت کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ نوبت طلاق تک پہنچ چکی ہے۔ لہٰذا آپ ہمیں طلاق کا شرعی طریقہ بتائیں تاکہ ہم عنداللہ ماخوذ نہ ہوں۔ اس ایک کیس کے علاوہ ہمیشہ یوں ہوا ہے۔ کہ از خود تین طلاقیں دے دیں اس کے بعد جب ندامت

ہوئی تو ہمارے پاس آ گئے کہ جلدی میں طلاق دیدی ہے۔ اب کوئی ایسا طریقہ بتائیں جس سے مطلقہ دوبارہ حلال ہو جائے۔ اللہ کے بندو! بغیر سوچے سمجھے، بغیر مسئلہ دریافت کیے ایسا کام کیوں کرتے ہو، جس سے خود تمہیں تکلیف ہو، اور جو تمہارے والدین اور پورے خاندان کے لیے باعثِ اذیت ہو چاروں مذاہب میں تیسری طلاق کے بعد بیوی حرام ہو جاتی ہے۔ اگر زبردستی حلال کرنے کی کوشش کرو گے، تو حلال نہیں ہو گی۔ اولاد بھی مشکوک اور حرام ہو گی۔ پھر جا کر شیعوں اور اہل حدیثوں سے مسئلہ دریافت کرتے ہیں۔ کہ کسی طرح حلت کا فتویٰ مل جائے۔ یہ سب انعامات خداوندی کی ناقدری ہے۔ اس نعمت کو بروقت استعمال کرنا چاہیئے۔ اور شیطان کے نقش قدم پر نہیں چلنا چاہیئے۔ جس قوم کے پاس قرآن وحدیث جیسی نعمت موجود ہو اُسے کس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ کبھی امریکہ کی طرف دوڑتے ہیں کبھی برطانیہ اور فرانس کی طرف دیکھتے ہیں۔ کہ ہمیں سکیم دو۔ کوئی اڈوائزر بھیجو۔ جو ہماری رہنمائی کریں یہ کس قدر کفران نعمت کی بات ہے فکر اور عقیدہ فاسد ہے۔ جس کی وجہ سے راحت میسر نہیں آرہا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی نعمت کو تبدیل کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ خود سخت سزا دینے والا ہے۔ اس کی نعمتوں سے روگردانی کر کے، قرآن وسنّت کا دامن چھوڑ کر عزت کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں تو عذاب وسزا کے لیے تیار رہنا چاہیئے۔ اپنے ارد گرد نظر مار کر دیکھ لیں، کوئی قوم سلطنت کے چھن جانے کے عذاب میں مبتلا ہے کہیں بدعات اور رسوم باطلہ کا دور دورہ ہے۔ محتاجی ہے۔ دین محبوس ہو گیا ہے۔ نیکی سے محرومی ہے۔ بدی کا چرچا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کی سزا ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا جس بادیہ میں جس کنویں پر تین آدمی موجود ہوں اور وہ نماز باجماعت ادا نہ کریں۔ استحوذ علیھم الشیطان اُن پر شیطان قابو پا لیتا ہے۔ مقصد یہ کہ جب بھی کوئی قوم اسلام کے خلاف چلے گی، اُس پر شیطان قابو پائے گا۔ اور یہی عذاب ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کے انعامات کی قدر کرنا چاہیئے۔ بنی اسرائیل نے اِن

نعمتوں کی قدر نہ کی، معجزات کو ٹھکرا دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے اپنی سازشی، تخریبی اور گندی ذہنیت کی بنا پر بدترین قوم بن کر رہ گئے۔ اسی طرح جو بھی قوم اللہ تعالیٰ کے انعامات کی ناقدری کرے گی ذلیل و خوار ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے آخری نبی کو مبعوث فرمایا۔ آپ کے ساتھ ایک معیاری جماعت کو پیدا کیا، خلفائے راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ تھے۔ اُن کی پیروی کرنے والے دُنیا اور آخرت میں سرخرو ہوئے۔ دُنیا میں عروج حاصل ہوا فتوحات نصیب ہوئیں اور آخرت میں بھی بہترین اجر و ثواب کے مستحق ہوئے۔

حُبِّ دنیا

اس کے بعد دنیا کی حقیقت کو واضح فرمایا۔ کہ کفار کے نزدیک دنیا کی کیا حیثیت ہے۔ اور اہل ایمان کی حالت دُنیا میں کیا ہے۔ اور آخرت میں ان کے لیے کون سے انعامات تیار کیے گئے ہیں۔ فرمایا زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، اُن کے لیے دنیا کی زندگی مزین کی گئی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو سارے شر و فساد کی جڑ ہے۔ جب کوئی شخص دنیا کی محبت میں اس قدر غرق ہو جائے کہ صرف اسی کو اپنا مقصد حیات بنا لے تو پھر طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ دوسروں کی حق تلفی، قتل و غارت، عیش و عشرت یہ سب دنیا سے غیر معمولی محبت کا ثمرہ ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔ محبت سے مُراد ایسی محبت ہے۔ جس سے آخرت بھی فراموش ہو جائے۔ دین ختم ہو جائے عبادت رہ جائے خدا پرستی کے طور طریقے ناپید ہو جائیں، اور حالت یہ ہو جائے کہ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وہ دنیا کی تمام ظاہری چیزوں کو جانتے ہیں وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ غٰفِلُوْنَ مگر آخرت کے بارے میں بالکل غافل ہیں، کچھ نہیں جانتے بظاہر بڑے عقل و دانش کے مالک ہیں۔ مگر معاد کے متعلق ذرہ بھر بصیرت نہیں رکھتے۔ اسی کا نام گمراہی ہے انسان جس قدر دنیوی محبت میں گرفتار ہو گا نیکی سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اسی کے متعلق فرمایا کہ کافروں کے لیے دنیا کی زندگی کو مزین

کیا گیا ہے۔

فرمایا جو لوگ دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ اُن کی ایک قبیح حرکت یہ ہے۔ کہ وَیَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وہ اہل ایمان کو تمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔ ایمان والوں کی ظاہری کمزوری، اُن کا فقر و فاقہ دنیا داروں کے لیے ٹھٹھا بن جاتا ہے اُن پر آوازے کستے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ کافر لوگ غریب مسلمانوں کو دیکھ کر اشارے کرتے ہیں کہ دیکھو یہ جنت کے وارث جا رہے ہیں۔ پھٹے پُرانے کپڑے، نہ زمین نہ باغات، نہ رہنے کو مکان مگر دعویٰ جنت کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن کے دل میں محض دنیا کی محبت گھر کر چکی ہے۔ اُن کے لیے دنیا کے لوازمات اور آسائش ہی معیار ہے۔ اُن کے نزدیک ایسا شخص حقیر ہے جس کے پاس دنیا کا مال و دولت نہیں ہے اور اس ساری خرابی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔

اہل ایمان سے ٹھٹھا

فرمایا اہل دنیا کے برخلاف وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا جو لوگ اہل تقویٰ ہیں جو دنیا سے بے رغبت اور آخرت پر نظر رکھتے ہیں۔ فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وہ قیامت کے دن اہل دنیا سے بلند تر درجات پر فائز ہوں گے۔ تقویٰ۔ کفر شرک اور معصیت سے پرہیز گاری کا نام ہے یعنی اَلتَّقْوٰی عَنِ الشِّرْكِ وَالْكُفْرِ وَالنِّفَاقِ وَالْعِصْيَانِ غرضیکہ عقائد و اعمال کی ہر برائی سے بچ جانا ہی تقویٰ ہے شیخ عبدالقادر جیلانیؒ آیت پاک "اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ" کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ متقی وہ لوگ ہیں جو عدل و انصاف پر قائم ہیں۔ اور جو لوگ ظالم ہیں، عدل و انصاف سے عاری ہیں۔ وہ متقی نہیں ہو سکتے۔

اہل التقویٰ

الغرض! فرمایا کہ دنیا میں تو یہ لوگ اہل ایمان سے ٹھٹا کرتے ہیں مگر قیامت کے دن اہل ایمان ان سے بالا ہوں گے۔ حضرت علیؓ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ جو شخص کسی مومن سے اُس کی ناداری کی بنا پر ٹھٹا کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسے شخص کو تمام اولین اور آخرین کے سامنے ذلیل و رسوا کرے گا۔ جو کوئی

شخص کسی مومن پہ ایسا عیب لگاتا ہے۔ جو اس میں نہیں پایا جاتا، تو قیامت کے روز عیب لگانے والے کو آگ کے ٹیلے پر کھڑا کیا جائیگا اور کہا جائے گا کہ سب کے سامنے خود اپنی تکذیب کرو۔ میں نے اس پہ جھوٹ کہا تھا۔ درحقیقت اس مرد مومن میں یہ عیب نہیں پایا جاتا تھا۔ آج تو یہ لوگ طرح طرح کے مذاق کرتے ہیں، عیب جوئی کرتے ہیں اور بہتان لگاتے ہیں۔ مگر انہیں قیامت کے دن پتہ چلے گا۔ جب دنیوی زندگی میں کمزور ناتواں مومن ان پہ حاوی ہوں گے اور بلند مراتب پہ فائز ہوں گے۔ یہ مقام انہیں تقوی کی وجہ سے حاصل ہوگا۔

قرآن پاک میں متقین کا ذکر بار بار ہے۔ جیسے "هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ" سورۃ بقرہ کی ابتداء میں ہے۔ کہ یہ قرآن پاک، یہ ہدایت متقیوں کے لیے ہے۔ دوسری جگہ فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ یعنی جن لوگوں کا ایمان اعمال، اور اخلاق اچھا ہے۔ جن میں تہذیب نفس پایا جاتا ہے، وہی لوگ سچے ہیں اور ایسے ہی لوگ متقی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ دنیا میں اگر ظاہری اسباب کے لحاظ سے کوئی شخص نادار اور کمزور ہے تو اس کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ مدار کار دولت مندی اور ناداری نہیں، بلکہ ایمان، تقوی اور نیکی ہے۔ کیونکہ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ" اللہ کے نزدیک قدر و منزلت کا معیار تقوی ہے۔ ایک مزدور بڑی محنت و مشقت سے اپنی روزی کماتا ہے۔ اس کا عقیدہ بھی درست ہے۔ فرائض کو ادا کرتا ہے، تو ایک بڑے سے بڑا دولت مند اس کے خاک پا کے برابر بھی نہیں۔ چہ جائیکہ ایک مالدار ایک مزدور کو حقیر سمجھے۔ یہ تو باعث لعنت ہے ایسا شخص عذاب کا مستحق ہے۔

فرمایا وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ اللہ تعالی جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔ مقصد یہ ہے۔ کہ رزق کی فراوانی اللہ تعالی کے مقرب ہونے کی دلیل نہیں۔ اور نہ ہی یہ اللہ کی رضا کا معیار ہے۔ رزق کی فراوانی

رزق کا بست و کشاد مالک الملک کی مصلحت پر موقوف ہے۔ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ

لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ۔ اللہ تعالیٰ جس کا چاہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور جس کا چاہے تنگ کر دیتا ہے۔ اس کی مصلحت کو انسان نہیں جان سکتا۔ یہ اُس کا اپنا پروگرام ہے۔ چاہے تو کافر دنیا میں دندناتے پھریں اور مومن کمتر ز محض ہو کر رہ جائے۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے۔ کہ ہر نافرمان دنیا میں خوشحال ہوا اور ہر مومن تنگ دست ہو۔ بلکہ "كُلًّا نُّمِدُّ ۔ هٰٓؤُلَآءِ" وہ سب کو دیتا ہے۔ مومن کو بھی، کافر کو بھی مگر حقیقی کمال یہ ہے کہ۔ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کو بلندی کیسے نصیب ہوئی ہے۔ یہ چیز صرف اور صرف تقویٰ کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔

مال کے تین مصرف

حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ اے ابن آدم تیری زبان میرا مال میرا مال کہتے نہیں تھکتی۔ تو ہمیشہ مَالِی مَالِی کہتا رہتا ہے۔ کبھی میری دکان کبھی میری زمین، میرا کاروبار، میرا باغ تیرے ورد زبان رہتا ہے۔ حالانکہ هَلْ مَالُكَ اِلَّا مَآ اَكَلْتَ تیرا مال وہ ہے جو تو نے کھا لیا۔ اَوْ لَبِسْتَ یا تو نے پہن لیا اور بوسیدہ کر لیا۔ اَوْ قَدَّمْتَ یا آگے بھیج دیا۔ اس کے علاوہ تیرا اور کوئی مال نہیں ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے۔ اَلدُّنْيَا دَارُ مَنْ لَّا دَارَ لَهٗ۔ یعنی دنیا تو اُس شخص کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو۔ اُس کا مال ہے، جس کا مال نہ ہو، اور صرف دنیا کی خاطر وہی انسان جمع کرتا ہے۔ جس کی عقل نہ ہو۔ کیونکہ صاحب عقل آخرت کی بھی فکر کرے گا۔ ایمان دار کو یہ فکر دامن گیر ہوگی۔ کہ آخرت کا سامان ہو جائے۔ وہاں پہنچ کر کہیں خالی ہاتھ نہ رہ جائیں۔ کیونکہ بعد میں وہاں کون لے کر آئیگا۔ لہٰذا آخرت کے لیے توشہ پہلے ہی بھیج دے۔

کس نیارد ز پس تو پیش فرست

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ وہ جسے چاہتا ہے۔ بغیر حساب کے روزی عطا کر دیتا ہے، اور کمالِ مدار ایمان اور تقویٰ ہے۔ سلف صالحین کو اسی چیز سے عروج حاصل ہوا۔ کافر لوگ حُبِ دُنیا کی وجہ سے اہل ایمان سے ٹھٹا کرتے ہیں حالانکہ یہی چیز خرابی کی اصل جڑ ہے۔ دنیا کو استعمال کرنے کی ممانعت نہیں ہے

مگر اس کو معبود بنا کر اس کی پرستش شروع کر دینا۔ اور اس کی وجہ سے فرائض اور امورِ آخرت سے غافل ہو جانا باعثِ وبال ہے۔

سَيَقُولُ ۲ — اَلْبَقَرَة ۲

درس ہشتاد و ہفت (۸۷) — آیت ۲۱۳

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً قف فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ
وَمُنْذِرِيْنَ ص وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ
بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ
اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا
بَيْنَهُمْ ج فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ
مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ (۲۱۳)

ترجمہ :- سب لوگ ایک ہی امت (دین ملت) پر تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے۔ خوشخبری سنانے والے اور ڈرانے والے، اور اُن نبیوں کے ساتھ سچی کتاب اتاری تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اُس بات میں فیصلہ کریں، جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اور نہیں اختلاف کیا اس میں مگر اُن لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی بعد اس کے کہ اُن کے پاس واضح باتیں آچکی تھیں (یہ اختلاف کیا انہوں نے) آپس میں سرکشی کرتے ہوئے۔ پس اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کو ہدایت دی اپنے حکم سے جو ایمان لائے اُس بات میں جس میں وہ اختلاف کرتے تھے حق سے، اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھے راستے کی ہدایت دیتا ہے (۲۱۳)

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تھی، کہ جو شخص نعمت الٰہی کے حصول کے بعد اسکی تکذیب کرتا ہے، وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ جل جلالہ نے بنی اسرائیل کا بطور مثال ذکر فرمایا۔ کہ ہم نے انہیں بہت سی نعمتوں سے نوازا مگر اس قوم نے

ناشکرگزاری کی اور طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہوئی۔ گویا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنی۔ گذشتہ درس میں یہ بھی بیان ہو چکا ہے۔ کہ فتنہ و فساد کی اصل جڑ حبِ دنیا ہے۔ دنیا کی محبت میں گرفتار کفار اہل ایمان سے ٹھٹا کرتے ہیں اور ان کو حقیر جانتے ہیں۔ حالانکہ کامیابی کا اصل دارومدار مال و دولت پر نہیں بلکہ تقویٰ و پرہیزگاری پر ہے۔ اہل تقویٰ قیامت کے دن اہل دنیا پر برتری حاصل کر لیں گے۔

امتِ واحدہ

آیت زیرِ درس میں اللہ تعالیٰ نے دین و ملت کی وحدت کا تذکرہ فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے کَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً سب لوگ ایک ہی ملت پر تھے۔ ملت اُس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد کے افکار و خیالات ایک جیسے ہوں۔ ملت حق بھی ہوتی ہے اور ملت باطل بھی۔ مگر اس آیت میں جس ملت کا ذکر ہو رہا ہے اُس سے مراد ملتِ حق ہے۔

تمام لوگ ایک ہی ملت پر کب تھے۔ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس کا تعلق عالم ارواح سے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح کو حاضر کر کے اُن سے سوال کیا تھا۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا۔ "قَالُوْا بَلٰی" اے مولا کریم! کیوں نہیں، تو ہی ہمارا رب ہے۔ اُس وقت تمام لوگ امت واحدہ تھے یعنی ایک ہی ملت پر قائم تھے۔ اس قسم کے اشارات سورۃ اعراف اور بعض دوسری سورتوں میں بھی ملتے ہیں مقصد یہ کہ اُس وقت تمام روحوں نے ملت واحدہ پہ ہونے کا اقرار کیا تھا تو اس دنیا میں اس سے انکار کی کیا وجہ ہے۔ یہ تو بڑی ناانصافی کی بات ہے۔

اس ضمن میں مشہور تر تشریح جو اکثر مفسرین کرام نے بیان فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ملت واحدہ کا زمانہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک کا ہے اس عرصہ میں تمام لوگ ایک ہی امت تھے اور وہ ملت واحدہ پر قائم تھے۔ اُن کا دین بعینہ وہی تھا جو حضرت آدم علیہ السلام کا تھا۔ ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ اس کے بعد اختلافات پیدا ہونے لگے اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک ان کا دائرہ

بہت وسیع ہوگیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آپ کے زمانے میں لوگوں کی وسیع پیمانے پر تطہیر ہوئی ان کی اکثریت ہلاک ہوئی اور صرف گنتی کے وہ افراد بچ گئے جو دین حق پہ قائم تھے۔ کہ کشتی میں سوار ہو کر بچ جانے والوں میں حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی اور بیٹا تک شامل نہیں تھے، کیونکہ وہ دین حق سے روگردانی کر چکے تھے۔ کشتی کے ذریعے ہلاکت سے محفوظ رہنے والے لوگ کافی عرصہ تک دین توحید اور ایمان خالص پہ کاربند رہے۔ حتیٰ کہ ایک زمانہ ایسا آیا، جب اختلاف نے پھر زور پکڑ لیا اور امت میں غلط ملط عقیدے پیدا ہو گئے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ امت واحدہ کا زمانہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کا زمانہ ہے۔ آپ کے بعد ڈیڑھ ہزار سال تک لوگ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے سچے دین پر قائم رہے۔ تاآنکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے تقریباً ساڑھے چار سو سال پہلے عمرو بن لحی جسے عمرو ابن قمیہ بھی کہتے ہیں۔ اُس نے عربوں میں بت پرستی کو رواج دیا۔ اس کے بعد چند صدیوں میں بت پرستی کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ اللہ کا پاک گھر بیت اللہ شریف بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا جب نبی کریم نے مکہ کو فتح کیا۔ تو اس پاک گھر کو بتوں سے پاک کیا۔ اور پھر حضور علیہ السلام کی حیات مبارکہ ہی میں عرب کا ہر حصہ کفر و شرک کی نجاست سے پاک ہوگیا۔ یہ سب تفسیریں ملتی ہیں۔ مگر زیادہ مشہور تفسیر وہ ہے۔ جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے۔

بعثتِ انبیاء

امتِ واحدہ کے تذکرے کے بعد فرمایا فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ ۔ پس اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ اب آیت کے ان دونوں حصوں کا ترجمہ یوں ہوگا کہ تمام لوگ ایک ہی ملت پر تھے، پھر اللہ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ یہاں پہ اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ملت کا دین حق پہ کاربند ہونا بعثت کی علت نہیں بنتا۔ اس سلسلہ میں مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ آیت کے ان دو جملوں کے درمیان لفظ "فَاخْتَلَفُوْا" محذوف ہے اس لفظ کو درمیان میں لانے سے اشکال دُور ہو جائے گا کیونکہ اب پورا جملہ اس طرح ہوگا۔ کہ سب لوگ ایک ہی دین حق پہ تھے۔ پھر اُن میں اختلاف پیدا ہوا، تو اللہ تعالیٰ

نے انبیاء کو وقتاً فوقتاً مبعوث فرمایا۔ جب لوگ اختلاف کی بنا پر دین سے ہٹ جاتے تھے تو اصل دین کی نشاندہی کے لیے انبیاء کو بھیجا گیا۔ وہ لوگوں کو بتاتے تھے۔ کہ تم اصل دین سے ہٹ چکے ہو۔ صحیح راستہ یہ ہے، اس کی طرف آؤ۔ اس بات کی مزید وضاحت سورۃ انبیاء میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے فرمایا اِنَّ ھٰذِہٖٓ اُمَّتُکُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّکُمْ "اے گروہ انبیاء تم سب کی ایک ہی جماعت ہو جو سچا دین بتلانے والی ہے۔ اور میں تم سب کا رب ہوں۔ شب معراج میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء سے دریافت فرمایا کہ آپ کی بعثت کا مقصد کیا ہے۔ تو سب نے یہی جواب دیا۔ بُعِثْنَا بِالتَّوْحِیْدِ ہمیں توحید کی اشاعت کے لیے بھیجا گیا ہے تاکہ لوگوں کی صراط مستقیم کی طرف راہنمائی کر سکیں۔

فرمایا ان تمام انبیاء کی ایک صفت یہ ہے مُبَشِّرِیْنَ کہ یہ مبشرین ہیں۔ ایمان اور نیکی کا راستہ اختیار کرنے والوں کو جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔ انہیں بتاتے ہیں۔ کہ اللہ تعالےٰ کے ہاں تم اعلیٰ مقام پر فائز کیے جاؤ گے۔ خدا تعالےٰ تم پر راضی ہو گا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آرام و سکون حاصل ہو جائے گا۔ برخلاف اس کے جو لوگ کفر، شرک اور معصیت کا راستہ پکڑیں گے۔ ان کے لیے یہی پیغمبر مُنْذِرِیْنَ ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے دوزخ کے عذاب سے ڈراتے ہیں سورۃ مدثر میں اللہ تعالیٰ نے یہی حکم حضور خاتم النّبیین کو دیا قُمْ فَاَنْذِرْ آپ کھڑے ہو جائیں اور ان کفار و مشرکین کو ان کے برے انجام سے ڈرائیں۔ ان کو اچھی طرح خبردار کر دیں تاکہ کل کو یہ عذر پیش نہ کر سکیں۔ کہ ہمارے پاس کوئی بشیر یا نذیر نہیں آیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیج کر یہ حجت پوری کر دی ہے۔ لِئَلَّا یَکُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰہِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ "انبیاء کے آنے کے بعد یہ عذر باقی نہیں رہا۔ کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ نبی کا فرض منصبی ہی یہ ہے۔ کہ وہ اللہ تعالےٰ کے احکام امت تک پہنچا دے۔ علم عقائد والوں نے نبی کی تعریف یوں کی ہے۔ ھو انسان بعثہ اللہ لتبلیغ ما اوحاہ اللہ الیہ۔ یعنی نبی ایک انسان

ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ شرعی احکام کی تبلیغ کے لیے مبعوث فرماتا ہے۔ مطلب یہ کہ چونکہ تبلیغ انسانوں کو کرنا مقصود ہوتی ہے۔ لہٰذا نبی بھی انسانوں میں سے بھیجا جاتا ہے کوئی فرشتہ یا کسی دوسری نوع سے نہیں ہوتا۔ تاہم نبی کا یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نزول وحی کے لیے اُسے منتخب فرماتا ہے۔ نبی معصوم عن الخطا یعنی خطاؤں سے پاک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کرتا ہے۔

کتب سماویہ

فرمایا انبیاء کی بعثت کے علاوہ وَاَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ انکے ساتھ سچی کتاب بھی نازل فرمائی۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور پیغمبر بھیجے اور ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں۔ ان میں چار بڑی کتابیں ہیں۔ زبور، تورات، انجیل، اور قرآن پاک اور ایک سو چھوٹے چھوٹے صحیفے ہیں جو مختلف انبیاء پر نازل ہوئے۔ تاہم تمام کُتُب سماویہ کا موضوع ایک ہی تھا یعنی سچے دین کی تبلیغ اور لوگوں کو ان کی غلطیوں پر آگاہ کرنا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتاری اور پھر آپ کے پیچھے آنے والے کئی ہزار پیغمبر اس کی اتباع و تبلیغ کرتے رہے۔ انبیاء کے ساتھ کتابوں کے نزول کی وجہ یہ ہے۔ کہ نبی تو انسان ہوتا ہے، جسے دوام حاصل نہیں۔ لہٰذا جب نبی اپنا کام ختم کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اس کی لائی ہوئی کتاب آنے والی نسلوں کی راہنمائی کرتی رہتی ہے۔ نبی کا لایا ہوا علم اور اس کی شریعت کتاب کی صورت میں موجود رہتا ہے۔

فرمایا انبیاء کے ساتھ کتابیں نازل کرنے کا مقصد یہ ہے لِيَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ فِيۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اُس بات کا فیصلہ کریں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ دیگر کُتُب سماویہ کی طرح قرآن پاک کے نزول کا مقصد بھی یہی بیان کیا گیا ہے لِتَحۡكُمَ بَيۡنَ النَّاسِ بِمَاۤ اَرٰٮكَ اللّٰهُ جو چیز اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھائی ہے، اس کے مطابق فیصلہ کریں۔ گویا نبی کتاب کے ذریعے اللہ کی وحی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔

وجہ اختلاف

آگے اس امر کی وضاحت کی جا رہی ہے۔ کہ اہل کتاب میں اختلاف کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ یہ احکام الٰہی سے بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے تھا۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔ اور اسمیں صرف انہی لوگوں نے اختلاف کیا جنہیں کتاب دی گئی اور ان کے پاس واضح نشانات آ چکے تھے اور پھر وہ آپس میں سرکشی کرتے ہوئے۔ آمادہ بر اختلاف ہوئے اور اس کی وجہ ان کی خود غرضی، ضد اور حسد تھا۔ جیسا کہ یہود کے متعلق پہلے بھی آ چکا ہے۔ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ یہ لوگ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اولاد کی طرح پہچانتے تھے۔ مگر آپ سے اختلاف کی وجہ حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ محض حسد تھا کہ نبوت بنو اسماعیل میں کیوں منتقل ہو گئی ہے۔ یہ لوگ اپنی برتری کو قائم و دائم دیکھنا چاہتے تھے اور کسی صورت اقتدار کو ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتے تھے مگر یہ تو مشیت ایزدی تھی۔ کہ ختم نبوت کا تاج حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر رکھا گیا۔

حدیث شریف میں موجود ہے۔ کہ قیصر روم نے زبان سے اقرار کیا تھا۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں جن کا ذکر سابقہ کتابوں میں موجود ہے مگر وہ ایمان کی دولت سے محض اس لیے محروم رہا۔ کہ اسکی زد اس کے جاہ و مال اور حکومت و اقتدار پر پڑتی تھی۔ ایمان لا کر وہ اپنی بادشاہت اور مطلق العنانی کو قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔ لہٰذا وہ کفر پر اڑا رہا۔ مقصد یہ کہ حق سے اختلاف کی وجہ اکثر و بیشتر حسد، بغض، عناد، خود غرضی وغیرہ ہی ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات غلط فہمی کی بنا پر بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ اصل وجہ اختلاف وہی ہے جس کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اس ضمن میں یہود و نصاریٰ کی واضح مثالیں موجود ہیں۔

حق و باطل میں تمیز

کفر و شرک، بغض و حسد، اور حب مال و جاہ کے اندھیروں میں کہیں کہیں شمع ہدایت بھی نظر آتی ہے۔ اور یہ مالک الملک کا خاص کرم ہوتا ہے فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ پس اللہ تعالیٰ نے

اہل ایمان کو اپنے حکم سے حق سے مختلف فیہ امور میں ہدایت بخشی۔ اختلافی معاملات میں ہدایت کی تلاش حضور نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ طرہ امتیاز رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نوافل کے دوران سجدے کی حالت میں دعا فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ○ اِهْدِنِيْ لِمَا اخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

اے خالق ارض وسما، اے عالم ظاہر و باطن! تو ہی مختلف فیہ امور میں اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔ حق سے اختلافی معاملات میں اپنے حکم سے میری راہنمائی فرما۔ تو جسے چاہتا ہے، راہ راست کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔ ایک دعا میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا اے اللہ! ہمیں حق بات سچ کر کے دکھا اور اس کا اتباع بھی نصیب فرما۔ وَالْبَاطِلَ بَاطِلًا اور باطل کو باطل کی صورت میں ہی دکھا۔ وَارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ اور ہمیں اس سے اجتناب کرنے کی توفیق بھی عطا کر۔ وَلَا تَجْعَلْهُ مُلْتَبِسًا اور اسے غلط ملط نہ بنا کہ کہیں ہمارے لیے حق و باطل کی تمیز ہی نہ اٹھ جائے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے یہاں پر بڑا عمدہ نوٹ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ایک مدت تک ایک ہی سچا دین یعنی دین توحید قائم رہا۔ اس کے بعد لوگوں نے اس میں اختلاف پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا، جو اہل ایمان کو اطاعت اور ثواب کی بشارت دیتے تھے۔ اور اہل کفر و باطل کو عذاب سے ڈراتے تھے۔ ان انبیاء کے ساتھ سچی کتاب بھی نازل فرمائی تا کہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والا نزاع دور ہو سکے۔ اہل کتاب یہود و نصاریٰ نے محض ضد اور حسد کی بنا پر اختلاف کیا۔ حالانکہ وہ حق کو اچھی طرح سمجھتے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اہل حق کی راہنمائی فرمائی اور انہیں گمراہی اور اختلاف سے بچا لیا جیسا کہ آپ کی امت کو عقیدہ و عمل میں امر حق کی تعلیم فرمائی اور اہل کتاب جیسی افراط و

تفریط سے محفوظ رکھا۔

آپ فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت مبارکہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ پہلی بات یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جو متعدد نبی اور کتابیں بھیجیں تو ان کا مقصد لوگوں کو ہر نبی کے علیحدہ علیحدہ فرقہ میں تبدیل کرنا نہیں تھا۔ بلکہ ایک ہی راستہ کی طرف راہنمائی کرنا مقصود رہا ہے جب لوگ اصل دین کو چھوڑ کر گمراہی کی طرف راغب ہوتے۔ تو اللہ تعالیٰ ایک اور نبی اور کتاب بھیج کر اصل راستہ کی پہچان کرا دیتا تاکہ لوگ اسی صراط مستقیم کی طرف لوٹ آئیں۔ اس کی مثال آپ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسانی جسم کے لیے صحت فقط ایک چیز ہے مگر بیماریاں لاتعداد ہیں۔ جب کسی انسان کے جسم میں کوئی ایک بیماری پیدا ہوتی ہے۔ تو معالج اس بیماری کے مطابق دوائی اور پرہیز تجویز کرتا ہے۔ پھر دوسرا مرض پیدا ہوتا ہے تو اس کے مطابق دوسرا علاج اور پرہیز تجویز کیا جاتا ہے۔ یہی حال امتوں کا ہے۔ جب کسی قوم میں کوئی روحانی بیماری پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اور کتاب بھیج کر اس بیماری کا علاج کیا۔ پھر دوسری بیماری پیدا ہوئی تو اس کے حسب حال نبی اور کتاب آئی۔ اور پھر آخر میں نبی آخر الزماں اور آخری کتاب قرآن پاک بھیج کر تمام روحانی بیماریوں کا شافی علاج کر دیا۔ تاکہ لوگ قیامت تک پیدا ہونے والی بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں۔

صبر و استقامت

حضرت مولانا شیخ الہندؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی۔ کہ اہل حق کو صبر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ یہ سنت اللہ ابتدائے سے جاری ہے۔ کہ ہر نبی اور ہر کتاب آسمانی کی مخالفت بڑے لوگ کرتے ہیں۔ کیونکہ حق کو تسلیم کر لینے کی زد اُن ہی کے اقتدار پر پڑتی ہے نبی اور کتاب اللہ کی مخالفت ہمیشہ انہی لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔ لہٰذا اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے۔ کہ ان لوگوں کے ٹھٹا کرنے، بدسلوکی اور ایذا رسانی سے گھبرائیں نہیں۔ بلکہ صبر و استقامت سے ہر تکلیف کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

ہدایت ربانی

فرمایا انبیاء علیہم السلام اور کتابوں کو بھیجنے کے باوجود ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ

میں ہے۔ وَاللّٰہُ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ وہ جسے چاہتا ہے راہ راست کی طرف راہنمائی فرما دیتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت اُسی کو نصیب کرتا ہے جس کے اندر حصول ہدایت کی طلب اور صلاحیت ہوتی ہے۔ اور جو کوئی ظلم و جفا پر اڑا رہتا ہے اسی کے متعلق دوسرے مقام پر فرمایا وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ایسے لوگوں کی قسمت میں ہدایت نہیں ہوتی۔ بہر حال لِمَنْ یَّشَآءُ سے واضح ہے کہ ہدایت ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت اہل حق کو ہی حاصل ہوتی ہے۔

درس ہشتاد و ہشت (۸۸) — آیت ۲۱۴ تا ۲۱۵

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ
الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ
وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى
نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْــَٔلُوْنَكَ مَاذَا
يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ
وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا
مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

ترجمہ :۔ کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تمہارے پاس پہلے لوگوں کے سے حالات نہیں آئے۔ اُن کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ متزلزل کیے گئے، یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور اس پر ایمان لانے والے کہنے لگے، اللہ کی مدد کب آئے گی۔ فرمایا آگاہ ہو بیشک اللہ کی مدد قریب ہے ﴿۲۱۴﴾ آپ سے لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجئے۔ کہ تم جو کچھ بھی مال سے خرچ کرو پس والدین کے لیے، قرابت داروں کے لیے، یتیموں اور مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے ___ اور تم جو کچھ بھی بھلائی ___ کرو گے بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے۔ ﴿۲۱۵﴾

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ابتداء میں سب لوگ ایک ہی مذہب و ملت پر تھے۔ پھر جب انہوں نے دین حق سے اختلاف کیا، تو اللہ تعالیٰ نے سچا دین واضح کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ اور یہ اختلاف

کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں تھا۔ بلکہ واضح دلائل آنے کے بعد محض حسد، خود غرضی اور مفاد پرستی کی وجہ سے تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی راہِ حق کی طرف راہنمائی فرمادی اور اُن پر حق واضح کر دیا۔ کیونکہ صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے جسے چاہتے ہیں کرتے ہیں

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا۔ کہ کافر لوگ دنیا کی محبت اور غرور کی وجہ سے کمزور وناتواں مسلمانوں کو استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں۔ جن کی وجہ سے انہیں تکلیف پہنچتی ہے۔ ان دونوں آیات کا آیت زیرِ درس کے ساتھ ربط ہے۔ ان کو ذہن میں رکھنے سے اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

مشکلات کا سامنا

اہل ایمان کو پیش آنے والی مشکلات کی طرف اشارہ کر کے ارشاد ہو رہا ہے اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ کیا تم گمان کرتے ہو کہ بغیر کوئی مشقت اٹھائے اور بغیر کسی تکلیف کے تم جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ مسلمانوں کو یاد ہونا چاہیئے کہ اُن کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے واسطہ ہے۔ منافقین ہر حالت میں اُن کے نقصان کے درپے ہیں۔ اُن پر آوازے کسے جاتے ہیں، جسمانی تکالیف دی جاتی ہیں مسلمان فقر وافلاس کے شکار ہیں۔ امراض اور دیگر پریشانیوں میں مبتلا ہیں فرمایا جو کوئی ان تمام مشکلات کو عبور کر کے اپنے ایمان کو سلامت لے نکلنے میں کامیاب ہوگا۔ وہی جنت میں داخلے کا حق دار ہوگا۔ محض کلمہ پڑھ لینے سے کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا، بلکہ اُس پر طرح طرح کی آزمائشیں آئیں گی، جن پر اُسے پورا اترنا ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے۔ "نَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً" ہم خیر اور شر کے ذریعے تمہیں آزمائیں گے ایک اور مقام پر فرمایا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ہم تمہیں ہر طرح سے آزمائیں گے یعنی خوف، بھوک، جان و مال اور پھلوں میں کمی کر کے آزمائش کریں گے۔ کہ ہمارا بندہ کس حد تک مشکلات کو برداشت کر سکتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے حُفَّتِ الْجَنَّةُ

بالمکارہ یعنی جنت کی باڑ مشکلات ہیں۔ ان کو عبور کر کے ہی کوئی شخص جنت میں پہنچ سکتا ہے حُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ جہنم کی باڑ خواہشات ہیں۔ خواہشات کی تکمیل کے لیے لوگ دوڑ دوڑ کر ان کی طرف جاتے ہیں۔ اور انہیں عبور کر کے جہنم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے لوگو! کیا تم سمجھتے ہو کہ بغیر کسی مشقت کے آسانی کے ساتھ جنت میں مقام حاصل کر لو گے۔ ایسا نہیں ہے۔

سابقین کی مثالیں

اس حقیقت کی مزید وضاحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔ وَلَمَّا يَأْتِكُم مَّثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلِكُم کیا تم تک پہلے لوگوں کے حالات نہیں پہنچے۔ اگر نہیں پہنچے تو ذرا ان کے حالات معلوم کر لو۔ تاکہ تمہیں پتہ چل جائے کہ مَّسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا ان پر کیسی کیسی سختیاں اور تکلیفیں آئیں اور وہ ہلا دیے گئے۔ ان کو ایسے مصائب کا سامنا کرنا پڑا کہ تم گمان بھی نہیں کر سکتے۔ ان تمام تر دشواریوں کو برداشت کرنے کے بعد وہ جنت کے حقدار ہوئے مثلاً حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کی تکالیف کو دیکھو۔ بخاری شریف اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہے۔ کہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے ان مشکلات کو کس طرح برداشت کیا۔ اور پھر کفار مکہ کی ان سزاؤں سے تنگ آ کر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ حضور! اَلَا تَدْعُو لَنَا کیا آپ ہمارے لیے دعا نہیں فرماتے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان مصائب سے نجات دلائے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا افسوس کا مقام ہے۔ کہ تم بے صبری کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ حالانکہ تم سے پہلے ایسے اہل ایمان بھی گزرے ہیں، جن کے سروں پر آرہ رکھ کر چیر دیا گیا۔ مگر وہ اپنے دین پر قائم رہے۔ پھر ایسے لوگ بھی تھے جنہیں لوہے کے کنگھوں سے نوچ دیا گیا مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ میں تم کو بتلا دینا چاہتا ہوں۔ وَاللّٰهِ لَيُتِمَّنَّ هٰذَا الْاَمْرَ اللہ کی قسم یہ معاملہ پورا ہو کر رہے گا۔ تب اسلام کو غلبہ حاصل ہو گا۔ اور پھر امن و امان کا وہ دور دورہ ہو گا۔ کہ ایک عورت صنعاء سے تنہا حضرموت تک سفر کرے گی۔ مگر اسے سوائے خدا تعالیٰ کے کسی چیز کا خوف نہیں ہو گا۔ انسان تو کجا![1]

---

[1] تفسیر... (فیاض)

کسی بھیڑیے کو بھی یہ جرأت نہ ہوگی کہ کسی بھیڑ کو کھا جاتے۔

بَاْسَآءُ سے مراد سختی ہے۔ اور یہ اندرونی اور بیرونی ہر دو طریقے سے ہو سکتی ہے۔ جیسے تجارت میں نقصان ہو گیا۔ فقر و فاقہ کی نوبت آگئی۔ اس کی تفصیل آگے آئیگی اور ضَرَّآءُ جسمانی تکلیف کو کہتے ہیں جیسے بیماری آگئی۔ کوئی حادثہ پیش آگیا زُلْزِلُوْا کا معنی ہلا دیے گئے ہے۔ یعنی پریشانی کے عالم میں ان پر لرزہ طاری ہو گیا۔ گھبراہٹ پیدا ہو گئی یا ان کی عزتِ نفس کو متزلزل کر دیا گیا، یہ سب آزمائش کی مختلف قسمیں ہیں۔ جن سے پہلے لوگوں کو گزرنا پڑا۔ یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور اہل ایمان پکار اٹھے۔ حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ کہ اللہ کی مدد کب آئیگی۔

نصرتِ الٰہی

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ بشریت کے تقاضے اللہ کے کامل بندوں پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ ان پر بھی دشواریاں آتی ہیں، ان پر بھی اضطراری حالت آتی ہے۔ مگر یہ چیز ان کے مرتبہ کمال کے منافی نہیں ہے۔ بعض اوقات انبیاء بھی پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے مدد کب آئیگی۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوتا ہے اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ اے میرے بندو فکر نہ کرو، اللہ کی مدد بالکل قریب ہے اور وہ پہنچنے ہی والی ہے۔ تاہم اہل ایمان کی شان یہ ہے کہ وہ ہر آزمائش میں ثابت قدم رہے۔ اللہ تعالےٰ نے سورۃ صف میں اہل ایمان کو خطاب فرمایا کہ اللہ کے عذاب سے خلاصی حاصل کرنا چاہتے ہو تو "تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ" اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ" اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال و جان کے ساتھ جہاد کرو، تو اللہ تعالےٰ تمہیں بہترین نعمتوں والی جنت میں داخل کر دے گا۔ "وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا" اس کے علاوہ تمہاری پسندیدہ ایک اور نعمت عطا کرے گا، وہ کیا؟ "نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ" وہ اللہ کی مدد اور قریبی فتح ہو گی، جس سے تم نوازے جاؤ گے۔ غرضیکہ اللہ کی یہی وہ مدد ہے جس کے لیے اللہ کے رسول بھی ہاتھ پھیلا دیتے ہیں اور اللہ کا ارشاد ہوتا

کہ اس کی مدد قریب ہے۔

اشاعتِ دین

جہاد کی مختلف اقسام میں سے معروف قسم جہاد بالسنان یعنی تلوار و تیر کے ساتھ جہاد ہے۔ آج کے زمانہ میں ترقی یافتہ آلاتِ حرب بندوق، پستول، بم، میزائل، ٹینک توپ وغیرہ اسی قبیل سے ہیں۔ جن کے ذریعے دشمن سے جنگ کی جاتی ہے۔ تاہم جہاد کی ایک نہایت اعلیٰ قسم اشاعتِ دین ہے۔ جسے "جَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہ ان کے ساتھ بڑا جہاد کیجیں۔ اور وہ جہاد نیکی کو پھیلانا اور برائی کو روکنا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اشاعت دین جیسے اہم فریضہ جہاد پہ مامور کیا ہے۔ جس کے لیے میں شب و روز مصروف کار ہوں۔

اشاعتِ علم دین کی کئی ایک صورتیں ہیں۔ ان میں ایک معروف صورت تالیف و تصنیف ہے۔ ائمہ دین نے اس سلسلہ میں بڑی کوشش اور محنت کی ہے۔ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح کی تدوین پہ سولہ سال صرف کر کے جہاد فی اشاعتِ علم کا حق ادا کر دیا۔ امام مسلمؒ نے پندرہ سال کے عرصہ میں ذخیرہ حدیث میں سے صحیح مسلم کو جمع کیا۔ مفسرین کرام نے قرآن پاک کی تفاسیر لکھ کر جہاد میں حصہ لیا۔ امام ابوحنیفہؒ اور دیگر ائمہ نے اپنے اپنے شعبہ میں دین کی خدمت انجام دی۔ الغرض تبلیغ دین کے کسی بھی شعبہ کو حقیر نہیں جاننا چاہیئے۔ اشاعتِ دین کے ہر کارکن کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔

اہل ایمان کے لیے تبلیغِ دین نہایت اہم فریضہ ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ "كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ" تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو تبلیغ دین کا کام کرے، لوگوں کو نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے۔ "بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ" اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ حکم آپ آگے پہنچا دیں۔ "فَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ" اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تو سمجھا جائے گا

کہ آپ نے حقِ رسالت ادا نہیں کیا۔

ساتویں صدی ہجری تک کا زمانہ مسلمانوں کا سنہری زمانہ شمار ہوتا ہے۔ تبلیغ دین، فتوحات، سیاسیات، معاشیات سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔ علمی کام جس قدر انجام پایا ہے۔ اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس عرصہ میں بڑے بڑے محدثین، مفسرین حفاظ اور فقہا پیدا ہوئے۔ جنہوں نے اشاعتِ دین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کے بعد مسلمانوں پہ انحطاط کا دور شروع ہو گیا۔ اور اب تک جاری ہے۔ اس عرصہ میں خال خال ہی لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ جنہوں نے کماحقہ اشاعتِ دین کا کام کیا۔ لہٰذا اس زمانے میں اس طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

جانی اور مالی جہاد

جہاد میں مال اور جان دونوں چیزیں لگانا پڑتی ہیں۔ پہلے ذکر آچکا ہے۔ کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو "بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ" تاہم نیت اصلاح کی ہونی چاہیئے۔ آگے اصلاح کے دو پہلو ہیں یعنی اصلاحِ نفس اور اصلاحِ عالم۔ اپنے نفس کی اصلاح اس لیے ضروری ہے۔ کہ اس کے بغیر انسان حظیرۃ القدس کا ممبر بن کر علیین میں نہیں پہنچ سکتا۔ اور اصلاح عالم بدیں وجہ لازم ہے۔ کہ اس کے بغیر فتنہ و فساد کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

مال کا ایک بہترین مصرف اشاعتِ اسلام ہے۔ انحطاط کے اس زمانہ میں اہلِ ثروت اس مد میں کتنا خرچ کر رہے ہیں۔ اس کام کے لیے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس کا ایک فیصد بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں کی دولت آج عیش پرستی پہ خرچ ہو رہی ہے۔ حضور علیہ السلام نے ممانعت فرمائی ہے۔ فرمایا فَاِنَّ عِبَادَ اللّٰہِ لَیْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِیْنَ یعنی اللہ کے بندے عیش پسند نہیں ہو سکتے۔ عیش پرستی تو کفار کا شیوہ ہے۔ مسلمان کی دولت تو امورِ خیر پہ خرچ ہونی چاہیئے۔ مگر افسوس کا مقام ہے۔ آج مسلمان عمارات اور ان کی تزئین پہ بے دریغ روپیہ صرف کر رہا ہے۔ کھیل تماشے اور لہو و لعب کو اولیت دی جا رہی ہے۔ مگر جہاد کی مدات سے صرفِ نظر کیا جا رہا ہے۔ اشاعتِ دین کا تھوڑا بہت کام جو

ہو رہا ہے۔ وہ بزرگانِ دین کے خلوص کا نتیجہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے قبول کر لیا ہے۔ ورنہ موجودہ زمانے میں کتنے لوگ ہیں جو اس طرف توجہ دے رہے ہیں اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہ۔

مجاہدہ ضروری ہے

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہوں گے، جنہیں بغیر حساب کتاب کے بخش دیا جائے گا۔ تو یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں آزمائشوں میں پورا اترنا کس حد تک ضروری رہ جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے۔ کہ مجاہدہ کے بغیر بخشش نہیں ہے۔ البتہ اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کے لیے تو مجاہدہ اور بھی ضروری ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے قریب تر سب لوگوں کو امتحانات سے گزرنا پڑا، تب ان کو بلند مراتب حاصل ہوئے۔ مگر کوئی عام مسلمان بھی مجاہدہ سے خالی نہیں ہے۔ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی جب ایمان لاتا ہے، تو اُسے کم از کم اپنے نفس اور شیطان کے خلاف تو مجاہدہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ ایمان کا تقاضا ہے۔ کہ نیکی کی طرف راغب ہو اور بُرائی سے اجتناب کرے۔ اور یہی چیز شیطان پہ شاق گزرتی ہے۔ جب شیطان اس مومن کی نیکی میں آڑے آتا ہے۔ تو اس کے خلاف جہاد کرنا پڑتا ہے "وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا" ہر شخص کے لیے اس کے عمل کے مطابق درجات ہیں۔ مگر مجاہدہ سے مبرا کوئی بھی نہیں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ وضو کرنے اور نماز ادا کرنے کے لیے بھی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے، یہی مجاہدہ ہے۔ پھر جتنا بڑا مجاہدہ کوئی کرے گا، اتنا بڑا اعزاز پائے گا۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مومن یہ نہ سمجھیں کہ بغیر آزمائش کے جنت میں چلے جائیں گے حالانکہ پہلے لوگوں کو بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں تب، جا کر وہ جنت کے حقدار ہوئے۔

خرچ کی مدات
(۱) والدین

یہاں پہ دوسرا مسئلہ خرچ کی مختلف مدات کے متعلق ہے۔ یہ مسئلہ قرآن پاک میں کئی ایک مقامات پہ بیان ہوا ہے۔ اور اپنی نوعیت کے مطابق ایک ہی سوال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں۔ یہاں پہ بھی سوال عام نوعیت کا ہے

یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ اے نبی علیہ السلام! یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ خود ہی اس بات کا جواب دیتے ہیں قُلْ آپ فرما دیجیے، مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَیْرٍ تم جو کچھ بھی اپنے مال سے خرچ کرو۔ فَلِلْوَالِدَیْنِ یہ تمہارے والدین کے لیے ہے۔ خیر کا لفظ نیکی اور بھلائی پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں اس سے مراد مال ہے۔ جیسا دوسری جگہ فرمایا اِنَّہٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ انسان مال کی محبت میں بہت سخت ہوتا ہے۔ قرآن و سُنّت میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بہت تاکید آئی ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے۔ کہ کسی پوچھنے والے نے پوچھا، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ اَبَرُّ میں کس کے ساتھ نیکی کروں۔ رحمت العالمین نے فرمایا اُمَّکَ یعنی اپنی ماں کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔ سوال کرنے والے نے تین دفعہ دریافت کیا اور آپ نے ہر بار یہی جواب دیا چوتھی دفعہ پوچھنے پر فرمایا اَبَاکَ یعنی اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ مقصد یہ کہ مال خرچ کرنے کے معاملہ میں والدین کو اولیت دو۔ ان کی خدمت کرو۔ وہ سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ ہاں یہ بات ذہن میں رہے۔ کہ زکوٰۃ کا مال نہ اولاد والدین پر خرچ کر سکتی ہے۔ اور نہ والدین اولاد کو دے سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ الگ ہے۔ اس کے علاوہ جو مال ہے۔ اس کے سب سے زیادہ مستحق والدین ہیں۔ البتہ یہ استحقاق مشروط ہے۔ اگر والدین محتاج ہیں۔ تو پھر ان پر خرچ کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ خود صاحب مال ہیں۔ تو پھر مالی خدمت فرض نہیں رہتی۔ البتہ ان کی جانی خدمت کرے میٹھی چاپلی کے ذریعے ان کو راحت پہنچائے یا اچھی بات کر کے ان کا دل بہلائے۔ تمام سابقہ شرائع اور خود ہماری شریعت مطہرہ کا قانون یہی ہے۔ کہ "بِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا" والدین کے ساتھ احسان کرو۔

(۲) اقربا خرچ کی دوسری مد فرمایا وَالْاَقْرَبِیْنَ قرابت داروں پر خرچ کرو۔ اگر کسی صاحب ثروت آدمی کے قریبی عزیز رشتہ دار امداد کے مستحق ہیں، تو ان کی اعانت کرنا ضروری ہے۔ دوسری جگہ فرمایا وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰی حَقَّہٗ "اپنے قرابت داروں

کو اُن کا حق ادا کرو۔ اس کا فلسفہ یہ بیان فرمایا اٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ
جو مال تمہیں اللہ نے عطا کیا ہے۔ اُس میں سے دو۔ اور یہ اسی طرح مختلف ذرائع سے حاصل
ہوتا رہتا ہے۔ جیسے کسی کو وراثت میں حصہ مل گیا۔ کسی کو تجارت میں نفع حاصل ہوا۔ کسی کا
ذریعہ ملازمت بن گیا۔ کسی کو کھیتی باڑی، کسی کو محنت مزدوری کے ذریعے مال حاصل ہوا۔ تو
اللہ تعالیٰ نے مختلف ذرائع سے جو مال تمہیں دیا ہے۔ اس میں سے اپنے قرابت داروں
پر خرچ کرو۔ انفاق مال کی یہ بھی ایک مد ہے۔

(٣) یتیم و مسکین

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ اور یتیموں اور مسکینوں پر خرچ کرو۔ اس مادی جہاں میں یتیم وہ ہے
جس کے سر پر اس کا سرپرست نہ ہو۔ والد فوت ہو جائے ذرائع آمدن نہ ہوں انسان بے سہارا ہو جائے ایسے
فرد کی دستگیری ضروری ہے اور مسکین وہ ہے جو محنت اور کوشش کے باوجود اپنے ضروری اخراجات
پورے کرنے کے قابل نہ ہو۔ ایسے شخص زکوٰۃ کے حقدار بھی ہیں۔ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ
لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ۔ لہٰذا صدقات و خیرات کا حقدار وہ شخص ہے، جو محنت
مزدوری کرنے کے باوجود اپنے بچوں کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتا۔
وہ بیچارے مناسب لباس اور معقول خوراک سے محروم ہیں۔ اُن کی صحت اور تعلیم کی
ضروریات ہیں۔ سر چھپانے کے لیے انہیں بھی مکان درکار ہے۔ مگر اُن کا سرپرست
یہ ضروریات کما حقہٗ پوری نہیں کر پاتا۔ اللہ اور اس کے رسول کی قائم کردہ یہی وہ
بنیادی ضروریات ہیں۔ جن کو پیش کرتے ہیں یورپ و امریکہ والے فخر کرتے
ہیں۔ اور ان کی حمایت کا دم بھرتے ہیں۔ دراصل یہ چارٹر تو قرآن و سنت کا مقرر
کردہ ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تعلیم تو یہاں سے ملتی ہے۔ یہ منشور ہمیں
بتاتا ہے کہ ہر انسان کو کم از کم اتنی تعلیم تو حاصل ہونی چاہیئے جس کے ذریعے وہ اپنے
حقوق و فرائض سے واقف ہو سکے اور پھر اُن کی ادائیگی کے لیے کوشش کرے

(۴) مسافر

وَابْنَ السَّبِيْلِ اور مسافروں پر خرچ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے مسافروں کی خدمت کا بھی حکم دیا ہے
مسافروں پر خرچ کرنا بھی تمہارے مال کے مصارف میں سے ایک ہے یہاں پر یہ بات اچھی طرح بیان کرنی چاہیئے
کہ اس معاملہ میں کسی پارٹی یا گروہ کی تخصیص نہیں ہے۔ کہ یہ ہماری پارٹی کا ۔۔۔

اور وہ تمہارے گروہ کا ہے بلکہ ہمارا تو شعار یہ ہے۔ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ جو شخص اللہ پہ ایمان رکھتا ہے۔ اُسے چاہیئے۔ کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ اور مسافر مہمان ہوتا ہے۔ اور مہمان کے متعلق حکم ہے۔ کہ ایک دن تک اسکی خوب خاطر تواضع کرو۔ اور تین دن تک ضیافت۔ اگر تین دن کے بعد بھی اُسکی خدمت کرو گے تو وہ صدقہ میں شمار ہو گا۔

اسلامی معاشرہ

الغرض! اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔ کہ کمزوروں اور محتاجوں کی اعانت کی جائے تاکہ وہ سوسائٹی میں باعزت مقام حاصل کر سکیں۔ اللہ تعالےٰ نے ان مدات پہ مال صرف کرنے کا حکم دیا ہے۔ بر خلاف اس کے غیر ضروری اور ناجائز کاموں پہ خرچ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور اُسے اسراف سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے دیواروں پہ پردے لٹکانے اور تصاویر آویزاں کرنے کا حکم تو نہیں دیا۔ باجے گانے اور عیاشی و فحاشی سے منع فرمایا ہے۔ بلکہ محتاج و ناتواں کی دستگیری کا حکم دیا ہے۔ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے دور کا مطالعہ کریں۔ کہ وہ غریب طبقوں کی کس طرح مدد کرتے تھے۔ اُن کی عزت نفس کا خیال رکھتے تھے۔ اُن کے احساس تک کو مجروح ہونے سے بچاتے تھے۔ اُن کی ضرورت خفیہ طریقے سے اُن کے گھروں پہ پہنچا دیتے تھے۔ اسلامی سوسائٹی کا معیار تو یہ ہے۔ انسانیت کا مقام تو اس طرح بلند ہوتا ہے مگر آج ہمارا شیوہ یہ ہے کہ گرے پڑے کو اٹھانے کی بجائے اُسے بالکل ختم کرنے کے درپے ہیں۔ امیر سے امیر تر اور غریب سے غریب تر ہو رہا ہے۔ یہ اسلامی سوسائٹی کے اصولوں سے لاعلمی ہے۔ کفر و شرک اور بدعات پہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ باطل رسومات پہ بے دریغ صرف ہو رہا ہے۔ اپنے عیش و آرام کی خاطر دوسروں کا خون چوسا جا رہا ہے۔ مگر اسلامی سوسائٹی کی تعمیر کے لیے مستحقین کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی ہے دلوں کو گھر سے نکالا جا رہا ہے۔ قرابت داروں سے عناد ہے۔ پڑوسی بھوکا ہے تو کوئی پروا نہیں یہ انٹر کانٹی نینٹل میں داد عیش دے رہے ہیں۔ غریب کے پاس دوائی لانے کے لیے پیسے نہیں مگر امیر بلاضرورت اپنے نفس پہ خرچ کر رہا ہے۔

فرمایا وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ تم نیکی کا جو کام بھی کرو اللہ تعالیٰ اُس سے خوب واقف ہے۔ وہ تمہاری نیت تک کو جانتا ہے۔ لہٰذا وہ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اُس کا پورا پورا اجر عطا کرتا ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ اُسی کے عطا کردہ مال کو اس کی رضا کی خاطر خرچ کرکے اس کی خوشنودی حاصل کرلو۔ اس سے بہتر سودا کیا ہو سکتا ہے۔

درس ہشتاد و نہ (۸۹) — آیت ۲۱۶ تا ۲۱۸

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن
تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن
تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ
لَا تَعْلَمُونَ ۝٢١٦ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ ع ۲۶ ۲۰
قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ
وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ ۚ
وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ
يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَن يَرْتَدِدْ
مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ
حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝٢١٧ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ
هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۙ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ
رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝٢١٨

ترجمہ: تم پر لڑائی فرض کی گئی ہے۔ اور وہ تمہیں ناگوار گزرتی ہے۔ اور شاید کہ تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور شاید کہ تم کسی چیز کو پسند کرو، اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے (۲۱۶)
آپ سے حرمت والے مہینے میں لڑائی سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے حرمت کے مہینے میں لڑائی لڑنا بڑا گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکنا اور اُس کے ساتھ کفر کرنا، اور مسجد حرام سے روکنا۔ اور اُس کے اہل کو

وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک بڑا گناہ ہے۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ بڑا ہے۔ یہ کافر لوگ ہمیشہ تمہارے ساتھ لڑتے رہیں گے حتیٰ کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کو طاقت ہو۔ اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا اور پھر مر جائے گا، اس حال میں کہ وہ کفر کرنے والا ہے۔ پس یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے۔ اور یہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے (۲۱۷) بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کے راستے میں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۲۱۸)

گذشتہ سے پیوستہ

گذشتہ دروس میں مال کے مصارف کا بیان تھا۔ حضور علیہ السلام سے سوال ہوا کہ لوگ اپنا مال کن امور پر خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھیجا کہ مال خرچ کرتے وقت سب سے پہلے والدین، پھر قرابت داروں پھر یتیموں اور مسکینوں اور اس کے بعد مسافروں کو پیش نظر رکھیں۔ تاہم کلیہ کے طور پر اس بات کی وضاحت فرما دی کہ نیکی کا جو بھی کام انجام دیا جائے، اللہ تعالیٰ اسکو جانتا ہے۔ اگر کوئی شخص صاحب نصاب ہے تو اسے سب سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنی چاہیئے۔ پھر صدقات واجبہ کا حکم آتا ہے۔ اس کے بعد نفلی صدقات پر خرچ کرے جسکے لیے صاحب نصاب ہونا ضروری نہیں۔ البتہ اجر و ثواب کی خاطر اچھی سے اچھی چیز خرچ کرنا چاہیئے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز راہ خدا میں صرف نہ کرو نیکی کا اعلیٰ درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انفاق فی سبیل اللہ سے دو باتیں مقصود ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ انسان کو تہذیب نفس حاصل ہوتی ہے۔ انسان کا نفس بخل جیسی رذیل خصلت سے پاک ہو جاتا ہے۔ اور یہ شخص بارگاہ رب العزت میں پیش ہونے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس

سے دوسرا فائدہ یہ ہے۔ کہ انسان بنی نوع انسان کی خدمت کر سکتا ہے۔ غرباء مساکین کی اعانت بحیثیت مجموعی انسانیت کی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ لہذا کسی مستحق کی مالی مدد سے بنی نوع انسان کی ترقی کے راستے کھلتے ہیں۔

جہاد اور قتال میں فرق

دین کی خاطر بعض اوقات مال سے بڑھ کر جان کی بازی بھی لگانی پڑتی ہے۔ اس کو قتال کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے۔ جہاد عام لفظ ہے۔ اور اس سے مراد اقامت دین کے لیے ہر قسم کی جدوجہد ہے۔ جس میں قتال بھی شامل ہے۔ مگر قتال سے مراد راہ خدا میں لڑائی کے ذریعے جان پیش کرنا ہے جب کوئی شخص دشمن کے مقابلہ میں آتا ہے۔ تو پھر اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ اس کی جان سلامت رہتی ہے یا نہیں۔ یہ قتال ہے۔ اسی لیے فرمایا "جَاهِدُوا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ" دونوں طرح جہاد کرو۔ مال بھی صرف کرو اور بنفس نفیس خود بھی میدانِ جنگ میں کود پڑو۔ ابوداؤد شریف کی روایت میں تین چیزوں کا ذکر آتا ہے۔ جَاهِدُوا الْكُفَّارَ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَاَلْسِنَتِكُمْ یعنی مال جان اور زبان کے ساتھ جہاد کرو۔ اللہ کے دین کو زبانی طور پر لوگوں تک پہنچانا، ان کے شکوک و شبہات کو زبان کے ذریعے دور کرنا دین کی خوبیوں کو زبان کے ساتھ اجاگر کرنا یہ بھی جہاد میں شامل ہے۔ چنانچہ یہاں پر ارشاد ہوتا ہے۔ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ دشمن کے ساتھ لڑائی تم پر فرض کی گئی ہے۔ قتال کی فرضیت بعض دوسرے مقامات پر بھی بیان ہوئی ہے۔ سورۃ حج میں فرمایا "اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا" مظلوم مسلمان جن کے ساتھ کفار لڑائی کرتے ہیں۔ اب انہیں بھی اجازت ہے کہ وہ کفار کے خلاف ہتھیار اٹھالیں۔

فرض عین اور فرض کفایہ

یہاں پر لفظ کُتِبَ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قتال ہر شخص پر لازم ہے جیسے رمضان المبارک کے متعلق آیا "کُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ" تم پر روزے فرض کیے گئے ہیں ظاہر ہے کہ روزوں کی فرضیت ہر مرد و زن کے لیے

ہے اسی طرح یہاں پر ہے کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِتَالُ تم پر قتال فرض کیا گیا ہے۔ مگر قرآن پاک کے بعض دوسرے مقامات سے اور خود حضور علیہ السلام کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے۔ کہ جہاد اور قتال کے فرض ہونے کی دو صورتیں ہیں یعنی فرض عین اور فرض کفایہ۔ فرض عین، فرض کی وہ صورت ہوتی ہے۔ جس سے کوئی مسلمان مرد و زن مستثنیٰ نہ ہو۔ یہ حالات و واقعات پہ منحصر ہے اگر دشمن کا اس قدر غلبہ ہو اکہ ہر مرد، عورت، چھوٹے بڑے، آزاد اور غلام کی خدمات کی ضرورت ہے۔ تو پھر ہر ایک پہ جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ سب کو شامل ہونا ہو گا۔ اگر کوئی اعراض کرے گا، تو گنہگار ہو گا۔ ایسی حالت میں اولاد کے لیے والدین کی اجازت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہر فرد بلا چون و چرا جنگ میں کود پڑے گا۔ البتہ عام حالات میں قتال کا فریضہ فرض کفایہ کے طور پہ ادا کیا جاتا ہے۔ جب جنگ کے لیے فوجی جوان کافی ہوں۔ اور وہ اپنا دفاع کر سکتے ہوں اور لبوقت ضرورت دشمن پر کاری ضرب لگا سکتے ہوں۔ تو ایسی صورت میں صرف اُن خاص مجاہدین کا شریک جنگ ہونا ہی تمام مسلمانوں کے لیے کفایت کرے گا۔ اور یہ فرض کفایہ ہو گا۔ ہر ایک کا قتال میں شامل ہونا ضروری نہیں ہو گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح میت کا جنازہ پڑھنا فرض کفایہ ہے۔ جب بعض لوگ جنازے میں شامل ہو جائیں۔ تو باقیوں سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی بھی شریک نہ ہو تو سب کے سب لوگ گنہگار ہوں گے۔

عام حالات میں اگر جہاد کے لیے جانا ہو، تو والدین کی اجازت ضروری ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ماں باپ کی خدمت کرنا فرض عین ہوتا ہے جبکہ جہاد میں شمولیت فرض کفایہ ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور! میں جہاد میں شریک ہونا چاہتا ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا، کیا تیرے ماں باپ موجود ہیں۔ عرض کی ہاں فرمایا پھر والدین کی خدمت کرو۔ تمہیں جہاد کا ثواب مل جائے گا۔ یاد رہے کہ

والدین کی خدمت اُس وقت فرض عین ہو جاتی ہے، جب کوئی دوسرا اُن کی دیکھ بھال کرنے والا موجود نہ ہو۔

خیر و شر اللہ کے علم میں ہے

یہاں پر ارشاد ہوتا ہے۔ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ تم پر لڑائی فرض کی گئی ہے وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ اور وہ تمہیں ناگوار گذرتی ہے۔ یہاں پر ناگوار گزرنے یا بُرا لگنے سے مُراد طبعاً بُرا لگنا ہے۔ کیونکہ عقلاً تو کسی بھی حکم الٰہی کو کوئی مومن بُرا نہیں کہ سکتا۔ البتہ طبیعت کے لحاظ سے ایسا ہو سکتا ہے۔ کہ انسان کو کوئی چیز اچھی محسوس نہ ہو کیونکہ "خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا" انسان پیدا ہی کمزور کیا گیا ہے۔ اور یہ بعض بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ عقل کے لحاظ سے ہر مسلمان ہر حکم الٰہی پر اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا ہی کہے گا۔ چاہے اُس کا فائدہ ہو یا نقصان۔ کُرْہٌ مشقت والی چیز کو کہتے ہیں جو شاق گزرے۔ دوسرے مقام پر عورت کے حمل کے متعلق آتا ہے۔ "حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا" ماں بچے کو پیٹ میں بڑی مشقت سے اٹھاتی ہے۔ اور پھر اُسے بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ جنم دیتی ہے۔ اسی لیے تو اللہ نے ماں کا بڑا حق رکھا ہے۔

فرمایا بعض چیزوں کا ناگوار گزرنا انسان کی ظاہراً طبیعت پر منحصر ہے۔ مگر حقیقت اللہ ہی کے علم میں ہے۔ کیونکہ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ شاید کہ تم کسی چیز کو ناگوار جانو مگر وہ تمہارے لیے بہتر ہو وَعَسَىٰ أَنْ تُحِبُّوا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ اور شاید کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بُری ہو۔

غالب اور مغلوب

جان کی بازی لگا کر دشمن کے ساتھ جنگ لڑنا کوئی معمولی بات نہیں اور اس کا طبیعت پر ناگوار گزرنا بھی طبعی ہے۔ مگر اس کے نتائج و عواقب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا جو قومیں اتنی آرام طلب ہو جائیں کہ وہ اپنا دفاع بھی نہ کر سکیں، وہ جلد یا بدیر مغلوب ہو جاتی ہیں ظاہر ہے کہ دشمن غالب آئیگا اور پھر جان مال، عزت و آبرو ہر چیز چھن جائے گی۔ حتیٰ کہ زن و فرزند کی

بیحرمتی تک ہو گی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نتیجہ بہت ہی بُرا ہو گا۔ لہذا اللہ تعالےٰ نے جہاد فرض کر کے مسلمان کو مشقت میں نہیں ڈالا۔ بلکہ اسے بدترین نتائج سے بچا لیا ہے

تاریخ شاہد ہے کہ جب کوئی قوم غالب آتی ہے۔ تو مغلوب قوم کو کس طرح پامال کرتی ہے۔ جب تاتاری غالب آئے تو انہوں نے ایک کروڑ مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا۔ تمام کتب خانے جلا دیئے۔ عورتوں اور بچوں تک کو معاف نہیں کیا۔ اسی طرح جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا، تو کون سا ظلم ہے جو یہاں کے باشندوں پر نہیں کیا۔ جی ٹی روڈ پر ہزاروں کی تعداد میں نعشوں کو درختوں پہ لٹکایا گیا۔ ان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ جب عیسائیوں نے اندلس (سپین) پر حملہ کیا تو وہاں دو کروڑ کی تعداد میں مسلمان تھے۔ مگر جب وہ غالب آئے تو مسلمانوں کی تعداد صرف گیارہ ہزار رہ گئی تھی۔ باقیوں کو یا تو قتل کر دیا گیا تھا۔ یا مرتد کر لیا گیا۔ یہ بلخ اور بخارا کا زمانہ تو قریب کا زمانہ ہے۔ صرف بخارا شہر میں چار سو مسجدیں تھیں۔ بے شمار دینی مدارس تھے۔ مگر اب وہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔

فرمایا جنگ کے حکم کو خوش دلی سے قبول کرو۔ تمہاری نظر صرف ظاہر پہ ہے۔ مگر درحقیقت وَاللّٰہُ یَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ہر کام کے نتیجے سے وہی واقف ہے تم اس کی اصلیت کو نہیں جانتے

حرمت والے مہینے

یہ بات تو واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پہ لڑائی فرض کی ہے مگر اگلی آیت میں حرمت والے مہینوں کے دوران جنگ کے جواز یا عدم جواز کا سوال اٹھایا گیا ہے۔ یَسۡـَٔلُوۡنَكَ عَنِ الشَّهۡرِ الۡحَـرَامِ قِتَالٍ فِيۡهِ‌ؕ یعنی اے نبی علیہ السلام! یہ لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ کہ ان مہینوں میں جنگ کرنا کیسا ہے۔ اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ قُلۡ قِتَالٌ فِيۡهِ كَبِيۡرٌ‌ؕ یعنی ان مہینوں میں لڑائی کرنا بڑا سخت گناہ ہے۔

اب پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ حرمت والے مہینے کون سے ہیں جن کے دوران لڑائی ممنوع ہے۔ اس ضمن میں سورۃ توبہ میں اللہ تعالےٰ نے ارشاد

فرمایا ہے۔ "اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا" یعنی اللہ کے ہاں مہینوں کی تعداد بارہ ہے "مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ" ان میں چار مہینے حرمت والے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں، رجب، ذی قعد، ذی الحج اور محرم۔ ملت ابراہیمی میں یہ بات مسلم تھی کہ ان چار مہینوں میں لڑائی قطعاً جائز نہیں۔ زمانہ جاہلیت میں مشرکین بھی اس کی پابندی کرتے تھے؛ چنانچہ وہ ان مہینوں میں ہتھیار ڈال دیتے تھے کوئی لڑائی نہیں کرتے تھے۔ کسی قافلے کو نہیں لوٹتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی شریعت میں یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اور بعض اصحاب کہتے ہیں کہ یہ حکم مطلقاً منسوخ نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی تاکید میں کمی ہو گئی ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے۔ کہ ان مہینوں میں مسلمان خود لڑائی کی ابتدا نہ کریں اور اگر دشمن جنگ شروع کرے، تو پھر اس کا جواب دیا جائے۔

شانِ نزول

دوسرا سوال شان نزول کا ہے۔ کہ یہ آیت کس موقع پہ نازل ہوئی۔ اور لوگوں نے یہ سوال کیوں اٹھایا۔ محمد بن اسحاقؒ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے غزوۂ بدر سے پہلے حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی سرکردگی میں کفار کے ایک تجارتی قافلے کو پکڑنے کے لیے ایک جماعت کو بھیجا۔ آپ نے امیر جماعت کو ایک خط لکھ دیا۔ اور ساتھ حکم دیا۔ کہ مسلسل دو دن سفر کرنے کے بعد اس خط کو کھول کر پڑھنا اور پھر اس میں مندرج ہدایات کے مطابق عمل کرنا۔ اس حکم کی تعمیل میں دو دن بعد جب خط کھول کر پڑھا گیا۔ تو اس میں لکھا تھا۔ کہ فلاں قافلہ کو گرفتار کر لو۔ اس کو کسی صورت میں جانے نہیں دینا۔ یہ دن جمادی الاخر کا آخری دن تھا۔ امیر لشکر نے فیصلہ کیا۔ کہ چونکہ رجب حرمت والا مہینہ شروع ہونے والا ہے لہذا اس سے پہلے پہلے قافلے کو پکڑ لینا چاہیئے۔ چنانچہ اپنے حساب سے انہوں نے جمادی الاخری کی تیس تاریخ کو کفار کے قافلے پہ حملہ کر دیا۔ ایک آدمی مارا گیا۔ باقی قید ہوئے۔ سامان بھی ہاتھ آ گیا۔ لہذا لشکر واپس آ گیا۔

درحقیقت حملہ کرنے کی تاریخ جمادی الاخری کی تیس ۳۰ تاریخ نہیں تھی۔ بلکہ رجب کی پہلی تھی، جو کہ حرمت والا مہینہ ہے۔ لہٰذا مشرکوں کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔ کہ دیکھو مسلمانوں کے پیغمبر اپنے آپ کو ملت ابراہیم کے متبع کہتے ہیں۔ مگر حرمت والے مہینہ کا بھی خیال نہیں کیا۔ قافلے پر حملہ کیا ہے۔ آدمی مارا گیا ہے اور قافلے کو مع سامان گرفتار کر لیا ہے۔ یہ تھا وہ واقعہ جس کی وجہ سے حرمت والے مہینوں کے متعلق سوال پیدا ہوا کہ ان مہینوں میں لڑائی کرنا کیسا ہے۔

حرام فعل اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ یہ لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ تو آپ فرما دیجئے کہ ان مہینوں میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے۔ تاہم جس واقعہ کو بنیاد بنا کر یہ سوال کیا گیا تھا۔ وہ تو غلطی سے ہوا تھا۔ مسلمان سمجھے کہ ابھی رجب کا مہینہ شروع نہیں ہوا۔ لہٰذا حملہ آور ہوئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا مزید جواب یہ دیا۔ کہ مسلمانوں سے تو یہ خلاف ورزی خطاءً ہوئی۔ مگر کفار و مشرکین اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ وہ خود کیا کچھ کر رہے ہیں۔ فرمایا بے شک حرمت والے مہینوں میں لڑائی حرام ہے۔ مگر وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ اللہ کے راستے سے روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا بھی تو سخت گناہ ہے وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور مسجد حرام سے روکنا بھی بڑا گناہ ہے۔ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ اور وہاں کے رہنے والوں کو مسجد حرام سے نکالنا بھی اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے فرمایا اے کفار و مشرکین تم یہ کیا یہ کوئی کم گناہ ہے جو تم جان بوجھ کر کر رہے ہو تم جس مسجد سے مسلمانوں کو نکال رہے ہو تم خود اس کے اہل نہیں ہو۔ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ، اس کے اہل تو صرف متقی ہیں اور وہ مسلمان ہیں فرمایا یاد رکھو، وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ یہ فتنہ برپا کرنا قتل سے بھی بڑا گناہ ہے مسلمانوں سے تو بھول کر ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے مگر تم انہیں بیت اللہ شریف سے روک کر اور انہیں ہجرت پر مجبور کر کے فتنہ پیدا کر رہے ہو، تمہارا کفر اور شرک پر اڑے رہنا بجائے خود ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی غلطی معمولی چیز ہے

مرتد اور اس کی سزا

اس کے بعد فرمایا کہ مسلمانوں کا یہ واقعہ تو کفار کو بہانہ کے طور پر مل گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے حَتّٰى يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا یہاں تک کہ اگر استطاعت رکھیں تو تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں۔ اُن کا مقصد تمہیں اپنے سابقہ دین پہ واپس لانا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق بھی دوسرے مقام پہ فرمایا کہ اُن کا بھی یہی مقصد ہے وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصٰرٰى یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ جب تک کہ آپ اُن کا دین اختیار نہ کر لیں (معاذ اللہ) گویا کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو مرتد بنانا چاہتے ہیں۔ مگر یاد رکھو۔ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهٖ تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا۔ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ اور کفر کی حالت میں مر جائے گا فَأُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ سو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت دونوں جگہ پہ ضائع ہو جائیں گے جو کوئی سچے دین اسلام کو چھوڑ کر یہودی یا عیسائی ہو گیا۔ کافر یا مرزائی ہو گیا۔ اس کی دنیا اور آخرت دونوں خراب ہو گئیں۔

دنیا میں اعمال ضائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مرتد شخص کی سابقہ نمازیں، روزے، زکوٰۃ، حج وغیرہ سب ضائع ہو گئے۔ اُسے اِن نیکیوں کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا، سب ضائع ہو گئیں۔ جب تک کہ وہ دوبارہ ایمان نہ لے آئے۔ علاوہ ازیں مرتد آدمی قوم و ملت کا غدار ہے۔ اور غدار کی سزا قتل ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ جو دین تبدیل کرتا ہے۔ وہ واجب القتل ہے۔ البتہ اس کا طریق کار یہ ہے۔ کہ تین دن تک اس کے شکوک و شبہات دور کرنے کی کوشش کی جائے اور اس سے توبہ کرانے کی کوشش کی جائے۔ اور اگر یہ کوشش بار آور نہ ہو سکے۔ اور مرتد دوبارہ مسلمان ہونے پہ آمادہ نہ ہو۔ تو اُسے سزائے موت دے دی جائے یہ شخص دین کی توہین کا مرتکب ہوا ہے۔ اور معافی کا حقدار نہیں۔

اشتراکی ممالک میں اُن کے آئین کی توہین کرنے والا شخص موت کی سزا پاتا ہے۔ برطانوی قانون کے مطابق جب ایمری کے بیٹے نے جنگ کے دوران غداری کی تو اُسے سُولی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ کسی نے آواز نہیں اٹھائی کہ اُن کے وزیر کے بیٹے کو سزائے موت کیوں دی گئی۔

موت کے بعد مرتد کی سزا یہ ہے۔ کہ نہ اُس کا جنازہ پڑھا جائے اور نہ اُسے مُسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ مرتد اپنے مُسلمان مورث کی وراثت کے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ تو دنیا میں اس کے اعمال کا ضیاع ہے۔ اور آخرت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ابدی جہنمی ہے۔ اُسے کبھی دوزخ سے رہائی نہیں ہوگی مرتد اصل کافر سے بھی بڑا مجرم ہے۔ کافر سے تو جزیہ قبول کر لیا جاتا ہے مگر مرتد سے جزیہ بھی نہیں لیا جاتا۔ امام اعظمؒ کے فتویٰ کے مطابق اگر عورت مرتد ہو جائے تو اُسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ تا مرگ قید میں ڈال دیا جائے گا ——— اگر توبہ کر لے تو آزاد ہو جائے گی۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ۔ یہ لوگ جہنمی ہیں۔ اور هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اُن کی رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

اہل ایمان کے لیے خوشخبری

کفار و مشرکین اور مرتدین کی مذمت کے بعد اہل ایمان کو خوشخبری دی جا رہی ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا جو لوگ ایمان لے آئے وَالَّذِينَ هَاجَرُوا اور جنہوں نے اللہ کی رضا کی خاطر ہجرت کی۔ نہ صرف وطن کو چھوڑا بلکہ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ممنوعہ چیزوں سے منہ موڑ لیا کہ یہ ہجرت بہت بڑا عمل ہے۔ إِنَّ شَأْنَ الْهِجْرَةِ لَعَظِيمٌ ہجرت کا معاملہ بڑا دشوار ہے دین کی خاطر سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے۔ جس نے ایسا کر لیا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اور وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ط یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے وہ نیکو کاروں کو پورا پورا اجر دیگا۔

درس نمبر (۹۰) آیت نمبر ۲۱۹ تا ۲۲۰ (پہلا حصہ)

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ
مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ۭ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ
مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ڛ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ
الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ

ترجمہ :- لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں آپ کہہ دیجئے ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔ اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں اور ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے اور وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجئے، جو زائد ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آیات بیان کرتا ہے۔ تاکہ تم فکر کرو ﴿۲۱۹﴾ دنیا اور آخرت کے بارے میں

گذشتہ سے پیوستہ — گذشتہ درس میں جہاد کی مشروعیت اور اس کی حکمت بیان کی گئی تھی حرمت والے مہینوں میں لڑائی سے منع کیا گیا تھا۔ کفار کی خصلت بیان ہوئی۔ کہ وہ مسلمانوں کو بہکا کر دینِ اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرتے رہیں گے نیز فرمایا کہ جو شخص مرتد ہو گیا، اس کی دنیا اور آخرت ہر دو برباد ہو گئیں۔ اس کے بعد ایمان، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ کی تعلیم دی گئی کہ ایسے ہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اور ان کی غلطیوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے۔

اس سے پہلے درس میں مال خرچ کرنے کا قانون بیان ہوا تھا۔ اور انفاق کی اہمیت بیان ہوئی تھی۔ اس کا بیان آگے بھی آئے گا۔ گویا یہ حصولِ مال کے ذرائع اور خرچ کی مدات کا مفصل تذکرہ ہے۔

موضوع آیات — اس آیت میں شراب اور جوئے کے فوائد و نقصانات اور ان کی حرمت کا

بیان ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ اے نبی علیہ السلام! آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ ان کی کیا حیثیت ہے۔ جائز ہیں یا ناجائز، حرام ہیں یا مباح، ان میں فائدہ ہے یا نقصان۔ اس کے جواب میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا۔ قُلْ آپ کہہ دیجئے فِيهِمَآ اِثْمٌ كَبِيرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ان دونوں چیزوں میں بہت بڑا گناہ ہے تاہم لوگوں کے لیے بعض فوائد بھی ہیں۔ مگر ایک بات ہے۔ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ان کا گناہ، ان کے فوائد سے بہت بڑا ہے۔ مقصد یہ کہ ان بری چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

شراب نوشی

خمر نشہ آور چیز کو کہتے ہیں۔ مَا خَامَرَ الْعَقْلَ جو کہ عقل کو ڈھانپ لے انسان کو بے عقل بنا دے۔ عام طور پر یہ لفظ شراب پہ بولا جاتا ہے۔ کیونکہ نشہ آور اشیا میں شراب سرفہرست ہے۔ اس قبیح چیز کے متعلق دو حکم وارد ہوتے ہیں، ایک اس کے استعمال پہ پابندی اور دوسرا اس کے ذریعے حصول زر یعنی تجارت کی ممانعت۔ اس کے نقصانات تو واضح ہیں۔ کہ انسان کو بے خود بنا دیتی ہے۔ جس میں انسان گالی گلوچ بکتا ہے۔ فرائض سے محروم رہ جاتا ہے۔ ذہن ماؤف ہوتا ہے۔ اور پھر مال کا ضیاع بھی ہے۔ نشے کی حالت میں انسان قتل و زنا جیسے کبیرہ گناہوں میں ملوث ہو جاتا ہے۔

شراب کے فوائد کے ضمن میں عربوں میں مشہور تھا کہ یہ انسانی ذہن کو جلا بخشتی ہے، دل میں سرور پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان میں فیاضی کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ عرب لوگ شراب کو کرم کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے حضور نے ایسے نام سے منع فرمایا۔ اور ارشاد کیا۔ کہ مومن کا دل تو کرم ہو سکتا ہے۔ شراب نہیں ہو سکتی۔ فرمایا، اس ام الخبائث کو عنب یا حبلہ کہو، جن چیزوں سے یہ کشید کی جاتی ہے۔ عرب شراب نوشی کو شریفانہ فعل قرار دیتے تھے۔ کہ اس کی وجہ سے فیاضی پیدا ہوتی ہے۔ اور جو شخص شراب کی محفل میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ اسے

کم تر خیال کرتے تھے۔ غرضیکہ شراب، اور جوا عام تھے۔ کوئی خال خال ہی ان سے بچا تھا۔ وگرنہ جس طرح اونٹ، گھوڑا، تلوار، لڑائی عربوں کی گھٹی میں پڑے تھے اسی طرح شراب اور جوا بھی اُن کا عام مشغلہ تھا۔

قمار بازی

میسر، جوا یا قمار بازی کو کہتے ہیں۔ اس کا مادہ یسر ہے اور یسر آسانی کو کہتے ہیں۔ قمار بازی کے ذریعے کوئی شخص بغیر محنت و مشقت، صنعت و تجارت یا مزدوری و ملازمت دوسرے کے مال پر قبضہ کر لیتا۔ اس لیے اس کو میسر کہتے ہیں جوئے کی یہی خباثت ہے۔ کہ اس میں ایک دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے۔ جس شخص کا داؤ چل گیا۔ اُسے بغیر کچھ کیے کرائے مال حاصل ہو گیا۔ اور دوسرا شخص بیٹھے بٹھائے بلا وجہ محروم ہو گیا پھر جس شخص کو مال مل جاتا ہے۔ وہ اس کی قدر نہیں کرتا۔ اور اسے عیش و عشرت، اور برائی کے کاموں میں صرف کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے معصیت کا شکار ہوتا ہے۔ دولت بھی ضائع کرتا ہے۔ اور گنہگار بھی ہوتا ہے۔ عربوں میں باقی خبائث کی طرح جوئے کی وبا بھی عام تھی۔ وہ قمار بازی کو اچھا فعل سمجھتے تھے۔ خاص طور پر قحط کے زمانے میں جوئے میں شدت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور قمار بازی سے حاصل کردہ مال غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

نزول قرآن کے زمانہ میں قمار بازی اس قدر عروج پر تھی۔ کہ خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مجسموں کے ہاتھوں میں جوئے کے تیر پکڑائے ہوئے تھے۔ جس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ یہ جلیل القدر پیغمبر بھی جوا کھیلا کرتے تھے (العیاذ باللہ) بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام ان مجسموں کے قریب سے گزرے تو فرمایا، ان لوگوں پر خدا کی لعنت ہو۔ اللہ کے پاک بندوں کی نسبت کیسی ناپاک چیزوں کی طرف کرتے ہیں۔ حضرات ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو ایسے شنیع کام سے کیا سروکار۔

جوئے کے مختلف طریقے رائج تھے۔ قحط کے زمانے میں عموماً یہ طریقہ

اختیار کرتے تھے۔ کہ دس آدمی مل کر مساوی حصہ سے ایک اونٹ خرید لیتے تھے اُن کے پاس دس تیر ہوتے تھے۔ جن پہ ایک سے لے کر سات تک نمبر لکھے ہوتے تھے۔ اور باقی تین تیر خالی ہوتے تھے۔ اب اُن دس تیروں میں سے کسی ایک حصہ دار کے نام سے تیر نکالتے تھے۔ اور پھر جس نمبر والا تیر اُس نام پر نکلتا تھا۔ اونٹ کے گوشت کے اتنے ہی حصے وہ اکیلا لے جاتا تھا۔ اُس کے بعد حسبِ ضرورت دوسرا اور تیسرا تیر نکالا جاتا، حتیٰ کہ اونٹ کا سارا گوشت ختم ہو جاتا۔ اور جو حصے دار باقی بچ جاتے وہ اپنے حصے سے محروم رہ جاتے۔ اسی طرح اگر ابتدا میں کسی کے نام خالی تیر نکل آتا، تو وہ بھی اپنے حصے سے محروم رہ جاتا اور اگلے نمبر والا اپنا حصہ وصول کرتا علیٰ ہذا القیاس۔ جب ایک اونٹ کا گوشت تقسیم ہو جاتا تو محروم رہنے والے دعوت دیتے کہ ایک اور اونٹ خریدا جائے اور اس کے پھر اسی طرح حصے بخرے کر لیے جاتے۔ یہ گوشت چونکہ غربا میں تقسیم کیا جاتا تھا اس لیے اس قمار بازی کو بھی وہ لوگ باعثِ فضیلت سمجھتے۔ موجودہ زمانے میں گھڑ دوڑ لاٹری، انعامی سکیمیں وغیرہ سب جوئے کی مختلف اقسام ہیں۔ جو مختلف ناموں سے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ حالانکہ ہر قسم کی قمار بازی حرام ہے۔

حرمتِ شراب کے مراحل

شراب بیک حکم حرام نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی حرمت آہستہ آہستہ بتدریج ہوئی ہے۔ اس کے احکام مختلف مواقع پہ نازل ہوتے رہے، حتیٰ کہ چوتھے مرحلہ پہ اس کو قطعی حرام قرار دے دیا گیا ابتداءً اللہ تعالیٰ نے سورۃ نحل میں اشارتاً پھلوں کا ذکر کیا اور فرمایا "تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّ رِزْقًا حَسَنًا" تم ان سے نشہ آور اشیا مثلاً شراب وغیرہ بناتے ہو اور اچھا رزق یعنی چٹنی اچار مربے وغیرہ بھی بنا لیتے ہو۔ یہاں پر حلت و حرمت کا ذکر تو نہیں ہے مگر نشہ آور اشیاء کو "رِزْقًا حَسَنًا" (اچھی روزی) سے علیحدہ کر کے اُسے کم تر قرار دیا۔

دوسرے نمبر پہ اس درس والی آیت نازل ہوئی۔ کہ آپ سے شراب اور

جوئے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیں کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فوائد بھی ہیں۔ مگر ان کا گناہ ان کے فوائد سے بڑا ہے۔ یہاں پر حرمت شراب کا قطعی حکم نہیں ہے۔ بلکہ اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے۔ کہ فوائد کی نسبت اس کا نقصان بہت بڑا ہے۔ بوعلی ابن سینا کے قول کے مطابق شراب میں نقصان اس کے فائدے سے ڈبل ہے۔ یعنی اس کے ذریعے فائدہ تو ایک حصہ ہوتا ہے۔ مگر نقصان دو حصے کے برابر ہے۔

حرمت شراب سے متعلق تیسرے حکم کے پس منظر میں ایک واقعہ پیش آیا ایک انصاری کے ہاں بعض صحابہ کرامؓ کی دعوت تھی۔ ان میں حضرت سعدؓ بھی تھے۔ جو عشرہ مبشرہؓ میں شامل تھے۔ صحابہؓ نے کھانا کھایا۔ چونکہ اُس وقت تک شراب قطعی حرام نہیں ہوئی تھی، لہذا اس کا دور بھی چلا۔ آپس میں کسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی ایک گروہ کا نظریہ تھا کہ انصار زیادہ اچھے ہیں۔ دوسرا گروہ مہاجرین کے حق میں تھا۔ آپس میں دوست اور رفیق تھے محض ایک دوسرے کی برتری کا ذکر ہو رہا تھا اتنے میں ایک نوجوان کو غصہ آیا، اُس نے طیش میں آکر ایک جبڑا حضرت سعدؓ کے سر پر دے مارا، جس سے وہ زخمی ہو گئے۔

ترمذی شریف کی روایت میں ایک اور واقعہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ کہ ایک دعوت میں جلیل القدر صحابہ کرامؓ موجود تھے۔ جن میں حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف بھی شامل تھے۔ چونکہ ابھی تک شراب قطعی حرام نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اکثر لوگ پیتے تھے، مگر بعض نہیں بھی پیتے تھے۔ جیسے حضور علیہ السلام نے کبھی شراب نہیں پی۔ حضرت صدیق اکبرؓ اور عثمانؓ بھی اس کے قریب نہیں جاتے تھے ایسے اصحاب اسے وقار کے منافی سمجھتے تھے۔ اسے استعمال کرنے والوں میں حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ وغیرہم تھے۔ کہ ایک چیز مباح ہے لہذا استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ نماز کا وقت ہو گیا۔ لوگوں نے شراب پی رکھی تھی۔ ایک صحابی کو امامت کے لیے آگے کر دیا گیا۔ نشے کی حالت میں

قرآن پاک غلط پڑھا۔ اسی طرح مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ صبح کی نماز کا وقت تھا۔ حضرت عثمانؓ کے سالے حضرت ولیدؓ امامت کرا رہے تھے۔ نشے کا زور تھا دو رکعت پڑھا کر کہنے لگے اور پڑھا دوں۔ ایسے ہی واقعات کے پیش نظر سورۃ نساء کی آیت نازل ہوئی۔ "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ" یعنی اے اہل ایمان نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تمہارے ہوش و حواس بحال ہو جائیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ گویا تیسرے نمبر پہ نشے کی حالت میں نماز سے روک دیا گیا۔

روایات میں آتا ہے۔ کہ حضرت عمرؓ کو اس معاملے میں اکثر تشویش رہتی تھی۔ اور وہ دعا کیا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ بَیِّنْ لَنَا فِی الْخَمْرِ بَیَانًا شَافِیًا یعنی اے مولا کریم! اشارے کنایے سے تو شراب کی قباحت محسوس ہو رہی ہے، مگر ہمارے لیے کوئی واضح حکم نازل فرما، چنانچہ اب چوتھے مرحلے میں سورۃ مائدہ کی یہ آیت نازل ہوئی، جس میں شراب اور بعض دیگر اشیاء کو قطعی حرام قرار دیدیا گیا۔ "اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ"۔ اے ایمان والو! بیشک شراب، جوا، تھان اور پانسے شیطان کے ناپاک کام ہیں۔ ان سے بچ جاؤ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اس کے بعد شراب قطعی حرام ہو گئی تو یہ چار مراحل تھے۔ جن کے ذریعے شراب کو بتدریج حرام قرار دیا گیا۔

حرمتِ شراب پر تاویلیں

بعض نئی روشنی کے لوگ شراب کی حرمت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض دوسری حرام چیزوں کی طرح اس پہ حرمت کا واضح حکم نہیں لگایا گیا۔ جیسے مردار، خون وغیرہ کے متعلق فرمایا۔ "حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ"۔ مگر اس آیت میں لفظ "فَاجْتَنِبُوْهُ" آیا ہے۔ یعنی اس سے اجتناب کرو، بچ جاؤ حالانکہ اگلی ہی آیت میں مزید وضاحت کر دی گئی ہے۔ کہ شیطان شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی

اور بغض ڈالنا چاہتا ہے۔ فَانْتَهُوْا پس ان چیزوں سے باز آجاؤ۔ لہذا یہ بھی قطعی حرمت کا حکم ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ شراب اور خمر دو مختلف چیزیں ہیں۔ شراب، ہر پینے والی چیز پر بولا جاتا ہے۔ سورۃ "دھر" میں موجود ہے "وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا" جنتیوں کو ان کا رب پاک شراب پلائے گا۔ مگر وہ نشہ سے خالی ہوگی اور خمر نشہ آور چیز کو کہتے ہیں۔ اور وہ حرام ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ ہر نشہ آور چیز شراب کے زمرے میں آتی ہے۔ وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ اس لحاظ سے بھنگ، چرس، گانجا اور شراب کی تمام اقسام حرام ہیں۔ خواہ وہ معمولی درجہ کی ہوں یا اعلیٰ درجہ کی۔ انگور سے کشید کردہ ہوں یا کھجور سے۔ شہد سے بنی ہوں یا گندم یا جو سے وہ بہرحال حرام ہیں۔

صاحب تفسیر روح المعانی علامہ سید محمود آلوسی بغدادیؒ شاہ عبدالعزیزؒ کے ہم عصر ہیں۔ انہوں نے تیس ۳۰ جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیر لکھی ہے۔ وہ اپنے زمانے کا حال لکھتے ہیں۔ کہ لوگوں نے عجیب روش اختیار کرلی۔ شراب کو مختلف ناموں سے پکار کر استعمال کر رہے ہیں حالانکہ اس کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں۔ کسی نے عرق اکسیر نام رکھ لیا ہے۔ اور کوئی اسے آبِ جو کہتا ہے۔ مگر نام بدلنے سے ایک حرام چیز حلال نہیں ہوسکتی۔

اس بات کو انگریزوں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ کہ حرمت شراب کے متعلق اگر کسی کو کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ تو وہ صرف مذہب اسلام ہے۔ سر ولیم میور ہندوستان میں صوبجات متحدہ کا گورنر رہا ہے۔ بڑا متعصب عیسائی پادری تھا اس نے دو جلدوں میں حضور علیہ السلام کی سوانح حیات لکھی ہے۔ جس کا نام ہے لائف آف محمد (LIFE OF MUHAMMAD) مسلمانوں کے خلاف تعصب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ کہ دو چیزیں انسانیت کی دشمن ہیں۔ ایک محمد کی تلوار

اور دوسرا محمد کا قرآن۔ مگر اُس کو تسلیم کرنا پڑا۔ کہ شراب کی حرمت کے متعلق اسلام کے سوا کوئی مذہب کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ کہتا ہے۔ کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے باعثِ فخر ہے کہ انہوں نے شراب جیسی قبیح چیز کو واضح طور پر حرام قرار دیا اور بڑی حد تک اس سے محفوظ ہے۔

حرام چیز کی تجارت بھی حرام ہے

بہر حال سورۃ مائدہ کی مذکورہ آیت نازل ہونے پر شراب حرام ہو گئی۔ اور صحابہ کرامؓ نے کلی طور پر اس کو ترک کر دیا۔ اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ کہ لَعَنَ اللّٰہُ مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ وَاٰمُرُھَا الخ یعنی شراب پینے والا، پلانے والا، نچوڑنے والا، بنانے والا، اٹھا کر لے جانے والا، اس کو بیچنے والا اور اس کی کمائی کھانے والا سب لعنتی ہیں۔ پھر آپ نے فتح مکہ کے دن اعلان کیا۔ کہ جس خداوند تعالیٰ نے شراب پینے سے منع فرمایا ہے۔ اُسی خدا نے اس کی تجارت سے بھی منع کر دیا ہے گویا ہر حرام شے کی تجارت بھی حرام ہے۔ سود حرام ہے اس کا لین دین بھی حرام ہے۔ اسی طرح بتوں کی تجارت حرام ہے سور کی چربی کا بھی یہی حکم ہے۔ مگر اس زمانے میں سوائے سعودی عرب کے تمام اسلامی ممالک میں شراب استعمال ہوتی ہے۔ اس کی تجارت ہوتی ہے۔ لائسنس جاری ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں پابندی کا نام سنتے ہیں۔ وہ بھی زبانی حکم تک ہے عملی طور پر مختلف حیلوں بہانوں سے اس کے استعمال کی اجازت ہے۔

خرچ کی مقدار

آگے خرچ کے متعلق سوال اور اس کا جواب ہے وَ یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کس قدر خرچ کریں۔ یہ سوال گذشتہ سے پیوستہ درس میں بھی آ چکا ہے۔ وہاں پر اس کا جواب دیا گیا تھا۔ کہ فلاں فلاں مد پر خرچ کریں۔ مگر اس آیت کے جواب میں ہے۔ قُلِ الْعَفْوَ ط آپ کہہ دیجئے، جو اپنی ضرورت سے زائد ہے، وہ خرچ کر دیں۔ گویا اس سوال کا تعلق خرچ کی مقدار سے ہے۔ یہاں پر ضمنی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ حاجت سے زائد سب کچھ خرچ کر دینا فرض، واجب وغیرہ کی کس مد میں آئے گا۔ تو

اس کا جواب یہ ہے۔ کہ خرچ جس مد کے لیے کیا جائے گا، اُس کا شمار اسی میں ہو گا مثلاً اگر زکواۃ ادا کی گئی ہے۔ تو اس مد کا خرچ فرض ہو گا۔ اگر صدقہ فطر ادا کیا ہے یا کسی اور واجب پر خرچ کیا ہو گا۔ تو واجب شمار ہو گا۔ اسی طرح نفلی امور کا خرچ نفل شمار ہو گا۔ اگر کسی مباح کام میں خرچ کیا گیا ہے تو ایسا خرچ بھی مباح ہو گا اگر محض ثواب کی نیّت ہے، تو خرچ کنندہ کو ثواب حاصل ہو گا۔ برخلاف اس کے اگر کسی معصیت والے کام پر خرچ کر دیا ہے، تو ایسا خرچ حرام شمار ہو گا۔ اگر کسی مباح کام پر خرچ کیا ہے مگر ثواب کی نیت نہیں کی۔ تو ایسا خرچ جائز تصور ہو گا۔

چونکہ اس آیت میں ضرورت سے زائد چیز خرچ کرنے کا حکم ہے۔ اس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ فرض واجب کے متعلق نہیں کیونکہ زکواۃ وغیرہ کی مقدار تو مقرر ہے۔ مگر یہاں ہر زاید چیز کے خرچ کرنے کا حکم ہے تو اس سے مراد صدقہ خیرات اور دیگر نفلی اخراجات ہیں۔ بہر حال اس آیت سے ایک بات کی وضاحت ہوتی ہے۔ کہ اپنی ضرورت کو مقدم رکھتے ہوئے اس سے زائد مال کو خرچ کرو۔ اگر خود اپنے لیے، اپنے بال بچوں کی جائز ضروریات موجود ہیں۔ اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا، تو مت خرچ کرو۔ پہلے اپنی ضروریات پوری کرو، اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال کر حق تلفی نہ کرو۔ ہاں بعض خاص شخصیات ہیں۔ جیسے حضرت صدیق اکبرؓ جن میں صبر کا مادہ بدرجہ اتم موجود ہے تو ایسے شخص اللہ کی راہ میں سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ مگر جو شخص صبر کے اس مرتبہ پر نہ ہو، اُسے اپنی ضروریات کو مقدم رکھ کر خرچ کرنا ہو گا۔

ذخیرہ اندوزی کی ممانعت

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے۔ کہ ذخیرہ اندوزی درست نہیں ہے مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ یَا بْنَ اٰدَمَ اِنْ تُمْسِکْ شَرٌّ لَکَ اے آدم کے بیٹے، اگر چیز کو روک رکھو گے تو یہ تمہارے لیے شر ہو گا۔ اور اگر زاید حصہ کو خرچ کر دو گے، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔ وَلَا تُلَامُ عَلٰی کَفَافٍ اور اگر آمد و خرچ برابر ہیں۔ تو پھر زائد نہ

خرچ کرنے پہ کوئی ملامت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص فرائض ادا نہیں کرتا تو وہ عنداللہ ماخوذ ہوگا، اور اگر فرض کی ادائیگی کے بعد روک رکھا ہے۔ تو ثواب سے محروم ہو گیا۔ اگر ضرورت سے زائد موجود ہے مگر خرچ نہیں کرتا تو بخل کا مادہ پیدا ہوگا، ثواب سے محروم ہوگا۔ اور شر بہر حال ہوگا۔

غور وفکر کی دعوت

فرمایا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ اس طرح اللہ تعالے تمہارے لیے احکام بیان کرتا ہے۔ یہاں پہ آیات سے مراد احکام ہیں لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ تاکہ تم غور وفکر کرو، فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ دنیا اور آخرت کے بارے میں۔ دنیا محل حوائج ہے۔ یہاں پہ رہ کر انسان ضرورتوں اور حاجتوں پہ درماندہ ہوتا ہے۔ اس کا بھی لحاظ رکھو۔ اور آخرت تو ثواب دائمی کا محل ہے اس کا بھی خیال رکھو۔ مقصد یہ ہے۔ کہ دنیوی اور اُخروی دونوں ضروریات کو ذہن میں رکھو۔ نہ یہاں محروم رہو اور نہ وہاں، بلکہ ہر دو مقامات کے لیے لوازمات مہیا کرو۔ سورۃ بنی اسرائیل میں آتا ہے۔ کہ نہ ہاتھ کو زیادہ کھُلا رکھو کہ خود محتاج ہو جاؤ اور نہ اتنا سکیڑ کر رکھو کہ بخیل شمار ہو۔ بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ اپنی جائز ضروریات پوری کرو، اور اس کے بعد مال کو روک کر نہ رکھو۔ بلکہ غریبوں اور محتاجوں کو بھی انکا حق ادا کرو۔

جائز ضروریات میں انسان کے بنیادی اخراجات ہیں، جیسے کھانا، پینا، لباس صحت، تعلیم، رہائش وغیرہ ہیں۔ ان چیزوں پہ خرچ کرنے پہ کوئی پابندی نہیں۔ البتہ اگر ریڈیو، ٹیلیویژن، کھیل تماشہ کو بھی بنیادی ضروریات میں شمار کر لیا جائے، تو پھر انسان کے پاس کبھی کچھ نہیں بچے گا۔ یہ سامان تعیش ہے اور اس کی کوئی حد نہیں۔ اس زمانہ میں مکانوں کی بلا ضرورت زیبائش، ان میں قیمتی سے قیمتی فرنیچر، پردے، قالین، فرج وغیرہ سب بلا ضرورت ہیں۔ اور ان اشیاء پہ خرچ کرنا بلا جواز اور محتاجوں کی حق تلفی کے مترادف ہے۔ اور اگر اس دنیا میں سب کچھ اپنی ذات پہ ہی خرچ کر جاؤ، تو پھر آخرت میں محرومی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ دنیا و آخرت ہر دو مقامات کا خیال رکھو یہاں پر بھی جائز ضروریات سے محروم نہ رہو، اور آخرت کے لیے بھی توشہ تیار کرو۔

درس نود و یک (۹۱) — آیت ۲۲۰ بقیہ

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ
تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ
وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

ترجمہ :۔ اور لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے، انکی اصلاح کرنی اُن کے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم اُن کو اپنے ساتھ ملا لو، تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے خرابی پیدا کرنے والے کو سنوارنے والے سے۔ اور اگر اللہ چاہتا، تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔ بیشک اللہ کمال قوت کا مالک اور حکمت والا ہے۔ ﴿۲۲۰﴾

گذشتہ سے پیوستہ

اس سے پہلی آیات میں شراب اور جوئے نیز خرچ کے متعلق سوالات اور اُن کے جوابات تھے۔ پورے قرآن پاک میں کل بارہ یا تیرہ مقامات ایسے ہیں۔ جن میں اس قسم کے سوالات کا ذکر ہے۔ یعنی لوگ آپ سے فلاں سوال کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگ بالعموم اہل ایمان ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے صحابہ سے بہتر کوئی انسان نہیں ہے۔ وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم سے بہت کم سوال کرتے تھے۔ بکثرت سوال کرنے کی بجائے اصحاب رسول آپ کی بات کو نہایت غور سے سنتے تھے اور پھر اُس پر عمل شروع کر دیتے تھے۔ حضور علیہ السلام دین کی ضروری باتیں خود بخود بیان فرما دیا کرتے تھے۔ اس لیے اس قسم کے سوالات کی بہت کم ضرورت پڑتی تھی۔

گذشتہ درس میں شراب کی حرمت کے مختلف مراحل کا تذکرہ ہو چکا ہے

کہ یہ خبیث چیز کس طرح بتدریج حرام قرار دی گئی۔ اُس آیت میں تو شراب کے فوائد ونقصانات کا ذکرہ تھا۔ اس کی قطعی حرمت سورۃ مائدہ والی آیت کے ذریعہ ہوئی۔ اسی طرح جوئے کو بھی اسی آیت نے حرام قرار دیا۔ سابقہ آیت میں دوسرا سوال اخراجات کے متعلق تھا۔ کہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں۔ کہ کیا چیز خرچ کریں۔ اس کا جواب یہ تھا کہ چونکہ دنیا دار الحوائج ہے اس لیے اپنی جائز ضروریات کو پیش نظر رکھکر جو باقی بچ جائے وہ اللہ کی راہ میں خرچ کردو۔ اگر زاید مال کو روک رکھو گے تو تشر کا باعث ہوگا۔ ایک شخص کو کہیں سے سونے کا ایک ٹکڑا مل گیا۔ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش کرکے عرض کیا کہ میں اسے صدقہ کرتا ہوں آپ نے ناراضگی کا اظہار فرمایا اور سونے کو پھینک دیا۔ آپ نے تنبیہ کے طور پر فرمایا، کہ کوئی شخص ایسی حرکت کرتا ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے۔ صدقہ کردیتا ہے۔ اور پھر محتاج ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ حالانکہ وہ صبر بھی نہیں کرسکتا مقصد یہ کہ اپنی ضروریات کو مقدم رکھو کہ زاید مال خرچ کردو گویا دنیا و آخرت ہر دو مقامات کو پیش نظر رکھ کر خرچ کرو۔ تاکہ تمہیں اس دنیا میں بھی تنگی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور آخرت کے لیے بھی سامان کرسکو۔ عاصم ابن ابی النجودؒ کی روایت میں آتا ہے کہ مومن آدمی کو دونوں باتوں کی فکر ہوتی ہے۔ ھم المعاد وھم المعاش اس کو آخرت کی بھی فکر ہوتی ہے اور دنیا میں رزق حلال کی جستجو بھی۔

شان نزول آیت زیر درس میں یہ تیسرا سوال یتیموں کے متعلق اٹھایا گیا ہے وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى اور یہ لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں دراصل یتیموں کے مال کی حفاظت کے متعلق قرآن پاک میں بہت سی آیات نازل ہوئیں، عرب کے لوگ عام طور پر یتیموں کا مال غصب کرجاتے تھے۔ اُن کے متولی بن کر اُن کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا لیتے اور پھر حیلے بہانے سے اُن کا مال ناجائز طور پر ہضم کرجاتے۔ اللہ تعالے نے تاکید اً کئی ایک احکام نازل فرمائے۔ مثلاً "وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ" یعنی سوائے احسن طریقہ کے یتیم کے مال

کے قریب نہ جاؤ۔ دوسری جگہ فرمایا "اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا" یعنی جو لوگ ظلم کے ذریعے یتیموں کا مال کھاتے ہیں، دراصل وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں۔

ان آیات کے نزول پر صحابہ کرامؓ یتیموں کے مال کے متعلق بڑے محتاط ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے اُن کی آمدنی اور خرچ اپنے سے بالکل علیحدہ کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ملا کر کھانے پینے سے کہیں یتیم کے مال کا کوئی لقمہ سہواً بھی ہمارے پیٹ میں نہ چلا جائے۔ جس کی وجہ سے قابل مؤاخذہ ٹھہریں۔ ایسا کرنے سے دقت پیش آئی کہ بعض اوقات یتیم کا مال ضائع ہو جاتا تھا۔ مثلاً یتیم کے لیے علیحدہ سالن روٹی وغیرہ پکائی گئی۔ اس نے پورا کھانا نہیں کھایا اور وہ بچ گیا ہے۔ تو یتیم کا بچا ہوا کھانا وعید خداوندی کے پیش نظر خود نہیں کھاتے تھے۔ اس لیے وہ خراب ہو کر ضائع ہو جاتا تھا۔ ایسی صورت میں صحابہ کرامؓ یہ سوال کرنے پر مجبور ہو گئے جو اس درس میں بیان ہوا ہے۔

یتیم کی سرپرستی

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْیَتٰمٰی یہ لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہ ان کا مال آپس میں ملا کر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یا وہ بالکل الگ تھلگ رہنے دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا قُلْ آپ کہ دیجیے اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَیْرٌ اُن کے متعلق اصلاح کا کام ہی بہرحال بہتر ہے یعنی یتیموں کی بھلائی ہر حالت میں مقصود ہونی چاہیئے۔ اگر اُن کا آمد و خرچ بالکل علیحدہ رکھنا اُن کے لیے بہتر ہے۔ تو ایسا کر لو۔ اور اگر اپنے ساتھ ملا لینا اُن کے حق میں جاتا ہے۔ تو انہیں ساتھ ملانے کی بھی اجازت ہے۔ اس میں سہولت یہ ہو گی۔ کہ اگر کسی یتیم نے کسی ایک وقت میں مشترکہ کھانے میں سے کھانا استعمال نہیں کیا۔ تو وہ اس کے سرپرست استعمال کر لیں گے۔ اور اگلے دن یتیم اپنے سرپرست کا کھانا کھا لے گا۔ اور اس طرح یتیم کا مال ضائع نہیں ہو گا۔

اس ضمن میں مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں۔ کہ گلنے سڑنے والی یا خراب ہو جانے والی چیز کو یتیم کے مال کے ساتھ ملا لینا چاہیئے۔ تاکہ اس کا نقصان نہ ہو۔ اور جس چیز کے خراب ہونے کا احتمال نہیں۔ یتیم کی وہ چیز علیحدہ ہی رہنے دی جائے اسی لیے فرمایا۔ کہ اگر کوئی چیز ملا لینے میں یتیم کی بہتری ہے۔ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ یعنی اگر تم ان کو اپنے ساتھ ملالو تو فَاِخْوَانُكُمْ تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ انہیں ساتھ ملالو۔ یہاں پہ بھائی سے مراد دینی بھائی ہیں۔ یا دینی بھائیوں کی اولاد ہے۔ لہذا ان سے دینی بھائیوں کا سلوک ہونا چاہیئے۔ اور اگر ایسی صورت ہو۔ کہ یتیم تمہارا دینی بھائی نہیں ہے۔ کسی غیر مسلم کا بیٹا ہے۔ تو اس صورت میں بھی اس آیت کی رُو سے اس کے ساتھ وہی معاملہ کرنا ہوگا، جو اس کے حق میں بہتر ہے اور اس کے ساتھ وہی سلوک ہوگا، جو ایک مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے۔

یتیموں سے متعلق اسلام کے اس زریں اصول کو غیر مسلم انگریزوں نے بھی سراہا ہے ایک انگریز مصنف (باسورتھ سمتھ) لکھتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یتیموں پہ خاص نظر شفقت رکھتے تھے۔ کیونکہ آپ خود بھی یتیمی کے دَور سے گزر چکے تھے۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو یاد دلایا "اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی" کیا ہم نے آپ کو یتیم نہ پایا، اور پھر ٹھکانا دیا گیا۔ "فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ" لہذا یتیم کو ڈانٹنا بھی نہیں۔ بلکہ فرمایا انکے حق میں اصلاح بہتر ہے۔ اس سے مفسرین کرام نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے۔ کہ اگر یتیم کی تعلیم و تربیت کے لیے اس کو ڈانٹ بھی دیا جائے

تو جائز ہے کیونکہ اس کی اصلاح کے لیے ہے۔ البتہ یتیم کو مارنے یا دوسری ایذا پہنچانے سے نبی علیہ السلام نے سخت منع فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے۔ کہ جب یتیم روتا ہے۔ تو خدا تعالےٰ کا عرش کانپ جاتا ہے۔ لہذا ان کو مارنا پیٹنا درست نہیں۔ البتہ ان کی اصلاح کی خاطر ڈانٹ ڈپٹ جائز ہے۔

ایک امریکی مصنف رابرٹس نے اپنی کتاب" سوشل لاز آف دی قرآن"
SOCIAL LAWS OF THE QURAAN میں لکھا ہے کہ دیکھو حضرت محمد صلی
اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں یتیموں کی پرورش، اُن کی نگرانی اور رعایت کا کس قدر
خیال رکھا گیا ہے یہ اسلامی تعلیمات
کی برتری کا ثبوت ہے۔ کمزوروں کی دادرسی کی تاکید جس قدر اسلام نے کی ہے
کسی اور مذہب نے نہیں کی۔ اسلام نے یتیم، مسکین، مسافر، بیوہ، وغیرہ کے ساتھ
حسن سلوک اور اُن کی خدمت کا زبردست حکم دیا ہے بلکہ اُس سوسائٹی کو ملعون قرار
دیا ہے جس سوسائٹی میں کمزور طبقوں پر ظلم و زیادتی کی جاتی ہو۔ جو لوگ بے کسوں
کی دستگیری کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی رحمت کو اپنی طرف کھینچنے والے ہوتے ہیں

مفسد اور مصلح فرمایا یتیموں کی ہر حالت میں خیر خواہی چاہو۔ اور اس مقصد کے حصول کے
لیے انہیں الگ رکھو یا ساتھ ملا لو، یہ تم پر منحصر ہے۔ البتہ ایک بات یاد رکھو کہ تم جو
بھی فیصلہ کرو گے، اللہ تعالیٰ تمہاری نیتوں کو جانتا ہے۔ کہ تم نے یہ فیصلہ نیک نیتی
سے کیا ہے۔ یا بدنیتی سے۔ اس فیصلہ سے فساد مراد ہے یا اصلاح کا پہلو۔ وَاللّٰہُ
یَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ اللہ تعالیٰ فسادیوں اور اصلاح کنندگان سب
کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اُسے علم ہے۔ کہ تم جو بھی یتیموں کے متعلق فیصلہ کرتے
ہو۔ وہ کس نیت کے ساتھ کرتے ہو۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ اے مولا کریم
اِنَّكَ تَعْلَمُ خَائِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِى الصُّدُوْرُ تو آنکھوں کی خیانت
کو بھی جانتا ہے اور دلوں کے پوشیدہ رازوں سے بھی واقف ہے۔ جو کوئی
یتیموں کے متعلق بُری نیت سے معاملہ کرے گا، اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں ہے
ایسا شخص اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکتا۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے یہ حکم تمہاری آسانی کے لیے دیا ہے۔ کہ چاہو تو الگ
رکھو یا چاہو تو ساتھ ملا لو۔ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ و گرنہ اللہ چاہتا تو تمہیں
مشقت میں ڈال دیتا۔ اور حکم دیتا کہ یتیموں کا خرچ لازماً علیحدہ رکھو، پھر تمہارے

لیے معیار پر پورا اُترنا مشکل ہو جاتا اب اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے آسانی پیدا فرما دی ہے۔ کہ وہ کام کرو جس میں یتیموں کی بھلائی مقصود ہو۔ اِنَّ اللّٰہَ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست اور کمال قوت کا مالک ہے۔ وہ حکیم ہے۔ وہ انسانوں کی مصلحت کے مطابق حکم دیتا ہے۔ اس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے۔ جو انسانوں کی مصلحت کے خلاف ہو۔ لہٰذا اس کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے یتیموں کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھو۔

درس نود و دو (۹۲) | آیت ۲۲۱

وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ ۚ وَلَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا ؕ وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ؕ اُولٰٓٮِٕكَ يَدۡعُوۡنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدۡعُوۡٓا اِلَى الۡجَـنَّةِ وَالۡمَغۡفِرَةِ بِاِذۡنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمۡ يَتَذَكَّرُوۡنَ (۲۲۱)

ترجمہ :۔ اور مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں البتہ ایک ایماندار لونڈی مشرک عورت سے بہتر ہے، چاہے وہ تم کو کتنی اچھی معلوم ہو۔ اور نہ نکاح کرو مسلمان عورتوں کا مشرکوں کے ساتھ، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ البتہ ایک ایماندار غلام مشرک سے بہتر ہے، چاہے وہ تم کو اچھا معلوم ہو یہ لوگ (مشرک) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بلاتا ہے، جنت اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بیان کرتا ہے اپنے احکام لوگوں کے لیے، تاکہ وہ نصیحت قبول کر لیں (۲۲۱)

ربط آیات گذشتہ آیت میں یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کا بیان تھا۔ کہ اُن کے ساتھ وہ معاملہ کرنا چاہیئے، جو ان کے حق میں بہتر ہو۔ اور اُن کی اصلاح مقصود ہو، اُن کو کھانے میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کے طور پر فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ تمہاری نیتوں سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یتیموں کے متعلق تمہارا فیصلہ اصلاح پر مبنی ہے یا فساد پر۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے یتیموں کو اپنے ساتھ ملانے کی اجازت دے کر تم پر مہربانی فرمائی ہے ورنہ تم مشقت میں پڑ جاتے۔

مشرکین سے نکاح کی ممانعت

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نکاح جیسے اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور حکم دیا ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ نکاح محبت اور رافت کا معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں اور بیوی کے درمیان شفقت و محبت کو پیدا فرمایا ہے اگرچہ نفسانی تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں مگر اصل جوہر الفت و محبت ہے۔ جیساکہ دوسری جگہ فرمایا "وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً" ہم نے اُن کے درمیان رافت و رحمت کے جذبے کو پیدا کیا۔ لہٰذا اس پاکیزہ رشتے کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ کہ میاں بیوی ہم عقیدہ و ہم خیال ہوں ورنہ اس رشتہ کا قائم رکھنا ممکن نہیں۔ اسی لیے فرمایا مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اور پھر دلیل کے طور پر فرمایا وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ ایک مومنہ لونڈی مشرکہ آزاد عورت سے بہتر ہے۔ وَلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ اگرچہ مشرکہ عورت تمہیں کتنی اچھی لگے۔ معاشرے میں لونڈی کی حیثیت آزاد عورت کی نسبت کم تر ہے۔ مشرکہ اگرچہ آزاد ہو، مالدار ہو، حسن و جمال میں بھی خوب ہو، اس کے باوجود ایک مومنہ لونڈی اللہ کے ہاں بہتر ہے۔ اگرچہ اس کے پاس مال و دولت اور حسن بھی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جب مشرکہ کا دین الگ ہوگا، عقیدہ غلط ہوگا، تو میاں بیوی کی راہیں جُدا جُدا ہوں گی اور ان میں رافت و محبت کا وہ رشتہ قائم نہیں ہو سکے گا۔ جو نکاح کی غرض و غایت ہے۔ لہٰذا مومنوں کو منع فرما دیا کہ مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کریں۔

آگے مومنہ عورتوں کے لیے حکم دیا جا رہا ہے۔ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ان کے نکاح مشرک مردوں سے نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ جس طرح مومن مردوں سے مشرکہ عورتوں کا نکاح جائز نہیں، اسی طرح مومن عورتوں کا مشرک مردوں سے نکاح درست نہیں۔ آگے دلیل کے طور پر فرمایا وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ ایک مومن غلام مشرک

آزاد مرد سے بہتر ہے۔ وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ اگرچہ تمہیں مشرک بھلا معلوم ہو۔ یعنی مالدار ہو، صحت مند ہو، اور شکل وصورت میں بھی پسندیدہ ہو، مگر مشرک ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ نکاح جائز نہیں کیونکہ عقیدے کی خرابی کی وجہ سے میاں بیوی کا نباہ ممکن نہیں نیز قرآن پاک نے فیصلہ کر دیا ہے اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ "بیشک مشرکین ناپاک ہیں کیونکہ ان کا عقیدہ غلط ہے شرک کی غلاظت اُس کے دل و دماغ میں سرایت کر چکی ہے، جو کہ میاں بیوی کے مقدس رشتہ کے منافی ہے۔ لہٰذا نکاح کے لیے ایمان دار مرد تلاش کرو، جس کا عقیدہ درست ہو، اگرچہ وہ کم تر حیثیت کا مالک ہو۔

مولانا شیخ الہندؒ لکھتے ہیں۔ اور احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلی امتوں میں مومن مرد اور مشرکہ عورت یا مومنہ عورت اور مشرک مرد کا نکاح جائز تھا۔ نکاح کے معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویاں مشرکہ اور کافرہ تھیں۔ خود قرآن پاک نے گواہی دی ہے "كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ" وہ دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں، مگر اُن کا عقیدہ فاسد تھا۔ اب شریعتِ محمدیہ میں اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرما دیا۔ کہ نہ مومن مرد مشرکہ عورت سے نکاح کرے اور نہ مومنہ عورت مشرک مرد کے عقد میں جائے یہاں تک کہ مشرکین ایمان لے آئیں۔ ایسی صورت میں نکاح جائز نہ ہو گا۔

ارتداد ناقض نکاح ہے

یہاں پہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ نکاح کے بعد اگر کوئی مرد یا عورت مشرک ہو جائے یا مرتد ہو جائے۔ تو اس نکاح کی کیا حیثیت ہو گی جو بحیثیت مومن مرد اور مومنہ عورت ہوا تھا۔ اس کا جواب یہی ہے۔ کہ نکاح ٹوٹ جائے گا۔ اگر مرد مشرک ہو گیا ہے یا دہریہ ہو گیا ہے۔ تو عورت اُس کے مرتد ہونے کے وقت سے آزاد ہو جائیگی۔ البتہ نکاح ثانی کے لیے اُسے عدت گزارنا ہو گی۔ اگر عورت کو حیض آتے ہیں تو اس کی عدت تین حیض ہیں۔ اگر حیض نہیں آتے تو تین ماہ عدت گزارے گی اور اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔ عدت پوری کرنے کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔

شرک کیا ہے

شرک کی تعریف میں شاہ عبد القادر دہلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ فرماتے

ہیں شرک یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کے علم، قدرت یا اس کی کسی خاص صفت میں کسی دوسرے کو شریک کیا جائے۔ مثلاً اللہ تعالےٰ علمِ محیط کا مالک ہے۔ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطًا یعنی اس کا علم ہر چیز کو گھیرنے والا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی ہستی کا علم بھی ہر شے پر محیط ہے۔ اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ تو ایسا عقیدہ رکھنے والا مشرک ہو گیا۔ کیونکہ کائنات کے ذرہ ذرہ کا عالم ہونا اللہ کی صفت مختصہ ہے۔ اور اس میں غیر اللہ کی شرکت شرک ہے۔ اس زمانہ میں یہ عام عقیدہ ہے کہ ہمارے پیر یا فلاں بزرگ یا پیغمبر علیہ السلام کو ذرہ ذرہ کا علم ہے۔ یہی شرک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک اور صفتِ خاصہ قادر مطلق ہونا ہے۔ "وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ" گویا اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ لہٰذا وہ جو چاہے کر سکتا ہے اب اگر یہی صفت کسی غیر اللہ میں ثابت کی جائے کہ فلاں بھی جو چاہے کر سکتا ہے تو ایسا اعتقاد رکھنے والا مشرک ہو گیا۔ کیونکہ اس نے اللہ تعالےٰ کی خاص صفت اس کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے ثابت کی۔ اسی طرح "وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ" ہے۔ ہر چیز اللہ کی نگرانی میں ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ اگر یہی صفت کسی دوسرے میں مانی جائے تو شرک کا ارتکاب ہو گیا۔ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی صفات میں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی حلال و حرام کرنے کی مجاز ہے۔ تو ایسا شخص بھی خدا تعالیٰ کی صفت مختصہ میں شرک کا مرتکب ہوا۔ اس کی مثال اہل کتاب کی ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ کہ اہل کتاب کے علماء جس چیز کو حلال قرار دیں وہ ان کے نزدیک حلال ہے۔ اور جس کو حرام کر دیں، اس کو حرام مان لیتے ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہے۔ اسی طرح جو تعظیم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسا سجدہ کرنا، اگر ایسی ہی تعظیم یا سجدہ کسی غیر اللہ کے لیے کیا جائے تو شرک میں داخل ہو گا۔ مولانا شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ علم یا قدرت یا کسی دیگر صفت خداوندی میں

کسی غیر کو خدا کا مماثل سمجھنا، خدا کے مثل کسی کی تعظیم کرنا، یا کسی کو مختار سمجھ کر اُس سے حاجت طلب کرنا، ان تمام صورتوں میں ایسا عقیدہ رکھنے والا یا ایسا عمل کرنے والا مشرک تصور ہو گا۔ زمانہ جاہلیت میں مشرکین ایسا ہی کرتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے شرک کے متعلق فیصلہ کر دیا۔ اِنَّ الشِّرۡکَ لَظُلۡمٌ عَظِیۡمٌ "شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ جب تک مشرک سچے دل سے توبہ نہ کرے، یہ گناہ معاف نہیں ہو گا۔ اسی لیے میاں یا بیوی میں کوئی ایک بھی شرک کا مرتکب ہو گا تو اُن کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔

اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے

البتہ ایک اور مسئلہ یہاں پر قابلِ بیان ہے بعض دوسری آیات سے ثابت ہے کہ یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح درست ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس کی اجازت دی ہے۔ "وَالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ" اہل کتاب کی پاک دامن عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتا ہے۔ جب کہ زوجین اپنے اپنے دین پہ قائم رہیں۔ اگرچہ یہ پسندیدہ کام نہیں ہے۔ تاہم اس کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت عثمان رضؓ نے عیسائی عورت نائلہ ثعلبیہ سے نکاح کیا تھا بعد میں اللہ تعالےٰ نے اُسے توفیق بخشی اور وہ اسلام لے آئی۔ حضرت حذیفہ رضؓ نے ایک یہودی عورت سے نکاح کیا تھا۔ حضرت عمر رضؓ کو علم ہوا، تو انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ حضرت حذیفہ رضؓ نے پوچھا، کیا یہ نکاح ناجائز ہے۔ فرمایا: ناجائز تو نہیں مگر خطرناک ضرور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے نکاح میں بدکار عورتیں آجائیں اور تمہارا اخلاق بگڑ جائے۔ اور یہ بھی خطرہ ہے کہ وہ تم پر اس قدر اثر انداز ہوں کہ تمہارے دین میں بگاڑ پیدا ہو جائے۔ نکاح میں پیار و محبت کو بڑا دخل ہے، اور محبت میں آکر انسان بہت کچھ کر بیٹھتا ہے۔ لہٰذا حضرت عمر رضؓ نے حکم دیا کہ اس بی بی کو جدا کر دو یہ پسندیدہ فعل نہیں ہے۔ بہر حال یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے نکاح جائز ہے، بشرطیکہ وہ اپنے دین پہ قائم رہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مانتے ہوں اگرچہ وہ شرک بھی کرتے ہیں۔ مگر ملحد اور دہریہ نہ ہوں، جیسا کہ آجکل اکثر نصاریٰ ہیں۔ عام طور پہ تمام انگریزوں کو عیسائی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ان میں بہت سے

دہریہ ہوتے ہیں، جو نہ کسی کتاب کو مانتے ہیں۔ اور نہ حضرت عیسٰی علیہ السلام پہ ان کا ایمان ہے۔ ایسی عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔

نکاح کی طرح اہل کتاب کے ذبیحہ کو بھی حلال قرار دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کریں۔ اگر حضرت موسٰی علیہ السلام یا عیسٰی علیہ السلام کا نام لے کر ذبح کریں گے۔ تو جانور حلال نہیں ہو گا۔ حضرت مولانا شیخ الہندؒ جب مالٹا میں نظر بند و اسیر تھے تو وہ عیسائیوں کا ذبیحہ نہیں کھاتے تھے انہوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں زندہ جانور مہیا کیا جائے، جسے وہ خود ذبح کریں گے آپ فرماتے تھے کہ اُن کی پکی ہوئی روٹی تو کھالیں گے مگر ان کا ذبیحہ نہیں کھائیں گے، کیونکہ ہماری تحقیق کے مطابق یہ لوگ عیسائی نہیں، بلکہ دہریہ ہیں۔ بہرحال کافی تگ و دو کے بعد انگریزوں نے حضرت شیخ الہندؒ کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔

الغرض اس آیت کا خلاصہ یہ ہوا۔ کہ مسلمان مرد کا نکاح مشرک عورت سے درست نہیں تاوقتیکہ مسلمان نہ ہو جائے۔ اور اس آزاد مشرکہ سے ایک لونڈی بہتر ہے گویا ایک ادنےٰ سے ادنےٰ مسلمان، اعلیٰ سے اعلیٰ مشرک سے بہتر ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ طاقتور مسلمان بہتر ہے وَفِیْ کُلٍّ خَیْرٌ اور پھر ہر ایک میں بہتری ہے جو کافر اور مشرک میں نہیں، یعنی کمزور مسلمان طاقتور مشرک سے بہتر ہے۔ مشرکین سے جس قدر محبت کی جائیگی، اُسی قدر کفر و شرک سے نفرت میں کمی واقع ہو جائے گی اور یہ چیز اصل دین کو ضائع کرنے کا سبب بن سکتی ہے

دوزخ اور جنت کی طرف دعوت

اللہ تعالےٰ نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے۔ اُولٰٓئِکَ یَدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ کفار و مشرکین دوزخ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یعنی ایسے کام کرتے ہیں۔ جو دوزخ میں لے جانے کا سبب بنتے ہیں۔ ان کی تحریف، باطل رسومات شرک وغیرہ ایسے افعال ہیں جن کی وجہ سے دوزخ لازم ہو جاتا ہے۔ البتہ وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلَی الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ اللہ تعالےٰ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ نیکی اور توحید کی طرف بلاتے

ہیں۔ اور اس طرف آجاؤ اور شرکیہ افعال سے بچ جاؤ۔ فرمایا وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ
اللہ تعالیٰ اپنے احکام لوگوں کے پاس کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ
تاکہ وہ نصیحت پکڑلیں، راہِ راست پہ آجائیں اور دوزخ کے عذاب سے بچ جائیں۔

درس نود وسہ (۹۳) آیت ۲۲۲ تا ۲۲۳

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

ترجمہ: اور لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے وہ گندگی ہے۔ پس الگ رہو عورتوں سے حیض کے دوران۔ اور ان کے قریب مت جاؤ، یہاں تک کہ وہ پاک ہوجائیں۔ جب وہ خوب اچھی طرح پاک ہوجائیں۔ پس جاؤ ان کے پاس جہاں سے اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور پسند کرتا ہے طہارت حاصل کرنے والوں کو ﴿۲۲۲﴾ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں۔ تو جاؤ اپنی کھیتی میں جس طرح تم چاہتے ہو۔ اور آگے بھیجو اپنے نفسوں کے لیے اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور جان لو کہ بیشک تم اس سے ملنے والے ہو۔ اور خوشخبری سنا دے ایمان والوں کو ﴿۲۲۳﴾

ربط آیات

پچھلے رکوع میں مختلف مسائل کا ذکر تھا۔ اور سوالات کے جوابات تھے۔ خصوصاً شراب اور جوئے سے متعلق سوال کا جواب تھا۔ پھر شراب اور جوئے کی قباحت کا ذکر ہوا۔ پھر مال میں سے خرچ کرنے کے متعلق سوال آیا۔ اس کے جواب میں بنیادی قانون سمجھایا گیا۔ کہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے بعد خرچ کرنا چاہیئے۔ پھر یتیموں کی اصلاح اور ان کے خرچ کو اپنے ساتھ ملانے کے بارے میں سوال کیا گیا۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی۔ کہ یتیموں کے حق میں جو چیز بہتر ہو، وہ ہونی چاہیئے۔ ان کی اصلاح اور ان کے مال کی حفاظت بہرصورت پیش نظر رہنی چاہیئے۔ یتیموں کا مال کھانا، جوئے کی کمائی کھانا، شراب کو استعمال کرنا یا اس کا کاروبار کرنا، کسی کا حق ناجائز طور پہ کھانا۔ یہ سب چیزیں حرام ہیں۔ اسی طرح مومن مرد کا مشرکہ عورت کے ساتھ اور مومنہ عورت کا مشرک مرد کے ساتھ نکاح حرام قرار دیا گیا۔ ان تمام ناپاک افعال سے منع کیا گیا ہے۔ نکاح ہی کے ضمن میں عورتوں کے ایام ماہواری کا سوال پیدا ہوا۔ جس کا جواب اس آیت زیر درس میں دیا گیا ہے

عورتوں کے خون مختصہ

فقہائے کرام فرماتے ہیں الدماء المختصة بالنساء ثلاثة عورتوں کے مخصوص خون تین قسم ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم حیض کا خون ہے۔ جو تندرست عورت کے رحم سے ہر ماہ چند دن تک خارج ہوتا ہے۔ اس کا اخراج لازمی ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ خون بند ہو جائے۔ تو عورت طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ گویا یہ خون عورت کی تندرستی کی علامت ہے۔ جب تک عورت بالغ نہیں ہوتی۔ یہ خون شروع نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد جب حمل ٹھہر جاتا ہے۔ تو یہی خون بچے کی خوراک بنتا ہے۔ لہٰذا حمل کے دوران بھی خارج نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جب تک بچہ دودھ پیتا ہے۔ عموماً یہ خون رکا رہتا ہے۔ اور پھر جب عورت کبرسنی میں پہنچ جاتی ہے۔ یعنی تقریباً پچاس سال کی عمر میں جاکر یہ یہ خون ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حجۃ الوداع کے سفر میں حضرت عائشہ صدیقہؓ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھیں۔ جب آپ کا قافلہ مکہ معظمہ کے قریب سرف کے مقام پہ پہنچا، تو حضرت عائشہؓ کے ایام ماہواری شروع ہو گئے۔ ایام حج قریب تھے۔ اور آپ کو خدشہ پیدا ہوا کہ اس حالت کی وجہ سے وہ حج سے محروم نہ ہو جائیں۔ لہٰذا فرطِ غم سے رونے لگیں۔ حضور علیہ السلام تشریف لائے۔ تو فرمایا گھبراؤ نہیں هٰذا شیءٌ كتبهُ اللهُ علىٰ بناتِ آدم یہ ایک فطری چیز ہے

جسے اللہ تعالےٰ نے آدم کی بیٹیوں کے لیے لکھ دیا ہے۔ فرمایا حج کے ضیاع کا فکر
نہ کرو۔ تم احرام باندھ لو، حج کے تمام ارکان ادا کرو، سوائے اس کے کہ طواف کو مؤخر
کردو، کیونکہ اس کے لیے مسجد الحرام میں جانا ضروری ہے۔ اور وہاں ایسی حالت
میں نہیں جاسکتیں۔

عورت کے خون مختص کی دوسری قسم نفاس ہے یہ زچگی کے دوران آتا
ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد کم و بیش چالیس روز تک رہتا ہے۔ اس کے
بعد اُسے نفاس نہیں شمار کیا جاتا۔ عموماً یہ خون دس بیس دن یا مہینہ تک ختم ہو جاتا
ہے۔ حیض اور نفاس کے خون کے احکام مشترکہ ہیں۔ البتہ تیسری قسم کا خون استحاضہ
کہلاتا ہے۔ یہ بیماری کی وجہ سے آتا ہے۔ عورت کے رحم میں کوئی باریک سی رگ
پھٹنے سے خون رستا رہتا ہے۔ اس کا حکم الگ ہے۔

مدت حیض

حیض کی مدت کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ
امام سفیان ثوریؒ، امام محمدؒ اور امام ابویوسفؒ کہتے ہیں کہ حیض کی مدت کم سے کم تین دن
اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ اگر تین دن سے کم خون آکر ختم ہو گیا۔ تو وہ
حیض شمار نہیں ہو گا، بلکہ کسی بیماری وغیرہ کا اثر ہو گا۔ اسی طرح اگر دس دن سے
زیادہ عرصہ تک خون آتا رہا، تو وہ بھی حیض کے زمرہ میں نہیں آئے گا۔ بلکہ استحاضہ
ہو گا، برخلاف اس کے امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ حیض کی مدت ایک دن سے لے کر
پندرہ دن تک ہے۔ اور ان ایام میں حیض ہی کے احکام لاگو ہوں گے۔ عورت
نماز نہیں پڑھ سکے گی۔ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے مطابق تین دن سے دس دن
تک کی مدت کے علاوہ بھی اگر خون آتا ہے۔ تو عورت کو غسل کر کے نماز پڑھنا
ہو گی۔ ہندو مذہب میں بھی حیض کی مدت پندرہ دن تک ہے۔ البیرونی نے
کتاب الہند میں لکھا ہے۔ کہ ہندو لوگ بھی پندرہ دن تک حیض شمار کرتے ہیں۔

اس مسئلہ میں دیگر مذاہب میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ مثلاً عیسائی حیض
کی حالت میں عورت سے جماع کر لیتے تھے۔ برخلاف اس کے یہودی، مجوس

اور ہندومت والے حائضہ سے اس قدر نفرت کرتے تھے۔ کہ اُسے گھر سے نکال دیتے نہ وہ کسی چیز کو ہاتھ لگا سکتی اور نہ کھانا پکا سکتی۔ بلکہ یہودیوں کی خود ساختہ تورات میں موجود ہے۔ کہ اگر حائضہ عورت کسی شخص کے کپڑے کو ہاتھ لگا دے۔ تو وہ شخص چوبیس گھنٹے کے لیے ناپاک ہو جائے گا۔ جو کوئی ایسے کپڑے کو دھوئے گا وہ بھی پورے دن کے لیے پلید ہو جائے گا۔

سوال و جواب

افراط و تفریط کے اس دور میں صحابہ کرامؓ کو حیض کے متعلق احکام الٰہی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ اسی سوال کے متعلق فرمایا وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ط اے پیغمبر علیہ السلام یہ لوگ آپ سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہ آیا ان ایام میں عورت کے قریب جانا چاہیئے یا نہیں۔ یا اس سے تعلق بالکل ہی قطع کر لینا چاہیئے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ یعنی اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے کہہ دیں، هُوَ اَذًى یہ گندگی ہے۔ اَذًى اس گندگی کو کہتے ہیں۔ جو تکلیف دہ ہو یعنی یہ سخت ناپاکی کی حالت ہے فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ لہذا حیض کی حالت میں عورت کے قریب نہ جاؤ۔ مطلب یہ کہ ان ایام میں مباشرت کرنا حرام ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حیض کی حالت میں عورت سے جماع کرتا ہے اور اسے حلال بھی جانتا ہے تو وہ کافر ہو گیا۔ کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے قطعی حکم کو توڑ دیا ہے۔ اور اگر نفسانی اور شیطانی غلبہ سے یہ کام کیا ہے۔ تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ ایسی غلطی کرنے والے کو توبہ کرنی چاہیئے۔ استغفار کرے اور ایک دینار یا نصف دینار صدقہ دے۔

طبی لحاظ سے بھی حیض کے دوران جماع کرنا میاں بیوی کے لیے مضر صحت ہے۔ یہ خون بعض اوقات بدبودار بھی ہوتا ہے۔ اس کی رنگت بھی بسا اوقات سیاہی مائل یا مٹیالی ہوتی ہے۔ لہذا اس حالت میں عورت سے پرہیز

کرنا چاہیئے۔ البتہ یہودیوں کی طرح یہ بھی نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ عورت کو بالکل ہی گھر سے الگ کر دیا جائے۔ کہ کسی چیز کو ہاتھ بھی نہ لگا سکے۔ اسلام میں ایسا نہیں ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ اس آیت میں عورتوں سے الگ رہنے کا مطلب یہ ہے اُن سے مباشرت نہ کرو۔ اس کے علاوہ عورتیں کھانا پکا سکتی ہیں۔ تم اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہو۔ ایک چارپائی پہ لیٹ سکتے ہو۔ ان سے دیگر خدمات لے سکتے ہو۔ تاہم ناف سے لیکر گھٹنے تک کے حصہ کو نہ ہاتھ لگا سکتے ہو اور نہ دیکھ سکتے ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حیض کی حالت میں ام المؤمنین حضور علیہ السلام کا سر مبارک دھو ڈالتی تھیں۔ الغرض! اسلام نے اس معاملہ میں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے بہتر اور درمیانہ راستہ اختیار کیا ہے۔

حائضہ کے احکام

حیض والی عورت کے لیے حکم یہ ہے۔ کہ وہ اس حالت میں نماز نہیں پڑھ سکتی، اُس کے لیے حرام ہے۔ اسی طرح روزہ بھی نہیں رکھ سکتی۔ اس کے لیے نماز کی قضا بھی نہیں ہے۔ البتہ روزے کی قضا لازم ہے۔ حائضہ عورت کا مسجد میں داخلہ منع ہے اسی لیے طواف بھی نہیں کر سکتی۔ قرآنِ کریم کو ہاتھ نہیں لگا سکتی کیونکہ ناپاک ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ حیض و نفاس والی عورت یا جنابت والی عورت یا مرد قرآن پاک کو نہ چھو سکتے ہیں اور نہ اس کی تلاوت کر سکتے ہیں۔ البتہ درود شریف پڑھ سکتے ہیں۔ دیگر وظائف استغفار بسم اللہ وغیرہ کا ورد کر سکتے ہیں فرمایا وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں فَاِذَا تَطَهَّرْنَ اور جب وہ اچھی طرح پاکیزگی حاصل کر لیں۔ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی خوب طہارت حاصل کر لیں، غسل جنابت کے سلسلہ میں بھی یہی صیغہ استعمال ہوا ہے فَاطَّهَّرُوْا یعنی خوب اچھی طرح غسل کیا جائے۔ حتیٰ کہ بال برابر جگہ بھی خشک نہ رہے۔ حیض و نفاس سے طہارت کا مطلب بھی یہی ہے۔ کہ خوب اچھی طرح غسل کیا جائے۔ کیونکہ حضور نے فرمایا کہ ہر بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے۔ لہٰذا خوب مل مل کر بڑے اہتمام سے غسل کرنا چاہیئے۔ جب یہ چیز حاصل ہو جائے۔

فَأْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللّٰهُ پس جاؤ ان کے پاس جہاں سے اللہ نے
تمہیں حکم دیا ہے۔ یعنی جب عورتیں پاک صاف ہو جائیں تو پھر تم مباشرت کر سکتے ہو
اس ضمن میں امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ کل مدت حیض یعنی دس دن گزرنے کے بعد
اگر کوئی شخص عورت کے غسل کیے بغیر بھی مباشرت کرے تو کوئی حرج نہیں۔ اور اگر
ان دس ایام کے اندر خون بند ہو گیا ہے۔ تو پھر جب تک عورت غسل نہ کر لے یا ایک
نماز کا وقت نہ گذر جائے مباشرت جائز نہیں ہو گی۔

توبہ اور پاکیزگی

فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ بے شک اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو پسند
کرتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے معافی مانگتا ہے
اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو جاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا كُلُّكُمْ خَطَّاءُوْنَ
تم سب کسی نہ کسی لحاظ سے خطا کار ہو۔ چھوٹی موٹی غلطیاں ہو جاتی ہیں وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ
التَّوَّابُوْنَ اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کر لیتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ عاجزی کرنے
والوں، استغفار کرنے والوں اور معافی مانگنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ فرمایا وَيُحِبُّ
الْمُتَطَهِّرِيْنَ اور اللہ تعالیٰ پاکیزگی اور طہارت حاصل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے
یہاں پاکیزگی سے مراد ہر قسم کی پاکیزگی ہے۔ جس میں جسم، لباس، خوراک، مکان حتیٰ کہ
عقیدہ و نظریات کی پاکیزگی بھی مقصود ہے۔ طہارت کا اصول ——
اتنا اہم اصول ہے۔ کہ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ چار چیزیں تمام ادیان میں اٹل
رہی ہیں اور ہمارے دین میں بھی ہیں۔ نمبر ایک طہارت جس کا بیان آچکا ہے دوسرے
نمبر پہ اخبات ہے جس کا مطلب خدا کے سامنے عاجزی کا اظہار ہے۔ نماز،
روزہ، حج، اور ذکر و اذکار سب اخبات کا حصہ ہیں۔ تیسری چیز سماحت ہے
یعنی خسیس اور حقیر چیزوں سے بچ جانا منجملہ ان کے ہر قسم کا گناہ، اللہ تعالیٰ کی حرام
کردہ اشیاء، کفر و شرک، حسد، بغض، لالچ وغیرہ ان چیزوں سے اعراض
کرنا سماحت کہلاتا ہے۔ اور آخری چیز ہے۔ عدالت۔ پوری زندگی کے ہر مرحلہ
پہ عدل و انصاف کا دامن تھامے رہنا اور کسی سے ظلم و زیادتی نہ کرنا۔ یہ تمام

امتوں کے مشترکہ اصول ہیں۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ پاکیزگی کے اصول میں عقیدہ کی پاکیزگی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سورۃ مدثر میں آتا ہے وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ یعنی دل و دماغ سے کفر و شرک اور بدعت کی گندگی کو نکال باہر کرو۔ جب تک عقیدہ پاک نہیں ہو گا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کچھ کام نہ آئے گا۔ لہٰذا اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیئے ایک اور اہم طہارت مال کی طہارت ہے جس مال سے انسان خوراک کھاتا ہے لباس پہنتا ہے، امکان بناتا ہے۔ وہ مال بھی پاک ہونا چاہیئے۔ چوری، خیانت رشوت، اور بلیک کا مال اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔ اسی طرح جس مال سے زکوٰۃ نہیں نکالی گئی وہ مال بھی پاک نہیں ہے۔ ایسے مال سے اللہ تعالیٰ صدقہ قبول نہیں کرتا ایسے شخص کی عبادت قبول نہیں کرتا۔ ایسا شخص مرگیا تو اپنے پیچھے جہنم کے راستہ کا توشہ چھوڑ گیا۔

عورت بمنزلہ کھیتی

آگے ایک اور مسئلہ بیان فرمایا۔ عورت کو کھیتی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے ارشاد ہوا۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ تمہاری عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتی کے ہیں فَأْتُوا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ پس جاؤ اپنی کھیتیوں میں جس طرح چاہو۔ اس مقام پہ عورت کو کھیتی کہہ کر اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھا دی کہ مرد کا نطفہ بمنزلہ تخم کے ہے اور اولاد بمنزلہ پیداوار کے ہے۔ جس طرح زمین میں بیج ڈالا جاتا ہے اور اس سے فصل پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح مرد کا یہ قطرہ آب عورت کے رحم میں جاکر بچے کی پیدائش کا سبب بنتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اولاد جبھی ہوگی جب نطفہ اصل مقام میں جائے گا۔ لہٰذا دوسرے مقام میں مباشرت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے متعلق سخت وعید آئی ہے۔ فرمایا مَنْ اَتَى امْرَاَةً فِىْ دُبُرِهَا فَقَدْ كَفَرَ بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی جس شخص نے عورت کے ساتھ پیچھے کے راستے مباشرت کی اس نے محمدؐ کی شریعت کا انکار کر دیا۔ وہ باغی اور مجرم ٹھہرا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اَنّٰى شِئْتُمْ

سے جماع کی کیفیت مراد ہے۔ یعنی تم جس طرح بھی پسند کرو مثلاً لیٹ کر یا بیٹھ کر یا کروٹ کے بل یا پیچھے سے ہو کر۔ مگر شرط یہ ہے۔ کہ فِی صِمَامٍ وَاحِدٍ مقام ایک ہی ہو دوسرے مقام کے استعمال کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پہ کھیتی کا لفظ لا کر ان سب باتوں کی وضاحت فرمادی

نیک اولاد صدقہ جاریہ

فرمایا وَقَدِّمُوا لِاَنْفُسِكُمْ اپنے نفسوں کے لیے کچھ آگے بھی بھیجو۔ یعنی اگلے جہان کے لیے بھی نیکی کا کچھ فکر کرو۔ نیت صحیح ہونی چاہیئے۔ مباشرت سے مقصود محض شہوت رانی ہی نہ ہو، اگرچہ یہ بھی روا ہے۔ مگر اس کا اصل مقصد اولاد کی پیدائش ہونا چاہیئے۔ اگر صالح اولاد ہوگی۔ تو وہ تمہارے پیچھے صدقہ جاریہ ہوگی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اَوْ وَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُو لَهٗ نیک اولاد ہوگی تو تمہارے لیے دعا کرے گی، جو تمہارے لیے ذخیرہ آخرت ہوگا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اور اللہ سے ڈرو۔ کہیں اس کے قانون کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھنا۔ اس نے طہارت اور مباشرت تک کے قانون واضح کر دیئے ہیں اب اُن سے روگردانی نہ کرنا۔ ایام حیض میں مباشرت سے نہ صرف اخلاق بگڑ جائے گا۔ بلکہ طرح طرح کی بیماریاں بھی لاحق ہو سکتی ہیں وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ اور یاد رکھو، ایک نہ ایک دن تمہیں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنی ہے۔ اس کے حضور پیش ہونا ہے۔ وہ ایسا دن ہوگا يَوْمَ تَاْتِيْ كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا جب ہر شخص خود اپنے نفس سے سوال و جواب کرے گا۔ درمیان میں کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ نہ کوئی وکیل ہوگا۔ اور نہ کوئی ساتھی۔ اپنی جوابدہی آپ ہی کرنا پڑے گی۔ اور آخری جملہ فرمایا وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ جو اہل ایمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اور قیامت کے دن پہ یقین رکھتے ہیں۔ پیغمبر پہ ان کا ایمان ہے۔ احکام الٰہی پہ یقین رکھتے ہیں۔ اس کے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ انہیں خوشخبری سنا دیں کہ اللہ کے نزدیک ان کے لیے فلاح و کامیابی کے دروازے کھلے ہیں۔

درس نود و چہار (۹۴) — آیت ۲۲۴ تا ۲۲۷

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کے پاک نام کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ کہ تم نیکی نہیں کرو گے۔ پرہیزگاری اختیار نہیں کرو گے اور یہ کہ تم لوگوں کے درمیان صلح نہیں کراؤ گے۔ بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۲۲۴﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری بیہودہ قسموں میں نہیں پکڑتا۔ لیکن اُن قسموں پہ پکڑتا ہے۔ جن پر تمہارے دل قصد کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا بردبار ہے ﴿۲۲۵﴾ اُن لوگوں کے لیے جو اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں، چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر وہ اس دوران میں لوٹ آئیں، تو بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے ﴿۲۲۶﴾ اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں تو بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۲۲۷﴾

ربطِ آیات

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ حیض کی وضاحت فرمائی کہ ایسی حالت میں عورت سے مباشرت حرام ہے۔ تاہم طہارت حاصل کر لینے کے بعد عورتوں کے پاس جانے کی اجازت ہے۔ اس سے گذشتہ آیت میں مشرک

مرد اور مشرکہ عورتوں سے نکاح کی ممانعت فرمائی تھی۔ اس سے پہلے یتیموں کے مال سے متعلق مسائل تھے۔ اور انہیں ساتھ ملانے کی اجازت دی تاہم فرمایا کہ ہر حال میں یتیموں کی اصلاح پیش نظر ہونی چاہیئے۔ محتاجوں کی اعانت کے متعلق بھی حکم آچکا ہے کہ اپنی جائز ضرورت سے زاید مال مستحقین پر خرچ کر دو۔ ضرورت سے زیادہ مال رکھنا شر کا باعث ہے۔ اس سے پہلے شراب اور جوئے کی حرمت کا بیان بھی آچکا ہے۔ کہ یہ سب ناپاک چیزیں ہیں۔ اور ہر برائی کی جڑ ہیں۔

مسئلہ قسم

گذشتہ درس کی آیات میں متذکرہ قبیح چیزوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس درس کی آیات میں لوگوں میں پائی جانے والی ایک اور بری بات کا ذکر فرمایا ہے اور وہ ہے نیکی کا کام نہ کرنے پر اللہ کی قسم اٹھانا۔ قسم کے متعلق احکام مختلف سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ آیات اور سورۃ مائدہ کی آیات ہیں۔ قرآن و حدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قسم اٹھانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اگر کوئی سچا ہو اور قسم اٹھائے بغیر چارہ بھی نہ ہو، تو ایسی صورت میں قسم اٹھانے کی اجازت ہے۔ اور اس میں شرط یہ ہے کہ قسم اللہ کے کسی نام یا اس کی صفت کے ساتھ اٹھائی جائے کسی انسان، جن، نبی یا کسی اور چیز کی قسم نہیں اٹھانی چاہیے۔ کیونکہ مَنْ اَقْسَمَ بِغَیْرِ اللّٰہِ فَقَدْ اَشْرَکَ جس نے غیر اللہ کی قسم اٹھائی اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔ اور اگر ایسی قسم اٹھانے والا شخص اس غیر اللہ کی ایسی ہی تعظیم کرتا ہے جیسی اللہ کی کرنی چاہیئے یا اس کی صفت کو ویسی ہی جانتا ہے۔ جیسی اللہ کی صفت، تو پھر ایسے شخص نے حقیقتاً شرک کیا۔ اور مشرک یا کافر ہوگیا۔ اور اگر حقیقی تعظیم غیر اللہ مراد نہ ہو پھر بھی غیر اللہ کی تعظیم میں شبہ ہوگا اس لئے مناسب نہیں کہ کسی حال میں بھی غیر اللہ کی قسم اٹھائی جائے اور مطلقاً بھی قسم اچھی نہیں لہذا بہتر یہی ہے۔ کہ حتی الامکان قسم اٹھانے سے گریز کیا جائے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ کہ میں نے پوری زندگی میں کبھی قسم نہیں اٹھائی

ناجائز قسم کی ممانعت

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ جائز امور میں تو قسم اٹھانے کی اجازت ہے مگر بری باتوں میں قسم مت اٹھاؤ۔ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ

اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ ان امور میں اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ کہ تم نیکی نہیں کرو گے، پرہیزگاری اختیار نہیں کرو گے یا لوگوں کے درمیان صلح نہیں کراؤ گے۔ فرمایا یہ تو بہت بُری حرکت ہے کہ ایک اچھائی کے کام میں اللہ کی قسم کھاتے ہو کہ ہم یہ نیکی کا کام نہیں کریں گے۔ یہ تو بہت ہی بُری بات ہے یا مثلاً کوئی اس بات کی قسم اٹھائے کہ میں والدین سے کلام نہیں کرونگا۔ یا کسی محتاج کی اعانت نہیں کروں گا یا کوئی قرض ادا نہیں کروں گا تو فرمایا ایسا نہ کرو۔ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ اللہ تعالےٰ سُننے والا ہے۔ لہٰذا کوئی ایسی بات زبان پہ نہ لاؤ جو قابلِ مواخذہ ہو۔ اور وہ عَلِیْمٌ بھی ہے۔ جو دِلوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔ اس کا علم ہر چیز پہ محیط ہے۔ وہ تمہاری نیتوں سے بھی واقف ہے کہ کوئی کام تم اچھی نیت سے کر رہے ہو یا بُری نیت سے۔ لہٰذا اپنا دِل قابو میں رکھو۔ اور اس میں کوئی بُرا خیال نہ آنے دو۔ زبان پر کنٹرول ہونا چاہیئے۔ زبان سے کوئی بُری بات نہ نکلے۔ کیونکہ اللہ تعالےٰ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ تم اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

قسم کی تین قسمیں

فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ قسم کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یمین لغو ہے۔ جو بغیر ارادے کے زبان سے نکل جائے۔ ایسی قسم پہ کوئی مواخذہ نہیں اور نہ ہی کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس پہ آخرت میں بھی کوئی گرفت نہیں۔ ہاں اگر دِل کے ارادے سے قسم اٹھائی جائے بِمَا کَسَبَتْ قُلُوْبُکُمْ ایسی قسم پہ یقیناً مواخذہ ہوگا۔

دوسری قسم یمین غموس ہے۔ غمس کا معنیٰ کسی گناہ میں غوطہ مارنا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی گذشتہ واقعہ کے متعلق دیدہ دانستہ غلط قسم اٹھاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں شخص میرے پاس آیا تھا۔ مگر حقیقت میں وہ نہیں آیا تھا تو ایسی قسم غموس کہلاتی ہے۔ اس میں اگرچہ کفارہ نہیں ہے۔ مگر قسم اٹھانے والا گنہگار ہوتا ہے۔ اور آخرت میں قابلِ مواخذہ ہے۔

قسم کی تیسری قسم یمین منعقدہ ہے۔ یعنی کوئی شخص آنے والے زمانہ کے لیے

قسم اٹھائے کہ میں فلاں کام کروں گا یا فلاں کام نہیں کروں۔ اگر ایسی قسم جائز کام سے متعلق ہے اور اُس نے قسم کو پورا بھی کر دیا، تو وہ بری ہو گیا۔ اگر اُس نے قسم کو توڑ دیا ہے۔ تو کفارہ دینا پڑے گا۔ اور قسم کسی ناجائز کام سے متعلق اٹھائی ہے تو قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔

قسم کا کفارہ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشادِ گرامی ہے۔ کہ جب میں کسی بات پر قسم کھا لیتا ہوں اور پھر دیکھتا ہوں کہ دوسری بات زیادہ بہتر ہے۔ تو قسم توڑ کر کفارا ادا کر دیتا ہوں۔ ایک موقع پر مشہور صحابی حضرت ابُو موسیٰ اشعریؓ نے عرض کیا، حضور! ہم جہاد پر جانا چاہتے ہیں، ہمارے لیے سواری کا انتظام فرما دیں۔ آپ نے فرمایا وَاللّٰهِ لَا اَحْمِلُكُمْ۔ اللہ کی قسم میں تم کو کسی سواری پر سوار نہیں کراؤں گا۔ صحابی خاموش ہو کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو بلا کر اونٹ ان کے حوالے کر دیے۔ انہوں نے عرض کیا حضور آپ نے تو قسم کھائی تھی کہ آپ ہمیں سوار نہیں کریں گے۔ اور میں نے اپنے ساتھیوں سے بھی کہہ دیا کہ آپ نے یہ قسم اٹھالی ہے۔ حضور! اگر اب میں اونٹ لے گیا تو اپنے ساتھیوں میں جھوٹا ثابت ہوں گا، حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ جب میں کسی معاملے میں قسم اٹھا لیتا ہوں اور پھر دیکھتا ہوں کہ دوسری بات بہتر ہے۔ تو قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دیتا ہوں۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص ایک بات پر اصرار نہ کرے جب کہ دوسری بات بہتر ہو۔ اس کو چاہیئے کہ ایسی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے۔

قسم کا کفارہ سورۃ مائدہ میں مذکور ہے قسم توڑنے والا ایک غلام آزاد کرے۔ غلامی کا رواج اب ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا یہ کفارہ تو اب ادا نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ یہ کہ دس مسکینوں کو اتنا کپڑا پہنا دیا جائے، جس میں وہ نماز ادا کر سکیں۔ یا دس مساکین کو دو وقت اوسط درجے کا کھانا کھلایا جائے۔ نہ زیادہ اچھا ہو اور نہ بُرا ہو۔ سادہ گوشت روٹی کھلا دینا کافی ہو گا۔ اگر اتنی استطاعت بھی نہ ہو، تو پھر تین دن

۱؎ مسلم صفحہ ۴۷/۲ (فیاض)

کے مسلسل روزے رکھے۔ ان چاروں صورتوں سے قسم کا کفارہ ادا ہوتا ہے۔

الغرض! فرمایا لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ اللہ تعالیٰ تمہاری لغو قسموں پر مؤاخذہ نہیں کرتا وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ بلکہ ان قسموں پر مؤاخذہ کرتا ہے جو تم دل کے ارادے سے اٹھاتے ہو، لہٰذا کثرت سے قسمیں نہیں اٹھانا چاہئیں جو کوئی ایسا کریگا، اُسے ان احکام کی پابندی کرنا ہوگی۔ ہاں! اگر کوئی شخص ایسی کوتاہی کرنے کے بعد اللہ تعالےٰ سے معافی مانگ لے اور مذکورہ احکام کے تحت کفارہ ادا کر دے تو وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ اللہ تعالےٰ بخشنے والا اور بردبار ہے مگر ایک بات یاد رہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اس کی بردباری سے انسان کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیئے۔ بلکہ ہمیشہ اللہ تعالےٰ سے ڈرتے رہنا چاہیئے۔ کہ کہیں اس کی گرفت میں نہ آجائے۔

مسئلہ ایلاء

اس سے پیشتر حیض کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے کہ حیض کے دوران عورت کے قریب جانا حرام ہے۔ اب اسی نوعیت کا ایک اور مسئلہ بیان ہو رہا ہے جسے ایلاء کہتے ہیں۔ ایلاء کا لغوی معنیٰ قسم اٹھانا ہے اور مراد اس سے یہ ہے کہ کوئی شخص اس امر کی قسم اٹھائے کہ وہ اپنی عورت کے قریب نہیں جائیگا۔ اس کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) مطلقاً قسم اٹھائے کہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔

(۲) چار ماہ کی مدت مقرر کرے کہ اتنا عرصہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔

(۳) چار ماہ سے زیادہ مثلاً پانچ، چھ، آٹھ ماہ کے لیے قسم کھائے کہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔

(۴) چار ماہ سے کم مدت ایک، دو، تین ماہ تک کے لیے قسم کھائے کہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔

چوتھی صورت یعنی چار ماہ سے کم مدت کے ایلاء کو شرعی ایلاء نہیں کہا جاتا اگر مقررہ مدت تک ایسا شخص عورت کے قریب نہیں گیا تو قسم سے بری ہو جائے گا۔

اور اگر اس دوران عورت سے مقاربت کر لی۔ تو قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ باقی تین صورتوں میں حکم یہ ہے۔ کہ ایسے شخص کو قسم توڑ دینی چاہیئے اور اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیئے۔ اور اگر چار ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اور قسم کھانے والا شخص عورت کے پاس نہیں گیا، تو پھر ایلاء مؤثر ہوگیا۔ البتہ اس کے حکم میں فقہائے کرام کے مختلف اقوال ہیں۔

امام ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کا قول ہے۔ کہ ایسی صورت میں ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔ اب اگر مرد دوبارہ رجوع کرنا چاہے تو اُسے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا ہوگا۔ اگر رجوع کا کوئی ارادہ نہیں تو عورت آزاد ہے، عدت گزرنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔

البتہ ائمہ ثلاثہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ چار ماہ کی مدت گزرنے کے بعد طلاق خود بخود واقع نہیں ہوگی، بلکہ حاکم وقت اُس شخص کو عدالت میں طلب کر کے اُسے مجبور کریگا۔ کہ یا تو وہ رجوع کرلے یا طلاق دے دے۔ دونوں صورتوں میں جو بھی فیصلہ ہوگا۔ اُس کے مطابق عمل ہوگا۔

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ شرعی ایلاء اُس صورت میں قائم ہوگا جب عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی گئی ہو۔ اگر قسم نہیں کھائی ویسے ہی کہ دیا کہ بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ تو یہ ایلاء شمار نہیں ہوگا۔ بعض مفسرین (جیسا صاحب تفہیم القرآن کو مغالطہ ہوا ہے اور اس نے غلط مسئلہ لکھا ہے) کو مغالطہ ہوا ہے۔ جو کہتے ہیں۔ کہ بغیر قسم کے بھی ایلاء ہو جاتا ہے۔ حالانکہ حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے۔ کہ ایلاء کے لیے قسم اٹھانا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص ویسے ہی ایک دو سال کے لیے علیحدہ رہے تو ایلاء قائم نہیں ہوگا۔ لغوی اعتبار سے بھی قسم ضروری ہے کیونکہ ایلاء کا معنیٰ ہی قسم ہے۔ البتہ قسم کے بغیر ایسی بات کرنے سے انسان گنہگار ضرور ہوتا ہے۔ ایسی چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیئے اس سے عورت کو تنگ کرنا مقصود ہے جو کہ ناروا ہے۔ جس طرح میاں بیوی کے دیگر حقوق ہیں۔ اسی طرح نفسانی خواہش کی تکمیل بھی دونوں کا حق ہے۔ اور کسی

فریق کو اُس کے حق سے محروم کرنا مستحسن نہیں ہے۔ بلکہ بُری بات ہے
فرمایا لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ
اُن لوگوں کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ جو اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں۔ فَاِنْ فَآءُوْ پس اگر وہ اس دوران لوٹ آئیں۔ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے غلطی کوتاہی معاف ہو جائے گی
وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ اور اگر انہوں نے طلاق یا تفریق کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔
فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔ تو اللہ تعالیٰ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ وہ انکی ہر ظاہر بات کو سنتا ہے۔ نیز اُن کی نیت اور ارادے تک کو جانتا ہے۔

درس نود و پنج (۹۵) — آیت ۲۲۸

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۸﴾

ع ۲۸ / ۱۲

ترجمہ: اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔ اور ان کے لیے حلال نہیں ہے۔ کہ وہ اُس چیز کو چھپائیں، جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے۔ اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے خاوند زیادہ حق رکھتے ہیں۔ انہیں اس مدت میں لوٹانے کا۔ اگر وہ اصلاح کا ارادہ کریں۔ اور ان عورتوں کے لیے بھی اُسی طرح حق ہے جس طرح عورتوں پر مردوں کا حق ہے۔ دستور کے مطابق۔ اور مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ عزیز ہے اور حکمت والا ہے ﴿۲۲۸﴾

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں قسم کے متعلق بیان تھا۔ اور اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایلاء کا مسئلہ بیان فرمایا۔ ایلاء سے مراد عورت سے عدم مقاربت کی قسم کھانا ہے۔ اور اس کی مدت زیادہ سے زیادہ چار ماہ رکھی گئی ہے۔ اگر خاوند اس دوران رجوع کر لے تو قسم کا کفارہ ادا کر دے۔ اور اگر چار ماہ کی مدت پوری ہوگئی۔ تو عورت پر ایک طلاق بائن پڑ جائیگی۔ تاہم بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ طلاق خود بخود واقع نہیں ہوگی بلکہ ایلاء کرنے والے کو عدالت میں طلب کر کے رجوع یا طلاق کا فیصلہ کیا جائے گا۔

نکاح اور طلاق

نکاح اور طلاق کے مسائل اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں بیان فرمائے ہیں، خصوصاً سورۃ احزاب، طلاق اور اس سورۃ بقرۃ میں یہ مسائل آئے ہیں

نکاح میاں بیوی کے درمیان ایک دائمی اور اجتماعی معاہدہ ہے۔ جسے مرتے دم تک نبھانے کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ جب تک نکاح کا معاہدہ طے نہیں پاتا، اس معاہدہ کے فریقین یعنی مرد اور عورت کے اخلاق کی چھان بین کی جاتی ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے کو کس حد تک قابل قبول ہیں پھر جب نکاح طے پا جاتا ہے۔ تو زوجین پر معاہدہ نکاح کی قانونی پابندی عاید ہو جاتی ہے۔ جسے پورا کرنے کے وہ پابند ہوتے ہیں۔ شریعت نے مرد اور عورت دونوں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں کچھ حقوق دیے ہیں اور کچھ فرائض سونپے ہیں۔ اگر فریقین ان کی پابندی کرتے ہیں تو اُن کی ازدواجی زندگی نہایت پرسکون گزرتی ہے۔ تاہم بعض اوقات اس قسم کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن میں اس معاہدہ سے منسلک فریقین کا نباہ ممکن نہیں رہتا، تو ایسی صورت میں شریعت نے اُن میں تفریق کا قانون بھی نافذ کر دیا ہے۔ تاکہ وہ ساری عمر کٹھن زندگی گزارنے کی بجائے اپنے لیے کوئی دوسرا بہتر ذریعہ تلاش کر سکیں۔

دوسرے مذاہب سے تقابل

اس مسئلہ میں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اُن کے معاشروں میں طرح طرح کی قباحتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ مثلاً بائیبل کے باب استثنا میں موجود ہے کہ اگر خاوند اپنی بیوی پر کسی وجہ سے ناراض ہو جائے تو فوراً طلاق نامہ عورت کے ہاتھ میں دے کر گھر سے نکال دے، اس سلسلہ میں صفائی وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اُدھر مطلقہ کو حق حاصل ہے۔ کہ طلاق کے فوراً بعد دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔ یہ تو یہودی مذہب ہے اب عیسائیوں کو لیجئے۔ ان میں طلاق کا تصور ہی نہیں ہے۔ جب ایک دفعہ نکاح ہو گیا۔ تو ساری عمر کے لیے میاں بیوی ایک دوسرے کے پابند ہو گئے۔ اب اُن کو موت ہی علیحدہ کر سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب کسی جوڑے کا میلان طبع ایک سا نہ ہوا اور اُن میں ناچاقی پیدا ہو گئی تو ساری عمر عذاب میں بسر کرنا پڑی۔ البتہ عیسائیوں کا دوسرا فرقہ جو صدیوں بعد پیدا ہوا ہے اُس نے عدالت کے ذریعے طلاق کو قانونی شکل دے دی ہے۔ اس کا طریق کار یہ ہے۔ کہ عدالت مجاز فریقین کو طلب کرے گی۔ اور اس بات کی تحقیق کرے گی کہ

فریقین میں سے کسی نے دوسرے پر ظلم کیا ہے۔ یا کسی ایک نے زنا کا ارتکاب کیا ہے اگر کوئی ایسا جرم ثابت ہو جائے۔ تو عدالت اُن کے درمیان تفریق ڈال دے گی۔ اور اس طرح طلاق واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح ہندو مت میں بھی طلاق کا کوئی تصور نہیں مرتے دم تک میاں بیوی میں علیحدگی نہیں ہو سکتی۔ رومیوں اور یونانیوں میں بھی طلاق نامی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے ان مذاہب میں معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں۔

اسلام میں نظریہ طلاق

اسلام نے افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح اس لیے نہیں کیا جاتا کہ زوجین میں تفریق ڈال دی جائے۔ اس معاہدہ (AGREEMENT) کو نبھانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس کے باوجود اگر میاں بیوی کے لیے اکٹھے زندگی گزارنا ممکن نہ ہو، تو پھر اسلام نے طلاق کے ذریعے ان کی علیحدگی کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ اگرچہ طلاق پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ یعنی مباح اشیا میں سے سب سے ناپسندیدہ چیز اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔ تاہم ضرورت کے تحت اس کی اجازت ہے۔ طلاق کی صورت میں اسلام نے ایک اور ضروری قانون عدت کا دیا ہے، جو دوسرے مذاہب میں نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلاق کے بعد عورت ایک خاص مدت تک دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ اس کا مقصد تحفظِ نسب ہے تاکہ پیدا ہونے والی اولاد کا نسب مشکوک نہ ہو جائے۔ طلاق کے بعد اگر عورت فوراً دوسرا نکاح کر لے۔ تو بچے کے نسب پر شُبہ ہو سکتا ہے۔ کہ پہلے خاوند کا ہے یا دوسرے کا۔ اور اس طرح کئی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے اسلام نے عورت کے دو نکاحوں کے درمیان مختلف صورتوں میں مختلف مدتیں مقرر کر دی ہیں۔ تاکہ اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ آئندہ پیدا ہونے والا بچہ کس باپ کا ہے۔ نیز پہلے نکاح کے احترام کا تقاضا بھی ہے۔ کہ دوسرے نکاح سے پہلے کچھ وقفہ ہونا چاہیئے۔

عدت

عدت اُس کم از کم مدت کا نام ہے۔ جو طلاق کی تاریخ یا شوہر کی فوتیدگی کی تاریخ سے لیکر نکاح ثانی تک کے لیے مقرر ہے۔ اس عرصہ میں عورت دوسرا نکاح نہیں

کر سکتی۔ عدت مختلف صورتوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً فوتیدگی کی صورت میں عدت تاریخ وفات سے چار ماہ دس دن ہے۔ اتنے عرصہ میں پتہ چل جاتا ہے۔ کہ عورت حاملہ تو نہیں ہے۔ اگر حاملہ نہیں ہے۔ تو چار ماہ دس دن کی عدت گزار کر عورت نکاح کر سکتی ہے۔ اور اگر حاملہ ہے تو اُس کی عدت وضع حمل ہے۔ جس دن بچہ جنے گی اُس کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔ بیوگی سے لے کر وضع حمل تک کی مدت کا کوئی تعین نہیں ہے۔ یہ عرصہ خواہ ایک دن کا ہو یا پورے نو ماہ کا۔ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے۔ لہٰذا بچہ جب بھی پیدا ہوا عورت نکاح کر سکتی ہے۔ حجۃ الوداع کے سفر میں ایک صحابی اونٹنی سے گر کر فوت ہو گئے۔ اُن کی بیوی حاملہ تھی۔ ٹھیک بائیس ۲۲ دن بعد اُس کے ہاں بچہ پیدا ہو گیا، تو حضور علیہ السلام نے فرمایا، اس کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ یہ جب چاہے نکاح ثانی کر سکتی ہے۔

اگر عورت عاقل، بالغ اور آزاد ہے، اور اُسے حیض آتے ہیں۔ کسی وجہ سے طلاق ہو گئی ہے۔ تو اس کی عدت تین حیض ہوگی۔ یہ تین حیض خواہ دو ماہ میں آجائیں یا ۱۹ ماہ میں، اُسے بہر حال تین حیض تک انتظار کرنا ہوگا۔ عام طور پر حیض ماہ بماہ آتے ہیں۔ اس لیے ایسی عورت کے حیض کم و بیش تین ماہ میں پورے ہو جاتے ہیں۔ جس کے بعد اُسے نکاح کی اجازت ہوتی ہے۔

پاکستان میں نافذ عائلی قوانین میں ایسی عورت کی عدت نوّے ۹۰ دن مقرر کی گئی ہے۔ جو کہ درست نہیں ہے۔ حیض والی عورت کو تین حیض کی عدت پوری کرنا ہوگی، خواہ اس میں کتنا عرصہ لگے۔ البتہ ایسی عورت جو ابھی بالغ نہیں ہوئی یا جو کبر سنی میں پہنچ چکی ہے اور اُس کے حیض بند ہو چکے ہیں۔ ایسی عورتوں کی عدت تین ماہ یا ۹۰ دن درست ہے۔ اس کی تفصیلات سورۃ احزاب میں موجود ہیں۔ ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔ کہ نکاح ہو گیا۔ مگر میاں بیوی کی خلوت صحیحہ نہیں ہوئی انہیں مباشرت کا موقع نہیں ملا۔ ایسی صورت میں اگر طلاق واقع ہو جائے، تو فرمایا "فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّونَهَا" ایسی عورتوں کے لیے کوئی عدت

نہیں۔ وہ جب چاہیں دوسرا نکاح کر سکتی ہیں۔ اس معاملہ میں بھی عائلی قوانین درست نہیں کیونکہ وہاں سب کے لیے نوے دن کی عدت مقرر ہے حالانکہ یہاں کوئی عدت نہیں ہے

ایسا ہی عدت کا ایک مسئلہ ہمارے نوٹس میں آیا تھا۔ کھوڑہ کے رہنے والے ایک شخص نے بتایا۔ کہ کسی عورت کو طلاق ہو گئی۔ اُس کو حیض دیر سے آتا ہے۔ اور نوے دن میں اس کے تین حیض مکمل نہیں ہوئے۔ مگر یونین کونسل والوں نے نوے دن کے بعد اس کا نکاح کرا دیا۔ حالانکہ یہ نکاح ہوا ہی نہیں ہے۔ کیونکہ عدت کے دوران نکاح ہو نہیں سکتا۔ تو اس قسم کی خرابیاں ہیں۔ جو عائلی قوانین میں خامی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس قسم کے نکاح قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ اور اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں۔ جو ایسا حکم دیتے ہیں۔

حیض یا طہر

الغرض فرمایا وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔ قُرُوْء قَرْءٌ کی جمع ہے اور اس لفظ کے معانی میں فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہل لغت بھی اس کے مختلف معانی بتاتے ہیں۔ دراصل یہ لفظ دو معانی میں مشترک ہے یعنی اس کا معنی حیض بھی آتا ہے اور طہر بھی۔ طہر اس وقفہ یا مدت کو کہتے ہیں۔ جو دو حیضوں کے درمیان ہوتا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ قرء کا معنی حیض بتاتے ہیں۔ اسی لیے اُن کے نزدیک بالغ مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہے۔ وہ ابوداؤد شریف کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ ایک عورت نے حضور علیہ السلام سے استحاضہ کے متعلق مسئلہ پوچھا، تو آپ نے فرمایا تَدَعُ الصَّلٰوةَ اَيَّامَ اَقْرَائِهَا یعنی حیض کے دنوں میں نماز نہ پڑھے البتہ جب حیض کے عام ایام گزر جائیں تو پھر غسل کر کے نماز ادا کرے کیونکہ اب یہ حیض نہیں رہا، بلکہ استحاضہ کا خون شمار ہوگا۔ مقصد یہ کہ اس حدیث سے قرء کا معنی حیض نکلتا ہے۔ البتہ امام شافعیؒ قرء سے مراد طہر لیتے ہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے۔ کہ طلاق کے بعد عورت تین طہر گزرنے تک دوسرا نکاح نہ کرے۔

کتمانِ حمل جائز نہیں

اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں عورتوں کو متنبہ فرمایا ہے وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ

اَنْ یَّکْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰہُ فِیْٓ اَرْحَامِھِنَّ کہ ان کے لیے یہ حلال نہیں ہے۔ کہ وہ چھپائیں اُس چیز کو جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے۔ مقصد یہ کہ طلاق یا بیوگی کے وقت اگر عورت حمل سے ہے تو اُسے وضع حمل تک انتظار کرنا چاہیئے۔ محض نکاح ثانی کے لیے حمل کو چھپانا ہرگز جائز نہیں۔ ایسا کرنے سے نسل میں گڑبڑ ہو گی۔ فرمایا ایسا ہرگز نہ کریں اِنْ کُنَّ یُؤْمِنَّ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اگر وہ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پہ ایمان رکھتی ہیں۔ تو انہیں کتمانِ حمل کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ شریعت کے مطابق صاف صاف بتلا دینا چاہیئے۔ اور پھر وہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ جو جائز ہو۔

طلاق رجعی

آگے رجوع عن الطلاق کا مسئلہ بیان فرمایا۔ کہ اگر طلاق سنت طریقہ کے مطابق دی گئی ہو۔ تو پہلی یا دوسری طلاق کے بعد خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ رجوع کر لے۔ وَبُعُوْلَتُھُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّھِنَّ فِیْ ذٰلِکَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ اگر نیّت اصلاح کی ہے تو مطلقہ عورتوں کے خاوندوں کو زیادہ حق حاصل ہے۔ کہ وہ ان عورتوں کو واپس لوٹائیں۔ اسے طلاق رجعی کہتے ہیں۔ مثلاً کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک طلاق صریح الفاظ میں دے دی ہے۔ اور عدت شروع ہو گئی ہے۔ تو اس خاوند کو حق حاصل ہے۔ کہ عدت پوری ہونے سے پہلے بغیر دوبارہ نکاح کیے عورت کی طرف رجوع کر لے اس امر کا اظہار زبانی طور پر کر دے یا ویسے ہی مباشرت کر لے تو اس کا مطلب یہ ہو گا۔ کہ اُس نے رجوع کر لیا۔ اسی طرح دوسری طلاق دینے کے بعد بھی بغیر نکاح کے رجوع ہو سکتا ہے بشرطیکہ عدت کے اندر ہو۔ اور اگر عدت گزر گئی، تو عورت آزاد ہو جائیگی۔ اب بغیر نکاح کے رجوع نہیں کر سکتا۔ یہ رجعی طلاق کا مسئلہ ہے جو محض ڈرانے دھمکانے کے لیے دی جائے۔

اگر طلاق بائن ہو، خواہ ایک ہو یا دو ہوں تو ایسی صورت میں بغیر نکاح کے رجوع ممکن نہیں۔ رجوع کے لیے بہرصورت دوبارہ نکاح کرنا ہو گا۔ طلاق بائن کا مطلب یہ ہے۔ کہ نیّت جُدا کرنے کی ہو۔ الفاظ صریح نہ ہوں محض اشارے کنائے سے کہ دیا جاوے۔ کہ تو مجھ پر حرام ہے یا اپنے والدین کے ہاں چلی جا وغیرہ وغیرہ۔

اور اگر تینوں طلاقیں دے دی ہیں تو پھر کسی صورت رجوع نہیں ہو سکتا۔ عورت عدت پوری کرنے کے بعد نکاح ثانی کرنے کی مجاز ہوگی، تو فرمایا کہ رجعی طلاق میں خاوندوں کا زیادہ حق ہے۔ کہ وہ رجوع کرلیں بشرطیکہ اُن کا ارادہ اصلاح کا ہو، محض تنگ کرنا مقصود نہ ہو۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا۔ کہ عورت کو تنگ کرنے کی غرض سے کبھی طلاق دے دی کبھی رجوع کرلیا۔ تاکہ وہ دوسری جگہ بھی نہ جا سکے یہ بات جائز نہیں ہے

حقوقِ زوجین

آگے اللہ تعالیٰ نے مردوزن کے حقوق کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ دستور کے مطابق عورتوں کا مردوں پر اسی طرح حق ہے جس طرح مردوں کا عورتوں پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زوجین کے اپنے اپنے دائرہ کار میں کچھ حقوق ہیں۔ لہٰذا اُن کی پاسداری ہونی چاہیئے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ مرد تو اپنے حقوق زبردستی عورت سے وصول کرے۔ مگر عورت کو اُس کا حق نہ دے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے عورت کا وراثت میں حق رکھا ہے۔ لہٰذا مرد پر لازم ہے کہ اُسے یہ حق ادا کیا جائے۔ زمانۂ جاہلیت میں عورت کو وراثت میں حصہ دار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ بیچاری عام معاشرتی حقوق سے بھی محروم تھی۔ جو کہ سراسر زیادتی ہے۔ رومی اور یونانی بھی عورت کو ذلیل سمجھتے تھے اور اس کا حق تسلیم نہیں کرتے تھے۔ عیسائی بھی اسی قسم کے تاثر کا شکار رہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ اے مردو! جس طرح تمہارے کچھ حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ انہیں ان سے محروم نہ کرو یہ تو اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔ کہ اُس نے کس فرد کو کس مقام پر رکھا ہے" خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً" یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک فرد سے سب کو پیدا کیا۔ پھر اُسی میں سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور پھر بیشمار مردوزن بکھیر دیئے۔ یہ اُس کی حکمت ہے کہ کسی کو مرد بنا دیا اور کسی کو عورت بنا دیا۔ اب تمہارا فرض یہ ہے۔ کہ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھو۔ دوسرے کو حقیر نہ سمجھو۔ اور دستور کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے۔ کہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں حقوق و فرائض کو بجالاؤ اور کسی دوسرے

کا حق غصب نہ کرو۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ تم پر یہ حق ہے۔ کہ بیوی کے لیے بھی ویسی ہی خوراک کا بندوبست کرو۔ جیسا کہ اپنے لیے کرتے ہو۔ جس معیار کا لباس پسند کرتے ہو، عورت کو بھی مہیا کرو۔ اُس کو بھی معقول ٹھکانہ بنا کر دو۔ اس کا حق مہر ادا کرو اور اُسے آزادی دو کہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے اس رقم کو خرچ کر سکے۔ یہ اُس کے حقوق ہیں۔ اُسے بلاوجہ مارنا پیٹنا بھی جائز نہیں۔ ہاں اگر کسی جائز ضرورت کی بنا پر تنبیہ مقصود ہو۔ تو اتنی خفیف ضربات لگاؤ کہ ہڈی پسلی نہ ٹوٹے۔ اس کی اجازت ہے "فَاضْرِبُوْهُنَّ"۔ ناجائز مار پیٹ درست نہیں۔ اُس سے قطع تعلقی بھی نہیں کرنی چاہیئے عورت پر بھی حق ہے۔ کہ وہ خاوند کی مرضی کے بغیر گھر سے باہر نہ جائے۔ سینما وغیرہ کے لیے جانا تو ویسے ہی حرام ہے۔ جائز امور کے لیے بھی اجازت لینی چاہیئے۔ اس کی تفصیلات آگے سورۃ نساء میں آئیں گی۔

مرد کی فضیلت

فرمایا ان حقوق کے باوجود وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ ایک درجہ کی فضیلت حاصل ہے۔ اسی موضوع کو سورۃ نساء میں یوں بیان کیا ہے "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَاۗءِ" مرد عورتوں پر نگران ہیں یا ان کے محافظ ہیں ان سے برتر ہیں اور یہ ایک فطرتی امر ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ اور پھر مردوں کی برتری کی دلیل بھی بیان فرمائی۔ "وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ" کہ مرد اپنی کمائی عورتوں پر خرچ کرتے ہیں، ان کے کفیل ہیں۔ اللہ نے انہیں برتری دی ہے۔ اور مشقت کے کام مرد کے سپرد کیے ہیں۔ کمانا اس کے ذمہ ہے۔ عورت کا کام گھر کی ذمہ داریاں پوری کرنا ہیں۔ انہیں کم مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ لہٰذا مرد کو برتری حاصل ہے اس کی مثال موجودہ دور میں بھی ملتی ہے کہ دنیا کی ڈیڑھ سو سے زیادہ اقوام میں سے صرف امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین کو ویٹو پاور حاصل ہے ان میں سے کوئی ایک ملک باقی پوری دنیا کے متفقہ فیصلے کو رد کر سکتا ہے۔ کہ اس کو یہ طاقت حاصل ہے۔ اسی طرح گھر کی چار دیواری میں مرد کو ویٹو پاور حاصل ہے۔ یہ پاور عورت کو یا بچوں کو حاصل نہیں ایک باپ اپنے سارے بیٹوں کے متفقہ مطالبہ

کو رد کر سکتا ہے۔

طلاق کا حق مرد کو ہے

اسی طرح طلاق کا حق بھی اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے۔ عورت اس سے محروم ہے اس میں بھی مصلحت ہے" بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ" نکاح کی گرہ چونکہ مرد کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے اس گرہ کو کھولنے کا اختیار بھی مرد کو حاصل ہے۔ مگر قدرت کے اس قانون کے خلاف جب برطانیہ میں عورت کو طلاق کا حق مل گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہاں پچاس فیصد سے زیادہ طلاقیں ہونے لگیں ہیں۔ ہر عورت دعویٰ کر سکتی ہے کہ اُسے طلاق ملنی چاہیئے ؟ محض اس لیے کہ اس کا خاوند سوتے میں خراٹے لیتا ہے۔ اور اس کی نیند خراب ہوتی ہے۔ دوسری کہتی ہے کہ میرا خاوند میرے کبوتر یا میرے کُتّے سے محبت نہیں کرتا۔ میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ایسی ایسی معمولی باتوں پر طلاق روزمرہ کا کھیل بن کر رہ گیا ہے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف اپنا قانون جاری کیا ہے۔ یہ اس مساوات کا نتیجہ ہے۔ جو عورت کو مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن پاک کہتا ہے۔ کہ مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے۔ اب اس مساوات کی بناء پر دفتروں میں، فوج میں ہر جگہ عورتیں ملازمت کر رہی ہیں، حالانکہ فوجی خدمات عورت کے فرائض سے بالکل باہر ہیں۔ اسی غلط ملط کی وجہ سے طرح طرح کی معاشرتی برائیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اکثر اداریے بدکاری کے اڈے بنے ہوتے ہیں۔ کوئی صحیح نسل قائم نہیں رہ سکی۔ گذشتہ صدی میں ایک انگریز مصنف ڈاکٹر لکھتا ہے۔ کہ یورپ کی پینتالیس ۴۵ کروڑ کی آبادی میں سے پینتالیس ۴۵ آدمی بھی ایسے نہیں نکالے جا سکتے جن کو یقین کے ساتھ نطفۂ حلال تسلیم کیا جائے یہ اس کی اپنے قانون کے متعلق رائے ہے۔ کہ اتنا گندہ قانون وضع کیا گیا ہے جب شاپنگ کے لیے عورتوں کو آزادی ہوگی اور غیر مردوں کے ساتھ میل جول کریں گی۔ ائیر ہوسٹس بن کر ساری دنیا کا سفر بغیر محرم کے کریں گی، دفتروں میں مردوں کے ماتحت کام کریں گی، تو پھر اچھے نتائج کی توقع ——— کیسے کی جا سکتی ہے جہاں تک فوجی خدمات کا تعلق ہے صرف غیر معمولی (AB NORMAL) حالات میں

عورت کو حصہ لینے کی اجازت ہے، وگرنہ عام حالات (NORMAL) میں عورت کو مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کی قطعاً اجازت نہیں، کیونکہ مرد کا دائرہ کار اور ہے عورت کا اور ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے عورت پر جمعہ فرض نہیں کیا۔ اس کی نماز گھر میں بہتر ہے۔ تاہم وہ خاوند کی اجازت سے نماز کے لیے مسجد میں جا سکتی ہے۔

بہر حال فرمایا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کی فضیلت ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ نساء میں آئیگی۔ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ اللہ تعالیٰ کمال قدرت کا مالک اور حکیم ہے۔ اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے۔ لہٰذا اس کے احکام پر عمل درآمد کرنا چاہیئے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّآ اَنْ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

ترجمہ: طلاق رجعی دو مرتبہ ہے۔ پھر اس کے بعد یا تو روک رکھنا ہے اس کو دستور کے مطابق یا اسکو آزاد کر دینا ہے نیکی کے ساتھ۔ اور تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ تم ان عورتوں سے اس چیز میں سے کچھ لے لو جو تم نے ان کو دی ہے۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ دونوں (میاں بیوی) اس بات سے خوف کھاتے ہوں کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمہیں خطرہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں کہ وہ عورت اپنی جان چھڑائی کا فدیہ دے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔ پس ان سے آگے نہ بڑھو۔ اور جو شخص بھی اللہ کی حدود سے آگے بڑھیگا۔ پس وہی لوگ ظالم ہیں ﴿۲۲۹﴾

ربط آیات

گذشتہ آیت کریمہ میں عدت کا مسئلہ بیان ہوا تھا جس کا مقصد یہ ہے۔ کہ طلاق اور دوسرے نکاح کے درمیان عورت وقفہ کرے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ امید سے ہے یا نہیں۔ پھر اگر امید سے ہے تو وضع حمل تک نکاح ثانی نہ کرے اور امید سے نہیں تو تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھے۔ کم سن اور معمر عورتوں کی عدت تین ماہ مقرر کی گئی ہے۔ اور بیوہ کے لیے چار ماہ دس دن عدت ہے

یہ بھی گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ مرد کو عورت پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے وہ اُن کے نگران اور کفیل ہیں۔ باقی حقوق میں مساوات ہے۔ کچھ حقوق مرد کے ہیں اور کچھ عورت کے، اپنے اپنے دائرہ کار میں زوجین حقوق و فرائض کے ذمہ دار ہیں۔

نکاح سنتِ انبیاء ہے

آج کے درس میں طلاق کی تعداد اور ان سے متعلقہ احکام کا ذکر ہے۔ کل بیان کیا تھا۔ کہ نکاح مرد و عورت کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے۔ جس کی پابندی فریقین کے لیے ضروری ہے۔ تاہم عام معاہدات اور نکاح کے معاہدہ میں قدرے فرق ہے کسی دو پارٹیوں کے درمیان لین دین کے سلسلہ میں، کاروبار میں، یا شراکت کے متعلق معاہدہ ہوتا ہے۔ یہ معاہدہ محض معاملہ کی حد تک ہوتا ہے۔ مگر نکاح کے معاہدہ میں معاملہ کے علاوہ عبادت اور سنّت کا معنیٰ بھی پایا جاتا ہے۔ آپ اکثر نکاح کے موقع پر خطبہ سُنتے ہیں اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَيْسَ مِنِّیْ یعنی نکاح کرنا میری سنت ہے جو اس سے اعراض کرے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَنِ الْاَنْبِيَاءِ نکاح سارے نبیوں کی سنت ہے قرآن پاک میں بھی انبیاء علیہم السلام کی حیثیت کے متعلق آتا ہے۔ کہ سب نبیوں کی بیویاں تھیں اور بچے تھے۔ اُن میں سے ایسا کوئی نہیں جو کھاتا پیتا نہ ہو۔ اور معاملہ نہ کرتا ہو۔ اس کو نکاح وغیرہ سے واسطہ نہ پڑتا ہو۔ البتہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جو ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے تھے اُن کو نکاح کا موقعہ نہیں مل سکا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے نکاح نہیں کیا۔ البتہ جب وہ قربِ قیامت میں دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو پھر نکاح بھی کریں گے اور ان کی اولاد بھی ہو گی، اس کے بعد ان کی طبعی وفات بھی ہو گی اور وہ دفن بھی ہونگے بہر حال نکاح تمام انبیاء کی سنت ہے۔

شرائطِ نکاح

نکاح اگرچہ ایک اجتماعی معاہدہ ہے۔ مگر اس کی بھی کچھ حدود اور قیود ہیں۔ شریعت مطہرہ نے کوئی سے مرد و زن کے درمیان نکاح کو جائز قرار نہیں دیا۔ بلکہ

بعض صورتوں کو حرام قرار دیدیا ہے۔ آگے سورۃ نساء میں آئے گا "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهٰتُكُمْ" تمہارے لیے تمہاری مائیں، بہنیں، بیٹیاں، بھتیجیاں، بھانجیاں اور خوش دامن وغیرہ حرام کر دی گئی ہیں۔ ان کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ایک منکوحہ عورت کا نکاح دوسری جگہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ پہلے نکاح کی طلاق نہ ہو۔ اس کے علاوہ رضاعی ماں بہن سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ سب محرمات ہیں۔ فرمایا "وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ" ان کے علاوہ باقی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ وہ تمہارے لیے حلال ہیں۔

نکاح کے لیے گواہان بھی لازمی ہیں۔ کسی دیگر معاملہ میں گواہ کے بغیر بھی معاہدہ ہو سکتا ہے۔ مگر نکاح کا معاہدہ ایک ایسا معاہدہ ہے۔ کہ گواہوں کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا۔ پھر نکاح کے لیے حق مہر مقرر ہونا بھی اس کی شرائط میں سے ہے۔ مہر دینا پڑے گا مال خرچ کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر نکاح درست نہیں۔

نکاح کے معاہدہ میں بعض حقوق کا تعین بھی ہے عورت اپنے حقوق طلب کر سکتی ہے، کھانا کپڑا، رہائش عورت کے حقوق ہیں۔ جو مرد کے ذمے ہیں۔ البتہ عورت کو چاہیئے کہ وہ خاوند کی حیثیت کے مطابق ان چیزوں کا مطالبہ کرے۔ اسکی حیثیت سے زیادہ طلب کر کے اُسے مشکل میں نہ ڈالے۔ پھر یہ بھی نکاح کی شرط ہے کہ اگر کسی وجہ سے میاں بیوی کا گزارہ نہ ہو سکے، تو خاص شرائط کے تحت اس معاہدہ کو ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ طلاق اور خلع کا قانون بھی شریعت میں موجود ہے زوجین کے درمیان تنازعہ کی صورت میں پہلے خود اسے حل کرنے کی کوشش کرو اگر ایسا نہیں ہو سکا۔ تو مرد و عورت کے خاندانوں میں سے ایک ایک نمائندہ لے لو، جو مل کر صلح و صفائی کی کوشش کریں۔ اگر پھر بھی مصالحت نہ ہو سکے۔ تو پھر معروف طریقے سے میاں بیوی میں جدائی کرا دو کہ اب اس کے بغیر کوئی اور چارہ کار نہیں رہا۔ لہٰذا دونوں کی بھلائی اس میں ہے کہ ان میں تفریق ڈال دی جائے۔ یہ سب نکاح کے اصول و قواعد ہیں۔

طلاق کی تین قسمیں

میاں بیوی میں جدائی کے لیے شریعت نے طلاق کا طریق کار مقرر کیا ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ طلاق کی تین قسمیں ہیں یعنی احسن، سنت اور بدعت۔ طلاق احسن سے مراد اچھی اور بہتر طلاق ہے اور یہ اُس طلاق کو کہتے ہیں۔ جو عورت کو اُس طُہر میں دی جائے۔ جس میں میاں بیوی کا ملاپ نہ ہوا ہو۔ اور ایک وقت میں ایک ہی طلاق ہو۔ ایسی طلاق کی صورت میں عدت کے اندر خاوند دوبارہ عورت سے رجوع کر سکتا ہے۔ اور رجوع کے لیے نکاح کی ضرورت نہیں۔ اگر عدت گزر جائے تو عورت آزاد ہو جائے گی۔ ہاں اگر کوئی شخص اب بھی رجوع کرنا چاہے۔ تو دوبارہ نکاح کر کے عورت کو گھر لا سکتا ہے۔ عدت کے بعد عورت کسی دوسری جگہ نکاح کرنے کی بھی مجاز ہے۔

اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ یعنی دو یا زیادہ سے زیادہ تین طلاقیں دینا چاہتا ہے یعنی اس نے ارادہ کر لیا ہے۔ کہ عورت کو کسی صورت میں بھی نہیں رکھنا۔ تو پھر اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ ہر طہر میں ایک طلاق دے۔ اس کا فائدہ یہ ہے۔ کہ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد اگر خاوند رجوع کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اور اگر تیسری طلاق دے دی تو پھر یہ طلاق مغلظہ ہو جائے گی، اب رجوع کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ اس طلاق کو طلاق سنت کہتے ہیں، کہ یہ سنت کے مطابق ہے۔

تیسری قسم طلاق، طلاقِ بدعت کہلاتی ہے۔ اور یہ ایسی ہے کہ یا تو طہر کی بجائے حیض کے دوران طلاق دے دے یا تینوں طلاقیں بیک وقت دیدے۔ اس طرح طلاق تو واقع ہو جائے گی مگر دینے والا گنہگار ہو گا۔ کیونکہ اس نے صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا

رجعی طلاقیں دو ہیں

اس آیت میں فرمایا اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ یعنی رجعی طلاقیں دو ہیں۔ ایک طلاق دینے کے بعد رجوع ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر دوسری طلاق دے دی تو پھر بھی رجوع کی گنجائش ہے۔ البتہ تیسری طلاق کے بعد یہ سہولت ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں طلاق رجعی میں رجوع دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ اگر طلاق صریح الفاظ میں دی گئی ہے۔ تو بغیر

نکاح کے رجوع ہو سکتا ہے۔ اور اگر اشارے کنایہ سے طلاق دی ہے۔ اور نیت قطعی علیحدگی کی ہے تو یہ طلاق بائن ہو جائے گی۔ اس میں رجوع کے لیے دوبارہ نکاح کرنا ہوگا۔ خواہ ایک طلاق کے بعد رجوع مقصود ہے یا دوسری طلاق کے بعد۔ تیسری طلاق کا ذکر تو آگے آئیگا۔ یہاں فرمایا کہ رجوع کے لیے زیادہ سے زیادہ دو طلاقیں ہیں۔

علیحدگی کا طریق کار

فرمایا دوسری طلاق کے بعد فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ یا تو دستور کے مطابق روک لو۔ اور اس سے اچھا سلوک کرو ـــــــــــ اس کا خرچہ ادا کرو۔ بشرطیکہ ارادہ اصلاح کا ہو، تنگ کرنے کا نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ نہ تو عورت کا حق ادا کیا جاوے اور نہ اس کو آزاد کیا جائے۔ بلکہ دستور کے مطابق اس سے اچھا سلوک کرنا چاہیئے۔ شریعت مطہرہ نے عورت کے جو حقوق مقرر کیے ہیں، انہیں ادا کرو۔ اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ اُسے نیکی کے ساتھ جُدا کر دو۔ لڑائی جھگڑے میں نہ پڑو بلکہ لین دین کا جو معاملہ ہے اسے احسن طریقے سے نپٹا کر مطلقہ کو رخصت کر دو۔ ہاں یاد رکھو وَلَا یَحِلُّ لَكُمْ اور تمہارے لیے یہ چیز حلال نہیں ہے اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ شَیْــٴًـا کہ تم اُن عورتوں سے کوئی چیز واپس لے لو، جو تم نے انہیں دے رکھی ہے۔ مثلاً اگر مہر ادا کر دیا تھا، تو طلاق کے وقت واپس لینے کی کوشش کی ہے یا کوئی تحفہ دیا تھا، تو اس کا مطالبہ کر دیا۔ یہ درست نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ عطیہ دے کر اس کو واپس لینا ایسا ہے۔ جیسے کتا قے کر کے خود ہی چاٹ لیتا ہے۔ فرمایا ہماری مسلمانوں کی مثال بُری نہیں ہونی چاہیئے۔ لَیْسَ لَنَا مَثَلُ السَّوْءِ سورۃ نسا میں آتا ہے۔ کہ وَّاٰتَیْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْــٴًـا اگر تم نے عورتوں کو ڈھیر مال بھی دے رکھا ہے تو ان سے کوئی چیز واپس نہ لو۔ خاص طور پر کوئی بہتان لگا کر مال واپس لینا اور بھی بُرا ہے۔ یہ چیز مسلمان کے شایان نہیں ہے۔ لہذا اگر تم نے طلاق کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ تو پھر دستور کے مطابق اچھے طریقے سے رخصت کر دو۔

خلع کا بیان

یہ بات گذشتہ درس میں بیان ہو چکی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کا حق مرد کو دیا ہے۔ عورت کو نہیں دیا۔ اور اس میں بھی اس کی مصلحت کارفرما ہے۔ تجربہ شاہد ہے۔ کہ حیض ونفاس یا حمل کے دوران عورت کے اعصاب پہ خاص اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ جلد باز واقع ہوئی ہے۔ اگر طلاق کا حق عورت کو مل جاتا تو طلاق کے معاملات کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا۔ پھر یہ بھی بیان ہو چکا ہے۔ کہ جن ممالک میں عورت کو یہ حق دیا گیا ہے۔ وہاں کس قدر معاشرتی برائیاں پیدا ہوئی ہیں۔ تو بہر حال طلاق کا حق اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے۔ اور اُسے عورت پہ ایک درجہ فضیلت دی ہے۔ البتہ بعض غیر معمولی حالات سے عہدہ برا ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عورت کو خلع کا حق دیا ہے۔ اگر خاوند ظلم کرتا ہے۔ اور طلاق بھی نہیں دیتا۔ تو عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ عدالت مجاز کی طرف رجوع کر کے اپنا معاملہ پیش کرے۔ عدالت فریقین کے دلائل سننے کے بعد اگر مناسب سمجھے تو میاں بیوی میں علیحدگی کرا سکتی ہے اس صورت میں طلاق کی ضرورت نہ ہوگی۔ البتہ اگر فریقین رضامند ہو جائیں۔ کہ خاوند اتنے مال کے عوض خلع پہ راضی ہوگا۔ تو عورت اتنا مال مرد کو ادا کر کے خلع حاصل کرے گی۔ اسی چیز کے متعلق فرمایا۔ کہ عام حالات میں تو مرد کو حق حاصل نہیں کہ وہ ادا شدہ مال عورت سے واپس لے۔ اِلَّآ اَنۡ يَّخَافَآ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ سوائے اس صورت کے کہ ان دونوں کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یعنی ان کا نباہ مشکل ہو گیا ہے۔ اور علیحدگی ضروری ہے۔ تو جب دونوں فریق خلع کے بدلے کسی مال کی ادائیگی پہ رضامند ہو جائیں، تو ایسا مال خاوند لے سکتا ہے۔

اس قسم کا واقعہ[1] خود حضور علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا۔ رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی کی بیٹی[2] جمیلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی ثابت بن قیسؓ کے نکاح میں تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ کہ باپ دشمن اسلام ہے۔ اور اس کا بیٹا اور بیٹی جان نثار اِن اسلام ہیں۔ حضرت ثابتؓ بڑے نیک آدمی تھے۔ مگر شکل وصورت کے لحاظ سے جمیلہؓ کو قابل قبول نہ تھے۔ انہیں احساس کمتری اس طرح پیدا ہوا۔ کہ کسی

---

[1] قرطبی ۱۳۹/۳ج [2] الطبقات الکبریٰ ابن لا سعد ۳۸۲/۸ج (فیاض)

موقع پر حضرت جمیلہؓ نے کسی مقام پر پردہ اٹھایا تو وہاں ایک جماعت موجود تھی جن میں حضرت ثابتؓ بھی موجود تھے۔ حضرت جمیلہؓ نے محسوس کیا، کہ اُن کا خاوند رنگ روپ اور شکل وصورت کے لحاظ سے سب سے کم تر ہے۔ چنانچہ اس نے اس بات کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ کہ حضور ہم دونوں بطور میاں بیوی نہیں رہ سکتے۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا ثابتؓ میں کوئی اخلاقی کمزوری واقع ہوئی ہے جس کی وجہ سے تو متنفر ہوگئی ہے۔ تو اُس نے عرض کیا۔ حضور! ایسی بات نہیں۔ وہ بڑا با اخلاق ہے۔ وَلٰکِنِّیْ اَکْرَہُ الْکُفْرَ فِی الْاِسْلَامِ مگر میں اسلام میں رہ کر کفر کو پسند نہیں کرتی۔ مقصد یہ کہ وہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ پس اس سے گلو خلاصی چاہتی ہوں۔ کیوں کہ اگر میں بادلِ نخواستہ اس کے ساتھ رہوں گی تو اس کی فرمانبرداری میں فرق آئے گا۔ اور یہ چیز اسلام کی تعلیمات کے منافی ہوگی۔ لہٰذا آپ ہماری علیحدگی کی کوئی صورت پیدا فرما دیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ ثابتؓ نے آپ کو حق مہر میں یا تحفہ کے طور پر جو باغ دیا تھا۔ کیا تم وہ باغ واپس کرنے کے لیے تیار ہو۔ حضرت جمیلہؓ نے کہا کہ ہاں میں ایسا کرنے پر رضامند ہوں۔ اس کے علاوہ اگر ثابتؓ کا اور بھی مطالبہ ہو تو میں پورا کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ باغ کی واپسی کی شرط پر حضور علیہ السلام نے خلع کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اُن دونوں کی علیحدگی کرا دی۔

بہر حال خلع میں طلاق کے الفاظ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ طلاق بائن کا قائم مقام ہوتا ہے۔ اور طلاق کی طرح اس میں بھی عورت کو عدت گزارنا ہوتی ہے۔ البتہ عدت کی مدت کے متعلق فقہائے کرام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے بعض فقہائے کرام کا خیال ہے کہ خلع میں عدت ایک حیض ہے۔ تاہم جمہور فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ طلاق کی مانند خلع کی عدت بھی تین حیض یا تین ماہ ہے جیسی صورت بھی ہو۔

طلاق بالمال

خلع کے علاوہ علیحدگی کی ایک اور صورت بھی ہے جسے طلاق بالمال کہتے ہیں۔ خاوند مال کا مطالبہ کرے کہ اتنا مال مجھے دو تو میں طلاق دیتا ہوں۔ اگر فریقین

رضامند ہوجائیں۔ تو مقررہ مال کے عوض خاوند باقاعدہ طلاق دے دیگا۔ اور وہ طلاق کے حکم میں آئے گی۔ خلع نہیں ہوگا۔

آیت کے اگلے حصّے میں روئے سخن مسلمانوں کی عام جماعت کی طرف ہے۔ فرمایا فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ اے لوگو! اگر تم کو ڈر ہے۔ کہ یہ میاں بیوی اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یعنی ان میں اختلافات کی خلیج اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ اب ان کا میاں بیوی کی حیثیت سے گزر اوقات ممکن نہیں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تو اُن دونوں پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں کہ وہ اپنی جان چھڑائی کا فدیہ دے۔ یعنی عورت فدیہ دے کر مرد سے خلع حاصل کرے۔ ہاں یہ بات یاد رہے۔ کہ اگر خاوند بے قصور ہے۔ اور عورت اُس سے بلاوجہ علیحدگی چاہتی ہے۔ تو وہ گنہگار ہوگی اور اگر خاوند بلاوجہ عورت کو تنگ کرتا ہے تو وہ گنہگار ہوگا۔ تاہم دونوں صورتوں میں خلع واقع ہو جائے گا۔

امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس قسم کا مال لینا مکروہ ہے۔ مگر بہرحال جائز ہے دوسرے فقہائے کرام کا کہنا ہے۔ کہ چونکہ اللہ تعالےٰ نے خاص حالات میں خلع کی اجازت دے دی ہے۔ اس لیے اس کے عوض مال وصول کرنا بالکل جائز ہے۔ اس میں کوئی کراہت نہیں۔

حدود اللہ کا احترام

فرمایا تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو۔ یہ نکاح، طلاق، ایلاء، خلع وغیرہ اللہ تعالیٰ کے نافذ کردہ قوانین ہیں ان کی پاسداری کرو۔ اور ان کے خلاف کر کے اللہ کی حدود کو نہ توڑ بیٹھنا۔ رمضان المبارک میں جہاں روزوں کی فرضیت کا ذکر تھا، وہاں فرمایا کہ روزہ رکھ کر کھانا پینا اور مباشرت حرام ہے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں۔ "فَلَا تَقْرَبُوهَا" اُن کے قریب بھی نہ جانا۔ اور یہاں فرمایا فَلَا تَعْتَدُوهَا ان کو عبور نہ کرنا۔ ظاہر ہے۔ کہ کھانا، پینا اور مباشرت کرنا انسان کی غایت درجہ کی خواہشات ہیں۔ اور انسان کسی وقت بھی ان کو پورا کر سکتا ہے۔ اس لیے وہاں یہ سخت حکم دیا۔ کہ ان حدود کے قریب بھی نہ جاؤ، کہیں پھسل کر حدود اللہ کو ضائع نہ کر بیٹھو۔ اور نکاح طلاق وغیرہ کے مسئلہ میں تنازعہ ہوتا ہے

دو فریق ملوث ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں پہ حدود کی خلاف ورزی کا اتنا خطرہ نہیں ہوتا۔ جتنا روزہ کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں پہ فرمایا کہ اللہ کی حد پار نہ کر جانا۔ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ اور یاد رکھو وَمَن يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ، جو اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدود سے آگے بڑھے گا۔ ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔ ظاہر ہے۔ ظالم مستوجب سزا ہوتا ہے۔ اللہ کی گرفت میں آتا ہے۔ اس لیے فرمایا جو اللہ کی حدود کو توڑے گا۔ وہ ظالموں میں شمار ہو کر سزا کا مستحق ہوگا۔

درس نود و ہفت (۹۷) — آیت ۲۳۰

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ ۗ فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ ۗ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ ﴿۲۳۰﴾

ترجمہ :- پھر اگر اُس نے طلاق دیدی عورت کو (یعنی تیسری مرتبہ) پس اس کے بعد اُس کے لیے حلال نہیں ہے یہاں تک وہ اس کے علاوہ کسی خاوند کے ساتھ نکاح کرلے۔ پھر اگر اُس نے بھی طلاق دیدی اس عورت کو تو کوئی گناہ نہیں ہے اُن دونوں پر کہ رجوع کرلیں، اگر وہ گمان کریں کہ وہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ اُس قوم کے لیے بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں ﴿۲۳۰﴾

حلالہ

گذشتہ درس میں طلاق کا مسئلہ بیان ہوا تھا۔ اور اس کے بعد خلع کا بیان آیا۔ آج کی آیت کا تعلق بھی مسئلہ طلاق سے ہے۔ وہاں یہ بیان ہوا تھا۔ کہ طلاق دو مرتبہ ہے جس کے بعد خاوند رجوع کرسکتا ہے۔ اس درس میں تیسری طلاق اور اس کے نتائج کا ذکر آرہا ہے۔ فرمایا فَإِنْ طَلَّقَهَا یعنی اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تیسری مرتبہ طلاق دے دے۔ تو اب رجوع کا حق ختم ہوگیا۔ فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ اب اُس مرد کے لیے عورت حلال نہیں ہے۔ جب تک کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرلے۔ اب یہ عورت پہلے خاوند کے لیے مغلظہ ہوگئی۔ اگرچہ یہاں پر عدت کا ذکر نہیں ہوا۔ تاہم یہ بات پہلے آچکی ہے۔ کہ طلاق یا بیوگی کے بعد عورت کے لیے عدت کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر نکاح ثانی نہیں کرسکتی۔ یہاں پر بھی وہی صورت ہے۔ جب کوئی شخص تیسری طلاق دے دے، تو پھر وہ عورت عدت کے ایام پورے کریگی۔ اور اس کے بعد

دوسری جگہ نکاح کرنے کی مجاز ہوگی۔ فَاِنْ طَلَّقَھَا اور اگر اب دوسرا خاوند بھی اس کو طلاق دے دے یا فوت ہو جائے۔ تو عورت کو پھر دوسری عدت گزارنا ہوگی۔ اس کے بغیر تیسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ جب یہ دوسری عدت بھی پوری ہو جائے فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَآ اَنْ یَّتَرَاجَعَا تو پہلے خاوند اور عورت پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ پھر رجوع کر لیں بشرطیکہ اِنْ ظَنَّآ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ وہ گمان کریں کہ اللہ کی حدود کو قائم کریں گے مطلب یہ کہ اُن دونوں کو اس بات کا احساس ہو جائے۔ کہ انہوں نے علیحدگی اختیار کر کے سخت پریشانی اٹھائی ہے۔ لہٰذا آئندہ ایسی صورت نہیں پیدا ہونے دیں گے۔ تو وہ دوبارہ نکاح کر کے زوجین کی حیثیت سے زندگی گزار سکتے ہیں۔

طلاق کی مختلف صورتیں

جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان آچکا ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ طلاقیں دراصل دو ہی ہیں۔ جن میں رجوع کی گنجائش ہے۔ اور اس کی آخری حد تین ہے۔ جس کے بعد جدائی لازمی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے امام مالکؒ تیسری طلاق کو پسند نہیں کرتے وہ کہتے ہیں۔ کہ تیسری طلاق دینی ہی نہیں چاہیئے۔ تاہم طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے۔ کہ ایسے طہر میں ایک طلاق دی جائے جس میں مباشرت نہ کی ہو۔ جب تین حیض یا تین ماہ (جیسی بھی صورت ہو) گزر جائیں گے تو عورت آزاد ہو جائے گی۔ لہٰذا دوسری اور تیسری طلاق دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ایک یا دو طلاق کی صورت میں عدت کے دوران بغیر دوبارہ نکاح کئے رجوع ہو سکتا ہے۔ اور اگر عدت گزر جائے۔ تو پھر بھی دوبارہ نکاح کر کے رجوع ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی دقت نہیں اور کوئی قباحت نہیں۔ اس طریقہ طلاق کے مطابق اگر ایک طلاق کے بعد رجوع کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو دوسرے طہر میں دوسری طلاق دی جا سکتی ہے۔ اب بھی سوچنے سمجھنے کا موقع موجود ہے۔ انسان ٹھنڈے دل سے غور کر کے متنازعہ امور کا تصفیہ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص تیسری طلاق ضرور ہی دینا چاہتا ہے۔ تو پھر تیسرے طہر میں تیسری طلاق دیدے۔ بہر حال بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ تین طہر میں تین طلاق دے۔ حیض کی حالت میں طلاق دینے سے اگرچہ

طلاق تو واقع ہو جاتی ہے۔ مگر انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ طلاق بدعت کہلاتی ہے
بیک وقت تین طلاق دینا بھی بدعت ہے۔ آدمی گنہگار ہوتا ہے سنّت کے خلاف ہے

طلاق ثلاثہ کی تحقیق

حیض کی حالت میں طلاق دینے، تین طلاقیں بیک وقت دینے یا ایک ہی طہر میں تین طلاقیں دینے کے متعلق فقہائے کرام کے تین مختلف مسلک ہیں۔ شیعہ حضرات کے نزدیک حیض کی حالت میں تین طلاقیں اکھٹی دینے سے طلاق واقع ہی نہیں ہوتی، فرقہ ظاہریہ جن میں اہل حدیث بھی شامل ہیں۔ انکا مسلک یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں ایک ہی شمار ہوتی ہیں۔ انمیں طاؤسؒ، مقاتلؒ، نخعیؒ وغیرہ شامل ہیں۔ اور تیسرا مسلک ائمہ اربعہ کا ہے جسے اکثر صحابہؓ اور تقریباً تمام تابعینؒ اور جمہور ائمہ کی تائید حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تین طلاق بیک وقت دینے کا طریقہ تو بلا شبہ غلط ہے اور ایسا کرنے والا گنہگار بھی ہوتا ہے مگر تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔

جو حضرات تین طلاق کو ایک تصور کرتے ہیں وہ مسلم شریف میں منقول حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ حضور علیہ السلام، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ تک تین طلاقیں ایک ہی طلاق تصور ہوتی تھی۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے حکم جاری کیا۔ جو شخص بیک وقت تین طلاقیں دے گا، وہ تین ہی سمجھی جائیں گی۔ اس حدیث کے متعلق جمہور فقہاء اور آئمہ کرام فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ فلاں فلاں زمانہ میں ایسا ہوتا تھا، یہ خود حضور علیہ السلام کا فرمان نہیں ہے اس استدلال میں کمزوری یہ ہے۔ کہ اس حدیث کے برخلاف خود حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا مذہب یہ ہے۔ کہ تین طلاقیں دینے سے تینوں واقع ہو جاتی ہیں اور یہ اصولِ حدیث کا کلیہ ہے۔ کہ جب کوئی راوی خود اپنی روایت کے خلاف فتویٰ دے یا عمل کرے تو وہ روایت ناقابلِ عمل ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال حضرت ابوہریرہؓ والی حدیث ہے جس میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔ کہ اگر کتا برتن میں منہ ڈال دے تو برتن سات دفعہ دھونا چاہیئے جس میں ایک مرتبہ مٹی مل کر دھونا بھی شامل ہو۔ اب حضرت ابوہریرہؓ کا اپنا فتویٰ یہ ہے کہ صرف تین دفعہ دھونے سے برتن پاک ہو جاتا ہے

چونکہ کتے کے دہن کا لعاب جراثیم آلود ہوتا ہے۔ اس لیے ایک دفعہ مٹی بھی مل لی جائے تو بہتر ہے۔ ورنہ تین دفعہ پانی کے ساتھ دھولینا کافی ہے۔ لہذا سات مرتبہ دھونے والی حدیث ناقابل عمل ہوگئی۔ اتنی دفعہ دھونا ضروری نہ رہا۔ بلکہ اگر احتیاطاً کوئی سات دفعہ بھی دھولے تو وہ استحباب کے درجہ میں آئیگا، لازم نہیں رہا۔ لہذا حضرت ابن عباسؓ کی تین طلاقوں کو ایک طلاق تصور کرنے والی روایت کے استدلال میں کمزوری واقع ہوگئی۔

اگرچہ حضرت ابن عباسؓ کے اکثر شاگرد مذکورہ روایت ہی بیان کرتے ہیں۔ جسمیں تین طلاق کو ایک تصور کیا گیا ہے۔ مگر ابوداؤد شریف کی روایت کے مطابق آپ کے ایک شاگرد ایک دوسری روایت بھی بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں بیک وقت دے دی ہیں۔ آپ نے برجستہ فرمایا عَصَیْتَ رَبَّكَ وَبَانَتْ مِنْكَ اِمْرَأَتُكَ یعنی تو نے اللہ تعالےٰ کی نافرمانی کی اور تیری عورت بھی تجھ سے جدا ہو گئی۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ خود حضرت ابن عباسؓ تین طلاق کو تین ہی تصور کرتے تھے۔ جبھی تو فرمایا۔ کہ اگرچہ تو گنہگار ہوا ہے۔ مگر طلاق واقع ہوگئی۔ اور تیری بیوی تجھ سے علحدہ ہوگئی۔

طحاوی شریف میں ایک اور روایت بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب ہے۔ ایک شخص آپ کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا کہ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔ اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا اِنَّ عَمَّكَ عَصَی اللّٰہَ تیرے چچا نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ وَاَطَاعَ الشَّیْطٰنَ اور شیطان کی بات مانی۔ وَلَمْ یَجْعَلْ لَہٗ مَخْرَجًا مگر اب خلاصی کی صورت بھی باقی نہیں رہی۔ عورت کو طلاق واقع ہوگئی۔

موطا امام مالکؒ میں محمود بن لبیدؓ سے روایت منقول ہے۔ آپ چھوٹی عمر کے صحابی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو تین طلاقیں اکھٹی دے دیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ اللہ کی کتاب کو کھیل اور مشغلہ بنانا درست نہیں۔

آپ سخت ناراض ہوئے۔ اتنے میں ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کی حضور! کیا میں اس کو مار نہ ڈالوں۔ مگر آپ خاموش رہے۔ آپ نے مزید کچھ نہیں فرمایا۔ مگر ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس سے بھی معلوم ہوا۔ کہ بیک وقت طلاق ثلاثہ سے آدمی گنہگار ضرور ہوتا ہے۔ مگر طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

موطا امام مالک میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک اور روایت ہے۔ کہ ایک شخص نے کہا طَلَّقْتُ مِائَۃً میں نے اپنی عورت کو سو طلاقیں دیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ کہ تین طلاقوں کے ساتھ تو عورت علیحدہ ہو گئی، باقی ستانویں ۹۷ طلاقیں دے کر تم نے اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ تین طلاقیں دینے سے تینوں واقع ہو جاتی ہیں۔

لہٰذا تین طلاقوں کے ایک طلاق واقع ہونے والی روایت قابلِ عمل نہیں رہی۔ البتہ اس کے متعلق فقہائے کرام یہ توجیہہ بیان کرتے ہیں۔ کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام، حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے ابتدائی دور تک لوگ ایک ہی طلاق دیتے ہوں، تین کا رواج ہی نہ تھا۔ پھر جب لوگوں نے تین طلاقیں دینا شروع کیں تو حضرت عمرؓ نے حکم صادر کیا۔ کہ جو شخص بیک وقت تین طلاقیں دے گا۔ وہ تین ہی شمار ہوں گی۔ لہٰذا کوئی غلط فہمی میں نہ رہے۔ کہ تین طلاق بیک وقت دینے سے ایک ہی واقع ہو گی اور وہ رجوع کر سکے گا۔ لہٰذا لوگ خبردار رہیں۔

ابوداؤد شریف میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ تین طلاقوں کا ایک طلاق شمار کرنا اس عورت کے لیے ہے جس کا نکاح ہوا مگر خاوند سے خلوت نہیں ہوئی۔ وہ شخص اگر ایک وقت میں تین طلاق بدیں الفاظ دیتا ہے۔ کہ تجھ کو طلاق ہے۔ تجھ کو طلاق ہے۔ تجھ کو طلاق ہے۔ تو ایسی عورت پہلی طلاق پر ہی جدا ہو جائے گی۔ اس کی دوسری اور تیسری طلاقیں لغو ہیں۔ کیونکہ عورت کے غیر مدخولہ ہونے کی وجہ سے اس کے لیے ایک طلاق ہی کافی ہے۔ یہاں دوسری اور تیسری طلاق کا کوئی موقع محل نہیں ہے۔

الغرض! تین طلاقوں کو ایک تصور کرنے کے متعلق صرف حضرت عبداللہ

بن عباسؓ والی روایت سے استدلال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خاص روایت نہیں۔ اس روایت کے متعلق معلوم ہو گیا۔ کہ یہ استدلال کمزور ہے اور روایت موؤن ہے البتہ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت آتی ہے۔ کہ کسی شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا حضرت! اگر کوئی حیض کی حالت میں عورت کو طلاق دیدے تو اس کا کیا حکم ہے۔ فرمایا اگر کوئی ایسی بیوقوفی کرے تو عورت تو جدا ہو جائیگی البتہ طلاق دینے والا گنہگار ہو گا۔ کہ اس نے غلط موقع پہ طلاق دی۔ ابن حزمؒ اور بعض دوسرے ائمہ یہ نکتہ بھی بیان کرتے ہیں۔ کہ پہلی آیت میں فرمایا "اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ" یعنی طلاق دو مرتبہ ہے۔ جس میں رجوع ہو سکتا ہے۔ اس آیت میں فرمایا فَاِنْ طَلَّقَھَا پس اگر اس نے (تیسری) طلاق دیدی۔ فرماتے ہیں۔ کہ یہاں پہ فَاِنْ کی بجائے ثُمَّ کا لفظ بھی آسکتا تھا۔ مگر اس میں حکمت یہ ہے۔ کہ فا اتصال کے لیے آتا ہے۔ جب کہ ثُمَّ میں یہ معنی نہیں پایا جاتا۔ تو یہاں پر فَاِنْ طَلَّقَھَا کا معنی یہ ہو گا کہ دو طلاق کے بعد اگر متصلاً تیسری طلاق دیدے یعنی یک وقت تین طلاقیں دیدے۔ تو عورت حرام ہو جائے گی۔ جب تک وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح کر کے طلاق حاصل نہ کر لے۔ اس سے بھی معلوم ہوا۔ کہ متصل تین طلاقیں تین ہی تصور ہوں گی۔

مشروط نکاح

اس وقت مروجہ حلالہ کی جو صورت ہے وہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب ہے۔ یہ حلالہ مشروط نکاح کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ جب دیکھتے ہیں۔ کہ اب رجوع کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ تو کسی دوسرے شخص کے ساتھ اس شرط پہ نکاح کر دیا۔ کہ وہ طلاق دیدے گا۔ اور پھر پہلے خاوند سے نکاح ہو سکے گا۔ اگرچہ اس طرح قانونی جواز تو پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر اس شرط کے تحت نکاح گناہ کبیرہ ہے۔ ایسے حلالے پہ لعنت کی گئی ہے۔ لَعَنَ اللّٰہُ المحلل والمحلل لہ۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا ــــ حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا گیا۔ دونوں پہ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

بہر حال یہ حلال حرام کا مسئلہ ہے۔ اور اگر حلال و حرام میں اختلاف پیدا ہو جائے تو کلیہ یہ ہے کہ حرام کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ میں تین طلاق پہ عورت حرام ہو جائیگی، خواہ بیک وقت تین طلاق دی ہوں۔ ایک ہی طُہر میں دی ہوں یا حیض کے دوران دی ہوں۔ اب عورت اُس مرد کے لیے حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے۔ پھر وہ خاوند فوت ہو جائے یا طلاق دے دے تو دوبارہ پہلے خاوند سے نکاح ہو سکتا ہے۔

فرمایا وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ یہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدیں ہیں۔ یُبَیِّنُهَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ جو کہ اہلِ علم قوم کے لیے بیان کی گئی ہیں۔ مسئلہ نکاح کا ہو، طلاق یا عدت کا ہو۔ ایلاء یا ظہار کا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے واضح حدیں مقرر کر دی ہیں۔ اِن حدود کا احترام کرنا چاہیئے اور ان کو عبور نہیں کرنا چاہیئے، ورنہ انسان گنہگار ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جائے گا۔

درس نود وہشت (۹۸) — آیت ۲۳۱ تا ۲۳۲

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ
أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ
وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا
آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا
أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُم بِهِ ۚ
ع ۳ ۲۹ ۱۳ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۳۱)
وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ
أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُم بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ
يُوعَظُ بِهِ مَن كَانَ مِنكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ
ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ
لَا تَعْلَمُونَ (۲۳۲)

ترجمہ :- اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت تک پہنچیں۔ پھر ان کو دستور کے مطابق روک رکھو یا ان کو چھوڑ دو دستور کے مطابق۔ اور ان کو ضرر پہنچانے کے لیے نہ روکو، تاکہ تم ان پر زیادتی کرو۔ اور جو شخص ایسا کرے گا۔ بیشک اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور اللہ کی آیتوں کو ہنسی مذاق نہ ٹھہراؤ۔ اور اللہ کی اُس نعمت کو یاد کرو۔ جو اُس نے تم پر کی ہے۔ اور جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں کے ساتھ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے (۲۳۱) اور جب تم عورتوں کو طلاق دیدو، پھر جب وہ

عدت کو پہنچیں۔ تو تم اُن عورتوں کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کریں۔ جب کہ وہ آپس میں دستور کے موافق راضی ہو جائیں۔ یہ باتیں وہ ہیں کہ ان کے ساتھ نصیحت کی جاتی ہے۔ اُس شخص کو جو تم میں سے اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین رکھتا ہے۔ یہ بات تمہارے لیے زیادہ شائستہ ہے اور زیادہ پاکیزہ ہے۔ اور اللہ تعالےٰ جانتا ہے۔ اور تم نہیں جانتے (۲۳۲)

طلاق برائے ایذا رسانی

گذشتہ درس میں یہ مسئلہ بیان ہو چکا ہے کہ طلاقیں اصل میں دو ہی ہیں۔ جب تیسری طلاق دیدی جائے تو پھر بغیر حلالہ کے پہلے خاوند کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا آیت زیر درس میں اللہ تعالےٰ نے نکاح و طلاق اور عدت سے متعلقہ دو اور مسائل بیان فرمائے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری طلاق کے بعد جب عدت پوری ہو جائے تو پھر عورتوں کو بلا وجہ تنگ نہ کرو۔ اگر انہیں روکنا ہے تو معروف طریقے سے اور اگر رخصت ہی کرنا ہے تو بھی اچھے طریقے سے انہیں رخصت کر دو۔ اور دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی مطلقہ یا بیوہ کو نکاح ثانی کرنے سے منع نہ کرو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے بلکہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق نکاح کی اجازت دو۔

زمانہ جاہلیت میں ایک غلط رسم جاری ہو گئی تھی کہ عورتوں کو تنگ کرتے تھے طلاق دے دیتے، جب عدت قریب الاختتام ہوتی تو رجوع کر لیتے۔ کچھ عرصہ بعد پھر طلاق دے دیتے اور جب عدت پوری ہونے کو آتی تو رجوع کر تے۔ مقصد یہ کہ نہ تو عورت کو معقول طریقے سے آباد کرتے اور نہ اُسے رخصت کرتے کہ وہ دوسری جگہ نکاح کر سکے۔ یہ سلسلہ سال ہا سال تک جاری رہتا۔ جس کی وجہ سے بے گناہ عورتوں کو سخت اذیت ہوتی۔ اس قسم کی قباحت کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ۔ جب تم عورتوں کو طلاق دیدو اور پھر اُن کی عدت پوری ہو جائے۔ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ پھر یا انہیں دستور کے مطابق روک لو یعنی رجوع کر لو۔ یعنی اگر تمہیں اپنے سابقہ فعل پر واقعی ندامت ہوئی ہے تو اپنا گھر دوبارہ آباد کر لو اور اس میں نیت اصلاح کی ہونی چاہیئے

محض ایذا رسانی اور عورت کو حق سے محروم کرنے کے لیے ایسا مت کرو۔ بالکل نیک نیتی سے رجوع کر لو۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو۔ علیحدگی کی صورت نظر آتی ہو۔ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ تو پھر انہیں معروف طریقے سے رخصت کر دو۔ تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق دوسرے خاوند کے ساتھ نکاح کر سکیں سَرِّحْ کا معنی چھوڑ دینا یا آزاد کر دینا ہے جانوروں کو جنگل میں چرنے کے لیے چھوڑ دینا تسریح کہلاتا ہے۔ اور جب جانور شام کے وقت جنگل سے واپس پلٹتے ہیں۔ تو اس وقت تریح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ "حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ" یعنی جب تم جانوروں کو واپس پلٹاتے ہو اور جب انہیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو۔ کنگھی کرنے کو بھی تسریح کہتے ہیں۔ اس سے بالوں کی الجھن دور ہو جاتی ہے۔ بہر حال اگر علیحدگی کا حتمی فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ تو پھر مطلقہ عورتوں کو بلا وجہ مت روکو بلکہ انہیں احسن طریقہ سے کچھ دے دلا کر رخصت کر دو۔ انہیں طعن تشنیع کا نشانہ نہ بناؤ۔ گالی گلوچ نہ کرو۔ بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ علیحدہ کرو۔ فرمایا وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا اور انہیں تکلیف پہنچانے کی خاطر مت روکو یہ زیادتی کی بات ہے۔ عورتوں پہ زیادتی مت کرو۔ اس طریقہ سے انہیں روکنا حرام ہے اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہے۔ اس سے بچ جاؤ۔ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ جو ایسا کریگا۔ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ اُس نے اپنی جان پہ ظلم کیا۔ اور اللہ تعالیٰ ظلم کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ دوسری جگہ واضح طور پہ آتا ہے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ۔ ہاں اللہ تعالیٰ بعض اوقات ظالموں کو مہلت دے دیتا ہے۔ مگر بالآخر وہ گرفت میں آجاتے ہیں۔ اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ فرمایا کہ اللہ کے احکام کی صریحاً خلاف ورزی کر کے وَلَا تَتَّخِذُوْا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا اللہ کی آیات کو تمسخر کا نشانہ نہ بناؤ یہ بہت بری بات ہے تمسخر کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص غلام کو کہہ دے کہ جا میں نے تجھے آزاد کیا۔ اور پھر کہے کہ یہ تو میں نے مذاقاً کہا تھا۔ میری نیت تو آزاد کرنے کی نہ تھی۔ یاد رکھو اگر کوئی دل لگی کے لیے بھی غلام کی آزادی کا اعلان کرتا ہے تو غلام آزاد ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی ٹھٹھا

کے طور پہ کہتا ہے کہ میں نے طلاق دی۔ تو بھی طلاق ہو جائے گی۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ کی آیتوں کو ہنسی مذاق نہ بناؤ۔ بلکہ ان پہ سختی سے عمل کرو۔

فرمایا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اللہ تعالیٰ کا وہ احسان یاد کرو۔ جو اُس نے تم پہ کیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان کی دولت سے نوازا ہے۔ تمہارے درمیان عظیم الشان رسول مبعوث فرمایا ہے۔ جو تمہاری تربیت کرتا ہے۔ اجتماعی لحاظ سے تمہیں حکومت عطا کی ہے۔ مال و دولت دیا ہے۔ جاہ و اقتدار بخشا ہے۔ عزت و آبرو دی ہے۔ اِن احسانات کو یاد کر کے اس کے شکر گزار بن جاؤ۔ اور پھر ایک خاص احسان یہ کیا وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ تم پہ ایک عظیم الشان کتاب نازل فرمائی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا آخری پروگرام ہے۔ جس کے بعد کوئی کتاب نہیں۔ کوئی نبی نہیں اور کوئی پروگرام نہیں۔ اور پھر اس کتاب کے ساتھ حکمت بھی نازل کی۔ قرآن پاک خود سراسر حکمت ہے۔ مگر اس کے ساتھ نبی کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ارشادات پُر از حکمت ہیں۔ حکمت کا لفظ حضور علیہ السلام کے ارشادات پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں دو جگہ پہ موجود ہے۔ کہ اس انعام کو یاد کرو جو اُس نے تم پہ کتاب و حکمت کی صورت میں کیا ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام کی سنت اور اس کا اتباع حکمت ہے۔ اور یہ نہایت بصیرت افروز اور حکمت آمیز باتیں ہیں، دانش وری کی باتیں ہیں، اسی لیے فرمایا وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا" جسے حکمت عطا کر دی گئی، وہ خیر کثیر یعنی بہت زیادہ بھلائی سے نوازا گیا۔ آگے اسی سورۃ میں اس کی مزید وضاحت آئیگی۔ فرمایا يَعِظُكُمْ بِهٖ اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ کہ بُری چیزوں کی طرف راغب نہ ہو۔ بلکہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ تعالےٰ سے ڈر جاؤ۔ کہیں اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھو۔ کسی کی حق تلفی نہ کرنا۔ اپنی نیت کو پاک صاف رکھو وَاعْلَمُوْٓا اور یاد رکھو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لو اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں وہ تمہارے دلوں کے ارادے

اور نیتوں کو بھی جانتا ہے تم خدا کو کسی طرح دھوکہ نہیں دے سکتے۔

نکاح میں عورت کی رضامندی

آگے دوسرے مسئلہ کا بیان ہے۔ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ جب تم عورتوں کو طلاق دے دو فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں یعنی عدت ختم ہو جائے فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ تو انہیں اس بات سے مت روکو اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ جب ان کے درمیان دستور کے مطابق راضی نامہ ہو جائے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ حضرت معقل بن یسارؓ کی بہن کا نکاح ایک شخص سے ہوا۔ کچھ عرصہ بعد اُس شخص نے طلاق دیدی۔ صحابی رسول نے اُسے رجوع کے لیے کہا مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اور مدت پوری ہو گئی۔ تاہم یہ طلاق مغلظ نہیں تھی دوبارہ نکاح ہو سکتا تھا۔ جب عورت آزاد ہو گئی۔ تو بعض دوسرے لوگوں نے بھی نکاح کے پیغام بھیجے۔ اتنے میں اُس شخص کو اپنے کئے پہ ندامت ہوئی اور اس نے بھی دوبارہ نکاح کی خواہش کا اظہار کیا۔ عورت بھی اس پر رضامند ہو گئی۔ کہ چلو کسی غیر کا منہ نہ دیکھنا پڑیگا۔ حدیث شریف میں یہ الفاظ آتے ہیں فَهَوِيَ مَاهَوِيَتْ یعنی دونوں کی خواہش تھی۔ کہ ان کا دوبارہ نکاح ہو جائے۔ مگر حضرت معقلؓ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ان کا استدلال یہ تھا۔ کہ جس شخص نے اُس کی بہن کو طلاق دی اور پھر کہنے کے باوجود رجوع نہیں کیا۔ ایسے کمینے شخص کے ساتھ دوبارہ نکاح نہیں ہونے دوں گا۔ اسی دوران یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضور علیہ السلام نے انہیں بلا کر اللہ تعالیٰ کا حکم سنایا۔ کہ اگر مرد اور عورت نکاح پہ رضامند ہیں۔ تو پھر ولی کو مداخلت نہیں کرنی چاہیئے۔ جب حضرت معقل بن یسارؓ نے یہ حکم سُنا تو کہا سَمْعًا لِرَبِّيْ وَطَاعَةً ہم اپنے رب کی بات سنتے ہیں اور اس پہ عمل کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا یہی منشاء ہے تو میں اپنے رب کی اطاعت کروں گا۔ چنانچہ ان دونوں کا دوبارہ نکاح ہو گیا۔ اسی لیے فرمایا۔ کہ اگر کوئی مرد اور عورت نکاح پہ رضامند ہوں۔ تو بلا وجہ انہیں اس کام سے نہ روکو۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت سے یہ مراد نہیں ہے۔ کہ عورت صرف

پہلے خاوند سے ہی نکاح کر سکتی ہے بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ عاقل بالغ عورت اپنی مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ درمیان میں بلاوجہ رکاوٹ نہیں بننا چاہیئے۔ بشرطیکہ وہ دونوں دستور کے مطابق صحیح طریقہ سے نکاح پر رضامند ہوں۔ اگر عورت کی رضامندی کے خلاف دوسری جگہ نکاح کر دیا جائے۔ تو کئی قسم کی معاشرتی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ جن کی وجہ سے یہ گنہگار ہوں گے۔ لہٰذا اُسے اپنی مرضی سے نکاح کرنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیئے۔ صرف ایک شرط ہے۔ کہ عورت کا مجوزہ خاوند اُس کا کفو (ہمسر) بھی ہو۔ اور اسے حق مہر بھی پورا میسر آتا ہو اور کوئی بھی چیز باعث تحقیر نہ ہو۔ تو انہیں نکاح کی اجازت دے دینی چاہیئے۔

مسئلہ ولایت

اس موقع پر مسئلہ ولایت کا مختصر بیان بھی ہو جائے۔ اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا اختلاف ہے۔ کہ آیا عاقلہ بالغہ عورت بغیر ولی کے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اس کے حق میں ہیں۔ جب کہ امام شافعیؒ کا فتویٰ اس کے خلاف ہے دونوں طرف دلائل موجود ہیں۔ تاہم امام اعظمؒ کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔ کہ نابالغ عورت کا نکاح تو بغیر ولی کے نہیں ہو سکتا۔ البتہ عاقلہ اور بالغہ عورت، باکرہ ہو یا ثیّبہ بغیر ولی کے نکاح کر سکتی ہے۔ فرمایا یہ نکاح تو ہو جائے گا مگر یہ ناپسندیدہ فعل ہوگا۔ اس سلسلہ میں ایک چیز کی گنجائش ہے۔ اگر عورت نے اپنی مرضی سے غیر کفو کے ساتھ نکاح کیا ہے۔ تو ولی یا سرپرست ایسے معاملہ کو عدالت میں لے جا سکتا ہے۔ اور اگر عدالت مناسب سمجھے تو نکاح فسخ کر سکتی ہے۔ شاہ صاحب کی یہ بات بڑی قیمتی ہے۔ اگر عورتیں خود بخود نکاح کرنے لگیں تو پھر تو یہ دھاندلی ہو گی ——— صحیح طریقہ یہ ہے۔ کہ نکاح سرپرست کی معرفت سے ہونا چاہیئے۔ لڑکی کا باپ ہے یا بڑا بھائی یا چچا ہے، وہ خود دیکھ بھال کر نکاح کا فیصلہ کریں۔ تاہم نکاح کے لیے عورت کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ بہرحال اگر عورت اپنی مرضی سے نکاح کر لیتی ہے۔ تو نکاح جائز ہوگا مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

ایک روایت میں آتا ہے۔ لَا نِکَاحَ اِلَّا بِوَلِیٍّ یعنی ولی کے بغیر نکاح ہی نہیں ہوتا ہے۔ بعض فقہائے کرام کہتے ہیں۔ کہ اس روایت کی رو سے بغیر ولیؒ کے نکاح باطل ہوگا پوری روایت اس طرح ہے۔ لَا نِکَاحَ اِلَّا بِوَلِیٍّ وَبِشَاهِدَیْ عَدْلٍ ولی اور دو عادل گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نکاح کے لیے دو عادل گواہ ضروری ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ ولی کا ہونا لازمی نہیں۔ دو گواہ ضروری ہیں۔ تاہم وہ فرماتے ہیں کہ ولی کی رضامندی اور اسکی سرپرستی بہتر ہے

نکاح ثانی میں رکاوٹ نہ بنو

اب آگے دوسرا مسئلہ بیان ہو رہا ہے۔ کہ اگر کوئی عورت بیوہ یا مطلقہ ہو جائے اور وہ دوسرا عقد کرنا چاہے۔ تو اسے اجازت دے دینی چاہیئے۔ نکاح میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیئے۔ فرمایا وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں۔ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ انہیں اس بات سے مت روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کریں۔ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ۔ جب کہ وہ آپس میں دستور کے مطابق راضی ہو جائیں۔ امام شافعیؒ یہاں بھی پہلے لفظ تَعْضُلُوْهُنَّ سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ یہ ولی کو کہا جا رہا ہے۔ کہ نکاح میں رکاوٹ نہ بنیں۔ گویا ولی کا دخل ضروری ہے۔ امام ابوحنیفہؒ لفظ يَنْكِحْنَ سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ نکاح کرنا عورت کا حق ہے۔ یہ اُسے اختیار ہے۔ کہ وہ اپنی حسب منشاء نکاح کرے۔ اس کی مثال حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ میں بھی ملتی ہے۔ کہ وہ دوسرے خاوند سے نکاح کرے اور پھر یہاں آگے آتا ہے ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ اس بات کی نصیحت کی جاتی ہے مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ تم میں سے اُس شخص کو جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے کہ وہ عورت کے معاملہ میں دخیل نہ بنے۔ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَاَطْهَرُ یہ چیز تمہارے لیے زیادہ شائستگی اور زیادہ پاکیزگی والی ہے۔ عورتوں کو نکاح ثانی سے مت روکو۔ ورنہ کئی طرح کی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اور اس کے ذمہ دار تم ہوگے۔ یہاں

یہ طہارت ۔ اسے مراد ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی پاکیزگی ہے ۔ نکاح کر لینے سے ان کے دِل بھی مطمئن ہو کر پاک ہو جائیں گے اور ظاہراً کسی گناہ میں ملوث ہونے کا احتمال بھی نہیں ہو گا ۔ فرمایا وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ اللہ تعالیٰ جو ایسے احکام نازل کرتا ہے ، ان کی حکمت کو بھی وہی جانتا ہے ۔ تم اس کی گہرائی سے واقف نہیں ہو ۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق عورت کو نکاح ثانی کی اجازت دو ، اس میں رکاوٹ نہ بنو ۔

درس نود و نہ (۹۹) آیت ۲۳۳

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ
اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ
بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ
فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْلَمُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾

ترجمہ: اور مائیں یعنی بچے والی عورتیں اپنے بچوں کو کامل دو سال تک دودھ پلائیں یہ اس شخص کے لیے ہے۔ جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ اور والد کے ذمہ ہے۔ ان کا کھانا اور لباس دستور کے مطابق ہے۔ نہیں تکلیف دی جائیگی کسی نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق، نہیں نقصان پہنچایا جائے گا والدہ کو اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ والد کو اس کے بچے کی وجہ سے۔ اور وارث پر بھی اسی طرح لازم ہے۔ پس اگر بچے کے والدین دودھ چھڑانے کا ارادہ کریں آپس کی رضامندی اور مشورہ سے تو ان پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اور اگر تم ارادہ کرتے ہو اپنی اولادوں کو دودھ پلانے کا دوسری عورتوں سے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ جب کہ تم دیدو وہ چیز جو مقرر کی ہے دستور کے مطابق۔ اور اللہ سے ڈرو، اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ (۲۳۳)

اس درس میں طلاق ہی کے ضمن میں مسئلہ رضاعت بیان ہوا ہے مسئلہ

یعنی طلاق کے بعد اگر عورت کی گود میں بچہ ہو، تو اس کی پرورش کس طرح ہوگی۔ بچے کی ذاتی دیکھ بھال کون کریگا اور اس کا خرچہ کون برداشت کریگا۔ رضاعت کا لفظی معنیٰ دودھ پلانا ہے۔ چونکہ بچہ مرد کا حق ہوتا ہے۔ اور دودھ عورت پلاتی ہے۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ مرد و زن کی علیٰحدگی کی صورت میں بچے کی پرورش کیسے ہوگی۔ جب کہ اصولاً بچے کو مرد کی تحویل میں چلے جانا چاہیئے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔ اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ۔ یہ اس شخص کے لیے حکم ہے۔ جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ علیٰحدگی کی صورت میں اپنی ماں کا دودھ پلانے میں خاص حکمت کار فرما ہے۔ اگر بچہ اپنی ماں کی بجائے کسی دوسری عورت کا دودھ پیئے گا۔ تو وہ عورت اس کی رضاعی ماں بن جائے گی۔ نکاح کے متعلق رضاعی ماں کے بھی وہی احکام ہیں۔ جو حقیقی ماں کے ہیں۔ لہذا جب بچہ نکاح کے قابل ہو گا، تو جس طرح اس کا نکاح حقیقی ماں کی رشتہ داری کی وجہ سے بعض عورتوں سے حرام ہے، اسی طرح رضاعی ماں کی وجہ سے جو رشتہ دار بہن، چچی، بھتیجی، خالہ، بھانجی وغیرہ ہوں گے۔ اُن سے بھی نکاح نہیں ہوسکے گا۔ اس لیئے اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ترغیب دی کہ طلاق کی صورت میں جہاں تک ممکن ہو مطلقہ عورت کا بچہ اپنی ماں کا دودھ پیئے۔ لہذا اس کے لیے احکام نازل فرمائے۔ اس کی تفصیل آگے سورۂ نساء میں آئیگی۔ "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ"

مدت رضاعت

رضاعت یعنی دودھ پلانے کی مدت کے متعلق فقہائے کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ جن فقہائے کرام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ وہ رضاعت کی مدت دو سال بتاتے ہیں حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔ مگر امام مالکؒ دو سال تین ماہ کے قائل ہیں۔ امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے۔ کہ رضاعت کی انتہائی مدت اڑھائی سال ہے۔ وہ سورۃ احقاف کی آیت "وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا" یعنی حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ ہے جو کہ اڑھائی سال

بنتے ہیں۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں جو دو سال کا ذکر آیا ہے، تو یہ قانونی مدت رضاعت ہے۔ قانونی حیثیت سے دو سال تک دودھ پلانا ضروری ہے تاہم زیادہ سے زیادہ مدت اڑھائی سال ہے۔ تاہم کسی کو دو سال سے زیادہ عرصہ کے لیے دودھ پلانے پہ مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی طور پہ اگر ماں رضامند ہو تو ایسا ہو سکتا ہے

رضاعت اور خرچہ کی ذمہ داری

اس آیت کریمہ میں دودھ پلانے کا حکم سب سے پہلے حقیقی ماؤں کو دیا گیا وَالْوَالِدٰتُ یُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ۔ اور حقیقی ماں کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ عورت اپنے خاوند کے نکاح میں ہے۔ دودھ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ کوئی بیماری بھی لاحق نہیں۔ تو ایسی حالت میں دودھ پلانا ماں پہ واجب ہے۔ اور اس کے خرچہ کی ذمہ داری باپ پر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے۔ کہ عورت کو طلاق ہو چکی ہے مگر ابھی عدت میں ہے تو اس حالت میں بھی دودھ پلانے کی ذمہ داری ماں پہ ہے۔ البتہ ماں اور بچے کا خرچہ مرد کے ذمے ہے۔ جب تک عدت ختم نہ ہو ہر قسم کا خرچہ خوراک، لباس، رہائش علاج وغیرہ سب آدمی کی ذمہ داری ہے۔ اب تیسری صورت یہ ہے۔ کہ عورت کو طلاق ہو کر عدت ختم ہو چکی ہے۔ تو اس حالت میں عورت کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے بچے کی پرورش کی ساری ذمہ داری اسکے باپ پہ عائد ہوتی ہے اگر بچے کی حقیقی ماں دودھ پلانے پر رضامند ہو تو باپ کو چاہیے کہ اُسے اولیت دے اور اس کا خرچہ معمول کے مطابق برداشت کرے ہاں اگر عورت معمول سے زیادہ خرچہ طلب کرے تو پھر اسی کی خدمات حاصل کرنا ضروری نہیں۔ مرد کسی دوسری عورت کو اجرت دے کر بچے کو دودھ پلوا سکتا ہے۔ بعض اوقات حقیقی ماں کا دودھ کسی عارضہ کی وجہ سے مضر صحت ہوتا ہے۔ یا دودھ اتنا کم ہے۔ کہ بچے کی پرورش ٹھیک طور سے نہیں ہو سکتی۔ تو ایسی صورت میں بھی باپ کی ذمہ داری ہے۔ کہ وہ مناسب معاوضہ ادا کر کے کسی دوسری عورت سے دودھ پلوائے

فرمایا وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ط

جب یہ طے ہو جائے۔ کہ ماں ہی بچے کو دودھ پلائے گی تو پھر ایسی ماؤں کی خوراک اور لباس کی ذمہ داری دستور کے مطابق بچے کے باپ پر ہوگی۔ عورت خواہ مرد سے

نکاح میں ہے یا مطلقہ ہو کر عدت گزار رہی ہے۔ اُس کے اخراجات مرد برداشت کریگا۔ اور اگر عورت عدت پوری کر کے بالکل جدا ہو چکی ہے۔ تو پھر اُس کو اُسی طرح اجرت دی جائیگی جس طرح کسی غیر عورت کو دی جاتی ہے اور یہ اُجرت یا معاوضہ دستور کے مطابق معقول ہونا چاہیئے، نہ کم نہ زیادہ اور اس معاملہ میں لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جائیگی۔ مثلاً عورت کو کوئی عارضہ ہے اور دودھ پلانے کے قابل نہیں ہے۔ یا دودھ پلانے سے اس کی صحت کو خطرہ ہے تو ایسی صورت میں اُسے دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر مرد کی مالی حالت کمزور ہے۔ تو اس کی حیثیت سے زیادہ اجرت طلب نہیں کی جائیگی اسی لیے فرمایا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا والدہ کو اُس کا اپنا بچہ ہونے کی بنا پر نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ چونکہ اس کو بچے سے محبت ہے اور اُس کی مامتا کا تقاضا ہے۔ کہ اُسے خود دودھ پلائے تو اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ماں کو کم اجرت پر مجبور نہیں کرنا چاہیئے۔ وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ اور نہ باپ کو محض اس وجہ سے تکلیف دی جائیگی۔ کہ وہ بچے کا باپ ہونے کی وجہ سے اس کی پرورش کرنے پر مجبور ہے۔ مگر وہ اپنی حیثیت سے زیادہ اجرت نہیں دے سکتا۔ لہذا ماں کو اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بچے کے باپ کو تنگ نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ یہ معاملہ افہام و تفہیم کے ذریعے دستور کے مطابق اور باپ کی مالی حالت کے پیش نظر طے کرنا چاہیئے۔

اسلام میں یہ ایک عام قانون ہے۔ کہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دینی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا دستور بھی یہ ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا " اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ عبادات میں دیکھ لیں۔ اگر کوئی شخص معذور ہے یا مجبور ہے کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا تو بیٹھ جائے۔ لیٹ کر پڑھ سکتا ہے، اشاروں سے نماز ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر بیمار ہے یا مسافر ہے تو روزہ کو قضا کر سکتا ہے۔ دودھ پلانے کے معاملہ میں بھی فرمایا کہ کوئی فریق دوسرے فریق کو تنگ نہ کرے، بلکہ معمول کے مطابق احسن طریقہ

سے یہ کام انجام دیا جائے۔

یتیم بچے کی رضاعت

یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر بچے کا باپ فوت ہو چکا ہو، تو اس کی رضاعت کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی۔ فرمایا وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ جس طرح باپ بچے کی پرورش کا ذمہ دار تھا اسی طرح اسکی عدم موجودگی میں وارث اس کی ذمہ داری قبول کرے گا۔ اب وارث سے کون سا وارث مراد ہے۔ اس ضمن میں مختلف اقوال ہیں۔ وارث اگر بطور اسم جنس لیا جائے۔ تو اس کے معنی تمام وارث ہوں گے۔ ہر وارث ترکہ سے جس قدر وراثت کا حقدار ہے، اسی نسبت سے وہ یتیم بچے کی پرورش کا خرچ بھی برداشت کرے گا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں کہ وارث سے مراد باپ کے وارث ہیں اور ان میں خود بچہ بھی شامل ہے۔ اس لحاظ سے بچے کی پرورش یعنی اس کی ماں کا نان نفقہ بچے کی جائیداد سے ادا کیا جائیگا۔ تفسیر روح البیان میں ہے۔ کہ وارث سے مراد بچے کے وارث بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی اگر بچہ فوت ہو جائے۔ تو اس کا ترکہ کن کن وارثوں کو پہنچتا ہے اس لحاظ سے جو وارث بنتے ہیں۔ وہی رشتہ دار بحساب حصہ رسدی وراثت بچے کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔ یعنی جس وارث کو بچے کی جائیداد سے آدھا حصہ مل سکتا ہے۔ وہ بچے کے نصف خرچہ کا ذمہ دار ہوگا اور جس کو ایک تہائی، چھٹا حصہ یا آٹھواں حصہ پہنچتا ہے۔ وہ اسی قدر بچے کا خرچہ برداشت کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ اگر بچے کی اپنی جائیداد نہ ہو، تو پھر اس کے مالدار عزیزوں میں سے جو اس کے وارث اور محرم ہوں وہ اس کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔ محرم سے مراد یہ ہے کہ اگر بچے اور اس کے عزیزوں میں سے ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت فرض کر لیا جائے، تو دونوں کا نکاح درست نہ ہو اس لحاظ سے بچے کی ماں پر بھی ذمہ داری آتی ہے۔ مثلاً یتیم بچے کی ماں موجود ہے اور اس کا دادا بھی ہے۔ تو وراثت کے حصہ رسدی کے مطابق بچے کی کفالت ایک تہائی ماں کے ذمہ اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہوگی۔ اس لحاظ سے بچے کے بھائی، چچا، تایا وغیرہ بھی بحیثیت وارث اور محرم اس کی پرورش کے ذمہ دار ہیں

تفسیر روح البیان کے مطابق متوفّی کے عصبات بھی ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی چچا، تایا، دادا وغیرہ کو یہ ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔

یہاں پہ مطلق وارث کا لفظ استعمال کرنے میں یہ حکمت کارفرما ہے کہ حالات کے مطابق شرعی عدالت یتیم بچے کی پرورش کی ذمہ داری کسی بھی وارث پر ڈال سکتی ہے تاہم عدالت کو یہ بات مدنظر رکھنا ہوگی کہ سب سے پہلے یہ ذمہ داری بچے کی اپنی جائداد پہ ڈالی جائے۔ پھر بچے کے قریبی وارثوں پہ اور پھر متوفی کے عصبات پر کیونکہ یہ مسلمہ اصول ہے۔ کہ حق ادا کرنے کا حق بھی اُسی پہ عائد ہوتا ہے۔ جو حق وصول کرنے کا حق رکھتا ہے

ایک صورت اور بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ کہ نہ تو بچے کی اپنی کوئی جائداد ہو اور نہ اس کا کوئی وارث ہو۔ ایسی صورت میں بچے کی پرورش کی ذمہ داری حکومتِ وقت پہ ہو گی۔ اگر دین سے بے بہرہ حکومت یہ ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ ہو۔ تو پھر یہ ذمہ داری مسلمانوں کی عام جماعت کے سر پہ ہے۔ کیونکہ اگر مناسب دیکھ بھال کے بغیر بچہ ضائع ہو گیا۔ تو مسلمانوں کی پوری جماعت عنداللہ ماخوذ ہوگی۔

مدت رضاعت میں رعایت

فرمایا اگرچہ رضاعت کی مدت عام طور پہ دو سال مقرر کی گئی ہے۔ تاہم فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اگر بچے کے ماں باپ باہمی رضامندی اور مشاورت سے بچے کا دودھ دو سال سے پہلے چھڑانا چاہیں تو ان پہ کوئی گناہ نہیں۔ بشرطیکہ بچے کی بہتری مطلوب ہو۔ اگر وہ دونوں سمجھتے ہیں۔ کہ ایک سال بعد یا ڈیڑھ سال بعد بچہ ماں کے بغیر بخیر و خوبی پرورش پا سکتا ہے۔ تو باپ کو حق ہے کہ وہ اُسے لے جائے۔

اجنبی عورتوں سے رضاعت

فرمایا وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ اگر تم بچے کی حقیقی ماں کے علاوہ کسی دوسری عورت سے بچے کو دودھ پلانا چاہو۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ تو اس کے لیے تم پہ کوئی گناہ نہیں۔ یہ بھی جائز ہے بشرطیکہ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ جو کچھ ان سے مقرر کیا ہے۔ اُسے دستور کے مطابق ادا کرو۔ اس میں کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہ کرو۔ جو اجرت طے کر لو، وہ ادا کر دو۔

تاہم دودھ پلانے کا اولین حق ماں کو ہے۔ کیونکہ جو ماماتا حقیقی ماں کے دِل میں ہوتی ہے۔ وہ دوسری کے دِل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ تاہم اگرچہ خاص مجبوری کی وجہ سے حقیقی ماں سے دودھ پلانا ممکن نہ ہو، تو دوسری عورت کو مقرر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ماں بیمار ہے۔ اور اس کا دودھ مضر صحت ہے۔ یا دودھ بالکل کم ہے جس سے بچے کی خوراک پوری نہیں ہوتی۔ تو ایسی صورت میں غیر عورتوں سے دودھ پلانا درست ہوگا۔

فرمایا اس معاملہ میں وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈرتے رہو کہیں اس کی نافرمانی نہ کر بیٹھنا، اس کے احکام بلا وجہ نہیں ہیں، بلکہ اس نے یہ احکام اپنی خاص حکمت اور انسان کی بہتری کے لیے دیے ہیں۔ ان کے مطابق عمل کرو۔ اور پھر یہ نہ سمجھ لینا کہ کسی ہیر اپھیری سے اللہ تعالیٰ کے احکام کو ٹال سکو گے۔ وَاعْلَمُوْا خوب یاد رکھو اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ تم جو کچھ بھی عمل کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔ وہ تمہاری نیتوں تک سے واقف ہے۔ تم اُسے دھوکہ نہیں دے سکتے۔ لہٰذا اُس کے احکام کی نافرمانی کا ارادہ کرتے وقت اس کے عذاب کو بھی نگاہ میں رکھ لینا۔

درس صد (۱۰۰)   آیت ۲۳۴ تا ۲۳۵

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ
بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًاۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ
عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا
اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ
حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ
اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ ع ۳۰ / ۱۴

ترجمہ: اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں چار ماہ اور دس دن۔ اور جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ جو کچھ وہ عورتیں اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو، اس کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۲۳۴﴾ تم پر اس بات میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ کہ تم اشارہ کرو اس بات کے ساتھ عورتوں کے لیے پیغام نکاح کا، یا پوشیدہ رکھو تم اس بات کو اپنے نفسوں میں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ کہ بیشک تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے، لیکن ان سے وعدہ نہ کرو نکاح کا پوشیدہ طور پر، مگر یہ کہ تم دستور کے مطابق بات کہو۔ اور نہ ارادہ کرو نکاح کی گرہ باندھنے کا یہاں تک کہ کتاب اپنی مدت تک پہنچ جائے اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ جانتا ہے، جو کچھ تمہارے نفسوں میں ہے اس سے ڈرتے رہو، اور جان لو

کہ بے شک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا اور بردبار ہے (۲۳۵)

گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے رضاعت کا مسئلہ بیان فرمایا تھا کہ اگر ماں کو طلاق ہو جائے تو بچے کو دودھ کون پلائے گی۔ رضاعت کی مدت اور دودھ پلانے والی عورت کے حق کا بیان تھا۔ یہ بھی آچکا ہے۔ کہ اگر بچے کا باپ موجود ہے۔ تو رضاعت کا خرچہ وغیرہ اس کی ذمہ داری ہے۔ اور اگر باپ نہیں ہے۔ تو یہ ذمہ داری ان لوگوں پر عاید ہوتی ہے۔ جو بچے کے وارث بن سکتے ہیں۔ اگر بچے کی اپنی ماں دودھ پلانے سے قاصر ہے، وہ خود بیمار ہے۔ یا اس کا دودھ مضر صحت ہے، تو پھر کسی دوسری عورت سے دودھ پلانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ تاہم ایسی عورت کے ساتھ جو اجرت طے ہو جائے اُسے دستور کے مطابق ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک دوسرے پر زیادتی نہیں ہونی چاہیئے۔ ماں کو مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ لازماً بچے کو دودھ پلائے، اگرچہ بغیر عذر بچے کو دودھ پلانا ماں ہی کے ذمہ واجب ہے۔ اسی طرح باپ کو بھی مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ صرف بچے کی ماں سے ہی دودھ پلوائے۔ وہ کسی اور عورت کیطرف بھی رجوع کر سکتا ہے اور بلاوجہ بچے کو ماں سے چھیننا بھی درست نہیں۔ یہ ساری باتیں سابقہ آیت میں واضح کر دی گئی ہیں۔ — ربطِ آیات

دوسرا مسئلہ عدت کا ہے۔ بعض قسم کی صورتوں کی عدت پہلے بیان ہو چکی ہے مثلاً جن مطلقہ عورتوں کو ماہواری آتی ہے۔ ان کی عدت اللہ تعالیٰ نے تین حیض مقرر فرمائی ہے اور جن کو حیض نہیں آتا۔ ابھی چھوٹی عمر ہے۔ یا کبرسنی کی وجہ سے خون آنا بند ہو گیا ہے۔ ایسی عورتوں کی عدت تین مہینے ہے۔ جس عورت کا نکاح ہو گیا مگر میاں بیوی میں خلوت نہیں ہوئی اور طلاق واقع ہو گئی۔ ایسی عورت کے لیے کوئی عدت نہیں۔ اس کا بیان سورۃ احزاب میں ہے۔ ایسی عورت طلاق کے بعد فوراً نکاح کر سکتی ہے۔ سورۃ طلاق میں اللہ نے حاملہ عورتوں کی عدت بھی بیان فرمائی ہے — عدت کی مختلف اقسام

وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ

ایسی عورت کی عدت وضع حمل ہے۔ جب بچہ پیدا ہو گا۔ عدت ختم ہو جائے گی۔ اس

بات کا کوئی لحاظ نہیں کہ بچہ چند دن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یا نو دس مہینے لگ جاتے ہیں

بیوہ کی عدت

آج کے درس والی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کی عدت بیان فرمائی ہے جن کے خاوند فوت ہو جاتے ہیں۔ متوفی عنہا زوجہا کی عدت کے بیشتر مسائل قرآن پاک میں بیان ہوئے ہیں۔ حدیث میں بھی بہت سی تفصیلات موجود ہیں۔ اب بیوہ بھی دو قسم کی ہو سکتی ہیں۔ اگر بیوہ حاملہ ہے۔ تو اس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ خواہ بچہ جلدی پیدا ہو جائے یا نو ماہ بعد، حضرت سعد ابن خولہؓ حجۃ الوداع کے موقع پر اونٹنی سے گر کر شہید ہو گئے تھے۔ اُن کی بیوی حاملہ تھی۔ وفات کے ۲۲ دن بعد اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا، تو حضور علیہ السلام نے فرمایا، اس کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ اب اس کو نکاح ثانی کی اجازت ہے۔ ہاں نفاس کا گزرنا ضروری ہے (مقاربت کے لیے)

اور اگر عورت حاملہ نہیں ہے۔ تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ اس کے اندر مصلحت یہ ہے۔ کہ اگر اُس کو حمل ہے۔ تو اس عرصہ میں ظاہر ہو جائے گا۔ اگر معلوم ہو جائے کہ عورت حاملہ ہے۔ تو اس کی عدت جیسا کہ پہلے بیان ہوا، وضع حمل ہو گی۔ اگر حمل نہیں ہے تو اُسے چار ماہ اور دس دن تک عدت پوری کرنا ہو گی۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا تم میں سے جن کو وفات دی جاتی ہے۔ اور وہ پیچھے بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ وہ روکے رکھیں اپنے آپ کو چار ماہ اور دس دن۔ یہ ان کی عدت ہے

غیر مذاہب میں قباحتیں

یہودیوں میں عدت کا کوئی نظریہ نہیں۔ ان کی عورتیں طلاق یا بیوگی کی صورت میں فوراً دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہیں۔ ہندوؤں میں ایسی عورتیں ساری عمر سوگ مناتی ہیں۔ انہیں نکاح ثانی کی اجازت نہیں اوّل تو وہ خاوند کے ساتھ ہی زندہ جل جاتی ہیں۔ اگر ایسا نہیں کیا، تو ساری عمر یونہی بیٹھی رہیں گی۔ بہر حال یہ افراط و تفریط ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اور افراط و تفریط سے پاک ہے۔ اس میں نکاح کے حقوق اور نسب کا لحاظ رکھا گیا ہے اسلام نے ایسے احکام جاری کیے ہیں کہ نہ تو انسان کا نسب خراب ہو۔ نہ اخلاق میں بگاڑ پیدا ہو۔ اور نہ ہی کوئی چیز حیا کے خلاف ہو۔

جاہلیت کے زمانہ میں بیوہ سال بھر تک سوگ مناتی تھی، بیوہ عورت عام لوگوں کے ساتھ مکان میں نہیں رہ سکتی تھی۔ بلکہ اسے کسی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیا جاتا تھا۔ نہ وہ غسل کر سکتی تھی اور نہ کپڑے تبدیل کرنے کی مجاز تھی۔ اس کو منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا بھی نہیں کھا سکتی تھی۔ ایک سال گزرنے کے بعد اُسے کوٹھڑی سے نکالا جاتا اور گدھے یا اونٹ پر سوار کیا جاتا مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ مُرغ یا کوئی دوسرا جانور ایسی عورت کو لا کر دیا جاتا جسے وہ اپنے اعضائے تناسلیہ کے ساتھ ملتی۔ اکثر اوقات وہ جانور تعفن اور زہریلے جراثیم پیدا ہو جانے کی وجہ سے مر جاتے۔ نہ استنجا نہ طہارت۔ پھر اس عورت کے ہاتھ میں اونٹ یا بکری کی مینگنیاں پکڑاتے، وہ اپنے ہاتھ سے مینگنیاں پھینکتی، تو اس کے لواحقین کہتے کہ اب اس کی عدت پوری ہو گئی ہے۔ اب یہ نہا دھو کر صاف لباس پہن سکتی ہے۔ خوشبو استعمال کر سکتی ہے۔ گویا جاہلیت کے زمانہ میں اس قسم کا بُرا دستور تھا۔

حضور علیہ السلامؐ کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کیا، حضور! میری بیٹی کا خاوند فوت ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔ کیا وہ سرمہ لگا سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا، بڑے افسوس کا مقام ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں تم سال بھر سخت مشقت اٹھاتی تھیں مگر اسلام کی عائد کردہ چار ماہ دس دن کی معمولی پابندی برداشت نہیں کر سکتی۔ مقصد یہ کہ عورت عدت کے دوران سرمہ نہیں لگا سکتی۔ رنگین کپڑے نہیں پہن سکتی۔ خوشبو نہیں لگا سکتی۔ زیور نہیں پہن سکتی زینت کا سامان استعمال نہیں کر سکتی۔ البتہ صاف لباس پہن سکتی ہے غسل کر سکتی ہے، نماز پڑھ سکتی ہے دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک مکان میں رہ کر اکٹھا کھا پی سکتی ہے۔ یہ سب جائز ہے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ جو عورت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قیامت پر ایمان رکھتی ہے وہ کسی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ نہ منائے مگر خاوند پر چار ماہ دس دن تک سوگ منانے کا حکم ہے۔ ام المؤمنین حضرت زینبؓ اور ام حبیبہؓ کے واقعات ملتے ہیں۔ ایک کے والد فوت ہو گئے اور دوسری کے بھائی انہوں نے تین دن گزرنے کے بعد خوشبو منگائی۔ اور کچھ بچی کے سر پر لگا دی اور کچھ اپنے ہاتھوں کو مل لی۔ عورتوں کے مجمع میں فرمایا۔ مجھے خوشبو کی حاجت نہ تھی۔ مگر میں تمہیں مسئلہ سمجھانا چاہتی تھی۔ کہ

---

[1] قرطبی ج ۲ ص ۱۸۰ (فیاض)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے۔ کہ کسی عورت کے لیے روا نہیں ہے۔ کہ وہ تین دن سے زیادہ سوگ منائے سوائے خاوند کی فوتیدگی پر جب کہ چار ماہ دس دن تک سوگ ہے۔

نکاح کی اجازت

فرمایا فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ جب انکی عدت پوری ہو جائے۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِىْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ تو اب تم پر کوئی حرج نہیں ہے۔ کہ وہ عورتیں اپنے بارے میں دستور شریعت کے مطابق فیصلہ کریں۔ یعنی اگر وہ نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں۔ کہیں نکاح کا پیغام بھیجنا چاہیں تو کوئی حرج نہیں، وہ ایسا کر سکتی ہیں۔ کسی دوسرے شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا۔ کہ وہ ان کو اس کام سے منع کرے یا ان کے کام میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالے۔ فرمایا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ جو کچھ تم کرتے ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی خبر رکھتے ہیں۔

عدت میں اشارے کنائے کی اجازت

اگر عورت مطلقہ ہے۔ تو دوران عدت کسی دوسرے شخص کو اجازت نہیں کہ وہ اشارہ کنایہ سے بھی مطلقہ کے ساتھ بات کرے۔ صرف اس کے خاوند کو اجازت ہے وہ بھی اس صورت میں کہ طلاق مغلظہ نہ ہو۔ بیوہ کے لیے حکم یہ ہے۔ کہ عدت کے دوران نکاح کا وعدہ کرنا حلال نہیں ہے۔ اگر اُسے کوئی ایسا پیغام بھی ملے۔ تو وہ کہلا بھیجے کہ عدت کے اختتام کا انتظار کرو۔ البتہ عدت کے دوران اشارے کنائے سے بات ہو سکتی ہے جبکہ اس میں صراحت نہ ہو۔ اس قسم کا ایک واقعہ ملتا ہے۔ ایک عورت بیوہ ہو گئی۔ امام جعفر صادق کے فرزند نے اس سے کہا۔ کہ تم جانتی ہو۔ کہ میرا تعلق حضور علیہ السلام کے ساتھ کیا ہے۔ اور جو میری قرابت حضرت علیؓ سے ہے اس کو بھی جانتی ہو عام لوگوں میں میرا جو مقام ہے۔ اس سے بھی تم واقف ہو۔ اس عورت نے کہا، خدا کا خوف کھاؤ میں عدت میں ہوں اور تم مجھے نکاح کا پیغام دے رہے ہو۔ انہوں نے کہا ———

میں پیغام نکاح تو نہیں دے رہا ہوں۔ میں تو صرف اپنی حیثیت واضح کر رہا ہوں کہ میرا فلاں فلاں ہستی سے کیا رشتہ ہے۔ اس کو کنایہ کہتے ہیں۔ کہ صراحتاً نکاح کی بات نہ کرے۔ صرف اشارے سے دل کی بات

کہہ دے ۔مثلاً یوں کہہ دے کہ میرا خیال ہے ۔کہ اگر کوئی اچھی دین دار عورت مل جائے تو نکاح کرلوں۔ یا کوئی متدین اور صالح عورت مل جائے تو اس کے ساتھ نکاح کرلوں یا تیری جیسی خوش بخت کسی نصیب والے ہی کو میسّر ہوسکتی ہے ۔ وغیرہ وغیرہ تاہم صریح الفاظ میں نکاح کا وعدہ لینا حرام ہے ۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے ۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُم بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ تم پر کوئی گناہ نہیں ہے ۔کہ تم عورتوں کے ساتھ پیغام نکاح کے سلسلہ میں اشارہ کرو۔ خطبہ عورتوں کے لیے نکاح کے پیغام کو کہتے ہیں مقصد یہ کہ تم اشارے کنائے سے بات کرسکتے ہو۔ ایک اور لفظ خُطبہ ہے جس کا معنیٰ اخطاب کرنا ہے ، وعظ نصیحت وغیرہ کرنا ۔ ان دونوں لفظوں کا باب ایک ہی ہے ۔جب یہ مصدر کے طور پر آتا ہے تو اس سے مراد خطاب کرنا ہوتا ہے ۔

فرمایا اشارے کنائے سے اپنا مقصد بیان کردو۔ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِىٓ اَنْفُسِكُمْ یا اس کو دل میں پوشیدہ رکھو۔ اس کا بھی کوئی گناہ نہیں ہے فرمایا عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ اللہ تعالیٰ جانتا ہے ۔کہ تم ان عورتوں کا ذکر کروگے ۔کیونکہ فطرتاً مرد کو عورت کی اور عورت کو مرد کی ضرورت ہوتی ہے ۔مگر اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کو قائم رکھو۔ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا ان سے خفیہ طور پر نکاح کا وعدہ نہ لے لینا۔ یہ بالکل جائز نہیں۔ عدت کے دوران عورت سے یہ کہنا کہ عدت کے بعد میرے ساتھ ہی نکاح کرنا کسی اور کے ساتھ نہ کرنا ، یہ جائز نہیں ہے ۔اس کی قطعاً ممانعت ہے۔ اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ہاں اچھے طریقے سے دستور کے مطابق بات کرسکتے ہو۔ اشارے کنائے کے ذریعے مدعا بیان کردو جس میں شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو۔

فرمایا وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ط جب تک عدت پوری نہ ہوجائے ۔ نکاح کی گرہ باندھنے کا ارادہ بالکل نہ کرو۔ یہاں کتاب سے مراد وہ نوشتہ عدت ہے ۔جو اللہ تعالیٰ کے قانون میں مقرر ہے ۔ عدت کے اندر تو ویسے ہی نکاح نہیں ہوسکتا۔ ایسا کرنا تو زنا کا ارتکاب کرنا ہے ۔ اور قطعی حرام ہے ۔ فرمایا وَاعْلَمُوْٓا جان لو اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِىٓ اَنْفُسِكُمْ کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ اگر دل میں بھی قانون کی خلاف ورزی کا خیال ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اُسے بھی جانتا ہے۔ فَاحْذَرُوْهُ لہٰذا اُس سے ڈرتے رہو۔ اس کے قانون کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھنا۔ وَاعْلَمُوْا اور یاد رکھو اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ غفور یعنی بخشنے والا بھی ہے۔ اور بردبار بھی ہے۔ تحمل کرنے والا ہے۔ بسا اوقات وہ گرفت نہیں کرتا مگر جب مجرموں کو پکڑتا ہے۔ تو پھر خوب پکڑتا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کے تحمل کی وجہ سے لاپرواہ نہیں ہو جانا چاہیئے۔ کہ ایک دفعہ بچ گیا۔ تو ہمیشہ ہی بچتا رہیگا بلکہ وہ اپنے وقت پر ضرور پکڑا جائیگا۔ اگر خدا کے قانون کو توڑ دوگے تو اسکی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

درس یکصد و یک (۱۰۱) — آیت ۲۳۶ تا ۲۳۷

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاۤءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّمَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا ۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۳۶﴾ وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّاۤ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۗ وَاَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۗ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۳۷﴾

ترجمہ: تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دو جب کہ تم نے اُن کو ہاتھ نہیں لگایا، یا اُن کے لیے مہر مقرر نہیں کیا۔ اور اُن کو فائدہ پہنچاؤ، طاقت رکھنے والے پر اس کی طاقت کے مطابق اور تنگ دست پر اُس کی طاقت کے مطابق فائدہ پہنچانا دستور کے مطابق یہ لازم ہے نیکی کرنے والوں پر ﴿۲۳۶﴾ اور اگر تم عورتوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ تم نے اُن کو چھوا ہو۔ اور بیشک تم نے اُن کے لیے مہر مقرر کیا ہے۔ پس آدھا مہر لازم ہو گا۔ جو تم نے مقرر کیا ہے۔ اِلّا یہ کہ وہ عورتیں ہی درگزر کریں یا درگزر کرے وہ شخص جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور یہ کہ تم درگزر کرو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور اس فضیلت کو نہ بھلاؤ، جو تمہارے درمیان ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ خوب دیکھتا ہے جو کچھ تم کام کرتے ہو ﴿۲۳۷﴾

ربط آیات

گذشتہ دروس میں عدت کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی کہ دوران عدت نکاح نہیں ہو سکتا۔ گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے دوران عدت عورت سے

نکاح کا وعدہ لینے سے بھی منع فرمایا ہے۔ البتہ اشارے کنایئے سے بات کرنے کی اجازت دے دی۔ مقصد یہ کہ جس طرح عدت میں نکاح کرنا حرام ہے اسی طرح نکاح کا وعدہ لینا بھی حرام ہے۔ طلاق کے دوران اور اس کے بعد بچے کی رضاعت کا مسئلہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ طلاق کے وقت اگر دودھ پیتا بچہ ہو، تو اس کی پرورش کا ذمہ دار کون ہوگا۔ اگر بچے کا باپ بھی نہیں ہے۔ تو پھر اس کا بار کون اٹھائے گا۔ نیز یہ کہ دودھ کس عورت سے پلانا چاہیئے۔ یہ سب مسائل بیان ہو چکے ہیں۔

حق مہر لازمی ہے

آج کے درس میں حق مہر اور اس کی ادائیگی سے متعلق مسئلہ بیان ہوا ہے۔ حق مہر نکاح کے لوازم میں سے ہے۔ سورۃ احزاب میں ہے "قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا عَلَيْهِمْ فِيْٓ اَزْوَاجِهِمْ" ہم اُس چیز کو جانتے ہیں، جو ہم نے عورتوں کے متعلق مردوں پر ضروری قرار دی ہے۔ اس میں حق مہر اور عورت کے دیگر اخراجات، روٹی، کپڑا، رہائش، علاج وغیرہ سب خاوند کے ذمہ ہیں۔ سورۃ نساء میں ہے "وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ" یعنی جن محرمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن کے علاوہ تم باقی عورتوں سے مال صرف کر کے نکاح کر سکتے ہو۔ مال خرچ کرنے کے متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلے نمبر پہ حق مہر آتا ہے۔ سب سے پہلے اُس کا خرچہ ہے جو مرد ادا کرے گا۔ پھر عورت کی باقی ضروریات پہ اخراجات ہیں۔ وہ بھی مرد کے ذمہ ہیں۔ سورۃ نساء ہی میں مزید وضاحت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ "وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً" عورتوں کے حق مہر خوشی خوشی ادا کیا کرو۔ اس میں پس وپیش نہ کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ نے تم پر فرض کیا ہے۔ الغرض! حق مہر نکاح کے لیے لازمی ہے۔

حضرت مولانا شاہ رفیع الدینؒ کی تفسیر رفیعی میں ہے، کہ مہر نکاح کالازم جزو ہے۔ لہذا اس کے بغیر نکاح کیسے درست ہو سکتا ہے۔ مگر نکاح کرتے وقت مہر مقرر کرنا ضروری نہیں ہے اگر اس کا اجمالی تذکرہ بھی ہو جائے تو کافی ہے۔ مثلاً صرف اتنا کہ دیا جائے۔ کہ ہم بعد میں آپس میں طے کر لیں گے۔ اگر نکاح کرتے وقت مہر کا تقرر بھول سے رہ گیا۔ تو بھی نکاح درست ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص سرے سے

حق مہر کا انکار ہی کر دے، تو نکاح نہیں ہو گا۔

خاندان حضرت شاہ ولی اللہؒ

ہندوستان میں خاندان شاہ ولی اللہؒ کی دینی خدمات، ناقابلِ فراموش ہیں۔ یہ آپ کا خاندان ہی ہے۔ جس نے قرآن پاک کے علم کو مقامی زبان میں پھیلایا۔ خود شاہ ولی اللہؒ نے سب سے پہلے "فتح الرحمٰن" کے نام سے قرآن پاک کا فارسی ترجمہ کیا۔ اور اس کے ساتھ مختصر حاشیہ بھی تحریر کیا۔ اس کے علاوہ اس کا مقدمہ بھی لکھا۔ اصول تفسیر پر آپ کی کتاب "الفوز الکبیر" بے نظیر چیز ہے۔ قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے راہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور آج بھی تمام دینی مدارس اور یونیورسٹیوں میں ایم اے (اسلامیات) کی جماعتوں کو پڑھائی جاتی ہے۔ فہم قرآن سے متعلق آپ نے نہایت بلند پایہ اصول مرتب کیے ہیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے قرآن پاک کے آخری دو پاروں اور سورۃ بقرہ کے نصف تک کی تفسیر فارسی زبان میں لکھی۔ آپ نابینا ہو گئے تھے اس لیے بولتے جاتے تھے اور آپ کے شاگردانِ رشید اس کو قلمبند کرتے تھے۔ اپنی وفات تک اس سے زیادہ تفسیر کا کام نہیں کر سکے۔ آپ ہفتہ میں ایک روز قرآن پاک کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ یہ درس بھی لوگوں نے لکھے۔ آجکل طبع شدہ نسخے نہیں ملتے۔ تاہم قلمی نسخے کہیں موجود ہیں۔ واللہ اعلم

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے دوسرے بیٹے شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن پاک کا سب سے پہلا اردو ترجمہ کیا۔ یہ تحت اللفظ ترجمہ ہے۔ جو عام پڑھا جاتا ہے۔ مختلف اشاعتی اداروں مثلاً تاج کمپنی، انجمن حمایت اسلام وغیرہ نے اس ترجمہ کے بیشمار ایڈیشن شائع کیے ہیں۔ آپ قرآن پاک کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ جس کو آپ کے شاگردان نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ آپ کی وفات کے چالیس پچاس سال بعد یعنی آج سے سو سال پہلے صرف سورۃ بقرہ والا حصہ شائع ہوا، جو کہ تفسیر رفیعی کہلایا۔

آپ کے تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن پاک کا بامحاورہ اردو ترجمہ کیا ہے اس میں بعض مشکل الفاظ بھی آئے ہیں جو محاورۃً استعمال ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ فرمایا کرتے تھے کہ اسیری کے دوران میں شاہ عبدالقادر

کا اُردو ترجمہ پڑھ رہا تھا۔ کہ اَللّٰہُ الصَّمَدُ کا ترجمہ نرادھار نظر سے گزرا۔ چونکہ یہ ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اس لیے میں اُسے سمجھ نہ سکا۔ جیل میں موجود ایک بہت بڑے پنڈت سے میں نے اس لفظ کا معنیٰ دریافت کیا۔ تو وہ کہنے لگا۔ تم کیوں پوچھتے ہو۔ پہلے یہ بتلاؤ کہ یہ لفظ کہاں آیا ہے۔ میں نے کہا پہلے تم اس کا معنیٰ بتاؤ۔ چنانچہ اُس پنڈت نے بتایا۔ کہ نرادھار سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ اور یہ اُس ذات کے لیے بولا جاتا ہے جس کی طرف سب چیزیں محتاج ہوں اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ایسے عجیب و غریب مگر بالکل صحیح الفاظ اپنے ترجمہ میں استعمال کیے ہیں۔ آپ نے دہلی کی کنگ ایڈورڈ روڈ پر واقع اکبری مسجد میں بارہ سال اعتکاف کیا تھا۔ بعد میں اس مسجد کو انگریزوں نے نیست و نابود کر دیا۔ یہ ترجمہ آپ نے اسی اعتکاف کے دوران لکھا تھا، ساتھ تھوڑا تھوڑا حاشیہ بھی ہے۔ اس ترجمہ کو شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ نے نسبتاً آسان زبان میں منتقل کیا ہے۔ اور یہ کام آپ نے مالٹا جیل میں اسیری کے زمانہ میں انجام دیا۔ شاہ صاحب کے زمانہ میں اُردو زبان ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ اور اس میں ابھی اتنا تسلسل نہیں تھا۔ دو سو سال کے عرصہ میں اُردو زبان کافی ترقی کر چکی تھی۔ لہٰذا شیخ الہندؒ نے شاہ صاحب کے اُردو ترجمہ کو آسان بنا دیا۔ اور آجکل اس کی اشاعت عام ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے سب سے چھوٹے اور چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنیؒ ہیں۔ آپ نے درس و تدریس کے ذریعے تو دین کی بہت خدمت کی ہے۔ مگر آپ کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ البتہ آپ کے صاحبزادے شاہ اسماعیل شہیدؒ نے قلم اور تلوار دونوں سے جہاد کیا۔ آپ کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ اور آپ نے انگریزوں اور سکھوں کے خلاف عملی جہاد میں بھی حصہ لیا۔ اور پھر بالاکوٹ کے مقام پر جام شہادت نوش فرمایا۔

اورنگزیب عالمگیرؒ

شاہ ولی اللہؒ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے جب کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ ۱۷۰۷ء میں وفات پا گئے۔ یہ اپنے خاندان کے واحد بادشاہ تھے جنہوں نے پچاس سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ کابل سے لیکر برما تک کا وسیع علاقہ انکی سلطنت میں شامل تھا

عالمگیرؒ کے انچاس^۴۹ سال تو لڑائیوں میں گزر گئے۔ انہیں صرف ایک سال امن و امان کا ملا۔ انہوں نے مغلیہ سلطنت کو مستحکم کرنے کی از حد کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے کئی بادشاہ تخت نشین ہوئے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے دس بادشاہوں کو مسند اقتدار پہ آتے دیکھا مگر ان میں سے کوئی بھی لائق ثابت نہ ہوا، سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی اور انگریزوں کو مداخلت کا موقع مل گیا اور آخر انہوں نے ہندوستان میں پاؤں جما لیے۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ بڑے متدین آدمی تھے مگر انگریزوں نے انہیں خوب بدنام کیا۔ انہوں نے عالمگیرؒ کو ایک ظالم بادشاہ کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور یہاں تک مشہور کیا۔ کہ عالمگیر اس وقت تک ناشتہ نہیں کرتا تھا۔ جبتک ہزاروں ہندوؤں کو قتل نہیں کروا دیتا تھا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوتا تو ہندوستان میں کوئی ہندو باقی نہ رہتا۔ آپ نے پچاس سال حکومت کی۔ اور ہندو دارالسلطنت دہلی میں بھی موجود تھے۔ آپ نے بعض سکھوں اور مرہٹوں کے ساتھ لڑائی کی۔ کیونکہ شورش پسند تھے مگر آپ نے کسی پر ظلم نہیں کیا۔ شریعت کا پابند پکا سچا مسلمان تھا۔ جہاں حق وانصاف کا تقاضا ہوا، اپنے بھائی تک کو معاف نہیں کیا۔ آپ کے بھائی نے شہزادگی کے زمانہ میں ایک غریب شخص کے بچے کو ناحق قتل کر دیا تھا۔ وہ شہزادہ ہونے کی وجہ سے گرفت میں نہ آ سکا۔ جب عالمگیرؒ کا دور آیا تو اُس بچے کے باپ نے مقدمہ دائر کر دیا اور دادرسی چاہی۔ باقاعدہ مقدمہ چلا۔ قتل کا ثبوت فراہم ہوا۔ اور پھر قصاص میں شہزادے کو سزائے موت ہوئی۔ عالمگیرؒ اس کردار کا آدمی تھا۔

حق مہر کا عدم تقرر

تو میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ نکاح کے لیے حق مہر لازمی ہے۔ البتہ بوقت نکاح اس کا تقرر ضروری نہیں ہے، یہ بعد میں بھی طے ہو سکتا ہے۔ اِس آیت کریمہ میں ایسی ہی صورت کا تذکرہ ہے۔ فرمایا لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً تم پر کوئی گناہ نہیں ایسی صورت میں کہ تم طلاق دے دو عورتوں کو اس حالت میں کہ تم نے اُن کو چھوا

نہیں اور اُن کا مہر بھی مقرر نہیں کیا۔ فرمایا بغیر مہر مقرر کیے نکاح بھی ہوگیا تھا اور اب طلاق بھی واقع ہوگئی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم عورتوں کو اُن کے حق سے بالکل محروم کرو۔ بلکہ وَّمَتِّعُوْهُنَّ اُن کو فائدہ پہنچاؤ۔ یعنی کچھ دے دلا دو۔ مگر کس قدر فرمایا عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ صاحب حیثیت، پر اسکی حیثیت کے مطابق۔ اگر کوئی طاقت والا ہے۔ تو وہ اس کے مطابق ادا کرے وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ اور اگر کوئی مالی لحاظ سے کمزور ہے، تنگدست ہے۔ تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق مطلقہ کو ادا کرے۔ اس مقام پر فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ عورت کو کم از کم ایک جوڑا کپڑے دینا ضروری ہے۔ جس میں تین کپڑے شامل ہوں ایک بڑی چادر، ایک دوپٹہ اور ایک کرتہ۔ جو جسم کو ڈھانپ لیں۔ تاہم یہ ہے۔ کہ مالدار اچھا قیمتی جوڑا لے دے اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کر دے یہ تو ایسی عورت کیلئے ہے جس کا مہر مقرر نہیں ہوسکا اور طلاق واقع ہوگئی۔ البتہ جن کے مہر مقرر ہوں ان کو حق مہر تو ادا ہوگا، اس کے علاوہ کپڑے دینا بھی مستحب ہے، اسی کو فرمایا مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ یہ متاع دستور کے مطابق دو۔ مطلقہ عورت کا حق غصب نہ کرو۔ فرمایا حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ یہ چیز صاحب ایمان نیکوکاروں پر لازم ہے۔ لہٰذا اس میں کوتاہی نہ کریں۔ بلکہ مطلقہ کو ضرور اس کا حق ادا کریں۔

مہر مثل

طلاق کے علاوہ ایک صورت بیوگی کی بھی ہے۔ اگر نکاح کرتے وقت مہر مقرر نہیں ہوا اور میاں بیوی کی خلوت بھی نہیں ہوئی اور خاوند مر گیا تو اب عورت کس چیز کی حقدار ہے۔ ایسی صورت میں عورت مہر مثل کی حقدار ہوگی۔ شریعت میں مہر مثل سے مراد ایسا مہر ہے۔ جو ایسی عورت کے خاندان کی دوسری عورتوں کا عام طور پر مقرر ہوتا ہے۔ جب ایسی صورت پیش آجائے تو پھر دیکھا جائے کہ اس خاندان یا برادری میں اس حیثیت کی عورتوں کا کیا مہر مقرر ہوتا ہے
اس کے مطابق اس عورت کو بھی مہر ادا ہوگا۔ اس کے علاوہ یہ عورت خاوند کی وراثت کی بھی حق دار ہوگی۔ اور اسے چار ماہ دس دن کی مقررہ عدت بھی گزارنا ہوگی۔

آج کے درس کی دوسری آیت کریمہ نصف مہر کے متعلق ہے۔ یہ کس حالت — نصف مہر
میں ادا کیا جاتا ہے۔ فرمایا وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ
فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً اور اگر تم ایسی حالت میں عورتوں کو طلاق دو کہ اُن کے
قریب نہیں گئے۔ مگر نکاح کرتے وقت مہر مقرر کیا تھا۔ اور وہ طلاق ہونے سے
قبل ادا نہیں ہوا۔ فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ پس نصف ہے جو تم نے مقرر کیا تھا
یعنی اگر بغیر مقاربت کے طلاق ہو گئی ہے تو مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا ہو گا۔ یہ تو کم از کم
ہے۔ کہ اتنا ضرور ادا کرو۔ البتہ سلف میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں۔ کہ انہوں نے
واجب الادا مہر سے زیادہ بھی دیا مثلاً حضرت حسن بن علی بن ابی طالب کے متعلق آتا ہے[1] کہ ان
کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آگیا۔ بغیر مجامعت کئے عورت کو طلاق دے دی۔ تو ایک
روایت کے مطابق انہوں نے دس ہزار درہم ادا کیے اور دوسری کے مطابق بیس ہزار
درہم کی رقم حق مہر کے طور پر ادا کی مقصد یہ تھا۔ کہ جدا ہونے والی عورت کسی پریشانی
میں مبتلا نہ ہو۔ لہذا اُسے احسن طریقے سے رخصت کیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہ حکم
نازل کر دیا۔ کہ اگر مہر مقرر نہ ہوا ہو اور طلاق واقع ہو گئی تو عورت کو کم از کم کپڑوں کا
ایک جوڑا دے دو۔ اور اگر مہر مقرر ہوا تھا۔ تو کم از کم اس کا نصف ادا کر دو۔

معافی تقویٰ کی علامت ہے — اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ البتہ ایک صورت میں ادائیگی مہر سے بچ سکتے ہو کہ وہ عورتیں
خود مہر معاف کر دیں۔ کہ ٹھیک ہے ہم نہیں لیتیں جاؤ معاف ہے۔ یا دوسری
صورت یہ ہے کہ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ یا وہ شخص
معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے یعنی طلاق دینے والا مرد معاف
کر دے۔ مردوں کا معاف کر دینا بدیں معنی ہے۔ کہ وہ نصف کی بجائے پورا حق مہر ادا
کر دیں۔ یا اگر پورا ادا کر چکے ہیں۔ تو نصف واپس نہ لیں بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ
سے اکثر مفسرین نے خاوند مراد لیا ہے۔ جس کے ہاتھ میں طلاق کی گرہ ہے۔ یعنی
طلاق دینے کا حق صرف مرد کو ہے۔ عورت تو زیادہ سے زیادہ عدالت سے خلع حاصل کر سکتی
ہے مگر طلاق مرد کا ہی حق ہے۔ بعض نے اس سے مراد عورت کا ولی بھی لیا ہے۔ مگر

[1] قرطبی ص ۱۰۲

راجح قول پہلا ہی ہے۔ فرمایا اے مردو! وَاَنْ تَعْفُوْا اگر تم معاف کرو اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی یہ بات تقویٰ سے قریب تر ہے لہٰذا اگر پرہیزگاری اختیار کرنا چاہتے ہیں، تو معاف ہی کر دیا کرو۔

فضیلت کی پاسداری

پہلے گزر چکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں کے قوام یعنی قوی بنایا۔ نیز یہ بھی بیان ہو چکا ہے۔ کہ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔ لہٰذا اے مردو! تمہاری اس فضیلت کا تقاضا ہے۔ کہ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ نے جو فضیلت رکھی ہے۔ اس کو مت بھولو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عورتوں پر برتری عطا کی ہے تو اس برتری کا تقاضا ہے۔ کہ تم عورتوں پر زیادہ احسان کرو۔ اور طلاق کی صورت میں آدھے کی بجائے پورا مہر ادا کرو، یا اگر پورا ادا کر چکے ہو، تو آدھا واپس نہ لو۔ بلکہ معاف کر دو۔ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ بیشک تمہارے سب کام اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں۔ وہ تمہارے ہر خیر و شر کو دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا اس کے احکام کی پابندی کرو گے تو اس کے مقرب بن جاؤ گے۔ اگر خلاف ورزی کرو گے، تو پھر اس کی گرفت بھی زیادہ دور نہیں ہے۔

درس یکصد دو (۱۰۲) — آیت ۲۳۸ تا ۲۴۲

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ
قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ
اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا
تَعْلَمُوْنَ ﴿٢٣٩﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ
اَزْوَاجًا ۚۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ
اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ
فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٤٠﴾
وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿٢٤١﴾
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿٢٤٢﴾

ترجمہ: حفاظت کرو سب نمازوں کی اور خصوصاً درمیانی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے سامنے عاجزی سے (۲۳۸) پس اگر تم خوف کی حالت میں ہو، پس پیدل یا سواری پر نماز ادا کرو۔ پھر جب تم امن کی حالت میں ہو۔ پس اللہ کو یاد کرو جیسا کہ اُس نے تم کو تعلیم دی جو تم نہیں جانتے تھے (۲۳۹) اور وہ لوگ جو تم میں وفات دیے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنی بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنی عورتوں کے بارے میں وصیت کر جائیں ایک سال تک فائدہ اٹھانے کی بغیر نکالے۔ اور اگر وہ عورتیں خود نکل جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں اُس بات میں جو وہ اپنے حق میں کریں دستور کے مطابق اور اللہ تعالیٰ کمال قوت کا مالک اور حکمت والا ہے (۲۴۰) اور طلاق والی عورتوں کے لیے فائدہ اٹھانا ہے۔ دستور کے مطابق۔ یہ بات لازم ہے متقیوں پر (۲۴۱) اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے

سے لیے بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ (۲۴۲)

رابط آیات گذشتہ آیات میں طلاق، عدت اور حق مہر کے مسائل ذکر ہوئے ہیں۔ اب درمیان میں دو آیتیں نماز کے متعلق ہیں۔ اور اس کے بعد پھر طلاق اور عدت کے مسائل ہیں۔ بظاہر ایک ہی نوعیت کے مسائل کے درمیان نماز کی یہ آیتیں بے ربط معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اور بعض دیگر بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہاں پر یہ بات سمجھانا چاہتا ہے۔ کہ دیکھو، نکاح، طلاق، عدت کے مسائل میں مشغول ہو کر کہیں نماز سے غافل نہ ہو جانا۔ نکاح طلاق کے مسائل ہی ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ بعض اوقات گفتگو طول پکڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں تمہاری نماز نہیں چھوٹنی چاہیئے۔ اس کا ہر حال میں خیال رکھو۔ اس طرح گویا نماز والی آیات دوسری آیات سے مربوط ہیں۔

حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ نماز کی آیات کو دیگر آیات سے اس طور ربط ہے۔ کہ گذشتہ اور آئندہ آیات میں نکاح، طلاق، عدت وغیرہ جیسے معاشرتی مسائل کا تذکرہ ہے۔ اور یہ مسائل تدبیر منزل کے مسائل کہلاتے ہیں۔ درحقیقت ان مسائل پہ عدل کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ یعنی احکام کی پابندی کرو، تقویٰ اختیار کرو۔ ظلم و زیادتی نہ کرو، بچوں والی اور مطلقہ عورتوں کا حق ضائع نہ کرو۔ بیویوں کے حقوق ادا کرو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا حکم دیا ہے یعنی عدل اور احسان "اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ" یعنی معاشرے میں عدل و انصاف کو قائم کرو اور احسان بھی کرو۔ تو یہ معاشرتی مسائل عدل کے تحت آتے ہیں۔ جب کہ نماز کی ادائیگی احسان کی تعریف میں آتی ہے۔ کہ نماز ادا کرنے سے انسان محسن بنتا ہے، نیکوکاری اختیار کرتا ہے تو یہاں پہ دونوں طرح کے مسائل کو اکٹھا بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ عدل و احسان کے تقاضے بیک وقت پورے کیے جا سکیں۔ اس طرح یہ آیات آپس میں مربوط ہیں۔

صلوٰۃ وسطیٰ عدل کے مسائل تو گذشتہ کئی درسوں میں آ رہے ہیں۔ اور آئندہ بھی آئیں گے۔

یہاں پہ اللہ تعالیٰ نے احسان کا مسئلہ بیان فرمایا حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ساری نمازوں کی حفاظت کرو۔ اور خاص طور پہ صلوٰۃ وسطیٰ کی۔ درمیانی نماز کے متعلق بہت سے اقوال ہیں۔ کسی نے اُسے فجر کی نماز بتایا ہے۔ کسی نے ظہر کی، کسی نے مغرب کی اور بعض نے عشاء کی، مگر راجح قول یہ ہے۔ کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد عصر کی نماز ہے۔ اور یہ نبی علیہ السلام سے ثابت ہے۔ اس نماز کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ یہ نماز دو رات کی (مغرب اور عشاء) اور دو دن کی (فجر اور ظہر) کے درمیان واقع ہے اور یہ وقت نسبتاً زیادہ مشغولیت کا ہوتا ہے۔ کاروبار کی وجہ سے اس نماز کے ضائع ہونے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ اس لیے اِس کی حفاظت کی زیادہ تاکید فرمائی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فجر کی نماز کے وقت اور پھر عصر کی نماز کے وقت اُن فرشتوں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی ہیں۔ جو بندوں کے اعمال اللہ کی بارگاہ میں لے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ وقت بڑا اہم ہے، ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ مَنْ فَاتَتْهُ صَلٰوةُ الْعَصْرِ فَكَاَنَّمَا وُتِرَ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ یعنی جس کی عصر کی نماز فوت ہو گئی گویا اس کا اہل اور مال سب کچھ ہلاک کر دیا گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ تمام نمازوں کی حفاظت کرو مگر خاص طور پہ درمیانی نماز کی حفاظت کرو۔ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ اور اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ گویا نماز میں پوری توجہ اسی طرف لگا دو۔ ادھر اُدھر کا خیال دل میں نہ لاؤ۔ بلکہ یہ تصور کرو کہ تم احکم الحاکمین کے حضور دست بستہ کھڑے ہو، لہٰذا پوری توجہ کے ساتھ نماز کو ادا کرو۔ ایسی ہی حالت کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ احسان اس بات کا نام ہے۔ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ یعنی عبادت کے وقت تیری کیفیت یہ ہونی چاہیئے گویا کہ تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ جب اس کے حضور میں نماز کے لیے کھڑا ہے تو اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہا ہے۔ فرمایا اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو سکے۔ تو کم از کم اتنا تو ہے۔ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ کہ وہ تو تجھے بہرحال دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا نماز کے لیے نہایت مؤدب طریقے سے کھڑے ہو کہ تمہارے دل میں خشیت الٰہی ہو۔ اور تمہاری حرکات و سکنات سے عاجزی کا اظہار ہو۔

نمازِ خوف

فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا پس اگر تم خوف کی حالت میں ہو پس پیدل یا سواری پر نماز ادا کر لو۔ خوف سے مراد دشمن کا خوف ہے۔ جب دشمن کے ساتھ حالت جنگ ہو۔ اور میدان کارزار میں نماز کا وقت آجائے تو جنگ سے فارغ ہونے تک نماز کو مؤخر نہ کرو۔ بلکہ اُس وقت اگر تم پیدل چل رہے ہو یا سواری پر ہو اور دشمن کا ہر آن خطرہ ہے۔ تو سواری کے اوپر چلتے چلتے ہی نماز ادا کر لو۔ اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے وہ قبول کرنیوالا ہے۔ بغیر سواری کے پیدل امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نماز درست نہیں ہے

عین جنگ کی حالت میں مجاہدین کے دو گروپ بنا کر نماز کی ادائیگی کا ذکر آتا ہے۔ ایک گروپ دشمن سے لڑتا رہے اور دوسرا نماز ادا کر لے۔ پھر دوسرا دشمن کے مقابلے پر ہو اور پہلا نماز ادا کر لے۔ اور اگر مجاہدین ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیں جیسا کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں صحابہ کرامؓ کی خواہش ہوتی تھی۔ تو پھر دونوں گروپ آدھی آدھی نماز امام کے ساتھ پڑھیں گے اور باقی آدھی آدھی خود پوری کریں گے۔ اگر دو رکعت نماز ادا کرنا ہے تو ایک گروپ امام کے پیچھے کھڑا ہوگا اور دوسرا دشمن کے مقابلے میں رہے گا۔ جب امام کے ساتھ ایک رکعت مکمل ہو جائے گی تو پہلا گروپ پیچھے ہٹ کر مورچے سنبھال لے گا اور حفاظت پر مامور دوسرا گروپ امام کے ساتھ دوسری رکعت میں شامل ہو جائے گا۔ اس طرح دونوں گروپ ایک ایک رکعت امام کے ساتھ ادا کریں گے اور دوسری رکعت خود پوری کریں گے۔ اگر نماز چار رکعت والی ہے۔ تو ہر گروپ دو دو رکعت امام کے ساتھ پڑھے گا۔ اور باقی دو دو رکعت خود مکمل کر لے گا۔ یہ اسی صورت میں ہے کہ مجاہدین کسی خاص نیک آدمی کے ساتھ جماعت میں شامل ہونا چاہیں۔ ورنہ ہر گروپ اپنی اپنی پوری نماز بیک وقت ادا کرے گا۔

حضور علیہ السلام نے سفر اور اقامت ہر دو حالتوں میں چھ یا دس دفعہ صحابہ کرامؓ کو صلوٰۃ الخوف پڑھائی۔ آپ نے سفر کی حالت میں دو رکعت اور اقامت کی حالت میں چار رکعت نماز پڑھائی۔

فرمایا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ جب تم امن کی حالت میں ہو۔ خوف دُور ہو جائے۔ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمْ تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں تعلیم دی ہے۔ یعنی رکوع، سجود، قعدہ وغیرہ جو بھی شرائط ہیں، فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات ہیں سب کی رعایت رکھو۔ اللہ نے تمہیں ایسی تعلیم دی ہے۔ مَا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ جو تم نہیں جانتے تھے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی ہے کہ اس نے اپنی عبادت کا وہ طریقہ بھی بتلا دیا ہے۔ جسے وہ پسند کرتا ہے۔ پس اس طریقے کے مطابق اللہ کا ذکر کرو۔

بیواؤں پر احسان

نماز کے تذکرے کے بعد اب پھر عورتوں کے مسائل کا بیان ہے فرمایا وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ وَیَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا۔ تم میں سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جاتے ہیں وَّصِیَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ وہ اپنی بیویوں کے حق میں وصیت کر جائیں مَّتَاعًا اِلَی الْحَوْلِ غَیْرَ اِخْرَاجٍ کہ وہ ایک سال تک فائدہ اٹھائیں بغیر گھر سے نکالنے کے فَاِنْ خَرَجْنَ اور اگر وہ خود بخود نکل جائیں فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ تو تم پر کوئی گناہ نہیں فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ کہ جو کچھ وہ اپنے معاملہ میں دستور کے مطابق کرنا چاہیں۔ مقصد یہ ہے۔ کہ مردوں پر یہ لازم ہے۔ کہ عورتوں کیلئے وصیت کریں کہ کم از کم ایک سال تک اُن کے گھر میں معمول کے مطابق بیٹھی رہیں۔ اُن کے تمام اخراجات بھی پورے کیے جائیں۔ ہاں اگر عورتیں خود اپنے متعلق کوئی دوسرا فیصلہ کر لیں۔ یعنی دوسرا نکاح کرنا چاہیں۔ تو پھر وہ اپنی مرضی کی مالک ہیں۔ تم پر اس کا کچھ گناہ نہیں۔ انہیں اپنا فیصلہ خود کرنے دیں۔ اس میں رکاوٹ بھی نہ بنیں۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ایک سال کی وصیت کا قانون اُس وقت تک تھا جب تک بیواؤں کے لیے چار ماہ دس دن کی عدت مقرر نہیں ہوئی تھی اس وقت عورتیں سال بھر خاوند کے گھر رہ سکتی تھیں۔ پھر جب اللہ نے عدت کی آیات نازل فرمائیں۔ تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ بعض دوسرے مفسرین کرام کا قول ہے

کہ کوئی بھی حکم منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ اصل عدت تو چار ماہ دس دن ہی ہے۔ مگر یہ ایک سال کی وصیت عورت کے ساتھ مزید احسان ہے۔ کہ اُسے عدت کے فوراً بعد گھر سے نہ نکال دیا جائے۔ بعض اوقات عورت کے ماں باپ بھی نہیں ہوتے۔ جن کے پاس چلی جائے اور نکاح ثانی کا بھی فوری بندوبست نہیں ہوسکتا، لہٰذا ایک سال تک انہیں گھر سے نہیں نکالنا چاہیئے۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے اُن کے ساتھ احسان کا برتاؤ ہونا چاہیئے، کیونکہ وہ بیوہ ہو چکی ہے وہ پہلے ہی غم و اندوہ سے نڈھال ہے۔ اس کے ساتھ مزید سختی نہایت ہی ناپسندیدہ فعل ہوگا۔

بعض فرماتے ہیں۔ کہ ایک سال ٹھہرنے کی رعایت عورت کو اُس وقت تک حاصل تھی جس وقت تک وراثت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ پھر سورۃ نساء میں مذکور تمام رشتے داروں کے حصے مقرر کر دیے گیے۔ اگر خاوند مر جائے تو بیوی کا حصہ بھی مقرر ہوا۔ یعنی اگر اولاد موجود ہے تو کل وراثت کا آٹھواں حصہ اور اگر اولاد نہیں ہے تو چوتھا حصہ مقرر ہوا۔ لہٰذا اب سال بھر کی رعایت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ عورت کو وراثت میں حصہ مل گیا ہے۔ فرمایا وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ یہ احکام خداوند تعالیٰ نازل کر رہا ہے۔ جو کمال قوت کا مالک ہے۔ اور حکمت والا ہے۔ نہ کوئی کام اس کی قدرت سے باہر ہے۔ اور نہ ہی کوئی کام حکمت سے خالی ہے اس لیے اِن احکام پر پورا پورا عمل کرنا چاہیئے۔

مطلقہ کے حقوق

فرمایا وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ مطلقہ عورتوں کو فائدہ پہنچانا ہے دستور کے مطابق۔ یعنی طلاق کی مختلف صورتوں کی نسبت سے ان کے حقوق ادا کرو۔ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ ایسی عورت جسے مقاربت سے پہلے طلاق ہو گئی اور اس کا مہر بھی مقرر نہیں ہوا، اُس کو اپنی مالی حیثیت کے مطابق ایک جوڑا کپڑے دو، جس میں ایک قمیص، ایک دوپٹہ اور ایک بڑی چادر ہو۔ یا ایک دوپٹہ اور دو چادریں ہوں۔ یہ واجب ہے۔ ایسی عورت جس کا مہر مقرر ہو چکا ہے مگر بغیر مقاربت کے طلاق ہو گئی۔ اس کو نصف مہر ملیگا۔ یہاں پر جن عورتوں کا ذکر ہے

عام طلاق یافتہ ہیں۔ جو مہر مثل یا پورے مہر کی حقدار ہیں۔ فرمایا کہ اُن کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچاؤ۔ یہ مستحب ہے۔ ان کو کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔ وہ طلاق کے غم میں مغموم ہیں۔ اُن کی دِل جوئی ہونی چاہیے۔ ان کے لیے بھی ایک جوڑا کپڑے تو ضرور ہونے چاہئیں۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ یہ بات متقیوں پر لازم ہے۔

فرمایا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے۔ آیت کے مختلف معانی آتے ہیں مثلاً دلیل، معجزہ، وغیرہ تاہم یہاں پر آیت سے مراد اس کے احکام ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ تمہارے لیے نازل کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ تاکہ تم انہیں اچھی طرح سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ اگر احکام پر چلتے رہو گے تو سعادتمندی کی منزل پا لو گے۔

درس یکصد سہ (۱۰۳) — آیت ۲۴۳ تا ۲۴۵

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ
حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۟ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا
يَشْكُرُوْنَ ﴿۲۴۳﴾ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۴۴﴾ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا
حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ؕ وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ ۪
وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۴۵﴾

ترجمہ :- کیا نہیں دیکھا آپ نے اُن لوگوں کو جو اپنے گھروں سے نکلے اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے موت کے ڈر سے۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے فرمایا مرجاؤ پھر اُن کو زندہ کیا۔ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔ لیکن اکثر لوگ شکریہ ادا نہیں کرتے ﴿۲۴۳﴾ اور اللہ کے راستے میں لڑو اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ سننے اور جاننے والا ہے ﴿۲۴۴﴾ کون ہے وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کو قرض دے، اچھا قرض۔ پس اللہ تعالیٰ اس کے لیے دُگنا کرے گا کئی گناہ اور اللہ تعالیٰ تنگی کرتا ہے۔ اور کشائش کرتا ہے۔ اور تم سب اُسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے ﴿۲۴۵﴾

ربط آیات

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا سے لے کر اللہ تعالیٰ نے بہت سے احکام بیان فرمائے ہیں جن کا تعلق بر یعنی نیکی کے ساتھ ہے۔ ان میں نکاح، طلاق، عدت اور ان کے متعلقات بیان ہوئے ہیں۔ حلت اور حرمت کا مسئلہ بھی آیا ہے۔ اس کے علاوہ عبادات، معاملات اور اخلاق سے متعلق مسائل کا بیان ہوا ہے۔ اب یہاں سے جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کا تذکرہ شروع ہو

ہو رہا ہے۔ پہلی آیت مسئلہ جہاد فی سبیل اللہ میں تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد حاکم کے انتخاب اور اس کے تحت جہاد میں حصہ لینے کا تذکرہ ہے کسی پہلی امت کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ کہ وہ لوگ جہاد سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے راستے میں اُن پر موت طاری کر دی۔ پھر انہیں عجیب و غریب طریقہ سے دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔

اسلوبِ خطاب

اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اَلَمۡ تَرَ کیا تو نے نہیں دیکھا اے مخاطب۔ تَرَ کا لفظ رویت سے مشتق ہے جس کے معنی دیکھنے کے ہیں مگر رویت بھی دو قسم کی ہے۔ ایک رویت بصری یعنی اس ظاہری آنکھ سے دیکھنا اور دوسری قسم ہے روایت قلبی یعنی علم کے ذریعے کسی چیز کو جان لینا۔ جیسے کسی کو کہا جائے "اَلَمۡ تَعۡلَمۡ" کیا تو نہیں جانتا۔ تجھے یہ بات معلوم نہیں۔ دوسرے لفظوں میں تجھے یہ بات ضرور معلوم ہے۔ چنانچہ موقع محل کے مطابق بعض اوقات رؤیت کے معنی آنکھ سے دیکھنا ہوتا ہے اور بعض اوقات علم سے جاننا۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ یہاں پر اَلَمۡ تَرَ سے مراد علم کے ذریعے جاننا ہے، نہ کہ ظاہری آنکھ سے ظاہر ہے کہ اب جو واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ وہ پہلی امتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا اس زمانہ میں اس واقعہ کو آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں، البتہ بعد میں اس کا علم ہوا ہے۔ یہ واقعہ حضور علیہ السلام کے زمانہ یعنی نزول قرآن سے بھی پہلے کا ہے اس لیے اُس وقت بھی یہ رؤیت بصری نہیں تھی۔ بلکہ رؤیت قلبی یا رؤیت علمی تھی۔ اس طرح کا اسلوب بیان بعض دوسری آیات میں بھی ملتا ہے۔ جیسے "اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِىۡ حَآجَّ اِبۡرٰهٖمَ فِىۡ رَبِّهٖۤ" کیا تو نے اُس شخص کی طرف نہیں دیکھا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے اُس کے رب کے متعلق جھگڑا کیا۔ سورۃ فیل میں فرمایا اَلَمۡ تَرَ كَيۡفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصۡحٰبِ الۡفِيۡلِ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یہ واقعات خود حضور علیہ السلام کے زمانے سے بہت پہلے کے ہیں۔ مگر لفظ اَلَمۡ تَرَ ہی لایا گیا ہے مقصد یہ

کہ ہم نے علم کے ذریعے آپ کو بتا دیا ہے۔ کہ فلاں فلاں واقعہ ایسے ایسے پیش آیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا۔ تو آخر میں فرمایا "ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ" یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں۔ جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ آپ اس وقت اُن کے پاس نہ تھے۔ گویا یہ بات آپ کو بذریعہ علم معلوم ہوئی۔

جہاد سے فرار اور موت

الغرض! فرمایا اَلَمْ تَرَ کیا آپ نے نہیں جانا اُن لوگوں کا حال اِلَى الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ جو اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے وَهُمْ اُلُوْفٌ اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ کس وجہ سے بھاگ کھڑے ہوئے حَذَرَ الْمَوْتِ موت سے ڈر کر۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ انہیں موت کیوں نظر آ رہی تھی۔ اس ضمن میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ تورات کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ بنی اسرائیل سے تھے۔ اور انہیں ایک دوسری فلسطی نامی قوم سے جہاد کا حکم ہوا تھا۔ مگر یہ لوگ جہاد پہ آمادہ ہونے کی بجائے جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے تاکہ دوسری جگہ چلے جائیں گے، تو موت سے بچ جائیں گے۔ بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ اُن لوگوں میں طاعون کی وبا پھیل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے علاقے سے بھاگ کر پہاڑوں کے دروں میں پناہ گزین ہو گئے۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ یہاں کی آب و ہوا نسبتاً بہتر ہے۔ اور اس پر فضا ماحول میں وہ طاعون سے بچ جائیں گے۔ جہاں تک اُن کی تعداد کا تعلق ہے مستدرک حاکم کی روایت اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے۔ کہ وہ لوگ چار ہزار کی تعداد میں تھے۔ بعض روایتوں میں ستر ہزار تک کی تعداد کا ذکر آتا ہے۔ مگر ابن عباسؓ کی روایت زیادہ قوی ہے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے۔ کہ جس علاقہ میں طاعون پھیل جائے وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے۔ بھاگنے والے اپنے ساتھ وبائی اثرات لے جائیں اور اگلے علاقے میں وبا پھوٹ پڑے۔ نیز وبائی مرض سے باہر رہنے والے لوگوں کو فرمایا کہ وہ متاثرہ مقام پر جانے کی کوشش نہ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی

مرض میں مبتلا ہو جائیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی روایت میں بھی آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ وبائی مرض والے خطہ سے نہ باہر نکلو اور نہ وہاں جانے کی کوشش کرو۔ بہرحال یہ احتیاطی تدابیر ہیں مگر جس کی موت لکھی جا چکی ہے۔ وہ رک نہیں سکتی۔ وہ جہاں بھی ہوگا، اس پر موت طاری ہو جائے گی۔ اور پھر یہی حال ان بھاگنے والوں کا ہوا۔ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا اللہ تعالیٰ نے ان سے کہا کہ مر جاؤ۔ وہ جس وجہ سے بھی بھاگ کر پہاڑوں میں پہنچے اللہ نے ان پر وہیں موت طاری کر دی، اور ان کا اپنے گھروں سے بھاگ نکلنا کچھ کام نہ آیا۔

دوبارہ زندگی

ان لوگوں کی دوبارہ زندگی کے متعلق کئی ایک روایتیں ہیں بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے نبی حزقیل علیہ السلام موجود تھے، جن پہاڑی دروں میں یہ لوگ پناہ گزین ہوئے وہاں حزقیل علیہ السلام کبھی کبھی عبادت کے لیے آتے تھے ان لوگوں کی موت کے بعد حسب اللہ کے نبی حسب معمول عبادت کیلئے گئے، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان دروں میں ہر طرف لاشیں بکھری پڑی ہیں، انہیں علم نہیں تھا کہ کونسا واقعہ پیش آیا ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی، تو اللہ تعالیٰ نے ان مردوں کو دوبارہ زندگی عطا کر دی۔ ثُمَّ اَحْیَاهُمْ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ کر دیا۔

اس مقام پر یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ دوبارہ زندگی ایک غیر معمولی واقعہ تھا اور معجزانہ طور پر عطا ہوئی، ورنہ موت کے بعد دوبارہ میل ملاپ کی زندگی تو قیامت کو ہی ملیگی تاہم اس قسم کے غیر معمولی واقعات کچھ اور بھی ملتے ہیں۔ جیسے اسی سورۃ بقرہ میں عامیل کا واقعہ ہے۔ جسے اس کے عزیزوں نے قتل کر دیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت اللہ تعالیٰ نے ورثائے مقتول کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اور گوشت کا ٹکڑا مردے کو لگانے سے وہ زندہ ہو گیا۔

رہا یہ سوال کہ یہ لوگ کتنا عرصہ موت کی آغوش میں رہنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوئے۔ اس بات میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ ان کی موت کے آٹھ دن بعد حضرت حزقیل علیہ السلام آئے تو آپکی دعا سے ان لوگوں کو دوبارہ زندگی

ملی بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان لوگوں کو مرے ہوئے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ اور ان کے جسم گل سڑ چکے تھے صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔ جب کہ اللہ نے انہیں زندہ کیا۔

اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں امام ابوبکر جصاص فرماتے ہیں کہ عذاب قبر کا انکار کرنے والے باطل پر ہیں۔ جس طرح اس قوم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد پھر زندہ کر دیا تھا۔ اسی طرح ہر مرنے والے کو برزخی زندگی عطا کرتا ہے۔ نیکوکاروں پر انعامات ہوتے ہیں۔ اور گنہگار سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ بعض دوسری آیات اور احادیث مبارکہ میں اس بات کی صراحت موجود ہے۔ کہ برزخ میں بھی لوگوں کو سزا و جزا بھگتنا پڑتی ہے۔ اگرچہ حقیقی جزا و سزا تو قیامت کو ہی ہوگی، تاہم قبر میں بھی سکون و راحت یا سزا و عذاب ہوتا ہے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ثُمَّ اَحْیَاھُمْ پھر اللہ نے انہیں دوبارہ زندہ کیا۔ بائبل کی روائتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت و زندگی کے ان مراحل سے گزرنے کے بعد وہ حقیقت حال کو سمجھ گئے۔ اللہ سے معافی مانگی، جہاد میں حصہ لیا۔ فلسطینیوں کے خلاف جواں مردی کے جوہر دکھائے اور آخر ان کو فتح حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا کیا۔

جہاد سے گریز حرام ہے

موت و حیات قبضۂ قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کی جتنی زندگی مقرر کی ہے۔ اس سے پہلے انسان کی موت واقع نہیں ہوسکتی اور نہ اس سے زیادہ زندگی حاصل ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اس خوف سے جہاد سے گریز کرنا کہ موت آجائیگی، یہ حرام ہے۔ حضور کا فرمان ہے لَنْ تَمُوْتَ نَفْسٌ حَتّٰی تَسْتَکْمِلَ رِزْقَھَا جب تک انسان اپنی روزی پوری نہیں کر لیتا، اس کی موت نہیں آتی۔ لہٰذا حرام روزی تلاش نہیں کرنی چاہیئے۔ اسی لیے فرمایا فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَجْمِلُوْا اللہ سے ڈرو اور اچھے راستے پر چلو۔ چاہے کتنے بڑے حادثات پیش آجائیں موت قبل از وقت نہیں آسکتی۔ کیونکہ اس کے لیے وقت متعین ہے۔ انسان کو اپنا فرض ادا کرتے

رہنا چاہیئے خواہ جہاد میں سر دھڑ کی بازی لگانا پڑے۔ جب تک اللہ کو منظور ہے اُسے موت نہیں آسکتی۔ نہ دشمن اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کی موت بستر پہ واقع ہوئی، حالانکہ آپ نے زندگی میں جی بھر کر جہاد کیا۔ بڑی بڑی جنگوں میں لشکر کی کمانڈ کی۔ آپ کہا کرتے تھے خدا تعالیٰ بزدل کی آنکھ کو ٹھنڈا نہ کرے، میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں، جس پر تیر، تلوار یا نیزے کا زخم نہ ہو آرزو تھی کہ میدان جہاد میں شہادت نصیب ہو، مگر افسوس کہ آج بستر پہ موت آرہی ہے بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت زبیرؓ کی ساری زندگی بھی جہاد میں گزری، اُنؓ کے جسم کا کوئی حصہ بھی زخموں سے خالی نہ تھا۔ حتیٰ کہ اعضاء مستورہ پہ بھی نیزے کا زخم تھا، مگر اُن کو بھی میدانِ جہاد میں شہادت کی موت نہ مل سکی۔ لہذا انسان کا فرض ہے کہ موت کے خوف کو دل سے نکال دے اور فریضہ جہاد کو انجام دیتا رہے۔

فرمایا اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنیوالا ہے وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ مگر اکثر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ یعنی اس کی قدرت پہ یقین نہیں رکھتے۔

الغرض! اللہ تعالے نے یہ واقعہ بیان کرکے موت وحیات کی حقیقت کو سمجھا دیا۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے۔ کہ شیطان لوگوں کو بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کوئی مال خرچ کرنا چاہے تو شیطان کہتا ہے دیکھنا تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اور اگر کوئی جہاد میں شرکت کا ارادہ کرتا ہے۔ تو اس کے کان میں کہتا ہے سوچ سمجھ لو، تمہارے بچے یتیم ہو جائیں گے۔ حالانکہ موت وحیات ایک اٹل حقیقت ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عاید کردہ فریضہ کو انجام دیتا ہے اور موت کو خاطر میں نہ لائے۔

جہاد کا حکم

جہاد کے اس تمہیدی طور پہ ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جان ومال کے ذریعے جہاد کا صریح حکم دیا۔ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ اس کے دین کی سربلندی کے لیے دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو جاؤ

کیونکہ موت وحیات تو اُسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ وقتِ معین سے پہلے نہ موت آسکتی ہے اور نہ وقتِ معین کے بعد زندگی باقی رہ سکتی ہے۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ۔ اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو سُنتا ہے۔ ہر پکارنے والے کی پکار کو سُنتا ہے۔ اور ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ کوئی شے اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں، لہٰذا اپنی جان کو اللہ کی راہ میں پیش کر دو۔ اس کا حکم ہے جَاھِدُوْا بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ اگر اس مالک الملک نے جان کی قربانی قبول کر لی۔ تو اس سے اچھا سودا کیا ہو سکتا ہے۔ اُس کا تو اعلان ہے اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ اُس نے تو مومنوں کے جان ومال جنت کے بدلے خرید رکھے ہیں۔

جہادِ بالمال

جہاد بالمال کے متعلق فرمایا مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا کون ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہے۔ قرض حسن۔ اللہ کو قرض دینا یہ ہے کہ اُس کے راستے میں مال کے ذریعے جہاد کیا جائے اس کو قرض حسن اس لیے کہا گیا ہے۔ کہ انسان کو یقین کامل ہو جائے۔ کہ جہاد میں لگائی ہوئی اُسکی رقم ضائع نہیں جائے گی۔ اس کا بدلہ اُسے بڑھا چڑھا کر مل جائے گا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗٓ اَضْعَافًا کَثِیْرَۃً اس قرض حسن کو اللہ تعالیٰ دُگنا بلکہ کئی گنا کر دے گا۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خلوص کے ساتھ دیا ہوا کھجور کا ایک دانہ، اُحد پہاڑ کے برابر بڑھ کر واپس ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے اجر وثواب کو اس قدر بڑھا دیں گے۔ جو شخص فی سبیل اللہ ایک پیسہ خرچ کرے گا، اُس کو کم از کم دس گنا تو ضرور ملیگا کہ یہ قطعی قانون ہے" مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَۃِ فَلَہٗ عَشْرُ اَمْثَالِھَا البتہ جہاد میں خرچ ہونے والے مال کے بدلے کی کم از کم مقدار سات سو گنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اسلام کی کو ہان کی بلندی جہاد میں مضمر ہے۔

جہاد کی اہمیت

جہاد بالمال اور جہاد بالنفس دونوں بڑی اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ اگر جہاد سے گریز ہو گا، تو نہ عزت ہو گی اور نہ دین کا غلبہ باقی رہے گا۔ بے دین اور کافر

طاقتیں غالب آجائینگی، حضور علیہ السلام کے ارشاد سے اور قرآن کریم کے مطابق جہاد سے گریز کرنے والے فاسق ہو جاتے ہیں یا منافق ہو جاتے ہیں۔ ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے۔ کہ اگر تم جہاد کو ترک کر کے تجارت، کھیتی باڑی یا دوسرے کاموں میں منہمک ہو گئے یُسَلِّطُ اللّٰہُ عَلَیۡکُمُ الذِّلَّۃَ تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دیگا حَتّٰی تَرۡجِعُوۡا اِلٰی دِیۡنِکُمۡ اور جب تک دین کی طرف واپس نہیں آؤ گے۔ اللہ تعالیٰ تم سے ذلت کو دُور نہیں کریں گے۔ جب تک مسلمانوں میں جذبہ جہاد موجود تھا اُن کو عزت اور غلبہ حاصل تھا۔ جب جذبہ جہاد میں سستی واقع ہوئی تو نہ عزت رہی نہ غلبہ غیر اقوام کی ملی بھگت سے مسلمان آپس کی جنگ وجدال میں مصروف ہیں۔ یہ انگریزی تہذیب کا اثر ہے۔ کہ ہم اپنے اکابرین کو بھول کر غیر اقوام کے گن گا رہے ہیں۔ دنیا میں چالیس سے زیادہ اسلامی سلطنتیں ہونے کے باوجود ان پر سپر پاورز کا غلبہ ہے اس قسم کے تجربات گذشتہ تاریخ میں بھی ملتے ہیں۔ جب عیسائیوں نے سپین (اندلس) پر قبضہ کیا تو وہاں مسلمانوں کی آبادی دو کروڑ کے قریب تھی۔ مگر بعد میں وہاں صرف گیارہ ہزار باقی رہ گئے، کچھ مارے گئے، کچھ جبراً عیسائی بنا لیے گئے۔ یہ مسلمانوں کی آپس کی نا اتفاقی ہے۔ کہ ہر جگہ ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔ ایران اور عراق کئی سالوں سے دست وگریباں ہیں۔ دونوں اسلامی ملکوں کی طاقت کمزور ہو رہی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ کسی غیر مسلم قوم کو موقع مل جائے۔ اور یہ دونوں اُن کے قبضہ میں چلے جائیں۔ روس اور امریکہ ہمیشہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ افغانستان میں کیا ہوا۔ یکے بعد دیگرے کتنے سربراہ قتل ہوئے، ملک کمزور ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ روس بزور شمشیر قبضہ کیے بیٹھا ہے" فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ۔

قرضِ حسن

اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے متعلق ان دروس میں کئی دفعہ بیان آچکا ہے۔ یہاں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے انفاق فی سبیل اللہ کو قرضِ حسن سے تعبیر فرمایا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اُس کو قرض دینے کے مترادف ہے جو وہ کئی گنا بڑھا کر دیگا۔ اس سے پہلے اس ضمن میں آچکا ہے وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ

اِلَی التَّھْلُکَۃِ مال کو روک کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ قرض حسن وہ قرض ہے جبکی واپسی کا تقاضا نہ کیا جائے۔ مقروض پر احسان نہ جتایا جائے اس کو حقیر نہ سمجھا جائے اور اس سے بدلہ نہ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو قرض دینے سے مراد جہاد میں خرچ ہے۔ یا غریبوں محتاجوں کی اعانت ہے۔ اس کا بدلہ قطعی طور پر آخرت میں کئی گنا بڑھا چڑھا کر دیا جائیگا۔ ایک شخص نے جہاد کے لیے ایک اونٹنی پیش کی۔ جس کے ساتھ مہار بھی اور اس پر پالان کسا ہوا تھا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، بہت اچھا کام ہے۔ قیامت کے روز اسے ایسی سات سو اونٹنیاں ملیں گی۔

قبض و بسط — بظاہر خرچ کرنے سے مال کم ہو جاتا ہے۔ مگر انسان کو جان لینا چاہیے وَاللّٰہُ یَقْبِضُ وَیَبْصُطُ قبض و بسط تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا چاہتا ہے مال قبض کر لیتا ہے۔ اور جس کا چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔ یہ اختیار اس نے اپنے پاس رکھا ہے۔ اور وہی بہتر جانتا ہے۔ کہ کس کو کتنا مال دینا ہے۔ چنانچہ وہ اُس کے مطابق رزق میں کمی اور زیادتی کرتا ہے۔ لہذا انسان کا یہ وہم کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس کا مال کم ہو جائیگا، کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ انسان بڑا ناشکرگزار ہے۔ جب اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے۔ تو اُسے زور بازو کا نتیجہ کہتا ہے اور جب وہ کم کر دیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینا شروع کر دیتا ہے اور پھر کہتا ہے۔ کہ تنگی کے لیے میں ہی رہ گیا تھا۔ خدا پر شکوہ کرتا ہے۔ مگر اپنے کرتوت کو نہیں دیکھتا۔ کہ میرے افعال کیسے ہیں فرمایا یہ بات یہیں ختم ہونے والی نہیں ہے۔ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ تم سب کو اُسی مالک الملک کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ لہذا جہاد بالنفس اور جہاد بالمال ہر دو طریقوں سے اللہ کو راضی کرو۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰىۘ اِذْ
قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِؕ
قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا
تُقَاتِلُوْاؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ
اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَ اَبْنَآىٕنَاؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ
الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ (۲۴۶)

ترجمہ: کیا آپ نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف نہیں دیکھا، موسیٰ علیہ السلام کے بعد، جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اُس پیغمبر نے کہا۔ کہ اگر تم پر لڑائی فرض کر دی جائے تو شاید تم نہ لڑو۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں کیا ہے کہ ہم نہ لڑیں حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے ہیں اور اپنی اولادوں سے علیحدہ کیے گئے ہیں۔ پھر جب اُن پر لڑائی فرض کر دی گئی تو اُن لوگوں نے روگردانی کی مگر بہت تھوڑے لوگوں نے ان میں سے۔ اور اللہ خوب جانتا ہے ظلم کرنے والوں کو (۲۴۶)

ربطِ آیات

گذشتہ درس کی آیت کریمہ جہاد کے مسئلہ میں بمنزلہ تمہید تھی۔ اس میں جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کی ترغیب دی گئی تھی۔ اور اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بھی ہوا۔ جب کہ کچھ لوگ جہاد کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کر دیا۔ اور نبی زمانہ کی دُعا سے اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر زندہ کیا۔ اس سے یہ ثابت ہوا تھا کہ لڑائی سے راہِ فرار اختیار نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ موت و حیات تو قبضہ قدرت میں ہے۔ موت اپنے وقتِ معینہ پر ہی آتی ہے۔ اس میں تقدیم و

و تاخیر کا کوئی امکان نہیں۔ پھر اسی آیت کے اگلے حصے میں لڑائی کا واضح حکم بھی دیا۔ کیونکہ جو قوم جہاد سے جی چراتی ہے۔ وہ مغلوب ہو کر قعرِ مذلت میں جا گرتی ہے۔

آج کے درس میں جہاد ہی کے متعلق تنظیم کا تذکرہ ہے جہاد ایک اجتماعی مسئلہ ہے اور اس کے لیے تنظیم کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ گویا یہاں سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سیاسی نظام کے اصول و قواعد بیان فرمائے ہیں اور اس کے طریق کار کی وضاحت فرمائی ہے۔

اسلام کا سیاسی نظام

دنیا بھر کا سیاسی نظام اجتماعیت سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن پاک نے اسلام کے سیاسی نظام کے خدوخال سورۃ بقرہ کے علاوہ بعض دوسری سورتوں مثلاً سورۃ صف، سورۃ حج، سورۃ انفال اور سورۃ توبہ وغیرہ میں بیان کیے ہیں بلکہ ان سورتوں کے بعض مقامات تو اس نظام کے متعلق مستقل ابواب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک اجتماعی مسئلہ ہے اس لیے اس نظام کو چلانے کے لیے حاکم یا امیر کا تقرر لازمی ہے۔ خصوصاً جہاد جیسے اجتماعی کام کے لیے امیر لشکر کا ہونا ضروری ہے۔ جس کی سرکردگی میں قوم جہاد میں حصہ لے سکے۔ بخاری، مسلم اور حدیث کی دیگر کتابوں میں امارت یا خلافت پر باب موجود ہیں۔ اور اس میں مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے مکمل تعلیم ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ایک مثال کے ذریعے اس مسئلہ کو سمجھایا ہے۔

بنی اسرائیل کا زوال

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے کافی عرصہ بعد تک بنی اسرائیل کے حالات درست رہے۔ اگرچہ اس عرصہ میں کہیں کہیں کوئی قباحت بھی پائی گئی مگر مجموعی طور پر ان کے حالات اچھے رہے۔ وہب ابن منبہؒ کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل کے حالات بڑی دیر بعد بگڑنے شروع ہوئے۔ ان میں بھی شرک کی بیماری پیدا ہو گئی۔ انبیاء کی نافرمانی اور ان کا قتل قرآن پاک میں مذکور ہے۔ فسق و فجور بہت بڑھ گیا۔ جس طرح اس زمانہ میں مسلمانوں میں ہر قسم کی برائیاں پائی جاتی ہیں اس زمانہ میں بنی اسرائیل طرح طرح کی خرابیوں میں ملوث تھے۔ جب وہ نیکی کو چھوڑ کر بدی کی طرف راغب ہو گئے، تو ان کا زوال شروع ہو گیا۔ اس زمانے میں عمالقہ بڑی طاقتور قوم تھی۔ انہوں نے بنی اسرائیل

کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ قوم بنی اسرائیل کی قریبی ہمسایہ تھی، لہذا وہ آسانی سے ان پر غالب آ گئے اُن کے مردوں کو قتل کیا، عورتوں کو لونڈیاں بنایا۔ اسرائیلی روایات میں آتا ہے۔ کہ عمالقہ نے تیس ہزار نوجوان لڑکیوں کو لونڈیاں بنا لیا۔

حضرت سموئیل علیہ السلام (SAMUEL)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نبوت کا سلسلہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں جاری رہا۔ حتیٰ کہ لاوی خاندان میں کوئی نیک آدمی باقی نہ رہا۔ تمام کے تمام مرد نالائق اور نابکار تھے، ایک نیک آدمی دشمنوں کے مقابلہ میں مارا گیا، اس کی بیوی اُس وقت حاملہ تھی۔ قحط الرجال کے اس زمانہ میں اُس عورت نے دُعا کی کہ مولا کریم! مجھے نیک اور صالح بیٹا عطا کر۔ اتفاق کی بات کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹا عطا کر دیا۔ جبکا نام اُس نے سمائل یا سموئیل رکھا۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دُعا کو سن لیا اور بیٹا عطا کیا گویا یہ لفظ اسماعیل کا ہم معنی ہے جب یہ لڑکا بڑا ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے اُسے نبی بنایا اس پر وحی نازل فرمائی۔ یہ واقعہ جو بیان ہو رہا ہے یہ اسی نبی سموئیل علیہ السلام کے زمانے کا واقعہ ہے اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام مسیح علیہ السلام سے گیارہ بارہ یا تیرہ سو سال پہلے مبعوث ہوئے اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے جو بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں۔ الغرض! بنی اسرائیل اپنے نبی سموئیل علیہ السلام کے پاس بیت المقدس میں جمع ہوئے۔ اور اُن سے درخواست کی کہ ہمارے لیئے تنظیم بنائیں ہمارا امیر مقرر کریں جس کی سرکردگی میں ہم دشمن کا مقابلہ کر کے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے سکیں۔

آغاز واقعہ

ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰى کیا آپ نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف نہیں دیکھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد، اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا۔ کہ ہمارے لیے ایک امیر یا بادشاہ مقرر کر دیں جس کی سرکردگی میں نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔

لفظ ملک کی تشریح

لفظ ملک وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ملک، سردار امیر، حاکم یا خوشحال آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے

پاس کچھ لوگ آئے، اپنی مالی حالت کا تذکرہ کیا اور مدد کی درخواست کی۔ فرمایا اگر تم چاہتے ہو تو تمہارے ملک (حاکم) کے پاس سفارش کیے دیتا ہوں، اور اگر چاہو تو ہمارے پاس ٹھہرو حسب توفیق ہم تمہاری خدمت کریں گے، یا اگر چاہو تو صبر کرو کیونکہ صبر کا نتیجہ آخرت میں بہترین ہوگا۔ چنانچہ اُن لوگوں نے سوال کرنے کی بجائے صبر کو پسند کیا۔ یہاں پر ملک بمعنی حاکم استعمال ہوا ہے۔

ایک اور شخص آیا۔ کہنے لگا میرے حالات بہت خراب ہیں۔ میری کچھ مدد کریں آپ نے فرمایا۔ کیا تمہارے پاس مکان ہے؟ کہا ہے۔ پھر پوچھا تمہاری بیوی ہے۔ اُس نے کہا کہ ہاں بیوی بھی ہے۔ پھر آپ نے دریافت کیا۔ تیرے پاس کوئی خادم بھی ہے تو اُس نے اس بار بھی اثبات میں جواب دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا۔ کہ تیرے پاس مکان ہے۔ تیری بیوی موجود ہے۔ خدمت کے لیے نوکر بھی ہے۔ تو پھر تو کیسا فقیر ہے۔ اَنْتَ مِنَ الْمُلُوْكِ تو تو بادشاہوں میں سے ہے۔ مطلب یہ کہ تو خوشحال آدمی ہے جس کے پاس ضروریات کی یہ چیزیں موجود ہیں۔ وہ ملک کہلانے کا مستحق ہے۔

ملوکیت کا تصور

بہر حال عربی زبان میں ملک کے مختلف معانی ہیں جن میں بادشاہ یا امیر بھی شامل ہے صاحب امر یعنی حاکم وقت بھی مراد ہے۔ مگر ملوکیت کا جو تصور اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ اسلام ہرگز اس کی تائید نہیں کرتا۔ آج ہم سمجھتے ہیں۔ کہ بادشاہ وہ ہے۔ جو کسی ملک کے ہر سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ جو چاہے کرے اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہو۔ مگر ملوکیت کا یہ تصور غیر فطری اور اسلامی تعلیم کے سراسر منافی ہے اور ڈکٹیٹر شپ بھی اسی حاکمیت کا نام ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو شورائی نظام سیاست عطا کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات نازل فرمائی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام (POLITICAL SYSTEM) کیا ہے۔ اُن کا امیر کیسا ہو، اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ اور وہ کن امور کا پابند ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی

جماعت کن اوصاف کی حامل ہونی چاہیئے۔ اس کے حقوق و فرائض کیا ہونگے وغیرہ وغیرہ مگر افسوس کہ اموی دور کے بعد مسلمانوں میں بھی غیر اسلامی تصور ملوکیت سرایت کر گیا۔ اور یہ آج بھی مسلمانوں میں موجود ہے۔

ہمارے قریبی زمانہ میں چوہدری افضل حقؒ بڑے فاضل آدمی ہوئے ہیں۔ زمین و مکانات کی صورت میں لاکھوں کی جائیداد کے مالک تھے۔ انگریزی دور میں اسمبلی کے ممبر تھے۔ سرکاری ملازمت میں انسپکٹر بھی رہے۔ مگر انگریزوں کی غلامی کا طوق اتار کر اُن کے خلاف جہاد میں شامل ہو گئے۔ مجلس احرار سے منسلک ہوئے۔ زمین و مکان ہر چیز اللہ کی راہ میں قربان کر دی، حتیٰ کہ اُن کا جنازہ مجلس احرار کے دفتر سے اٹھایا گیا۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں حضور علیہ السلام کی سیرت طیبہ پر بھی ایک نہایت عمدہ کتاب ہے۔ فرقہ واریت کے خلاف کتاب لکھی، سورۃ فاتحہ کی تشریح قلمبند کی۔ آپ نے ملوکیت کے متعلق ایک نہایت عمدہ بات کی ہے۔ فرماتے ہیں "افسوس کہ بنوامیہ کے بعد مسلمانوں نے اسلام کا اجتماعی اور شورائی نظام چھوڑ کر اس کی جگہ شہنشاہیت کا ٹاٹ بچھا دیا ہے۔ وہ ملوکیت اور شہنشاہیت جو قیصر وکسریٰ کا طرہ امتیاز تھا اور جس کو مٹانے کے لیے اللہ تعالےٰ نے اپنے آخری نبی کو مبعوث فرمایا، یہی نظام اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مسلمانوں میں پھر رائج ہے"۔

کابل کے امیر امان اللہ خان مرحوم کا باپ امیر حبیب اللہ خاں مرحوم بھی اپنے وقت کا بادشاہ تھا۔ اس کے متعلق حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ لکھتے ہیں۔ کہ آخری دور میں اسکی حالت اس حد تک پہنچ چکی تھی۔ کہ متعدد بیویاں (تین صد بیویاں) رکھنے کے باوجود شریف لوگوں کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ مارتا تھا۔ ایسا عیاش آدمی تھا۔ بڑی حیثیت کا مالک تھا مگر اس قسم کی حرکتیں شہنشاہیت کا خاصہ ہوتا ہے۔ آخر وہ قتل ہوا مگر قاتل کا پتہ بھی نہ چل سکا۔ باقی نوابوں اور بادشاہوں کا بھی یہی حال ہے۔ نواب حیدرآباد جب مرا تو اس وقت اس نے بھی تقریباً پونے دو سو عورتیں (داشتہ) اکھٹی کر رکھی تھیں۔

جماعت کی اہمیت

بہر حال بنی اسرائیل نے حضرت سموئل سے کہا ۔ کہ آپ ہمارے لیے کوئی امیر، سردار یا ملک مقرر کر دیں، جس کی کمان میں ہم دشمن سے جنگ کر سکیں۔ اگرچہ اُس وقت اللہ کے نبی موجود تھے ۔ مگر وہ کافی بوڑھے اور کمزور ہو چکے تھے ۔ اور جنگ میں بنفسِ نفیس شرکت سے معذور تھے ۔ البتہ ہدایات دینے کے لیے وہ کافی تھے ۔ لہٰذا انکی قوم نے عرض کیا کہ ہمارے لیے کوئی قابل امیر مقرر کر دیں، جو جنگ میں ہماری قیادت کر سکے ۔ ظاہر ہے ۔ کہ جنگ کرنے کے لیے جماعت کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اور اسلام میں جماعت کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ جماعت کے بغیر سیاسی نظام چل ہی نہیں سکتا ۔ جیسے فرمایا لَا اِسۡلَامَ اِلَّا بِالۡجَمَاعَةِ یعنی جماعت کے بغیر اسلام کا کوئی تصور نہیں اور لَا جَمَاعَةَ اِلَّا بِالۡاِمۡرَةِ اور امیر کے بغیر جماعت کسی کام کی نہیں اسی لیے فرمایا ۔ کہ سفر میں اکیلا آدمی نہ جائے ۔ اس کے ساتھ جماعت ہونی چاہیئے ۔ ایک ۔ اور دو ——————— شیطان ہیں، مگر تین کی تعداد جماعت ہے ۔ اور اگر چار آدمی جمع ہو جائیں تو فرمایا ۔ خیر الجماعة اربعة بہتر جماعت چار آدمیوں کی ہے ۔ اسی لیے فرمایا کہ جب سفر پہ روانہ ہونے لگو تو اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کر لو، اسکی سرکردگی میں، اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرو ۔ انفرادی حالت میں شیطان کے غلبے کا خدشہ ہے ۔ اس لیے سفر بھی بحیثیت جماعت اختیار کرو، شیطان کے شر سے محفوظ رہو گے ۔

نبی اور قوم میں مکالمہ

الغرض ! جب قوم نے خود نبی سے درخواست کی کہ اُن کے لیے ایک امیر مقرر کر دیا جائے جسکی سرکردگی میں وہ جہاد کریں ۔ قَالَ هَلۡ عَسَيۡتُمۡ اِنۡ كُتِبَ عَلَيۡكُمُ الۡقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوۡا تو نبی نے کہا ۔ کہ اگر تم پر لڑائی فرض کر دی جائے تو شاید تم نہ لڑ سکو، نبی نے اس خدشہ کا اظہار کیا ۔ کہ جنگ فرض ہونے کے بعد اگر تم نے اس میں لیت و لعل کیا ۔ تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آجاؤ گے ۔ لہٰذا فرضیت جہاد سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لو ۔ قَالُوۡا وَمَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ قوم کہنے لگی ۔ کہ ہمیں کیا ہے ۔ کہ ہم لڑائی نہ کریں اللہ کے راستے میں وَقَدۡ اُخۡرِجۡنَا

مِنْ دِيَارِنَا حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکال دیے گئے ہیں۔ دشمن نے ہماری زمین اور ہمارے مکانات پر قبضہ کر لیا ہے وَاَبْنَآئِنَا اور انہوں نے ہمیں ہماری اولادوں سے جدا کر دیا ہے۔ ہماری عورتوں کو لونڈیاں اور بچوں کو غلام بنا لیا ہے۔ اب نہ لڑنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ لہٰذا ہم ضرور اپنے دشمن سے جنگ کریں گے۔ آپ ہمارے لیے امیر لشکر مقرر کر دیں۔

بنی اسرائیل کی روگردانی

بنی اسرائیل کے اس قدر اصرار کے بعد فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ جب اُن پر لڑائی فرض کر دی گئی، تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ تو ان میں سے ایک قلیل تعداد کے سوا سب اپنے وعدے سے پھر گئے۔ انہوں نے جہاد سے منہ موڑ لیا۔ اس کی تفصیلات اگلے رکوع میں آ رہی ہیں۔ تاہم آگے وہ بیان بھی آ رہا ہے۔ جس میں تھوڑے لوگوں نے ہمت اور جوانمردی سے دشمن کا مقابلہ کیا اور پھر وہ غالب آئے۔

آج مسلمانوں کی حالت بھی اُس زمانے کے بنی اسرائیل سے کم خراب نہیں۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کے حالات اس قدر بگڑے ہوئے ہیں۔ کہ اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ وجہ ایک ہی ہے کہ جہاد سے روگردانی کر رہے ہیں۔ دوسروں کے دست نگر ہیں مگر آپس میں دست و گریبان ہیں۔ ذرا غور کریں فلسطینیوں کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اُن کی ہزاروں لڑکیاں غیر مسلموں کے قبضہ میں چلی گئی ہیں۔ انہیں رہنے کے لیے زمین پر کوئی ٹھکانہ میسر نہیں آ رہا ہے۔ فلپائن کی عیسائی اکثریت نے مسلمان اقلیت کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ وہ مسلمانوں کو مارو یعنی ڈاکو کہتے ہیں۔ حالانکہ وہ بیچارے قلیل تعداد میں ہیں۔ مگر انہیں بھی جینے کا حق نہیں دیا جا رہا ہے۔ قبرص میں بھی مسلمانوں کا یہی حال ہو رہا ہے۔ صرف چند سال پہلے چالیس ہزار قبرصی ترکوں کو ختم کر دیا گیا۔ اب انہوں نے ایک جزیرہ میں پناہ لے رکھی ہے۔ مگر عیسائی قوتیں انہیں وہاں بھی اکٹھا نہیں دیکھ سکتیں۔ ان کی سکیم یہ ہے۔ کہ کسی طرح ان کو علیحدہ علیحدہ کر کے ان کی جمعیت کو ختم کر دیا جائے۔

ظالم اور عادل

فرمایا وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

ظالم بزدل ہوتا ہے اور جہاد سے جی چراتا ہے۔ وہ خود بھی کوئی اچھا کام نہیں کر سکتا بلکہ برائی کی طرف رغبت رکھتا ہے۔ اُس سے اچھے نظام کی توقع نہیں کی جا سکتی ۔۔ ہمارے لیڈر، ظالم ہیں۔ اس قسم کے مولویوں، مشائخ، امیروں تاجروں سے اچھائی کی کیا اُمید ہو سکتی ہے البتہ اچھائی کی امید عادل شخص سے ہو سکتی ہے۔ وہی نظام اسلام قائم کر سکتا ہے۔ وہی جہاد کر سکتا ہے۔ اور قوم کو ذلّت سے نکال کر عزت و آبرو کی زندگی دے سکتا ہے۔ اس ایک جملہ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ میں ان سب چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔

امام بیضاوی منافقین کے متعلق لکھتے ہیں۔ جب انہیں کہا جاتا ہے۔ کہ زمین میں فساد نہ کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا راز فاش کرتے ہوئے فرمایا اَلَآ اِنَّھُمۡ ھُمُ الۡمُفۡسِدُوۡنَ اصل فسادی یہی لوگ ہیں ان کا اصلاح کا دعوےٰ محض فریب ہے۔ کفر، شرک، معصیت، حدود اللہ کو توڑنا، بدعت کا اجراء، چوری، ڈاکہ، قتل، دوسروں کے حق کا ضیاع وغیرہ سب ظلم کی مختلف شاخیں ہیں۔ ظالم سے اسی قسم کے افعال سرزد ہوں گے۔ البتہ جب عادل حاکم آئے گا، تو تمام برائیاں ختم ہو جائیں گی۔ حق و عدل کا دور دورہ ہو گا کہ عدل نظام اسلام میں سب سے بڑا ستون ہے۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایمان چار ستونوں پہ قائم ہے یعنی صبر، عدل، جہاد اور یقین، لہٰذا عادل شخص کے ایمان کی گواہی دی جاتی ہے۔ اور ظالم آدمی بے ایمان اور کافر ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِالظّٰلِمِیۡنَ اللہ تعالیٰ ان ظالموں کو اچھی طرح جانتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا
قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ
وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ
وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ
يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ
إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَن يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ
مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ
تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُمْ ع ۳۲ / ۱۶
مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾

ترجمہ:۔ اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ وہ کہنے لگے، ہم پر اُس کی حکومت کیسے ہو گی۔ اور ہم اُس سے حکومت کے زیادہ مستحق ہیں۔ اور وہ مال میں وسعت بھی نہیں دیا گیا۔ اُنکے پیغمبر نے اُن سے کہا، بیشک اللہ تعالیٰ نے اُسے تمہارے اُوپر منتخب کیا ہے اور اس کو علم اور جسم کی فراخی کے لحاظ سے زیادہ کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے بادشاہی دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۴۷﴾ اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ بیشک اُس کی بادشاہی کی نشانی یہ ہے۔ کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئیگا۔ جس میں تمہارے رب کی طرف سے دل کی تسلی ہے۔ اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں۔ جن کو موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کی اولاد نے چھوڑا ہے۔ اس کو فرشتے اٹھا کر لائیں گے

بیشک اسمیں تمہارے لیے نشانیاں ہیں اگر تم یقین رکھنے والے ہو (۲۴۸)

رابط آیات

گذشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔ وہ مغلوب ہو گئے۔ دشمن نے ان کے بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ان کے بچوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنا لیا۔ انہوں نے نبی وقت حضرت سموئیل علیہ السلام سے عرض کیا۔ کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ مقرر کر دیں۔ جس کی سرکردگی میں ہم دشمن سے جنگ کر کے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے سکیں اور اپنے گھروں کو لوٹ سکیں نیز اپنے مردوں اور عورتوں کو دشمن کی غلامی سے نجات دلائیں۔ ان کے نبی نے فرمایا کہ دیکھنا کہیں اپنے وعدے سے پھر نہ جانا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہم آپ کی طرف سے مقرر کیے گئے بادشاہ یا امیر کی اطاعت کریں گے۔ آج کے درس میں بنی اسرائیل کے لیے طالوت بادشاہ کے تقرر اور بنی اسرائیل کے انکار کا بیان آرہا ہے۔

طالوت بطور بادشاہ

ارشاد ہوتا ہے۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ ان کے نبی نے بنی اسرائیل سے کہا اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ لہذا تم اس کی سرکردگی میں اپنی تنظیم قائم کرو اور پھر دشمن سے جہاد کرو۔ مگر اس قوم کے آسودہ حال لوگوں کو طالوت کا انتخاب پسند نہ آیا۔ قَالُوْٓا کہنے لگے اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا طالوت ہمارا بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو غریب اور کمزور حیثیت کا مالک ہے۔ وہ ہمارا بادشاہ بننے کا اہل نہیں وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ اس سے زیادہ بادشاہ بننے کا ہمارا حق ہے۔ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ان کے پاس تو مال بھی نہیں ہے۔ وہ ہمارا سردار یا امیر بننے کے بالکل اہل نہیں ہے۔

دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بادشاہی تو زیادہ تر یہودا کے خاندان میں رہی جن میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔ اور نبوت زیادہ تر لاوی خاندان میں رہی جس سے حضرت ہارون علیہ السلام تھے۔ یہ طالوت بن کش حضرت یوسف علیہ السلام

کے چھوٹے بھائی بن یامین کی اولاد سے تھا اور یہ نسبتاً چھوٹا خاندان سمجھا جاتا ہے۔ مگر حضرت سموئیل علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اُسے بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر فرما دیا۔ ان کے خاندان کو دیگر خاندانوں کی طرح عزت حاصل نہیں تھی، یہ کم تر لوگ تھے۔ خود طالوت کپڑے رنگنے کا کام کرتا تھا۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ تیلی تھا۔ لہٰذا بنی اسرائیل اس کے بطور امیر تقرر پہ رضامند نہ ہوئے۔ دراصل مالی کمزوری نبوت کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ رکاوٹ رہی ہے۔ جب بھی کسی نبی نے نبوت کا دعوے کیا۔ تو اس کی قوم نے یہی جواب دیا کہ تو تو ہماری قوم کا گھٹیا آدمی ہے۔ تیرے پاس نہ مال و دولت ہے۔ نہ زمین و مکانات ہیں۔ نہ سونا چاندی ہے۔ تو نبی کیسے ہو سکتا ہے۔ یہی چیز طالوت کو بادشاہ تسلیم کرنے میں مانع ہوئی کیونکہ وہ شخص قوم کا ایک ادنیٰ فرد سمجھا جاتا تھا۔ اور دنیاوی مال و متاع سے محروم تھا۔

تفسیری روایات میں آتا ہے۔ کہ جب بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر سے امیر مقرر کرنے کی درخواست کی، اُس وقت طالوت کی عمر تیس ۳۰ سال کے قریب تھی۔ یہ سب لوگ پیغمبر کے پاس جمع تھے اور اُن سے سوال و جواب کر رہے تھے طالوت کے باپ کا گدھا گم ہو گیا تھا، وہ تلاش کرتا ہوا اُس طرف جا نکلا جہاں بنی اسرائیل کے لوگ جمع تھے۔ چنانچہ وہ بھی اُن کے قریب پہنچ گیا۔ اُدھر اللہ کے نبی کو وحی کے ذریعے خبر دی جا چکی تھی۔ کہ بنی اسرائیل کا بادشاہ ایسے شخص کو مقرر کیا جائے۔ جس کا قد نبی کے پاس موجود لاٹھی کے برابر ہو۔ نیز یہ کہ وہ آدمی آ رہا ہے۔ اس کے پہنچنے پر نبی کے پاس خوشبودار تیل والی شیشی میں جوش پیدا ہو گا۔ لہٰذا جس شخص پر یہ نشانیاں صادق آ جائیں اُسے امیر مقرر کر لیا جائے۔ جب طالوت اُس مجمع میں پہنچا۔ تو تیل کی شیشی میں جوش پیدا ہو گیا۔ جب اُس کا قد ماپا گیا، تو لاٹھی کے برابر نکلا، چنانچہ اللہ کے نبی نے طالوت کو بادشاہ یا امیر مقرر کر دیا مگر بنی اسرائیل نے اُسے اپنا امیر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

امیر کی خصوصیات

اللہ کے نبی نے اپنی قوم کو سمجھایا۔ کہ محض مال و دولت یا اعلیٰ خاندان کا ہونا

ہی امارت کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ اصول مقرر ہیں جن کی بنا پر کسی شخص کو امارت کے عہدے پہ فائز کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلی بات جو پیغمبر نے کہی قَالَ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰـہُ عَلَیْکُمْ اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہے۔ لہٰذا اس میں کسی کے ذاتی اختلاف کو دخل نہیں ہونا چاہیئے اور دوسری بات یہ کہ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ اللہ نے اُسے علم اور جسم میں وسعت دی ہے۔ یعنی اسمیں یہ خوبی ہے۔ کہ وہ علم میں بھی تم سے زیادہ ہے۔ اور جسمانی طاقت کے لحاظ سے بھی تم میں سے زیادہ قوی ہے۔ یہاں پہ علم سے مراد سیاسی علم یعنی نظام حکومت چلانے کی صلاحیت ہے۔ جہاں تک دینی علم کا تعلق ہے۔ وہ تو نبی کے پاس تھا، تاہم اللہ تعالیٰ نے سیاسی علم طالوت کو عطا کیا تھا۔ امیر کے لیے جسمانی طور پر صحت مند ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ غیر صحت مند یا بیمار اور لاغر شخص نظام حکومت کو بطریق احسن انجام نہیں دے سکتا۔ طالوت تیس سال کا وجیہ نوجوان تھا۔ قد آور اور صحت مند تھا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اُسے اِس کام کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ اور اس انتخاب پہ کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو نبی منتخب فرمایا۔ اسی طرح اُس نے طالوت کو بادشاہت کے لیے منتخب فرمایا۔

خلیفہ کا انتخاب

بعض اوقات اللہ تعالیٰ خلیفہ کا انتخاب بھی خود کرتا ہے۔ جیسے دنیا میں سب سے پہلے خلیفہ آدم علیہ السلام تھے۔ "اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً" میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا "یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ" اے داؤد علیہ السلام ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا۔ سلیمان علیہ السلام کی خلافت کا ذکر بھی آتا ہے۔

چونکہ اب وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے اب یہ تو ممکن نہیں۔ کہ ملتِ اسلامیہ کے لیے اللہ تعالیٰ خود کسی کو خلیفہ منتخب فرما دے۔ اب خلیفہ کے انتخاب کے لیے کئی ایک صورتیں ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے۔ کہ سمجھدار، دانا اور صاحبِ حل و عقد مسلمان خود خلیفہ کا انتخاب کریں۔ جس طرح حضور علیہ السلام کے

بعد لوگوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کو منتخب کیا تھا۔ انتخاب کی دوسری صورت یہ ہے کہ خلیفہ خود اپنا جانشین مقرر کر دے۔ جیسا کہ حضرت ابُوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو مقرر فرمایا تھا۔ یہ بھی درست ہے۔ کہ خلیفہ خود مستحق ترین شخص کو اس کام کے لیے نامزد کر دے۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص طاقت کے زور پہ خود بخود اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس کی مثال حضرت امیر معاویہؓ کی ہے۔ جنہوں نے غالب آکر خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔ اس طرح مسند اقتدار پہ آنے والا شخص اگر اللہ تعالےٰ کے احکام کے مطابق حکومت کا نظم و نسق چلائے۔ تو یہ صورت بھی قابلِ قبول ہے۔

خلافت کے معاملہ میں اہلِ اسلام میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں

اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک مسلمانوں کی جماعت پہ واجب ہے کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کریں۔ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام پہ عمل کرتا ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی یہی جماعت اُسے معزول بھی کر سکتی ہے۔ کیونکہ خلیفہ بھی ایک انسان ہوتا ہے اور وہ بھی غلطی کر سکتا ہے

برخلاف اس کے شیعہ کا عقیدہ یہ ہے۔ خلیفہ یا امام معصوم ہوتا ہے۔ اور اُس کا انتخاب من جانب اللہ ہوتا ہے اس کی خلافت مستقل ہوتی ہے اور کوئی اُسے معزول نہیں کر سکتا۔ حالانکہ یہ عقیدہ درست نہیں ہے۔ خارجی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حاکم صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ خلیفہ کی ضرورت ہی نہیں ہے یہ عقیدہ بھی باطل ہے۔

خلیفہ کا انتخاب اس قدر اہم مسئلہ ہے۔ کہ حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے یہ مسئلہ آپ کے کفن دفن سے پہلے طے کر لیا۔ کیونکہ ہر اجتماعی کام میں امیر کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر تمام امور اس کے احکام کے تحت انجام دیئے جاتے ہیں۔ ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے۔ کہ جب تین آدمی سفر پہ روانہ ہوں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں۔ تاکہ سفر کے تمام معاملات تنظیم کے تحت حل ہوں۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ کہ جو لوگ عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں چاہیئے۔ کہ ملک کا نظام ایسے ہاتھوں میں دیں، جو اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ کر سکیں۔ اور یہ کام وہی لوگ کر سکتے۔ جو خود ایماندار اور عادل ہوں۔ مولانا تشریح فرماتے ہیں۔ کہ جن ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ اُن کے ملک میں اسلامی نظام نافذ ہو، مگر جب حکومت منتخب کرنے کا وقت آتا ہے۔ تو ہمیشہ غلط فیصلہ کرتے ہیں۔ مولانا کا ارشاد ہے۔ کہ اسمبلی کا ممبر اُس شخص کو چُنو جو کتاب اللہ کا عالم اور حضور علیہ السلام کی سُنّت اور خلفائے راشدینؓ کے دور کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔ جو شخص کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے واقف نہیں، وہ اسلامی نظام کیسے لائیگا ممبر ایسا ہونا چاہیئے۔ جو قومی مفاد پہ ذاتی مفاد کو قربان کر دے۔ اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور آخرت میں محاسبے کا ڈر ہو۔ صرف ایسے لوگ ہی اللہ کا قانون جاری کر سکتے ہیں۔ وہ جب پارلیمنٹ میں جائیں تو سربراہ بھی صحیح منتخب کریں گے۔ اور قانون بھی ٹھیک وضع کریں گے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہمارے اکابرین میں سے ہیں۔ آپ اجتماعیات اور اقتصادیات کے ماہر تھے۔ آپ سکھوں کے گھر میں پیدا ہوئے۔ مگر اللہ تعالےٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سولہ سال کی عمر میں مُسلمان ہو کر حضرت خواجہ محمد صدیقؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ خواجہ صاحب نے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا اس عمر میں ان کا ختنہ بھی کرایا۔ مولانا بھی اپنے آپ کو خواجہ صاحب کا روحانی فرزند کہتے ہیں۔ حضرت خواجہ محمد صدیقؒ اپنے زمانے کے اس پایہ کے بزرگ تھے۔ جس پایہ کے حضرت جنید بغدادیؒ ہوئے ہیں۔ اُن کے دو مرید خاص طور پہ قابل ذکر ہیں۔ ایک مولانا غلام محمد دین پوریؒ اور دوسرے مولانا سیّد تاج الدین امروٹیؒ۔ مولانا دین پوریؒ علم میں زیادہ وسعت نہیں رکھتے تھے تاہم حاجی امداد اللہؒ کی طرح نسبت بہت اونچی تھی۔ جنوبی پنجاب اور سندھ میں اُس دور میں اُن جیسا کوئی بزرگ نہیں ہوا۔ سیّد تاج الدین امروٹیؒ میں دونوں خوبیاں پائی جاتی تھیں آپ عالم بھی تھے اور مجاہد بھی۔ آپ کے ہاتھ پہ تقریباً سات ہزار ہندو سکھ مسلمان

ہوئے۔ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے دوست اور رفیق ان کی طرح انگریز کے سخت دشمن تھے، آپ نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

جب مولانا عبید اللہ سندھیؒ تحصیل علم کے لیے ہندوستان جا رہے تھے۔ تو حضرت خواجہ محمد صدیقؒ نے ان کے حق میں دعا کی۔ کہ اللہ تعالیٰ اُن کو کسی صحیح عالم دین کے پاس پہنچا دے اللہ تعالیٰ نے دُعا قبول فرمائی۔ اور چلتے چلتے مولانا سندھی دارالعلوم دیوبند پہنچ کہ حضرت مولانا شیخ الہندؒ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ جملہ علوم آپ سے حاصل کیے۔ اور حدیث کا درس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے گنگوہ میں جا کر لیا آپ مدرسہ دیوبند کے سرپرست تھے مگر قیام گنگوہ میں تھا۔ مولانا سندھیؒ کی ذہانت کا یہ عالم تھا۔ کہ خود لکھتے ہیں۔ کہ علم میراث کی کتاب سراجی صرف دو گھنٹے میں پڑھ لی اور صحاح ستہ میں سے ابن ماجہ اور نسائی دو دن میں ختم کر لی۔ جب آپ علم حاصل کر کے واپس اپنے پیر صاحب کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا۔ کہ خواجہ صاحب وفات پا چکے ہیں۔ آپ نے آخری وقت میں اپنے دونوں شاگردان کو وصیت فرمائی تھی۔ کہ جب عبید اللہؒ واپس آئے۔ تو اُسے اپنا بیٹا سمجھنا۔ چنانچہ ان دو بزرگوں نے آپ کو باپ کی سی شفقت دی۔

مولانا سندھیؒ خود فرمایا کرتے تھے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ تحصیل علم کے بعد میں نے اٹھارہ سال تک اپنے استاد محترم مولانا محمود الحسنؒ کی خدمت میں رہ کر اسلامی سیاست اور حکمت سیکھی۔ شیخ الہندؒ سیاسیات کے بہت بڑے امام تھے۔ مولانا سندھیؒ کا چھوٹا سا قد مگر اللہ تعالیٰ نے ان میں وہ صلاحیت رکھی تھی کہ انگریز جیسا جابر حکمران آپ سے بہت خائف تھا۔ آپ کے پیچھے ہر وقت جاسوس لگے رہتے تھے۔ آپ بارہ سال تک مکہ معظمہ میں رہائش پذیر رہے۔ عرب حکومت نے بھی سیاست میں حصہ لینے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اس کے باوجود انگریزوں کو ہمیشہ اُن کی طرف سے طوفان اٹھنے کا خطرہ رہتا تھا۔ انگریزوں نے ایک مولوی کو جاسوسی کے لیے مکہ مکرمہ بھیج دیا۔ آپ کو پتہ چلا تو فرمایا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اللہ

کے گھر میں بھی میرا پیچھا کرتے ہو۔ تقسیم ہند سے پانچ سال قبل آپ نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ میں نے انگریز کی سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اب یہ اس ملک میں نہیں رہ سکتا۔ اگر یہ زیادہ عرصہ ہندوستان میں ٹھہر گیا تو میری قبر پر تھوک دینا کہ تو نے جھوٹ کہا تھا۔ مگر اس کے بعد دو سال کے اندر اندر انگریز کو ہندوستان خالی کرنا پڑا۔

شرائط خلافت

جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے کہ خلافت کے لیے اعلیٰ خاندان کا ہونا اور خلیفہ کے پاس مال و دولت کا ہونا کوئی شرط نہیں ہے۔ بلکہ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے طالوت کی جو صفات بیان کی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ کہ علم اور صحت کے لحاظ سے دوسروں سے بہتر تھا۔ اور پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خود اُسے اس کام کے لیے منتخب کیا تھا۔ اسی لیے امام ابوبکر جصاصؒ اور دیگر مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں۔ کہ خلیفہ کے لیے خاندان قریش سے ہونا ضروری نہیں ہے۔ حدیث شریف اَلْاَئِمَّۃُ مِنَ الْقُرَیْشِ کی تشریح میں فرماتے ہیں۔ کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب قریش کے علاوہ لوگ کسی دوسرے پر متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ اُس وقت قریش میں خلافت کا کام انجام دینے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ اگر دو آدمی بھی خاندانِ قریش سے باصلاحیت ہوں گے تو خلافت کسی اور طرف منتقل نہیں ہو گی۔ مگر عباسیوں کے دور میں اسقدر بگاڑ پیدا ہو گیا۔ کہ دو آدمی بھی باصلاحیت موجود نہ رہے۔ لہٰذا خلافت اُن کے ہاتھ سے نکل گئی۔ دوسری جگہ آتا ہے مَا اَقَامُوْ جب تک انصاف پر قائم رہیں گے۔ خلافت اُن کے پاس رہیگی۔ چنانچہ ساڑھے چھ سو سال تک خلافت اسی خاندان میں رہی

پھر جب ———————————— اس اہلیت سے محروم ہو گئے تو خلافت سے محروم ہو گئے۔ آج بھی من حیث القوم مسلمانوں میں صلاحیت ناپید ہے۔ مسلمان خود اپنا صحیح خلیفہ منتخب نہیں کر سکتے۔ آج وہ مسلمان کہاں سے پیدا ہوں جو قومی درد رکھنے والے ہوں۔ اور اپنے ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر قربان کر سکیں۔ جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہو گا۔ یہ قوم قعرِ مذلت سے نہیں نکل سکتی۔

الغرض ! فرمایا: کہ اللہ تعالےٰ نے بعض خصوصیات کی بنا پہ طالوت کو بادشاہ منتخب فرمایا ہے۔ وَاللّٰهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَنْ يَّشَآءُ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنا ملک عطا کرتا ہے وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا اور علم والا ہے وہ جس کو بادشاہی دیتا ہے اس کو مال و دولت سے بھی نواز سکتا ہے۔ اور جس کے اندر خود اس نے صلاحیت رکھی ہے۔ اس کو امیر بنا دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس کے علم میں ہے

تابوتِ سکینہ

اللہ کے نبی نے اللہ کے حکم سے اپنی قوم کے سامنے ایک معجزانہ نشانی کا اظہار فرمایا۔ تاکہ اُن کی تسلی ہو جائے کہ طالوت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا انتخاب بالکل درست ہے۔ قوم جانتی تھی۔ کہ جب دشمن نے اُن پر غلبہ حاصل کیا تھا۔ تو سلیمان علیہ السلام کے زمانے کا وہ مقدس صندوق بھی اٹھا کر قریہ یاریم میں لے گئے تھے۔ جس میں آل موسیٰ اور آل ہارون کے تبرکات تھے۔ جن میں حضرت موسیٰ کی لاٹھی تختی کے ٹکڑے۔ تورات کا کچھ حصہ، آپ کا لباس اور پاپوش وغیرہ تھے۔ یہ ایسی بابرکت چیز تھی۔ کہ بنی اسرائیل سفر و حضر میں ہمیشہ اسے ساتھ رکھتے تھے۔ یہ تابوت جنگ میں بھی اپنے ساتھ رکھتے تھے جس کی برکت سے اللہ انہیں فتح دیتا۔ تابوت سکینہ حضرت سلیمان کے زمانے تک بنی اسرائیل میں رہا۔ پھر آپ نے بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے وقت وہاں رکھ دیا۔ اس کے بعد اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ ہیکل سلیمانی میں دفن ہے غالباً اس لیے یہودی وہاں پہ کھدائی کر رہے ہیں تاکہ وہ تابوت مل جائے۔

اگرچہ بنی اسرائیل کو تبرکات کے کھو جانے کا بڑا قلق تھا مگر وہ مجبور تھے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اُن کے نبی نے اُن سے کہا۔ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ تمہارے پاس وہ صندوق خود بخود آجائے گا فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ جس میں تمہارے رب کی طرف سے تسکین قلب ہے۔ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ اور کچھ بچی ہوئی چیزیں ہیں۔ جنہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی اولاد نے چھوڑا ہے۔ تَحْمِلُهُ الْمَلَائِكَةُ اسے فرشتے اٹھا کر لائیں گے۔

یہ صندوق بیس سال تک دشمن کے قبضہ میں رہا۔ اللہ کی قدرت، وہ جس بستی میں

صندوق کو رکھتے تھے، وہاں وبا پھوٹ پڑتی اور وہ بستی تباہ ہو جاتی تھی۔ اس طرح پانچ بستیاں تباہ ہو گئیں۔ تو اُن لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس صندوق کو کسی طرح نکال دیا جائے، چنانچہ انہوں نے صندوق بیل گاڑی پہ رکھ کر بیلوں کو ایک طرف ہانک دیا۔ بیل چلتے چلتے طالوت کے دروازے پہ پہنچ گئے۔ اور اس طرح صندوق اُن کے پاس آ گیا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ یہ صندوق اگرچہ بظاہر بیل گاڑی پہ آیا تھا مگر اللہ کے حکم کے مطابق اُسے فرشتے لائے تھے۔ جو عام لوگوں کو نظر نہیں آتے تھے۔ انہوں نے ہی بیلوں کو طالوت کے دروازے پہ لا کھڑا کیا تھا فرمایا اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اس میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں۔ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اگر تمہیں یقین و ایمان ہے، ان نشانیوں کو دیکھ کر بنی اسرائیل طالوت کے بادشاہ مقرر ہونے پہ مطمئن ہو گئے۔ چنانچہ قوم نے ان کی سرکردگی میں جہاد کرنے کا عزم بھی کر لیا۔ اب اللہ کا نبی سموئیل بھی موجود تھا اور طالوت بادشاہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ وہ دشمن سے جنگ کے لیے نکلے جس کا ذکر اگلے درس میں آئے گا۔

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُمْ
بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ
يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ
فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ؕ قَالَ
الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ
غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾

ترجمہ: جب طالوت اپنے لشکر کے ہمراہ باہر نکلے، تو انہوں نے کہا، بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں آزمانے والا ہے ایک نہر سے۔ پس جس نے نہر سے پانی پی لیا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ اور جس نے اس سے نہ چکھا بیشک وہ میرا ہے۔ ہاں جس نے ہاتھ سے پانی کا چلو بھر لیا وہ مستثنیٰ ہے۔ پس لوگوں نے اس میں سے پی لیا سوائے تھوڑے آدمیوں کے۔ پھر جب طالوت اور اس کے ہمراہ اہل ایمان نہر سے پار ہوئے تو کہنے لگے کہ آج جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی ہمیں طاقت نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا یقین رکھتے تھے، کہنے لگے کہ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں اللہ کے حکم سے۔ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۲۴۹﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں طالوت کے بطور بادشاہ تقرر کا بیان آچکا ہے۔ جب اللہ کے نبی نے بنی اسرائیل کی درخواست کے مطابق طالوت کو بادشاہ مقرر کیا۔ تو انہوں نے اُسے اپنا رہبر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے۔ کہ یہ تو ایک غریب آدمی ہے اس کے پاس

مال و دولت نہیں ہے۔ ہم اسے اپنا بادشاہ کیسے تسلیم کرلیں۔ اس سے زیادہ تو بادشاہت کے ہم حقدار ہیں بلکہ اللہ کے نبی نے فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے طالوت کو علم اور جسمانی طاقت سے نوازا ہے۔ نیز یہ انتخاب اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جس کو چاہے بادشاہت دے دے۔ لہذا تمہیں اس پر معترض نہیں ہونا چاہیئے۔ اللہ کے پیغمبر نے فرمایا کہ دیکھو طالوت کے تقرر کی ایک خاص نشانی یہ ہے کہ تمہارا وہ مقدس صندوق جس میں انبیائے سابقین کے بعض تبرکات محفوظ ہیں۔ اور جسے تمہارے دشمن اٹھا کر لے گئے تھے، وہ تمہارے پاس فرشتے لے کر آئیں گے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ وہ مقدس صندوق ایک بیل گاڑی کے ذریعے خود بخود طالوت کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اب قوم نے طالوت کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اور اس کی سرکردگی میں دشمن سے جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ آج کے درس میں لشکر طالوت کی دشمن کے مقابلے کے لیے روانگی اور پھر راستے میں پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ ہے۔

لشکرِ طالوت اور جالوت

طالوت بادشاہ کی سرکردگی میں فوج کی تیاری شروع ہوئی۔ عام اعلان کیا گیا۔ کہ تمام کے تمام صحت مند جوان فوج میں بھرتی ہو جائیں۔ چنانچہ اسی۸۰ ہزار کا لشکر جرار تیار ہوا دشمن بھی بڑا طاقتور تھا۔ قوم عمالقہ کا سردار جالوت تھا۔ دس فٹ قد کا یہ جوان بڑا طاقتور تھا۔ اُسے دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ بائیبل کی روایتوں میں آتا ہے۔ کہ جالوت کی ڈھال تین من وزنی تھی۔ چہرہ چھوڑ کر اس کا باقی سارا جسم زرہ میں محبوس ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بڑے بڑے کڑیل جوان موجود تھے مگر سب کافر اور مشرک تھے۔ لشکر طالوت کا ان لوگوں کے ساتھ مقابلہ تھا۔

سپاہی کے اوصاف

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلامی لشکر بعض مخصوص اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے۔ تاکہ اُسے دشمن کے مقابلہ میں کامیابی حاصل ہو۔ سب سے پہلی بات یہ ہے۔ کہ کسی سپاہی میں حرص کا مادہ نہ ہو۔ اگر ان میں حرص اور لالچ پیدا ہو گیا تو وہ ناکام ہو جائیں گے۔ اس کے بجائے طبیعت میں استقلال ہونا چاہیے۔ چھوٹی چھوٹی آزمائشوں میں گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اسلام کے سپاہی کے لیے مستقل مزاجی ایک اچھی علامت ہے۔

اس کے علاوہ صبر ملت ابراہیمی کا بہت بڑا اصول ہے۔ صبر، شکر، اللہ کا ذکر، نماز، عقیدۂ توحید پر پختگی، تعظیم شعائر اللہ اور دعا سب ایسے اصول ہیں۔ جو مسلمانوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ کے صبر و استقلال اور مصائب کو برداشت کرنے کے کتنے واقعات حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ انہوں نے بھوک، پیاس اور ہر قسم کے ابتلا کو برداشت کیا۔ مگر جہاد سے منہ نہیں موڑا۔ ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابو عبیدہؓ کی معیت میں ایک اسلامی لشکر جہاد پر روانہ ہوا۔ راستے میں راشن کی کمی واقع ہو گئی۔ اور اس کی مقدار مٹھی بھر فی کس رہ گئی۔ جب راشن بالکل تھوڑا رہ گیا۔ تو ایک ایک کھجور حصے میں آنے لگی۔ اور پھر وہ وقت بھی آیا جب کھجور کی گٹھلیوں کو چوس لیا جاتا اور اوپر سے پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا جاتا۔ جب بالکل کچھ نہ رہا تو درختوں کے پتے کھانے شروع کر دیے۔ کڑوے پتے کھا کھا کر صحابہؓ کی باچھیں پھٹ گئیں۔ حدیث کے لفظ ہیں تَقَرَّحَتْ اَفْوَاهُهُمْ ان کے منہ پھٹ گئے۔ مگر اس قدر مصیبتیں جھیلنے اور تکلیفیں برداشت کرنے کے باوجود ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ بلکہ دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر رہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے فتح و کامرانی کے لیے دعائیں کرتے رہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

لشکر کی آزمائش

بعض اوقات سالار لشکر اپنے لشکر کی آزمائش بھی کرتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے۔ کہ فوج ہر قسم کی سختیاں برداشت کرنے کے قابل ہے یا نہیں۔ اور بعض اوقات اس میں خاص مصلحت بھی ہوتی ہے۔ جو امیر لشکر کے ذہن میں ہوتی ہے۔ تو اس لحاظ سے امیر کو حق حاصل ہے۔ کہ وہ حالات کے پیش نظر فوج کو کوئی حکم دے۔ جس کی بظاہر کوئی افادیت نہ ہو۔ حضور علیہ السلام کے اپنے زمانہ مبارک کا واقعہ ہے۔ حضرت عمرو ابن العاصؓ کو امیر لشکر بنا کر روانہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ فوج میں بطور سپاہی شامل تھے۔ جب دشمن کے قریب پہنچے تو ایک جنگل میں ڈیرہ لگایا۔ رات سخت سرد تھی۔ مگر امیر لشکر نے حکم دیدیا کہ کوئی شخص آگ نہ جلائے۔ لوگ سخت حیران ہوئے کہ سردی میں ٹھٹھر رہے ہیں۔ مگر آگ جلانے کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ نہ آگ جلی، نہ کھانا پکا۔ لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ سے گزارش کی کہ امیر لشکر کے پاس سفارش کریں۔

کہ آگ جلانے کی اجازت دیں، مگر شیخین ؓ نے یہ کہہ کر سفارش کرنے سے انکار کر دیا۔ کہ اس شخص کو حضور علیہ السلام نے امیر مقرر کیا ہے۔ اس کی اطاعت ہم پر لازم ہے آگ نہ جلانے میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ آخر علی الصبح امیر نے دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دیدیا وہ لوگ اسلامی لشکر کی آمد سے بے خبر تھے۔ اچانک حملہ ہوا۔ تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور لشکر اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔ اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ اگر رات کو آگ روشن کرتے تو دشمن کو ہماری آمد کا پتہ چل جاتا اور وہ جنگ کے لیے تیار ہو جاتے۔

طالوت نے بھی اپنے لشکر کو اللہ کے حکم سے آزمائش میں ڈالا۔ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ جب طالوت لشکر کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ کہا اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر کے ذریعے آزمانا چاہتا ہے کہتے ہیں۔ کہ یہ ایک چھوٹی سی نہر ہے جو جیرون میں شمالاً جنوباً بہتی ہے پیچ و خم کے راستے اس کی کل لمبائی دو سو میل کے قریب ہے۔ تاہم براہ راست قریب ترین فاصلہ پینسٹھ میل بنتا ہے۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ اس سے مراد دریائے اردن ہے جسے عبور کر کے دشمن کے مقابلہ پہ جانا تھا۔ جب لشکر اس نہر کے قریب پہنچا۔ تو امیر لشکر نے اعلان کیا۔ کہ تمہاری آزمائش کا وقت آگیا ہے۔ اگرچہ تم پیاس کی شدت میں مبتلا ہو، مگر اللہ کا حکم یہ ہے کہ یہاں سے پانی نہیں پینا فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي جو کوئی اس حکم کی خلاف ورزی کر کے نہر کا پانی پی لیگا۔ وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یعنی میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي اور جس نے اس پانی کو بالکل نہ چکھا، بلاشبہ وہ مجھ سے ہے۔ یعنی وہ میرے لشکر میں شامل رہیگا۔ ہاں اتنی گنجائش ہے إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ کہ جو کوئی اپنے ہاتھ سے چلو بھر لے تو اس کو اجازت ہے اس سے زیادہ پانی پینے کی اجازت نہیں۔

فَلَيْسَ مِنِّي کے الفاظ بہت سی احادیث مبارکہ میں بھی ملتے ہیں۔ جہاں

کہیں حضور علیہ السلام نے امت کو کسی کام سے روکا، فرمایا جو ایسا کریگا۔ فَلَيْسَ مِنِّيْ وہ مجھ سے نہیں ہے۔ جیسے فرمایا مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِيْ فَلَيْسَ مِنِّيْ جو میری سنت سے اعراض کرے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یا جیسے فرمایا مَنْ لَّمْ يُكْرِمْ ضَيْفَنَا فَلَيْسَ مِنَّا۔ جو ہمارے مہمان کی عزت نہیں کرتا وہ ہم سے نہیں یعنی وہ ہماری جماعت سے خارج ہے ایک اور مقام پر فرمایا مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السِّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا جو ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا جو کسی مسلمان کو دھوکا دے، وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اکثریت کی ناکامی

غرض! طالوت کے پانی سے منع کرنے کے باوجود فَشَرِبُوْا مِنْهُ إِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ اسی ہزار کے لشکر میں سے اکثریت نے خوب پیٹ بھر کر پانی پیا، سوائے ایک قلیل تعداد کے جنہوں نے امیر لشکر کے حکم پر صبر و استقامت کا دامن تھامے رکھا۔ کہتے ہیں کہ اس قلیل تعداد میں سے بعض نے تو بالکل نہ پیا اور بعض نے چلو بھر پانی لے لیا جس کی اجازت تھی۔ حدیث شریف میں ان کی تعداد ۳۱۳ آتی ہے۔ اور یہ تعداد بدر کے جانثاروں کی تعداد کے برابر ہے۔ بعض روایتوں میں ۳۱۹ کا ذکر بھی آتا ہے۔ اسی ہزار کے لشکر میں صرف یہ قلیل تعداد آزمائش میں پوری اتری، باقی کی غالب اکثریت پانی پینے کے بعد سستی اور کاہلی کا شکار ہو گئی۔ حتیٰ کہ وہ آگے بڑھنے سے بھی معذور ہو گئے۔ اور نہر کے اس پار ہی رک گئے۔

تین گروہ

فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جب طالوت اور اس کے ہمراہی اہل ایمان نہر سے پار پہنچے تو سامنے جالوت کا لشکر موجود تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے مفسرین کرام کے حوالہ سے مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس وقت طالوت کا لشکر تین گروہوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ پہلا گروہ ناقص الایمان تھا، جنہوں نے حکم کے خلاف سیر ہو کر پانی پیا اور لڑائی کے قابل نہ رہے دوسرا گروہ کامل الایمان لوگوں کا تھا جنہوں نے چلو بھر پانی پیا۔ مگر یہ گروہ اپنی قلت تعداد کی بناء پر دشمن کے لشکر سے خوفزدہ تھا۔ کہ اتنے بڑے لشکر سے مقابلہ کیسے

ہوگا۔ کہتے ہیں۔ کہ تیسرا گروہ اکمل الایمان تھے۔ جن کا ایمان اتنا پختہ تھا۔ کہ قلت و کثرت ان کے نزدیک بے معنی چیز تھی۔

غرض ! پہلا گروہ تو تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے تو جنگ کی طرف منہ کرنے کی ہمت ہی نہیں کی۔ دوسرا گروہ کہنے لگا قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ اپنی قلت تعداد کی وجہ سے ہم جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ اگر لڑائی شروع کی۔ تو ہم مغلوب ہو جائیں گے۔ اسی ہزار کا لشکر لے کر نکلے تھے مگر اب صرف ۳۱۳ باقی ہیں۔ یہ دشمن سے کیسے نبرد آزما ہوں گے رہا تیسرا گروہ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُوا اللَّهِ اور یہ ایسا گروہ تھا۔ جسے یقین کامل تھا۔ کہ انہیں ایک دن اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔ اگر بزدلی سے مر جائیں گے تو بھی اللہ کے ہاں پیشی ہے۔ اور اسکی رضا کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے تو پھر بھی جانا تو وہیں ہے۔ وہ ہماری نیتوں سے واقف ہے۔ لہذا انہوں نے لشکریوں کو تسلی دی کہ دیکھو تعداد کی قلت اور کثرت کیوجہ سے جنگ نہیں لڑی جاتی بلکہ اس کے لیے بامقصد اور پُرخلوص جذبے کی ضرورت ہے۔ تم اپنی ہمت کے مطابق پوری قوت کے ساتھ ٹکرا جاؤ اور نتیجہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ کیا تم تاریخی واقعات کو بھول چکے ہو۔ کَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ کتنے ہی قلیل تعداد کے لشکر تھے غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ جو اللہ کے حکم سے کثیر التعداد لشکروں پر غالب آئے۔

تاریخی واقعات

صحابہ کرامؓ کے ایسے کتنے ہی واقعات تاریخ میں ملتے ہیں جن میں صحابہؓ کی قلیل تعداد دشمن کی کثیر تعداد پر غالب آئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک جنگ کا جو نقشہ سامنے آتا ہے۔ اس میں دشمن کا لشکر ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ جب کہ مسلمانوں کی تعداد صرف ساٹھ تھی۔ اس واقعہ کے متعلق کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

غَزَا سِتُّوْنَ وَهُمْ سِتُّوْنَ أَلْفاً
مَعَ هٰذَا تَوَلَّوا مُدْبِرِيْنَ

اس معرکہ میں ایک ایک مومن ایک ایک ہزار کافر کے مقابلہ میں تھا مگر اللہ تعالے نے مسلمانوں کو فتح عطا کی۔ صرف دس مسلمان شہید ہوئے جب کہ کفار کے دس ہزار جہنم واصل ہوئے۔

بخاری شریف میں حضرت زبیرؓ کا واقعہ آتا ہے آپ نے ررنا کھ کفار کے لشکر میں تن تنہا کود گئے اور تلوار چلاتے ہوئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے گئے۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے پھر واپس آئے اور بیشمار کفار کو ہلاک کیا۔ جنگ احد کے متعلق طبری کی روایت ہے۔ کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ایک بڑا سخت مرحلہ پیش آگیا۔ ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ اور آپ اکیلے رہ گئے۔ اس نازک موقع پر انصار مدینہ میں سے حضرت ابو دجانہؓ نے حضور علیہ السلام کی حفاظت کے لیے اپنی پشت کو بطور ڈھال استعمال کیا۔ اور تلوار اور نیزے کے چوراسی زخم کھائے۔ مگر آپ کی حفاظت کی۔ ایک اور موقع پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار میان سے نکالی اور فرمایا، کون ہے جو اس کا حق ادا کرے گا۔ سب خاموش تھے کہ ابو دجانہؓ بول اُٹھے۔ حضور! یہ مجھے عطا فرمائیں، میں اس کا حق ادا کروں گا۔ اور پھر آپ نے واقعی اس کا حق ادا کر دکھایا۔

جب مسیلمہ کذاب نے دعویٰ نبوت کیا۔ تو اس کے پاس چالیس ہزار کا لشکر تھا جو قلعہ بند ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کا ایک قلیل لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں سرکوبی کیلیے پہنچا، مگر مضبوط قلعہ سر نہیں ہوتا تھا۔ آخر حضرت ابو دجانہؓ نے ایک تدبیر بتائی۔ کہنے لگے، مجھے ٹوکری میں ڈال کر رات کی تاریکی میں کسی طرح قلعے کے اندر اتار دو، باقی کام میں خود کر لوں گا۔ ایسا ہی کیا گیا۔ حضرت ابو دجانہؓ نے ٹوکری سے نکل کر بے دریغ تلوار چلانا شروع کر دی۔ دشمن میں افراتفری پیدا ہو گئی، وہ سمجھے کہ مسلمانوں کا لشکر قلعے میں داخل ہو گیا ہے۔ لہٰذا انہوں نے خود ہی قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ اس معرکے میں مسیلمہ کے ۲۸ ہزار آدمی مارے گئے۔ کئی ہزار کفار صرف ابو دجانہؓ کی تلوار کا شکار ہوئے۔

غرض ! اُن اَھل الایمان لوگوں نے باقی سپاہیوں کو حوصلہ دیا۔ کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ ہماری قلیل تعداد کو کثیر تعداد پہ غالب کریگا۔ لہٰذا تم صبر و استقامت کے ساتھ جنگ میں کود جاؤ۔ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر ایسی ضروری چیز ہے۔ جس کے بغیر نہ نماز ادا ہوسکتی ہے نہ روزہ کی بھوک پیاس برداشت ہوتی ہے۔ نہ جہاد میں حصہ لیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی تبلیغ کا کام کماحقہٗ ادا ہوسکتا ہے۔ صبر ملّت ابراہیمی کا ایک اہم اصول ہے۔ اس کو اپنانے والے ہمیشہ کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔

درس یکصد ہفت (۱۰۷) — آیت ۲۵۰ تا ۲۵۱

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَ
ثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوهُم
بِإِذْنِ اللّٰهِ قف وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ
الْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ط وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لا لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ
عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾

ترجمہ :- اور جب جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے ہوئے تو کہنے لگے اے ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ۔ اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما ﴿۲۵۰﴾ پس اہل ایمان نے اُن (کافروں) کو شکست دی اللہ کے حکم سے اور قتل کیا حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو اور اللہ تعالیٰ نے داؤد کو سلطنت اور حکمت دی۔ اور جو چاہا سکھایا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض کے ساتھ دفع نہ کرتا، تو زمین خراب ہو جاتی۔ مگر اللہ تعالیٰ جہان والوں پر فضل کرنے والا ہے ﴿۲۵۱﴾

ربط آیات

گذشتہ درس میں طالوت کے لشکر کی روانگی کا تذکرہ تھا کہ جب وہ دشمن کی طرف چلے تو راستے میں طالوت نے اپنی فوج کو آزمایا۔ کہ یہ لوگ کس حد تک تکالیف برداشت کر سکتے ہیں۔ راستے میں نہر پڑتی ہے۔ اللہ کے حکم سے طالوت نے اپنے سپاہیوں کو اس نہر سے پانی پینے سے منع کر دیا۔ اور پیاس برداشت کرنے کی تلقین کی۔ ہاں البتہ سخت شدت کی صورت میں چلو بھر پانی پی لینے کی اجازت دی مگر لشکر کی اکثریت پیاس برداشت نہ کر سکی اور انہوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا جس کی وجہ سے ان میں سستی اور کاہلی پیدا ہو گئی اور وہ آگے سفر کرنے کے قابل نہ رہے

لہذا تھک ہار کر وہیں بیٹھ گئے۔ طالوت صرف ۳۱۲ سپاہیوں کا لشکر لے کر نہر سے پار ہوئے۔ اب فوج تین گروہوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ جنہوں نے خوب پانی پیا وہ ناقص الایمان لوگ تھے اور وہ اُدھر ہی رہ گئے۔ جو نہر سے پار گئے۔ ان میں بھی دو طرح کے آدمی تھے جنہوں نے چلو بھر پانی پیا تھا وہ کامل الایمان تھے مگر ۳۱۲ کے مقابلے میں دشمن کی کثیر تعداد دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم جالوت کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ تیسرا گروہ جس نے بالکل پانی نہیں پیا تھا وہ اکمل الایمان لوگ تھے جنہوں نے دوسروں کو تسلی دی کہ تعداد کی کثرت اور قلت سے مت گھبراؤ۔ دنیا میں کتنے ہی واقعات پیش آ چکے ہیں۔ جن میں قلت نے اکثریت کو شکست دی۔ فتح و شکست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لہذا تم صبر استقامت پر قائم رہ کر جہاد کرو اللہ تعالیٰ فتح دیگا۔ اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ صابروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب آیات زیر درس میں دونوں لشکروں میں جنگ کا حال بیان ہو رہا ہے۔ کہ کسطرح بنی اسرائیل نے میدان جنگ میں پہنچکر اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی دعا کی اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح سے نوازا۔

میدان جنگ میں دُعا

گذشتہ درس میں اسلامی سپاہ کے اوصاف بیان ہو چکے ہیں۔ کہ اُن کے اندر حرص کا مادہ نہیں ہونا چاہیئے۔ نیز یہ لوگ صبر و استقلال کے پیکر اور اچھے اخلاق کے حامل ہونے چاہئیں۔ اور ان کا آخری وصف یہ ہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور کامیابی کے لیے دست بدعا رہتے ہیں۔ آج کے درس میں سب سے پہلے اسی دُعا کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ جب بنی اسرائیل جالوت کے لشکر کے سامنے ہوئے قَالُوا تو انہوں نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے اور کہنے لگے، رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر ڈال دے وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

دُعا ایک ایسی اعلیٰ و ارفع چیز ہے جس کے ذریعے انسان اپنے رب کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے۔ خاص طور پر میدانِ جنگ میں غیر مسلم قوتیں اپنی طاقت کے غرور

میں شراب پی کر اور گاتے گاتے ہوئے جنگ کا ابتدا کرتے ہیں۔ جب کہ ایمان والے جنگ شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حضور گڑگڑا کر فتح کی دعائیں کرتے ہیں کیونکہ دعا ایسی چیز ہے جو ساری عبادت کا نچوڑ ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ یعنی دُعا عبادت کا مغز ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے تمام غزوات میں میدانِ جنگ میں پہنچ کر دعائیں کی ہیں۔ جنگِ بدر کے متعلق بخاری، مسلم، نسائی اور حدیث کی دوسری کتب میں مذکور ہے۔ کہ حضور علیہ السلام نے کس قدر گڑگڑا کر دُعا فرمائی۔ آپ رات بھر عاجزی وانکساری کے ساتھ دُعا مانگتے رہے۔ حتیٰ کہ آپ کی چادر مبارک بھی کندھے سے سرک گئی۔ آپ فرما رہے تھے اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِکْ ھٰذِہِ الْعِصَابَۃَ لَا تُعْبَدْ فِی الْاَرْضِ اے مولا کریم! میں نے یہ مٹھی بھر اہل ایمان تیرے نام پر جنگ میں دھکیل دیے۔ اگر یہ ہلاک ہو گئے۔ تو روئے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ آپ نے ایمان والوں کو حکم دیا کہ وہ جب بھی دشمن کے مقابلے میں نکلیں تو اس طرح دُعا کریں اَللّٰھُمَّ مُنْزِلَ الْکِتٰبِ وَمُجْرِیَ السَّحَابِ اے کتاب نازل کرنے والے اور بادلوں کو چلانے والے اللہ! اَھْزِمِ الْاَحْزَابَ لشکر کفار کو شکست دے اور ہم کو فتح سے سرفراز فرما۔

حضور نے ایسی جامع دعا سکھائی۔ کہ پہلے لفظ میں ہی اسکی حقیقت کو واضح فرما دیا۔ اَللّٰھُمَّ مُنْزِلَ الْکِتٰبِ یعنی اے اللہ! جس نے کتاب نازل فرمائی ہے مقصد یہ ہے۔ کہ ہم یہ جنگ اس لیے کر رہے ہیں۔ کہ اُس پروگرام پر عمل درآمد کر سکیں جو تو نے کتاب اُتار کر ہمیں دیا ہے۔ اس جنگ سے ہماری کوئی ذاتی اغراض وابستہ نہیں ہیں۔ بلکہ تیری کتاب کے احکام لوگوں تک پہنچانے مقصود ہیں۔ اور اس راستے میں جو رکاوٹ آئے اس کو دور کرنا مقصود ہے۔ ہمارا مقصد ہوس ملک گیری نہیں۔ ہم مال غنیمت کے لیے نہیں آئے اور نہ لوگوں کو غلام بنانے کی خاطر آئے ہیں۔ بلکہ ہم نے اعلائے کلمۃ الحق کے لیے اپنی جانوں کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اٰمِنْ رَوْعَاتِنَا وَاسْتُرْ عَوْرَاتِنَا اے اللہ! ہمارے خطروں کو ٹال

دے اور ہمارے عیوب پہ پردہ ڈال۔ غرضیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ کے لیے خود دعائیں کی ہیں۔ اور صحابہؓ کو سکھائی ہیں۔ حضرت علیؓ نے دیکھا کہ بدر کے میدان میں سجدے کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہایت عاجزی کے ساتھ یَاحَیُّ یَا قَیُّوْمُ کہہ رہے ہیں۔ اے اللہ! ہم تیری رضا کی خاطر آئے ہیں۔ ہماری زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں ہے۔ کافروں کے مقابلے میں ہمارا غلبہ تیری مشیت پہ منحصر ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت علیؓ چلے گئے۔ میدان جنگ کا چکر لگا کر واپس آئے۔ تو دیکھا۔ کہ حضور علیہ السلام اسی طرح سجدہ میں پڑے ہوئے ہیں اور اللہ کے حضور دُعائیں کر رہے ہیں۔

جالوت سے مقابلہ

الغرض! طالوت مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ میدان میں اترا۔ اللہ کے نبی سموئیلؑ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جالوت کا کثیر لشکر دیکھ کر دل دہل گیا۔ اُس وقت گڑگڑا کر دُعا کی رَبَّنَا اے ہمارے پروردگار! دُعا کے ابتدا میں خدا تعالےٰ کی صفت ربوبیت کو مقدم رکھا۔ کیونکہ پالنا اور درجہ کمال تک پہنچانا صفت ربوبیت کا کرشمہ ہے۔ رَبَّنَا کے لفظ کے ساتھ اپنی عاجزی اور انکساری کا اظہار کیا۔ جیسا کہ اکثر دعاؤں کی ابتدا میں یہ لفظ آتا ہے۔ جیسے رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا یا جیسے رَبَّنَا ھَبْ لَنَا، یا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وغیرہ، یہاں پہ یہ دُعا کی رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا اے اللہ! ہم پہ صبر ڈال دے یا صبر انڈیل دے۔ ہم میں صبر کا مادہ پیدا ہو جائے وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا اور ہمیں ثابت قدم رکھ۔ ہمارے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائے۔ اور ہم دلجمعی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ ایسا موقع تھا کہ دشمن کی قوت کو دیکھ کر اہل ایمان کو سخت پریشانی لاحق تھی حتیٰ کہ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ اُن کے دل اچھل کر گلے تک آ گئے تھے، کا منظر تھا تو اس حالت میں وہ رب العزت سے دُعا کر رہے تھے۔ کہ مولا کریم! ہمیں دشمن کے مقابلے میں صبر کی دولت عطا کر اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ اور پھر آخری بات یہ کہ وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما اور ان پر غلبہ عطا فرما۔ کفار کفر کے پروگرام کے داعی ہیں۔ اور اہل ایمان حق کا کلمہ بلند کرنا چاہتے ہیں، نیکی، اطاعت اور تیری رضا کا پروگرام

نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ان کی نصرت فرما۔

جب جالوت نے دیکھا۔ کہ مقابلے میں معمولی سا لشکر ہے تو کہنے لگا میری ساری فوج کو لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لشکر کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ اس زمانے میں جنگ کا طریقہ یہ تھا، کہ ابتدا میں دونوں طرفوں سے ایک ایک آدمی نکلتا اور مقابلہ کرتا۔ پھر دونوں اطراف سے ایک ایک اور سپاہی نکلتا ہے۔ حتیٰ کہ عام جنگ شروع ہو جاتی۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں جنگ بدر میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جب کفار مکہ نے مقابلے کے لیے مسلمانوں کو للکارا تو مسلمانوں کی طرف سے انصار مدینہ میں سے کچھ جانباز نکلے مگر کفار نے کہا۔ کہ یہ تو مدینہ کے کاشتکار ہیں۔ ہمارے مقابلے کے لیے ہمارے ہم پلہ لوگ آئیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت حمزہؓ اور حضرت عبیدہؓ کو میدان میں آنے کا حکم دیا۔ چنانچہ ادھر سے حضرت عبیدہ رضؓ شہید ہوئے اور کفار کے تین جوان جہنم واصل ہوئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا کارنامہ

اہل اسلام کے لشکر میں حضرت داؤد علیہ السلام کے والد الیاع یا یسی بن عوبید بھی شامل تھے۔ ان کے چھ بیٹے تھے جن میں داؤد علیہ السلام سب سے کم سن تھے کہتے ہیں کہ آپ کم سنی کے باعث جنگ میں شرکت کے لیے نہیں آئے تھے۔ بلکہ اپنے بڑے بھائیوں کو سامان پہنچانے کے لیے وہاں پہنچے تھے، ادھر اللہ کے نبی کو حکم ہوا۔ کہ جالوت کے مقابلے کے لیے داؤد کو نکالو۔ آپ نے اُن کے باپ کو مع چھ بیٹوں کے طلب کیا۔ اور بمطابق حکم الٰہی داؤد علیہ السلام سے پوچھا کیا وہ جالوت کا مقابلہ کریں گے انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ چنانچہ اللہ کے نبی نے آپ کو جالوت کے مقابلہ کے لیے نکالا۔ آپ نے تلوار، تیر یا نیزہ استعمال کرنے کی بجائے دشمن پر پتھر پھینکنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ آپ کم سن تھے مگر بڑے ذہین اور پتھر چلانے میں بڑے ماہر تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے تھیلے سے ایک پتھر نکالا اُسے فلاخن میں ڈالا اور زور سے گھما کر جالوت کو دے مارا۔ جالوت سر تا پا لوہے میں غرق تھا، صرف اُس کا ماتھا کھلا تھا۔ پتھر وہیں پر جا کر لگا۔ اور سر کے پار نکل

گیا۔ آپ نے دوسرا اور تیسرا پتھر چلایا تو جالوت زمین پر گر گیا۔ آخر داؤد علیہ السلام نے اس کے اوپر پہنچ کر اس کا کام تمام کر دیا۔ جب لشکر نے دیکھا کہ ان کا سردار مارا گیا ہے۔ تو اس کی جگہ دوسرے نے لینے کی کوشش کی مگر وہ بھی کیفر کردار کو پہنچا۔ آخر دشمن کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ اہلِ ایمان نے ان کا تعاقب کر کے انہیں مکمل شکست سے ہمکنار کر دیا۔ اسی واقعہ کے متعلق یہاں ارشاد ہوا ہے۔ فَهَزَمُوهُمْ بِإِذْنِ اللَّهِ اسرائیلیوں نے فلسطینیوں کو اللہ کے حکم سے شکست دیدی وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ اور حضرت داؤد علیہ السلام نے سالار لشکر جالوت کو قتل کر دیا۔

مناقب حضرت داؤد علیہ السلام

تفسیری روایات میں آتا ہے۔ کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام اپنے باپ اور بھائیوں کے پاس میدانِ جنگ کی طرف آ رہے تھے۔ تو راستے میں درختوں کے پتوں سے آواز آئی، اے داؤد! تمہارے قریب یہ پتھر ہیں انہیں اٹھا لو، تمہارے کام آئینگے چنانچہ آپ نے ان میں سے تین پتھر اٹھا کر تھیلے میں ڈال لیے اور پھر یہی پتھر آپ نے جالوت پر چلائے جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ آپ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ آپ اتنے بہادر تھے۔ کہ دشمن کے مقابلے میں کبھی پشت نہیں پھیری۔ آپ بچپن میں بکریاں چراتے تھے۔ جب کبھی کوئی بھیڑیا یا شیر بکریوں پر حملہ کرتا تو آپ اس کے جبڑے پھاڑ دیتے۔ اللہ نے اتنی طاقت عطا کی تھی۔ اگرچہ قد میں آپ چھوٹے تھے۔ مگر جسم میں قوت بلا کی تھی۔ آپ نہایت خوش الحان تھے۔ جب آپ تلاوت کرتے تو پرندے بھی آپ کی آواز سننے کے لیے ٹھہر جاتے، اُن کا لحن داؤدی آج بھی محاورتاً استعمال ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے لوہے کو آپ کے ہاتھ پر موم کر دیا تھا۔ جدھر چاہتے موڑ لیتے۔ چنانچہ آپ لوہے کی زرہیں بھی بناتے تھے۔ عبادت کا یہ حال تھا۔ کہ آپ کو اعبد البشر کہا گیا ہے۔ یعنی آپ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ عبادت گزار تھے۔

وَآتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ اور اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو حکومت بھی عطا کی۔ تفسیری روایات میں آتا ہے۔ کہ طالوت کے بعد آپ ان کے جانشین ہوئے

آپ کو خلیفۃ اللہ کہا جاتا ہے۔ "یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ" اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ مقرر کیا۔ بائیبل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ کی بہادری سے متاثر ہو کر طالوت نے اپنی بیٹی کا نکاح حضرت داؤد سے کر دیا تھا۔

حکومت کے علاوہ فرمایا وَالْحِکْمَۃَ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو حکمت بھی عطا کی۔ عام طور پر حکمت سے مراد غایت درجہ کی عقلمندی اور معاملہ فہمی ہوتا ہے تاہم بعض فرماتے ہیں۔ کہ یہاں پر حکمت سے مراد نبوت ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے بھی سرفراز فرمایا۔ اس سے پہلے اسرائیلیوں میں حکومت اور نبوت دو مختلف شخصیتوں کے پاس ہوتی تھی جیسے نبی سموئیل علیہ السلام تھے اور حکومت طالوت کے پاس تھی مگر یہ دونوں چیزیں داؤد علیہ السلام پر آکر اکھٹی ہو گئیں۔ طالوت کے بعد آپ کو خلافت ملی اور حضرت سموئیل کے بعد آپ نبوت پر بھی سرفراز ہوئے۔

ایک اور خصوصیت جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی، وہ ہے وَعَلَّمَہٗ مِمَّا یَشَآءُ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا حضرت داؤد علیہ السلام کو سکھا دیا۔ داؤد علیہ السلام کا ذکر قرآن پاک میں سولہ[۱۶] مقامات پر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مختلف فنون اور علوم سے نوازا۔ پرندوں کی بولیوں کے علم کا تذکرہ تو سورۃ نمل میں موجود ہے "عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّیْرِ" ہمیں اڑتے جانوروں کی بولی سکھائی گئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے جملہ علم کے متعلق فرمایا "وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا" ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو علم عطا کیا۔ آپ کے بعد آپ کے بیٹے سلیمان علیہ السلام بھی نبی ہوئے اور خلیفہ ہوئے۔ یہ دور بنی اسرائیل کا سنہری دور تھا۔ خلافت اور نبوت ایک جگہ پر جمع تھیں امن اور خوشحالی کا زمانہ تھا۔ اچھائی کو غلبہ حاصل تھا۔ اور برائی دم توڑ چکی تھی۔

فلسفہ جہاد

آیت کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا فلسفہ بھی بیان فرما دیا۔ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعے نہ ہٹاتے تو زمین میں فساد برپا رہتا۔ یعنی جب کسی گروہ نے خدا کی زمین پر بدامنی پھیلانے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے

مقابلے میں دوسری جماعت کو بھیج کر مفسدین کا خاتمہ کر دیا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ جب قوم عمالقہ کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو اللہ تعالیٰ نے طالوت کے ذریعے ان کا قلع قمع کر دیا۔ اسی لیے دشمن کے ساتھ جہاد کا حکم ہے "حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ" یہاں تک کہ فتنہ و فساد بالکل ختم ہو جائے کفر و شرک کی ناپاکی دور ہو جائے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہونے لگے اور اسلام کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

یہی وہ مشن ہے جسے جمال الدین افغانیؒ لے کر اٹھے۔ اور اپنی پوری زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی۔ آپ نے مسلمانوں کو ذہن نشین کرایا کہ عیسائی اور یہودی انگریز اسلام کی دشمن طاقتیں ہیں۔ وہ اسلام کی شمع کو بجھانا چاہتی ہیں۔ لہٰذا اہل اسلام کو اس بات کا نوٹس لینا چاہیئے۔ اور اپنا دفاع کرنا چاہیئے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ پہلے مرحلے میں دفاعی جہاد (DEFENSIVE) فرض ہے۔ اگر جہاد سے روگردانی کی گئی تو درندہ صفت طاقتیں دنیا میں چھائی رہینگی۔ اور کسی کی جان، عزت و آبرو محفوظ نہ ہوگی۔ بزدلی دکھانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

بہرحال فرمایا۔ کہ یہ سنت اللہ ہے۔ کہ وہ کسی برائی کو ختم کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر وسائل پیدا کر دیتا ہے۔ دنیا میں کتنے فرعون، ہامان اور نمرود پیدا ہوئے مگر آخر ختم ہو گئے۔ کبھی جرمنی کا طوطی بولتا تھا۔ اب امریکہ اور روس سپر پاورز ہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنے پروگرام کے مطابق ادل بدل کرتا رہتا ہے۔ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ اللہ تعالیٰ اہل جہان پر فضل کرنیوالا ہے۔ جب وہ کسی ظالم کی بیخ کنی کرتا ہے۔ تو یہ صحیح معنوں میں دنیا والوں پر اس کا فضل ہوتا ہے انہیں ظلم سے نجات مل جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ انبیاء علیہم السلام کے مشن میں یہ بات بھی داخل ہے۔ کہ دنیا میں ظلم کو ختم کریں۔ حق و انصاف کا نظام قائم کریں عقیدہ توحید کو پختہ کریں۔ چنانچہ ظلم کو مٹانے کے لیے جہاد کی ضرورت ہے۔ جہاد کی مشروعیت اگلی آیات اور کئی دوسرے مقامات پر آئیگی۔

درسِ یکصد ہشت (۱۰۸) — آیت ۲۵۲ تا ۲۵۳

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾
تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ
كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ
الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ
الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ
اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ
۳۳ ع ۵ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

ترجمہ: یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں، جو ہم آپ کو حق کے ساتھ سناتے ہیں۔ اور بیشک آپ اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں ﴿۲۵۲﴾ یہ سب رسول ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔ بعض اُن میں سے وہ ہیں کہ جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کلام کیا اور بعض کے درجات بہت بلند کیے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام) کو واضح نشانیاں دیں۔ اور ہم نے اس کی روح القدس کے ساتھ تائید کی۔ اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ان نبیوں کے بعد آئے۔ بعد اس کے کہ اُن کے پاس واضح باتیں آچکی تھیں۔ لیکن انہوں نے اختلاف کیا۔ اور بعض ان میں سے ایمان لائے۔ اور ان میں سے بعض نے کفر اختیار کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا، تو وہ نہ لڑتے لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے ﴿۲۵۳﴾

ربطِ آیات

بنی اسرائیل کے واقعات بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بطور خاص اور پھر تمام انبیاء کی نبوت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں جہاد کی حکمت بیان فرمائی تھی۔ اور

معترضین کے اعتراض کا رد تھا۔ اور واضح کیا تھا کہ اگر جہاد فرض نہ کیا جاتا تو مفسدین زمین میں فساد برپا کر کے اس کو خراب کر دیتے۔ مگر اللہ تعالےٰ نے اپنی رحمت فرمائی۔ اور بدامنی کے خاتمے کے لیے جہاد کا حکم دیا۔ تمام انبیاء اپنے اپنے دور میں جہاد کرتے آئے ہیں۔ اسی ضمن میں طالوت کا ذکر کیا۔ جو کہ سموئیل نبی کے زمانے میں ہوا ہے۔ آپ کے نام پر بائیبل میں دو صحیفے بھی موجود ہیں۔ آپ خود بھی جہاد میں شریک ہوئے۔

بعثتِ انبیا کا مقصد

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد لوگوں کو ایمان اور توحید کا راستہ بتانا، اور ان کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کرنا ہے اس کے علاوہ رسومات باطلہ کو مٹانا اور رفع تظالم بین الناس یعنی لوگوں کے درمیان ظلم و زیادتی کو فرو کرنا ہے۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے جہاد لازمی ہے۔ اس کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ معاشرہ میں ظلم و زیادتی برپا کرنے والے لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے جسم میں پھوڑا ہوتا ہے۔ جب تک اس پھوڑے کو کاٹ نہیں دیا جاتا، جسم تندرست نہیں ہو سکتا، اسی طرح جب تک فسادی لوگوں کو جڑ سے نہیں اکھاڑ دیا جاتا، معاشرے میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی آپریشن کا نام جہاد ہے

تصدیقِ رسالت

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی نبوت و رسالت کی تصدیق فرمائی ہے۔ بنی اسرائیل کا واقعہ بیان کیا۔ کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں موت سے ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر اللہ نے انہیں راستے میں ہی موت سے ہم کنار کر دیا۔ پھر اللہ کے نبی نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندگی دی۔ اُن کی اپنی فرمائش پر اللہ تعالےٰ نے طالوت کو اُن کا امیر مقرر کیا۔ اور اس کی سرکردگی میں جہاد کا حکم دیا۔ پھر راستے میں لشکر کی آزمائش ہوئی۔ اور اُن میں سے بہت تھوڑے اس آزمائش میں پورے اُترے اکثریت نے بے صبری کا اظہار کیا۔ اور جہاد سے محروم رہے۔ جانثاروں کی ایک قلیل تعداد کو اللہ نے فتح سے ہم کنار کیا۔ اس موقع پر اللہ نے دُعا کا فلسفہ سکھایا۔ اور پھر میدان جنگ میں دشمن کا سردار حضرت داؤد علیہ السلام کے پتھر سے ہلاک ہوا۔ طالوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو خلیفہ بنایا۔ یہ تمام واقعات ہیں، جنہیں

اللہ تعالیٰ نے اپنی نشانیاں قرار دیا۔ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ "یہ اللہ کی نشانیاں ہیں۔ اللہ کی آیتیں ہیں جنہیں ہم آپ کو حق کے ساتھ سناتے ہیں۔ وحی الٰہی کے ذریعے بتلاتے ہیں۔ وگرنہ آپ نے کوئی تاریخ نہیں پڑھی اور نہ کسی تاریخ میں ایسے واقعات موجود تھے۔ یہ آپ کی نبوت ورسالت کی نشانی ہے۔ کہ آپ کے علم میں ایسے ایسے واقعات آ رہے ہیں۔ اور پھر یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے کہ وہ جونسے واقعات چاہے آپ کو بتلا دے۔ اور جو نہ چاہے، نہ بتلائے، دوسری جگہ فرمایا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ "اور اگر اللہ چاہتا تو یہ واقعات آپ کو نہ سناتا یہ چیزیں آپ کی نبوت کی دلیل ہیں فرمایا" فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ "میں نے تم میں عمر کا ایک حصہ گزارا ہے اس سے پہلے میں نے کبھی ایسی باتیں نہیں بتائی تھیں۔ جب اللہ کی وحی نازل ہونے لگی۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے واقعات کا انکشاف ہوا۔ تو میں نے یہ آیتیں تمہیں بھی پڑھ کر سنا دی ہیں۔ پہلی دلیل ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ نے مجھے نبوت ورسالت کے مرتبہ پر فائز کیا ہے۔ فرمایا وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ○ یقیناً آپ اللہ کے نبیوں میں سے ہیں۔ بلکہ سلسلہ انبیاء کی آخری کڑی ہیں آپ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ آپ خاتم النبیین ہیں۔

انبیاء کی ایک دوسرے پر فضیلت

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں کا اجمالاً ذکر فرمایا ہے۔ تِلْكَ الرُّسُلُ یہ اللہ کے ایسے رسول ہیں۔ اس سے پہلے بہت سے انبیاء کا ذکر آ چکا ہے۔ گذشتہ آیات میں حضرت سموئیل علیہ السلام کا ذکر آیا ہے۔ "قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ" اُن کے نبی نے اُن سے کہا۔ اگرچہ یہاں پر نبی کا نام نہیں لیا گیا۔ تاہم اس سے مراد سموئیل نبی ہیں۔ داؤد علیہ السلام کا ذکر آ چکا ہے۔ اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بیان آ چکا۔ فرمایا یہ تمام اللہ کے رسول ہیں۔ ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کسی ایک نبی کا انکار ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے انکار کے برابر ہے۔ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ جہاں تک منصب نبوت و رسالت کا تعلق ہے ہم اُن میں کوئی فرق نہیں رکھتے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ

بندے ہیں اور معصوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں گناہ سے پاک رکھتا ہے۔ البتہ باعتبار فضائل اور خصوصیات فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔

یہاں پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ لَا تُفَضِّلُوا بَيْنَ الْاَنْبِيَاءِ یعنی نبیوں کے درمیان تفاضل نہ کرو۔ یا مجھے بھی باقی نبیوں کے درمیان فضیلت نہ دو۔ یا یہ کہ یونس ابن متی کے مقابلہ میں کسی کو فضیلت نہ دو۔ اس کے متعلق محدثین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ اس معاملہ میں اپنی عقل سے بات نہ کرو۔ کہ بعض کو بعض پر فضیلت دینے لگو اور بعض کی توہین کرنے لگو، ایسا نہ کرو، کیونکہ ایسا کرنے سے کفر لازم آجاتا ہے۔ فضیلت کا جو ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے۔ اُسی پر کاربند رہو۔ چنانچہ اس امر میں اجماع اور اتفاق ہے کہ حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء پر فضیلت دی ہے۔ آپ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام کے درجات ہیں خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امامت عامہ کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے "اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا" یعنی میں تم کو تمام لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔

اس مقام پر فضائل انبیاء کے متعلق ارشاد ہے مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ ان میں سے بعض ایسے ہیں۔ جن کے ساتھ اللہ نے کلام کیا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔ "وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا" اور کوہ طور پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے بالمشافہ کلام فرمایا۔ معراج کے واقعہ میں آتا ہے۔ کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا۔ کہ اوّل النبیین یعنی سب سے پہلے نبی کون ہیں۔ آپ نے فرمایا آدم علیہ السلام۔ پھر عرض کیا ہے۔ حضور! کیا وہ نبی ہیں۔ فرمایا، ہاں وہ نَبِيٌّ مُّكَلَّمٌ اللہ تعالیٰ نے ان سے بالمشافہ کلام کیا۔ آپ سب سے پہلے نبی ہیں اور سب سے آخری نبی حضور خاتم النبیین علیہ التحیۃ والسلام ہیں۔ فرمایا وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ اور بعض کے درجات بلند کیے۔ اس آیت میں بعض کے درجات سے مراد حضور علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے درجات سب نبیوں سے

زیادہ بلند کیئے ہیں۔ اللہ نے آپ کو مقام محمود پر سرفراز فرمایا ہے۔ جس کا مظاہرہ قیامت کے روز ہوگا۔ آپ کو شفاعت کبریٰ عطا ہوئی ہے۔ آپ کو وسیلہ عطا ہوا ہے آپکی امت کو اکثریت حاصل ہے آپکی اُمت تمام امتوں سے افضل ہے آپ کو کتاب بھی سب سے افضل دی گئی ہے اور آپکو اللہ نے بیشمار معجزات عطا کیئے ہیں غرضیکہ آپکے درجات بہت بلند فرمائے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ بعض کے درجات بلند کیے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات

فرمایا وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو واضح نشانیاں عطا کیں۔ قرآن میں اسکی وضاحت موجود ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں مردوں کو زندہ کرنا۔ کوڑھیوں کو تندرست کرنا، اللہ کے حکم سے غیب کی خبریں دینا۔ گھر سے کھا کر آنے والے کو بتا دینا کہ کیا کھایا ہے وغیرہ شامل ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جہاں بھی قرآن میں ذکر آتا ہے۔ عیسیٰ ابن مریم کے نام سے آتا ہے۔ جس سے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ آپ کا باپ کوئی نہ تھا۔ اللہ نے انہیں بغیر باپ کے پیدا کیا۔ قیامت کے روز بھی آپ کو یَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ کے لقب سے پکارا جائے گا۔ اور پھر پوچھا جائے گا۔ کہ کیا آپ نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے معبود بنالو۔ آپ جواب دیں گے۔ سُبْحٰنَكَ اے اللہ تو پاک ہے۔ میں ایسی بات کس طرح کرسکتا ہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ میں نے تو انہیں وہی کچھ کہا جس کا تو نے مجھے حکم دیا۔ گویا عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا ردّ کیا گیا ہے۔ اور ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی سرزنش کی گئی ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ سرسیدؒ اور پرویز جیسے لوگ بھی موجود ہیں۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ بھی ثابت کرتے ہیں۔ یہ بات قرآن پاک کی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے۔ اور الحادانہ عقیدہ ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں دیں۔

روح القدس سے تائید

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہی فرمایا وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ ہم نے روح القدس کے ساتھ اُن کی تائید فرمائی۔ روح القدس کا معنیٰ عام طور پر جبرائیل علیہ السلام کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جدھر بھی جاتے تھے

حضرت جبرائیل علیہ السلام کی تائید اُن کے شاملِ حال ہوتی تھی۔ حضور علیہ السلام نے یہی بات حضرت حسّانؓ کو کہی تھی۔ فرمایا۔ اے حسّان! تم مشرکین کو اشعار کے ذریعے جواب دو۔ تمہیں جبرئیل امین کی تائید حاصل ہو گی۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے نزدیک رُوح القدس کا معنی کچھ اور ہے وہ فرماتے ہیں۔ کہ کائنات کی ہر چیز مشیت الٰہی کی تابع ہے۔ اور ملاء اعلیٰ کی تمام بزرگ ہستیوں کی توجہ جس طرح ایک طرف لگی رہتی ہے۔ اس کو تائید روح القدس کہا جاتا ہے۔ اور پھر حظیرۃ القدس جیسے پاک مقام سے جو شعائیں اِن بزرگ ہستیوں پر پڑتی ہیں۔ یہ بھی روح القدس کی تائید ہوتی ہے۔

انسان اپنے ارادے کا خود ذمہ دار ہے

فرمایا وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا۔ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ تو نبیوں کے بعد آنے والے لوگ واضح نشانیاں آجانے کے بعد نہ لڑتے۔ یعنی اگر مشیتِ الٰہی چاہتی۔ تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتی اور وہ ایک دوسرے سے لڑائی جھگڑا نہ کرتے۔ دوسری جگہ فرمایا وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ۔ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا۔ وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ مگر لوگ اختلاف کرتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کسی کام پر مجبور نہیں کیا۔ بلکہ خیر و شر کے دونوں راستے دکھا کر انسان کو اپنے ارادے کے مطابق عمل کرنے کا اختیار دے دیا۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کے ارادے کو سلب نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو انسان کی فضیلت باقی نہ رہتی اس کا امتحان نہ ہو پاتا اور وہ بے جان چیزوں کی طرح مجبورِ محض قرار پاتا۔ چنانچہ اُن لوگوں نے نیکی کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا انہوں نے اختلاف کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ کہ ان میں کچھ لوگ ایمان لے آئے۔ اور کچھ دوسروں نے انکار کر دیا۔ اور کفر کا راستہ اختیار کیا۔ جب اختلاف پیدا ہو گا۔ تو پھر لڑائی بھی ہو گی۔ اہل ایمان اور کفار ایک جگہ اکٹھے نہیں

ہو سکتے۔ ان میں سے ہر گروہ اپنا پروگرام نافذ کرنا چاہے گا۔ لہٰذا ان کے درمیان ضرور ٹکر ہو گی اور یہی جہاد ہے۔ جو اہل اسلام پر فرض کیا گیا ہے۔ کیونکہ جہاد کے بغیر فتنہ و فساد کا قلع قمع نہیں ہو سکتا پچھلے درس میں آ چکا ہے۔ کہ جہاد کے ذریعے شر و فساد کو مٹانا مقصود ہے اسی چیز کے متعلق فرمایا۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ بعض کو بعض کے ذریعے نہ مٹاتا تو زمین میں فساد برپا رہتا۔ لہٰذا جہاد لازم قرار دیا۔ اور بتا دیا کہ جہاد کو ترک کر دو گے تو یسلط اللّٰہُ ذلّۃً علیکم (ابوداؤد) اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دے گا اور یہ ذلت ختم نہ ہو گی۔ حتّٰی ترجعوا الی دینکم جب تک تم اپنے دین کی طرف پلٹ کر نہ جاؤ گے۔

فرمایا وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوا اگر اللہ چاہتا تو یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے سب ایک ہی راستے پر ہوتے اور ان میں کوئی اختلاف رونما نہ ہوتا۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ اللہ نے انسان کو عقل اور قوت عطا کی ہے۔ اُسے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اور پھر اسے اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے ارادے سے جونسا راستہ چاہے اختیار کرے۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا یہ اپنے ارادے کا خود ذمہ دار ہے جو راستہ اختیار کرے گا اس کے مطابق سزا و جزا کا مستحق ہو گا۔ اگر صحیح راستہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے گا۔ اور اللہ ایمان پر راضی ہوتا ہے کفر پر راضی نہیں ہوتا۔ اہل ایمان کو نجات دے گا اور ان کو فلاح حاصل ہو گی۔

فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ وہ چاہتا تو یہ لوگ اختلاف کا شکار نہ ہوتے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ مگر اللہ تعالیٰ وہ کچھ کرتا ہے جو اس کا اپنا ارادہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ انسان کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ اور اپنے بندوں کو آزما کر اس کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔ اس کا منشا یہ ہے۔ کہ لوگ ایمان کا راستہ اختیار کریں۔ اور جو لوگ کفر کے راستے پر چل نکلیں ان کے شر و فساد کو مٹانے کے لیے ایمان والے جہاد کریں تاکہ اسلام کو غلبہ حاصل ہو۔ اور اللہ کا دین اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِىَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۵۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اس میں سے خرچ کرو جو ہم نے تم کو رزق دیا ہے اس سے پیشتر کہ وہ دن آجائے۔ جس میں خرید و فروخت نہیں ہوگی۔ اور نہ دوستی ہوگی۔ اور نہ سفارش ہوگی اور جو لوگ کفر کرنے والے ہیں وہی بڑے ظالم ہیں۔

ربط آیات

گزشتہ درس میں نبوت اور رسالت کا ذکر تھا۔ اس سے پہلے جہاد کا تذکرہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کی حکمت بھی واضح فرمائی۔ اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کا بیان ہے اس کا تعلق اس آیت کے ساتھ ہے۔ جس میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ کہ ان کا ایک گروہ موت کے ڈر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر اللہ نے انہیں راستہ میں موت دے دی پھر اپنے خاص فضل سے انہیں دوبارہ زندگی عطا کی۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا "قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ" اللہ کے راستے میں دشمنانِ خدا اور دشمنانِ دین سے ٹکرا جاؤ۔ اور پھر درمیان میں یہ بھی فرمایا "مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا" کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے۔ اور اللہ اسے بڑھا چڑھا کر عطا کریگا۔ یہ مال خرچ کرنے کی ترغیب ہوگئی۔

جان و مال کی قربانی

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں۔ کہ سورۃ بقرہ سب سے لمبی سورۃ ہے۔ اور اس میں مختلف الانواع مسائل ذکر ہوئے ہیں۔ اس سورۃ میں عبادات معجزات اور معاملات کا بیان ہے۔ خصوصاً معاملات کی بہت سی تفصیلات ہیں۔ عائلی قوانین یعنی نکاح و طلاق کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ احکام کی تعمیل نفس پر شاق گزرتی ہے۔ انسان کا نفس اور اس کی سوچ بوجھل ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جان مال کی

قربانی پیش کرتے وقت بڑی دشواری پیش آتی ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس قربانی کے لیے خاص تاکید فرمائی ہے۔ اور اکثر لوگ جان و مال کی وجہ سے ہی معصیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ محبت کسی نفس کی ہو یا مال کی، یہ انسان کو قانون کی خلاف ورزی پر ابھارتی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر جان کو کھپانے کا حکم دیا ہے۔ اور دوسری جگہ مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو جان کو لگا دینا نسبتاً آسان سمجھتے ہیں۔ مگر مال کے خرچ کرنے میں بخیل واقع ہوتے ہیں یہ ایک روحانی بیماری ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اَیُّ دَآءٍ اَدْوَءُ مِنَ الْبُخْلِ بخل سے بڑی بیماری کون سی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔ ؎

گر جان طلبی مضائقہ نیست
گر زر طلبی سخن دریں جاست

یعنی اگر جان کا مطالبہ ہے۔ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، جان حاضر ہے۔ اور اگر مال چاہتے ہو۔ تو یہ بات نہیں بن سکے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کے متعلق خصوصی احکام دیے ہیں۔ مال پر بہت سی عبادات موقوف ہیں۔ اگر مال خرچ نہیں کیا جائے گا۔ تو جہاد بھی نہیں ہو سکتا۔ زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، حج نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اگلے رکوع میں انفاق فی سبیل اللہ کا تذکرہ بالتفصیل آئے گا۔

انفاق فی سبیل اللہ

چنانچہ یہاں پر بھی ارشاد ہوتا ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ خرچ کرو اس میں سے جو ہم نے تم کو عطا کیا ہے۔ مراد اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔ یہاں پر رَزَقْنٰکُمْ خصوصاً توجہ طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے۔ یہ ہمارا عطا کردہ ہے۔ ہم نے ہی اسباب و وسائل مہیا کیے تو تمہارے پاس مال آیا وگرنہ انسان اگر اپنی ذاتی کاوش کی بنا پر کچھ حاصل کرنا چاہتا، تو اُسے کچھ نہ ملتا۔ یہ مال ہم نے ہی تمہیں دیا ہے۔ جس سے خرچ کرنے کا حکم دیے رہے ہیں۔ لہٰذا اس میں کسی قسم کی حیل و حجت نہیں ہونی چاہیئے۔ اسی موضوع کو سورۃ نور میں بھی بیان فرمایا۔ جہاں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے

وہاں فرمایا وَاٰتُوْھُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰہِ الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اُن کو دو، تاکہ وہ مکاتبت کر کے اپنی جان چھڑا سکیں۔ یہاں پہ یہ نظریہ واضح کر دیا گیا کہ ایماندار اپنے مال کو اپنی ذاتی چیز نہیں سمجھتا بلکہ اللہ کا انعام سمجھتا ہے۔ جو اس نے مہربانی فرما کر عطا کیا۔ کبھی کوئی اسباب پیدا کر دیئے۔ کہیں مزدوری مل گئی۔ نوکری میسّر آگئی، کاروبار میں برکت ڈال دی۔ وراثت سے حصہ مل گیا، کوئی تحفہ مل گیا۔ یہ سب مالک الملک کے پیدا کردہ اسباب ہیں۔ اس لیے انسان کو جو بھی مال میسّر آتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی جانب سے ملتا ہے لہٰذا اس کے راستے میں خیرات، صدقات، زکوٰۃ وغیرہ پہ خرچ کرنا کوئی اپنا ذاتی کارنامہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ اس توفیق پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اُس کا دیا ہوا مال اُس کے حکم کے مطابق خرچ ہوا۔

اب سوال یہ ہے۔ کہ جو مال خرچ کیا جا رہا ہے وہ آیا کہاں سے ہے۔ کمائی حلال کی ہے یا حرام کی۔ ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے کی بھی سخت وعید ہے۔ وَلَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ وَاَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ طلب کرنے میں اچھا طریقہ اختیار کرو۔ حرام کی کمائی سے اجتناب کرو۔ حرام کی کمائی کھانے والے کی نہ عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ صدقہ کسی کام آتا ہے۔ اور یہی چیز مرنے کے بعد جہنم کا توشہ بنے گی۔

خرچ میں اعتدال کی راہ

اب خرچ کرنے کے متعلق بھی اصول و قواعد ہیں۔ ہر شخص کو من مانی کرنے کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ فرمایا وَلَا تُسْرِفُوْا اسراف نہ کرو وَلَا تُبَذِّرْ فضول خرچی سے بچ جاؤ۔ اللہ کے دیئے ہوئے انعام کو صحیح طریقے سے خرچ کرو۔ ہمارے دیئے ہوئے مال میں سے اپنی جائز ضرورتیں بھی پوری کرو۔ اور پھر حقوق و فرائض اور واجبات کا خیال بھی رکھو۔ جہاد کے لیے خرچ کرو۔ اقامت دین اور تبلیغ دین پہ خرچ کرو۔ غرباء و مساکین کی اعانت کرو۔ مقروض کا قرضہ ادا کر دو۔ تاہم اپنی ذاتی ضرورتیں مقدم ہیں۔ اُن کو پہلے پورا کرو۔ یہ بات مستحسن نہیں۔ کہ آدمی سارا مال خرچ کر دے اور خود محتاج ہو کر بیٹھ جائے۔ اس کے لیے تو صدیق اکبرؓ جیسا صبر درکار ہے

ایک صحابی کو کچھ سونا حاصل ہوا، لا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیا کہ اے اللہ کے رسول میں یہ مال صدقہ کرتا ہوں، آپ نے فرمایا ایسا مت کرو پہلے اپنی ضروریات پورا کرو۔ اس کے بعد صدقہ کرو۔ خود محتاج ہو کر بیٹھ جاؤ گے تو پھر شکوہ کرو گے۔ خاص طور پر جب کہ برداشت کا مادہ بھی نہ ہو۔ لہٰذا ہر کام میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ پورے کا پورا مال خرچ نہ کر دو۔ بلکہ اپنی جائز ضروریات کیلئے بھی رکھ لو۔

روز قیامت خرید و فروخت نہ ہو گی

فرمایا اللہ کے رستے میں خرچ کرو مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ پیشتر اس کے کہ وہ دن آجائے جب کوئی خرید و فروخت نہیں ہو سکیگی۔ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اس دن اگر کوئی شخص کوئی قیمتی سے قیمتی چیز دیکر بھی ایمان یا کوئی نیکی خریدنا چاہے گا تو یہ ممکن نہ ہو گا۔ اول تو کسی کے پاس دنیا کا مال و دولت ہو گا ہی نہیں جس سے کوئی چیز خریدی جا سکے۔ دوسرے وہاں کوئی بازار نہیں لگے گا جہاں خرید و فروخت ہو سکے۔ یہ دنیا عمل کی دنیا ہے۔ یہاں پر انسان اچھے اعمال کے ذریعے، عبادات کے ذریعے، مال خرچ کر کے آخرت کا توشہ خرید سکتا ہے۔ مگر وہاں قیامت کے دن ایسی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔ کہ کوئی شخص اپنے اعمال کی کمی کو خرید و فروخت کے ذریعے پورا کر سکے۔ وہاں خرید و فروخت قطعاً ناممکن ہو گی۔ وہاں نیکی حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں ہو گی۔ اس دار العمل میں انسان وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ کے مصداق آخرت کے لیے ذخیرہ بنا سکتا ہے۔ وہ تو دار الجزا ہو گا۔ قیامت کے دن تو کردہ اعمال کا بدلہ ملیگا۔ وہاں نئے سرے سے عمل کرنے کی اجازت نہیں ہو گی۔ نہ وہاں خرید و فروخت ہو گی۔

دوستی کام نہ آئے گی

فرمایا وَلَا خُلَّةٌ وہاں پر عام دوستی بھی کام نہیں آئے گی۔ جس طرح اس دنیا میں اقربا پروری اور تعلقات کام آتے ہیں وہاں پر ایسا نہیں ہو گا۔ وہاں تو لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہونگے اَلْاَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ مگر دوستی وہ کام آئیگی جس کی بنیاد نیکی اور تقویٰ پر ہو گی اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ اہل ایمان کی دوستی وہاں پر قائم رہے گی۔ مگر فاسق و فاجر اور لہو و لعب والی دوستیاں ختم ہو جائیں گی۔ ہر ایسا دوست

دوسرے سے نفرت کریگا۔

عام سفارش نہیں ہوگی

فرمایا جس طرح خرید و فروخت اور عام دوستی نہیں ہوگی۔ قیامت کے دن وَلَا شَفَاعَةٌ عام سفارش بھی نہیں چلے گی۔ اس دُنیا کا دستور ہے کہ بڑے لوگ سفارش کے ذریعے بڑے بڑے مجرموں کو بھی چھڑا لیتے ہیں۔ مگر قیامت کے دن ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں سفارش ہوگی مگر اس شخص کے لیے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت مرحمت فرمائیں گے آگے آیۃ الکرسی آرہی ہے۔ جسے اعظم آیۃ فی القرآن کہا گیا ہے۔ اس میں مسئلہ سفارش کو واضح کیا گیا ہے۔ مشرک لوگ جو سمجھتے ہیں۔ کہ ہمارے معبود ہماری سفارش کر کے ہمیں چھڑا لیں گے اور ہمیں درجات بھی دلائیں گے۔ اس قسم کی سفارش قطعاً باطل ہے۔ کیونکہ وہاں پر شفاعت مشروط ہوگی۔ دوسرے مقام پر آتا ہے۔ "لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا" اس دن تو کوئی کلام بھی نہ کر سکے گا سوائے اس کے کہ جسے اللہ تعالیٰ اجازت دیں گے۔ اور وہ بھی اس شرط پر کہ اُس کی بات ٹھیک ہو۔ غلط بات کرنے کی تو اجازت ہی نہیں ہوگی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا میری شفاعت اُس شخص تک پہنچے گی لِمَنْ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک میں ملوث نہ ہوا ہو۔ مشرک یا دہریہ یا کسی اور بدعقیدہ کے لیے سفارش کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

اسی لیے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو، جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لو۔ آج یہ موقع ہے۔ یہ عمل کی دنیا ہے۔ اس میں جو کچھ کر سکتے ہو کر لو۔ کل کو دار الجزا میں جا کر یہ موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہاں تو بدلہ دیا جائے گا۔ اُس روز نہ کوئی شخص نیکی خرید سکے گا۔ نہ کوئی دوستی کام آئیگی اور نہ کوئی سفارش کام آئے گی یہ سب کچھ بتلا دیا۔ مزید شرائط اگلی آیت میں آئینگی۔

کفار ہی ظالم ہیں

فرمایا وَالْكٰفِرُونَ هُمُ الظّٰلِمُونَ۔ کفر کرنے والے ہی سب سے بڑے ظالم ہیں انہوں نے اللہ کے احکام، اسکی کتاب اور اس کے انبیاء کا انکار کیا۔ یہ انسان کے بدبخت ہونے کی واضح نشانی ہے۔ مشرک کے بارے میں واضح حکم ہے اِنَّ الشِّرْكَ

لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اس سے بچ جاؤ۔ اگر شرک جیسے ظلم سے باز نہیں آؤ گے تو پھر اللہ نے جہاد کا حکم بھی دیا ہے اس کے ذریعے کفر و شرک کی بیخ کنی کی جائے گی۔ اور اس کام کے لیے جہاں جان کی قربانی دینی پڑتی ہے وہاں مال بھی لگانا پڑتا ہے۔ اور یہی انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ آگے دو رکوع کے دوران انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر مزید تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

درس یکصد دہ (۱۱۰)

آیت ۲۵۵

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ ؕ
لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ
اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ ۚ وَ لَا
یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ ۚ وَ لَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَ هُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں مگر وہی ہے۔ وہ زندہ ہے۔ قائم رکھنے والا ہے۔ نہیں پکڑتی اس کو اونگھ اور نہ نیند، اُسی کا ہے، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے۔ جو اس کے سامنے سفارش کر سکے بغیر اس کی اجازت کے، جانتا ہے جو کچھ اُن کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور نہیں احاطہ کرتے کسی چیز کا اُس کے علم میں سے مگر جتنا وہ چاہے وسیع ہے اس کی کرسی آسمانوں اور زمین سے اور نہیں تھکاتی اس کو حفاظت ان کی اور وہ بلند تر اور عظمت والا ہے ﴿۲۵۵﴾

ربطِ آیات

پہلے دو رکوع میں اللہ تعالیٰ نے نظامِ خلافت کا ذکر فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کا واقعہ بیان کر کے جہاد کا مسئلہ سمجھایا ہے۔ اور پھر نظامِ اسلام کی نشان دہی کی ہے۔ کہ امیر کیسا ہونا چاہیئے۔ سپاہی اور لشکر کی صفات کیا ہوں جہاد ہی کے سلسلہ میں جان و مال کی قربانی کا خصوصی ذکر فرمایا ہے۔ پھر اُس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ کہ جہاد کرنا نبیوں کا کام نہیں۔ فلسفہ جہاد بیان کیا ہے۔ کہ اگر جہاد کا حکم نہ ہو، تو فسادی لوگ زمین میں فساد برپا کریں گے۔ لہٰذا سوسائٹی کو درندہ صفت لوگوں سے محفوظ کرنے کے لیے جہاد ضروری ہے۔

اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور توحید کا مسئلہ بیان کیا ہے۔ اور اس کا ربط پہلی آیتوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ہے جہاد کے سلسلہ میں جان و مال کھپانے کا ذکر ہو چکا ہے۔ مگر ان دو چیزوں کی قربانی اُسی وقت قبول ہو گی جب ایمان صحیح ہو اور انسان کا عقیدہ توحید پر ہو۔ اعمال کا دار و مدار عقیدہ پر ہے۔ اگر عقیدہ درست نہیں ہو گا، تو کوئی عمل قابل قبول نہیں۔ عقیدہ توحید کے بغیر پہاڑ جتنے اعمال بھی بے سود محض ہوں گے۔ اُن کی حیثیت راکھ اور غبار سے زیادہ نہیں ہو گی۔ لہٰذا مسئلہ توحید کو مسئلہ جہاد کے ساتھ یہ ربط ہے۔

پیشتر ازیں بنی اسرائیل کے واقعہ کے ضمن میں نظام خلافت بھی سمجھا دیا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اقتدار کا حقیقی مالک خلیفہ نہیں ہوتا جو اپنی من مانی کرتا پھرے، بلکہ اقتدار کا مالک اللہ ہوتا ہے۔ خلیفہ تو اللہ کا بندہ ہوتا ہے جو نظامِ خلافت کو چلاتا ہے۔ اس سورۃ کے آخری حصہ میں بھی یہی بات سمجھائی گئی ہے۔ کہ خلیفہ اقتدار کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ وہ تو امین ہوتا ہے۔ اور دین اور شریعت کو جاری کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک جماعت ہوتی ہے۔ جو نفاذِ شریعت میں اس کی مدد کرتی ہے۔ اُسے مجلس شوریٰ کہہ لیں یا کچھ اور۔ وہ بہر حال وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے تابع ہوتی ہے۔ تو گویا نظام خلافت کا صحیح طور پر قائم کرنا بھی عقیدہ توحید پر موقوف ہے لہٰذا اس لحاظ سے بھی آیت زیرِ درس کو سابقہ آیات کے ساتھ ربط ہے۔

آیت الکرسی کی فضیلت

یہ آیت ایک لمبی آیت ہے اور آیت الکرسی کہلاتی ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالےٰ کی کرسی کا ذکر ہے۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ حدیث شریف میں اس آیت پاک کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ حضرت ابی ابن کعبؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن سے پوچھا کہ قرآن پاک میں سب سے بڑی آیت کون سی ہے۔ تو حضرت ابی ابن کعبؓ نے نہایت ادب سے عرض کیا اللہ و رسولہ اعلم یعنی اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر حضور علیہ السلام نے پوچھا۔ اچھا یہ بتاؤ، قرآن پاک میں بہتر آیت کون سی ہے۔ انہوں نے پھر عرض کیا۔ اللہ اور اس کا

رسُول ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر نبی کریم نے حضرت ابیؓ کے سینہ پر ہاتھ مار کر وہی سوال کیا۔ تو انہوں نے جواب دیا حضور! اعظم آیۃ فی القرآن اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یعنی قرآن پاک کی سب سے بڑی آیت یہ آیت الکرسی ـــــ ہے تاہم اس آیت کا یہ اعزاز الفاظ یا کلمات کے اعتبار سے نہیں بلکہ فضیلت کے اعتبار سے اسے سب سے بڑی آیت ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے۔ جو شخص فرض نماز کے بعد اخلاص کے ساتھ آیت الکرسی پڑھیگا، وہ اگلی نماز تک اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوگا۔ حضور نبی کریم رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔ جو کوئی فرض نماز کے بعد اخلاص کے ساتھ آیت الکرسی پڑھیگا۔ موت کے سوا اس کے دخول جنت میں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔ یعنی جنت میں داخلے کے لیے صرف موت ہی درمیان میں رکاوٹ ہے۔ جونہی اس کی موت واقع ہوگی، وہ شخص جنت میں داخل ہوجائیگا۔ گویا یہ آیت کریمہ تلاوت کرنے والا جنت کا مستحق ہوگیا۔

ایک اور حدیث میں اس آیت اور سورہ مومن کی چند ابتدائی آیات کی مزید فضیلت آئی ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی آیتیں ہیں مگر فضیلت کے لحاظ سے ان کو کمال درجہ حاصل ہے۔ "حٰمٓ ۝ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝ غَافِرِ الذَّنْۢبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ۙ ذِی الطَّوْلِ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ؕ اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ" حضور نے فرمایا جو شخص آیت الکرسی اور سورۃ مومن یا غافر کی یہ تین آیتیں رات کے وقت تلاوت کریگا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے صبح تک اس کی حفاظت ہوتی رہیگی۔ اور جو کوئی صبح کے وقت یہ آیتیں تلاوت کریگا، وہ رات تک اللہ کی امان میں ہوگا۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے۔ کہ حضور نبی علیہ السلام نے فرمایا کہ سورۃ بقرہ میں ایک ایسی آیت ہے۔ جو فضیلت کے لحاظ سے سب سے بڑی آیت ہے جس گھر میں یہ آیت پڑھی جاتی ہے۔ وہاں شیطان نہیں ٹھہر سکتا۔ بلکہ وہاں سے

بھاگ جاتا ہے۔ اس آیت کا اتنا عظیم اثر ہے۔ صحیحین میں صدقہ الفطر کے اناج کی حفاظت والی حدیث آتی ہے۔ کہ اُس اناج کی حفاظت حضرت ابوہریرہؓ کے ذمہ تھی۔ آپ رات کو پہرہ پر تھے۔ کہ شیطان نے اس اناج میں سے کچھ لینا چاہا۔ مگر صحابی رسول نے اسے پکڑ لیا۔ مگر اس کے منت خوشامد کرنے پر چھوڑ دیا۔ پھر دوسری رات آئی۔ تو یہی واقعہ پیش آیا آپ نے شیطان کو دبوچ لیا۔ اُس نے وعدہ کیا۔ کہ اس دفعہ چھوڑ دیا جائے پھر نہیں آئیگا آپ نے پھر اس کو چھوڑ دیا۔ مگر وہ کم بخت تیسری رات پھر آگیا۔ حضرت ابُوہریرہؓ نے پھر اُس کو پکڑ لیا۔ اور فرمایا میں آج تجھے ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ بلکہ حضور کے پاس لے چلوں گا۔ شیطان نے پھر منت سماجت کی اور کہا کہ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں ایک ایسی بات بتاتا ہوں جس کا تمہیں بہت فائدہ ہوگا۔ پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگا۔ کہ اگر تم آیت الکرسی پڑھ لیا کرو، تو شیطان تمہارے قریب نہیں آسکے گا۔ تمہاری حفاظت ہوگی۔ حضرت ابُوہریرہؓ نے تیسری رات بھی شیطان کو چھوڑ دیا۔ اور صبح کو سارا معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا۔ اے ابُوہریرہؓ! شیطان ہے تو جھوٹا، مگر بات اس نے ٹھیک کہی ہے۔ اگر کوئی شخص ایمان کے ساتھ اس آیت کی تلاوت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا محافظ و نگہبان ہوگا۔

الغرض! اس آیت پاک کو بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان کو اسے ورد زبان بنا لینا چاہیئے۔ ہر نماز کے بعد اس کی تلاوت کی جائے۔ صبح و شام کو اسے پڑھا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ ہر مصیبت سے مامون فرمائیگا اور آخرت میں جنت میں داخلے کی ضمانت ہوگی۔ تاہم مفسرین اور محدثین کرام فرماتے ہیں۔ کہ ہر دُعا اور ذکر کی قبولیت کے لیے بعض شرائط ہیں۔ ہر دُعا اور ہر ذکر محض پڑھ لینے سے درجہ قبولیّت تک نہیں پہنچ جاتی۔ قبولیت دُعا کے لیے ضروری ہے۔ کہ دُعا گو فرائض سے خالی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر نماز، روزہ فرض کیا ہے۔ تو ان کا تارک نہ ہو۔ بلکہ انہیں پورا کرتا ہو۔ اور پھر اس کا رزق بھی حلال ہو۔ اس کا کھانا، پینا اور پہننا حرام سے پاک ہو۔ اور یہ بھی قبولیت کی شرط ہے کہ انسان حتی الامکان امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر پر عمل کرتا ہو۔ ترمذی شریف کی حدیث ـــــ میں آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُقْبَلُ دُعَآءً عَنْ قَلْبٍ غَافِلٍ۔ اللہ تعالیٰ غافل دل کی دُعا قبول نہیں کرتا۔ جب کوئی دُعا کرے۔ تو نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ دُعا کرنی چاہیئے۔ خدا کی بارگاہ میں ایسی دُعا قبول نہیں۔ جو دل کی گہرائیوں سے نکلنے کی بجائے محض زبان کی حرکت تک محدود ہو۔

یہ آیت پاک پچاس الفاظ پہ مشتمل ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے گیارہ دلائل موجود ہیں۔ یہ آیت گویا مجموعہ دلائل ہے۔ اس آیت کی فضیلت ان معانی میں ہے۔ کہ کسی چیز کا علم یا اس کا ذکر اس کے معلوم یا مذکور کے تابع ہوتا ہے۔ یعنی جو درجہ اور فضیلت کسی مذکور معلوم کو حاصل ہوگا، وہی اس کے علم یا ذکر کو حاصل ہوگا۔ اب قرآن پاک میں تو تمام چیزوں کا ذکر ہے۔ کہیں خود قرآن پاک کے متعلق آتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور یہ ہدایت ہے۔ کہیں اللہ کے نبیوں کا ذکر ہے۔ کہیں بڑے آدمیوں کا ذکر ہے۔ کہیں فرعون و قارون کا واقعہ بیان ہوا ہے کہیں صالحین کا ذکر ہے۔ کہیں احکام ہیں کہیں نواہی ہیں۔ انسان کی تہذیب کا بیان ہے۔ اس کے نفس اور روح کی کیفیت کا ذکر ہے۔ اسی طرح قرآن میں خود خدا تعالےٰ کی ذات اور اسکی توحید کا ذکر ہے، کہیں اس کی صفات کمال اور کہیں صفات جلال و جمال کا ذکر ہے۔ تو یہ جو اللہ کا ذاتی ذکر ہے۔ یہ تمام اذکار سے افضل ہے۔ لہٰذا جن آیات اور جملوں میں ان چیزوں کا ذکر ہوگا، وہ آیات باقی آیات سے افضل ہوں گی۔ اس لحاظ سے چونکہ آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسکی صفات کا ذکر ہے۔ لہٰذا یہ آیت پاک بھی باقی آیات سے افضل ہے۔

توحید باری تعالےٰ

اِس عظیم آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اللہ وہی ہے۔ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ کوئی چھوٹا نہ بڑا، نہ عارضی نہ مستقل، نہ باپ نہ بیٹا کوئی بھی معبود نہیں معبود وہی اور صرف وہی ہے۔ جو کوئی اللہ کے علاوہ کسی اور کو بھی معبود مانتا ہے، تو اس کا عقیدہ قطعاً باطل ہے۔ وہ تو ایسی ذات ہے اَلْحَیُّ جو

زندہ ہے۔ اس کی حیات ابدی اور سرمدی ہے۔ اس کے علاوہ جتنی بھی زندگیاں ہیں، سب جزوی اور عارضی ہیں۔ کسی کو دائمی حیات حاصل نہیں۔ زندگی کا سرچشمہ خدا کی ذات وحدہٗ لاشریک ہے۔ یہ اُس کی مشیت ہے۔ جس کو جتنی زندگی چاہے دے دے اور جب چاہے واپس لے لے۔

وہ اَلْقَیُّوْمُ بھی ہے۔ یعنی خود قائم ہے۔ اور کائنات کی باقی چیزوں کو قائم رکھنے والا ہے وہ عالم بالا سے لے کر ذرہ ذرہ تک کا محافظ اور نگران ہے۔ وہی پیدا کرنیوالا ہے وہی جتنا عرصہ چاہے قائم رکھنے والا ہے اور پھر وہی فنا کرنے والا بھی ہے لوگوں نے کئی قسم کے باطل عقیدے بنا رکھے ہیں۔ عیسائیوں نے باپ، بیٹا اور روح القدس کا نظریہ قائم کیا ہوا ہے۔ تین خدا ہیں۔ کیا ایک خُدا کافی نہیں ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق پیدا کرنے والا برہما ہے۔ تھامنے والا وشنو ہے اور فنا کرنے والا شواجی مہاراج ہے۔ اُن کے بھی تین خدا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے باطل نظریات کی تردید فرمائی۔ اور یہ بات واضح کر دی کہ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وہی ہے۔ پیدا بھی وہی کرتا ہے۔ پرورش بھی وہی کرتا ہے قائم بھی وہی رکھتا ہے اور پھر فنا بھی وہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے عقیدے ہیں سب باطل ہیں۔

اور پھر اُس مالک الملک کی ہر چیز پہ نگرانی اور حفاظت بھی اس طور ہے۔ کہ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ نہ اُسے اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اونگھ اور نیند تو غفلت کی علامت ہے اور اُس کو آتی ہے جس کو تھکاوٹ ہو جائے اور آرام کی ضرورت ہو۔ مگر اللہ کی ذات تو پاک ہے نہ وہ تھکتا ہے اور نہ اُسے آرام کی ضرورت ہے۔ یہ تو ناتواں انسان ہے جو کچھ مشقت کرنے کے بعد تھک جاتا ہے۔ اور پھر اُسے آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اللہ تعالےٰ نے اس کے لیے نیند جیسی نعمت تیار کی ہے۔

اللہ نے اس کو سُباتاً کہا ہے یعنی نیند انسان کے

لیے آرام کا ذریعہ ہے تاکہ جب محنت کرنے کے بعد تھک ہار جائے تو کچھ دیر آرام کر کے پھر سے تازہ دم ہو جائے۔ اور دوبارہ کام کاج اور عبادت میں مصروف ہو جائے۔ یہ تھکان، کمزوری اور پھر آرام کی ضرورت اللہ تعالیٰ کی شان کے شایان نہیں ہے۔ وہ ان چیزوں سے پاک اور منزہ ہے۔ بلکہ درحقیقت لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ زمین و آسمان کی ہر شے اسی کی پیدا کردہ ہے۔ اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اور اُس کی مطیع ہے، ہر چیز پہ اُسی کا تصرف ہے۔ اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں وہ ذات ہے جو يُصَرِّفُ الْاَمْرَ كَيْفَ يَشَاءُ جس طرح چاہے تصرف کرتا ہے۔ کسی چیز کا گھٹانا، بڑھانا، بلندی، پستی، زندہ کرنا اور مارنا سب اُس کے اختیار میں ہے ہر چیز پہ اُسی کا حکم چلتا ہے۔

مسئلہ شفاعت

فرمایا جب قادرِ مطلق وہ ذات ہے۔ تو مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ کون ہے جو اُس کے سامنے سفارش کرنے کا دم مار سکے بغیر اسکی اجازت کے۔ مشرکوں کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ اُن کے معبود اُن کی سفارش کریں گے، اللہ تعالیٰ خواہ راضی ہو یا ناراض یہ ہماری سفارش کر کے خدا کو ضرور ہی منا لیں گے۔ یہودیوں اور نصرانیوں کا بھی اسی قسم کا عقیدہ ہے۔ حالانکہ جبری اور قہری سفارش کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے پہلی آیت میں آچکا ہے کہ اس دن نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئیگی وَلَا شَفَاعَةٌ اور نہ کوئی سفارش ہوگی۔ ہاں اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ سفارش کرنیکی اجازت ہوگی۔ اشرف المخلوقات میں سب سے افضل انسان حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن میں رب العالمین کے سامنے آؤں گا اور اللہ تعالیٰ کے حضور لمبا سجدہ کروں گا پھر حکم ہوگا یا محمد ارفع راسك، اے محمد! آپ اپنا سر اٹھائیں۔ آپ بات کریں آپ کی بات سُنی جائے گی۔ آپ سفارش کریں، آپ کی سفارش قبول کی جائے گی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کا یہ سجدہ دس برس کے وقفہ کے برابر لمبا ہوگا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ شفاعت کی اجازت دیں گے۔ بغیر اجازت کے کوئی سفارش نہیں ہوگی اور اجازت بھی اس شخص کے

لیے دی جائیگی جس کا عقیدہ توحید پر ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہوگا" وَلَا یَرْضٰی لِعِبَادِہِ الْکُفْرَ" اللہ تعالیٰ کفر والے عقیدہ، شرک والے عقیدہ کو پسند نہیں کرتا۔ وہ کفر کرنے کی توفیق تو دے دیتا ہے۔ کافر کی رسی تو دراز کر دیتا ہے مگر ان سے ناراض ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک" وَالْکٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ" کافر لوگ ہی اصل ظالم ہیں، نیز یہ کہ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ" شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ لہذا قیامت کے دن سفارش دو شرطوں سے مشروط ہوگی۔ اور مستحق سفارش ایسا شخص ہوگا۔ مَنْ لَّا یُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَیْئًا" جو اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا نہ ہو۔ اور پھر یہ کہ بغیر اجازت کے سفارش نہ ہوگی۔ جب اجازت ہوگی تو انبیاء، ملائکہ، اولیاء، شہداء اور مومن سفارش کریں گے صحیحین کی حدیث میں ہے۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بار بار سجدہ ریز ہوں گے۔ اور اللہ تعالیٰ بار بار سفارش کی اجازت دیں گے۔ یہ سفارش مختلف قسم کے لوگوں کے لیے ہوگی۔ ایک دفعہ اجازت ہوگی کہ اس قسم کے لوگوں کے متعلق سفارش کریں۔ آپ سفارش کر کے اُن لوگوں کو دوزخ سے نکال لیں گے۔ پھر سجدہ کریں گے پھر اجازت ہوگی، اب ایسے لوگوں کی سفارش کریں۔ آپ اُن لوگوں کو بھی دوزخ سے نجات دلوائیں گے اور اس طرح آپ بار بار سجدہ کریں گے اور اللہ بار بار سفارش کی اجازت دیں گے۔ دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حضور علیہ السلام کی شفاعت نصیب فرمائے۔

علمِ غیب خاصہ خداوندی ہے

جس طرح اللہ تعالیٰ مختار مطلق اور قادر مطلق ہے اور جس طرح وہ الٰہ برحق ہے اسی طرح وہ علیم کُل بھی ہے۔ چنانچہ یہ اس کی صفت خاصہ ہے۔ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وہ ماضی کو بھی جانتا ہے اور مستقبل سے بھی واقف ہے۔ اس دُنیا کے تمام امور کا بھی مکمل طور پر عالم ہے اور آخرت کے جہان یعنی برزخ اور قیامت کے حال کے ذرہ ذرہ سے بھی واقف ہے۔ یہ ماضی حال، مستقبل وغیرہ انسانوں کی نسبت سے ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو کوئی چیز غائب نہیں وَمَا یَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ تیرے رب سے کوئی ذرہ برابر چیز بھی غائب نہیں۔ وہ ہر شے کو جانتا ہے۔ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ

عِلمِہٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ؂ مخلوق میں سے خواہ انسان، جن یا فرشتے یا کوئی اور مخلوق ہو کوئی بھی خدا تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہاں جس قدر اللہ تعالیٰ چاہے، وہ کسی کو اتنا علم عطا کر دیتا ہے۔ خدا کا علم غیر محدود ہے۔ اور غیر متناہی ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں مگر مخلوق کا علم محدود ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق بخاری شریف کی روایت موجود ہے۔ کہ ایک چڑیا نے پانی میں چونچ ماری اور جتنا پانی لے سکتی تھی لے لیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا، اے موسیٰ! تیرا اور میرا علم خدا تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اس چڑیا کی چونچ کی مانند ہے۔ ہم نے تو اللہ تعالیٰ کے علم میں سے اتنا حصہ بھی حاصل نہیں کیا۔ جتنا اس چڑیا نے سمندر سے پانی لیا ہے۔ تم کیسے ہو کہ میں بڑا عالم ہوں۔ بھلا ہمارے علم اور اللہ تعالیٰ کے علم میں کیا نسبت ہے۔ تاہم یہ ایک مثال ہے ورنہ اللہ کا علم اور قدرت تو اس سے بھی زیادہ وسیع ہیں۔ حتیٰ کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اب جو لوگ دوسروں کے متعلق گمان رکھتے ہیں کہ وہ بھی ہر چیز کو جانتے ہیں انکو کیا کہا جائے۔ بعض لوگ اولیاء اللہ اور بعض انبیاء کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ہماری سب باتوں کو جانتے ہیں۔ بھائی! یہ شرکیہ عقیدہ ہے۔ ہر چیز کا جاننے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ ہاں اِلَّا بِمَا شَآءَ؂ جس قدر اللہ تبلا دے، اتنا ہی جانتے ہیں۔ یہ معبود برحق ہی جانتا ہے کہ کسی کو کیا دکھ اور کیا تکلیف ہے۔ دوسرا کوئی نہیں جانتا اور نہ اس کو رفع کرنے پر قادر ہے۔ وہ جب تک چاہتا ہے کسی کو مشکل میں ڈالے رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے۔ مصیبت اور پریشانی کو دور کر دیتا ہے۔ آج کی دنیا میں بیچارے فلسطینی کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ فلپائنی مسلمان کس مشکل میں گرفتار ہیں۔ افغانوں پہ کیا بیت رہی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان کسقدر بے بس ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے جو مسلمانوں کے حالات کو درست فرمائے۔ کون ہے۔ جو اُن کو مشکلات سے نکالے۔ اُن کی کشتی کو گرداب سے نکالنا تو درکنار اللہ کے سوا کون ہے جو اُن کے حال سے بھی واقف ہو۔

تمام انسانی برادری میں سے انبیاء علیہم السلام سب سے زیادہ جاننے والے ہوتے ہیں۔ مگر ان کا علم بھی محدود ہوتا ہے، وہ عالم الغیب نہیں ہوتے۔ عالم الغیب والشہادت صرف ذاتِ خداوندی ہے۔ اُسی کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا اس کے علاوہ کسی اور کا علم ہر شے پر محیط نہیں ہے۔

عرش اور کرسی

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اس کی کرسی آسمان و زمین سے وسیع ہے عرش اور کرسی کا ذکر قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے۔ مگر اس کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ اِن اشیاء کی موجودگی پر ایمان لے آئیں۔ عرش اور کرسی کا حجم کیا ہے۔ ان کی ساخت کیا ہے۔ یہ چیزیں ہمارے احاطہ علم میں نہیں آسکتیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ساتوں زمینیں اور آسمان کرسی کے مقابلے میں ایسے ہیں۔ جیسے کسی بہت بڑے میدان میں کڑا سا ہو۔ اسی طرح عرش کے مقابلے میں کرسی کی ایسی ہی نسبت ہے۔ عرش اتنا بڑا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش کو عرشِ عظیم فرمایا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ کرسی سے مراد علم اور قدرت ہے جو ہر چیز پر وسیع ہے "اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے۔ کس کیفیت کے ساتھ، جیسا اسکی شان کے لائق ہے یہ بات۔ ہمارے فہم و فراست میں نہیں آسکتی۔ اور نہ ہم اپنے ذہن سے اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ بس ان چیزوں پر ایمان لانا ہی کافی ہے۔

وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ان چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ کو تھکا نہیں دیتی۔ انسان تو مسلسل کچھ عرصہ کام کر کے تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر آرام چاہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ تمام کائنات کی مسلسل نگرانی کے باوجود تھکتا نہیں۔ وہ ازل سے لے کر ابد اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے کام میں مصروف ہے۔ نہ وہ تھکتا ہے، نہ اُسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے اور نہ کوئی چیز اس کے احاطہ قدرت سے باہر ہوتی ہے۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ اور وہ باعتبار ذات بہت بلند ہے۔ وہ ہمارے تصور، وہم

اور خیال سے بلند تر ہے۔ اس کے علاوہ وہ اَلْعَظِیْمُ بھی ہے۔ یعنی اس کی صفات بہت عظمت والی ہیں۔ وہ کمال عظمت کا مالک ہے۔ وہ ذات کے لحاظ سے بلند ہے تو صفات کے لحاظ سے عظیم ہے۔

ہر شخص کو چاہیے کہ اس بلند مرتبہ آیت کو وردِ زبان بنائے تاکہ حضور علیہ السلام کے فرمان کے مطابق یہ آیت اس کے لئے بخشش و مغفرت کا ذریعہ بن جائے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ
يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ
الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى
الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾ ع ۳۴

ترجمہ :- دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں تحقیق ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے پس جو شخص طاغوت کے ساتھ کفر کریگا۔ اور اللہ پر ایمان لائے گا۔ پس اس نے مضبوط کڑا پکڑ لیا ہے جس کے لیے ٹوٹنا نہیں اور اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا ہے اور جانتا ہے ﴿۲۵۶﴾ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کا کارساز ہے، جو ایمان لائے، اُن کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے، اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کو اختیار کیا۔ اُن کے دوست اور ساتھی طاغوت ہیں۔ وہ اُن کو روشنیوں سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں وہ اس کے اندر ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۵۷﴾

ربطِ آیات

گذشتہ درس میں آیت الکرسی کا ذکر تھا۔ اور اس کی فضیلت بیان ہوئی تھی۔ یہ آیت فضیلت کے اعتبار سے قرآنِ حکیم میں سب سے بڑی آیت ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق توحید باری تعالیٰ سے ہے۔ حضور علیہ السلام کا وعدہ ہے۔ کہ جو شخص خلوص نیت کے ساتھ آیت الکرسی کی تلاوت کریگا، اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں مقام عطا فرمائیں گے۔ آج کے درس میں اسی موضوع کو آگے چلایا گیا ہے۔ کہ دینِ اسلام کی قبولیت اور پھر اس میں خلوص نیت انسان کا اپنا فعل ہے۔ جس قسم کا عقیدہ اور عمل ہوگا اس کے مطابق

جزا و سزا ہوگی۔ دین میں زبردستی نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کا اپنا انتخاب ہے

دین میں جبر نہیں

فرمایا لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہے۔ کسی کو زبردستی دین میں داخل کرنے کی قطعاً اجازت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ ہدایت گمراہی سے بالکل واضح ہوچکی ہے۔ اب کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا۔ نیکی اور بدی کا امتیاز کھل کر سامنے آگیا ہے لہٰذا جو شخص اپنی مرضی سے اسلام میں داخل ہونا چاہے، بلاجھجک اسلام قبول کرلے۔ اور جس کا دل نہیں مانتا۔ وہ ایمان نہیں لاتا تو بیشک نہ لائے۔ اُسے زبردستی دین میں داخل نہیں کیا جائیگا۔

اس آیت کی تفسیر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں "جبر نیست برائے دین" یعنی دین اسلام میں داخلے کے لیے کسی شخص پر جبر روا نہیں ہے۔ تاہم اسلام میں فی الجملہ جبر موجود ہے۔ اور اس سے مراد وہ تمام احکام ہیں جن کے ذریعے کسی پر سختی کی جاتی ہے۔ مثلاً جہاد کا تعلق جبر سے ہے۔ جبر کے بغیر جہاد نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح حدود کا قیام ہے کوئی مجرم خوشی سے سزا قبول نہیں کرتا، اُسے اس کے کردہ گناہ کی سزا جبراً دینا پڑتی ہے زانی کو سنگسار کیا جاتا ہے، چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ شرابی کو کوڑے مارے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ جبر کی اقسام سے ہیں اور یہ جبر بالکل جائز اور ضروری ہے۔ البتہ کسی غیر مسلم کو طاقت کے ذریعے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ اسلامی تعلیم کے منافی ہے۔ اسی لیے فرمایا لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۚ

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے کا ایک واقعہ ہے۔ ایک عیسائی بڑھیا تھی۔ امیر المؤمنین نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس عورت کو کہو۔ کہ اسلام قبول کرلے جب اس کو یہ پیغام ملا، تو کہنے لگی میری عمر کا بیشتر حصہ عیسائی مذہب پر گزرا ہے عمر کے اس آخری حصہ میں میرا دل نہیں چاہتا۔ کہ اُس مذہب کو چھوڑ دوں جس پر زندگی گزاری ہے۔ مجھے یہ بڑا دشوار نظر آتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اس بڑھیا کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ کیونکہ دین میں جبر نہیں ہے۔

امام ابوبکر جصاصؒ نے "احکام القرآن" اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفا

میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کا وثیق نامی رومی غلام تھا۔ مدت تک آپؐ کی خدمت کرتا رہا۔ اُس نے آخر عمر تک اسلام قبول نہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے غلام کو بلا کر کہا۔ کہ تو بڑا قابل آدمی ہے۔ خاص طور پر حساب کتاب میں بڑا ماہر تھا۔ فرمایا اگر اسلام میں جبر روا ہوتا تو میں تمہیں زبردستی مسلمان بنا لیتا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر تم مسلمان ہو جاتے تو تمہاری قابلیت کی بنا پر کوئی اچھا عہدہ دیتا۔ اب میں یہی کرتا ہوں کہ تجھے آزاد کر دیتا ہوں۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔

تاریخ آل عثمان کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ ترکی کے سلطان سلیم خان کے زمانہ میں یہودی اور عیسائی بڑی سازشیں کرتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین اُن سے بڑے تنگ آئے اور آخر حکم جاری کر دیا۔ کہ جو بھی عیسائی اور یہودی ملے اُسے زبردستی اسلام میں داخل کر لیا جائے۔ جب یہ خبر اُس زمانے کے شیخ الاسلام کو پہنچی۔ تو وہ فوراً سلطان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور فرمایا کہ میں نے سنا ہے تم نے کوئی ایسا حکم جاری کیا ہے سلطان نے اقرار کیا۔ کہ ہاں میں نے ایسا سرکلر جاری کیا ہے۔ کہ تمام عیسائی اور یہودیوں کو زبردستی مسلمان بنا لیا جائے۔ ان کے عبادت خانے موقوف کر دیے جائیں، کیونکہ انہوں نے اپنی سازشوں کی وجہ سے سلطنت میں فتنہ برپا کر رکھا ہے۔ شیخ الاسلام نے فرمایا اے خلیفہ! آپ کو معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اللہ کا حکم ہے لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین میں جبر نہیں ہے۔ آپ ایسا حکم جاری کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ چنانچہ خلیفہ نے فوری طور پر یہ حکم واپس لے لیا۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے متعلق انگریزوں نے بڑا پراپیگنڈا کیا۔ کہ وہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بناتا تھا۔ مگر یہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اورنگ زیبؒ نے پچاس۵۰ سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اگر وہ واقعی زبردستی اسلام میں داخل کرتا، تو کم از کم دہلی کے گرد و نواح میں کوئی غیر مسلم باقی نہ رہتا۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ کہیں بھی غیر مسلموں کے ساتھ جبر کا ثبوت نہیں ملتا۔ اسلام ایک زندہ حقیقت ہے اور اس کا فروغ تبلیغ کے ذریعے ہوا ہے تلوار کے ذریعے نہیں ہوا۔ برصغیر میں مسلمان

آٹھ سو سال تک حکمران رہے ہیں۔ مگر کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا اسلام کے پاکیزہ اصولوں کی ترجمانی ضرور کی ہے۔ مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں کتنے غیر مسلم رؤسا تھے مگر کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ کسی کو زبردستی دین میں داخل کیا جائے یہ تو اسلام کی تعلیم کے منافی ہے۔ کیونکہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین میں جبر نہیں ہے۔

شانِ نزول

حضور علیہ السلام کے ورودِ مدینہ سے پہلے مدینہ طیبہ میں دو قسم کے لوگ تھے ایک تو یہودی تھے۔ جو پڑھے لکھے اور مالدار لوگ تھے۔ دوسرے عرب تھے۔ جو عام طور پر ان پڑھ اور غریب لوگ تھے۔ اسلام لانے کے بعد یہی لوگ انصارِ مدینہ کہلائے۔ چونکہ یہ لوگ پسماندہ تھے۔ اس لیے یہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے انہیں یہودیوں کے پاس چھوڑ دیتے تھے۔ چنانچہ اسلام آنے کے بعد جب یہودی قبائل بنو نضیر اور بنو قینقاع کو مدینہ سے نکالا گیا۔ تو اس وقت ایک انصاری ابوحصین کے دو بیٹے یہودیوں کی تحویل میں تھے۔ اور انہوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ جب وہ مدینہ سے جانے لگے تو انصاری نے چاہا کہ اپنے بیٹوں کو زبردستی اسلام میں داخل کر کے انہیں اپنے پاس رکھ لے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ دین میں جبر نہیں ہے۔ لڑکے جوان ہیں۔ انہوں نے یہودیت اختیار کر رکھی ہے۔ اب اگر وہ اپنی مرضی سے جا رہے ہیں تو مسلمانوں کو اُن کے روکنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔[۱]

ابوداؤد اور دیگر کتبِ احادیث میں عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے جسے امام ابن کثیرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبل از اسلام انصارِ مدینہ کی عورتیں اولاد کی تمنا کرتیں تو یہ منت مانتیں کہ اگر اللہ نے انہیں لڑکا عطا کیا۔ تو وہ اُسے یہودی کر دیں گی۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتیں، جس کی وجہ سے کئی بچے یہودیوں کی تحویل میں چلے گئے۔ جب اسلام آیا تو اس وقت کچھ بچے بنو نضیر کی تحویل میں تھے۔ جب انہیں مدینہ بدر کیا گیا۔ تو وہ لڑکے بھی اُن کے ساتھ جا رہے تھے۔ اُس وقت انصارِ مدینہ کی خواہش ہوئی۔ کہ اپنے بچوں کو اسلام میں داخل کر کے یہودیوں کے ساتھ

---

[۱] قرطبی صفحہ ۲۸۰ ج ۳ (فیاتھ)

جانے سے روک لیں۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کہ کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جاسکتا۔ کیونکہ حق اور باطل واضح ہو چکے اب جس کا جی چاہے حق کو قبول کر لے۔ اور جو چاہے باطل پہ اڑا رہے۔

مضبوط کڑا حق اور باطل کو واضح کرنے کے بعد فرمایا فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ جس نے طاغوت کا انکار کیا۔ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰہِ اور اللہ پہ ایمان لایا فَقَدِ اسْتَمْسَکَ بِالْعُرْوَۃِ الْوُثْقٰی اس نے مضبوط کڑا پکڑ لیا۔ لَا انْفِصَامَ لَہَا جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے اسلام کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ گویا ایسی مضبوط جگہ پہ پہنچ گیا۔ جہاں پہ وہ محفوظ ہو گیا۔ اب اس کو کسی قسم کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ اور یہ ایسا مضبوط مقام ہے۔ جو کمزور ہو کر ٹوٹ بھی نہیں سکتا بلکہ یہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔

قرآن پاک میں طاغوت کا لفظ (آٹھ مرتبہ) استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ طغیان اور طغوا کے مادہ سے ہے جسے سرکشی پر محمول کرتے ہیں۔ عام طور پہ اس کا ترجمہ شیطان کیا جاتا ہے۔ مگر شاہ عبدالقادرؒ نے اس کا ترجمہ "ہڑدنگا" کیا ہے۔ اُعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ یعنی اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی پرستش چھوڑ دو۔ ہڑدنگا کا لفظ اُس پہ بولا جاتا ہے۔ جو زور سردار بن جائے اور لوگوں سے زبردستی اطاعت کرائے۔

چونکہ شیطان کا بھی یہی کام ہے۔ لہٰذا اُس پہ بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ امام جعفر صادقؒ نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ کُلُّ مَا یُشْغِلُکَ عَنِ الْحَقِّ فَھُوَ طَاغُوْتُکَ جو کوئی چیز تمہیں حق سے مشغول کرنے والی ہے۔ وہ تمہارے لیے طاغوت ہے۔ گویا حق سے ہٹانے والا شیطان ہو یا انسان، مال ہو یا اولاد سب طاغوت کی تعریف میں آئیں گے۔ باطل راستے پہ چلانے والے ماں باپ اور غلط طرف لیجانے والے پیر بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ غرضیکہ جو بھی کسی کو حق سے باز رکھنے کی کوشش کریگا، وہ اس کے لیے طاغوت ہے۔

عروہ کا معنی کڑا اور وثقیٰ کا معنی مضبوط ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام ؓ نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک اونچے ستون پر چڑھ گئے۔ اس کے آخری سرے پر ایک کڑا لگا ہوا تھا۔ جسے آپ نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ صبح اُٹھے اور حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر خواب بیان کیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ اس خواب کی تعبیر یہ ہے۔ اَنْتَ تَمُوْتُ عَلَى الْاِسْلَامِ تمہاری موت اسلام پر آئیگی۔ یعنی مرتے دم تک تم اسلام کا دامن پکڑے رکھو گے۔ لَا انْفِصَامَ لَهَا کا یہی مطلب ہے کہ وہ مضبوط کڑا ہے۔ جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ کڑا ہاتھ سے چھوٹ تو سکتا ہے۔ مثلاً آدمی گمراہ ہو جائے اور اسلام کا دامن چھوڑ دے۔ مگر یہ حلقہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ اور اس کو تھامنے والا آدمی محفوظ ہو جاتا ہے فرمایا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ ہر شئے کو سنتا اور جانتا ہے۔ وہ انسان کے ارادے تک سے واقف ہے۔ کہ وہ کوئی کام نیک نیتی سے کر رہا ہے یا بدنیتی سے۔ وہ ہر ایک کی پکار کو سنتا ہے۔

نور اور ظلمت

آگے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ملنے والے انعام کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جو شخص دین اسلام کے ساتھ وابستہ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہو گیا۔ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کا دوست، رفیق، کارساز، مددگار یا ولی ہے۔ جو ایمان لائے۔ لفظ ولی میں یہ سب معنی پائے جاتے ہیں جیسے فرمایا اَنْتَ وَلِيُّنَا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ دنیا اور آخرت میں تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ جب اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھیں گے۔ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا۔ کہ ہماری پرستش کرو۔ تو وہ جواب دیں گے۔ اے مولی کریم! اَنْتَ وَلِيُّنَا تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ ہم لوگوں کو کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہماری پرستش کرو۔ انہوں نے تو خواہ مخواہ شیطان کی بات مانی ہے۔ بہر حال فرمایا، اللہ تعالیٰ ہی مومنوں کا مددگار رہے اور وہ اُن کی مدد اس طریقہ سے کرتا ہے يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے۔ یہاں پر نور کو مفرد استعمال کیا ہے۔ اور ظلمات جمع ہے۔ مقصد یہ ہے۔ کہ توحید اور

ایمان تو ایک ہی چیز ہے۔ جب کہ کفر اور شرک بہت سے ہیں۔ کوئی ستاروں کو پوج رہا ہے۔ کوئی انسانوں کی پرستش کرتا ہے۔ کوئی جنات کو حاجت روا سمجھتا ہے اور کوئی بتوں کے آگے سجدہ ریز ہے۔ یہ سب ظلمت کی قسمیں ہیں۔ الغرض کہیں کفر شرک کی ظلمت ہے۔ کہیں گناہ اور نفاق کی ظلمت ہے اور کوئی شک کی ظلمت میں مبتلا ہے مگر ان سب کے مقابلے ایمان اور توحید واحد نظریہ ہے۔ لہذا یہاں پہ نُور صیغہ واحد کے طور پہ استعمال کیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو کس طرح اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ تو اس نے اپنے نبی بھیجے ہیں۔ کتابیں بھیجی ہیں۔ جن کے ذریعے اہلِ ایمان کے دِلوں کو منور کرتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا۔ "اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ" اللہ تعالیٰ جس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے "فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ" وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پہ ہے۔ اور اس کے برخلاف دوسرے لوگ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی واضح راستہ نہیں ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا۔ "اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا" اگر اللہ سے ڈرتے رہوگے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ہر تاریکی میں راستہ پیدا کر دیگا۔ تمہارے راستے کو روشن کر دیگا۔ مشکلات کو حل کر دیگا۔ اور تمہارے تمام اُمور میں آسانی پیدا کر یگا۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ اہلِ ایمان دوسرے لوگوں کے درمیان روشنی میں چلے گا۔ جس نے ایمان کا راستہ نہیں پکڑا وہ اندھیروں میں بھٹک گیا۔ اس کے لیے تمام معاملات میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ مگر اہلِ ایمان ایسی روشنی سے منور ہے۔ جو اُسے برزخ میں بھی کام آئیگی۔ اور اس کی قبر بھی روشن ہو جائیگی۔ حضور نے فرمایا نماز مومن کے لیے قبر میں روشنی پیدا کریگی۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

طاغوت کی دوستی

فرمایا "وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا" جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا "اَوْلِيٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ" اُن کے ساتھی طاغوت ہیں۔ اور اُن کا کام کیا ہے "يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ"

إِلَى الظُّلُمٰتِ ط وہ انہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب شیاطین کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ تو کوئی انہیں کفر کی طرف لے جاتا ہے کوئی شرک کی طرف اور کوئی بدعت کی طرف۔ اور کوئی ترغیب دلا کر معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔ ایسے لوگ بہر حال دین و ایمان کی روشنی سے نکل کر اندھیروں کی طرف ہی جاتے ہیں۔ یہ تو پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ دین میں جبر نہیں۔ اب ایمان اور کفر کا تقابلی جائزہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

فرمایا جو لوگ روشنی سے نکل کر اندھیرے کی طرف جائیں گے۔ ان کا انجام یہ ہے۔ کہ أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ یہی لوگ اہل دوزخ ہیں۔ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ یہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں ہی جلتے رہیں گے۔ وہاں سے نکلنے کی کوئی امید نہ ہوگی كُلَّمَآ أَرَادُوٓا أَنْ يَّخْرُجُوا مِنْهَآ أُعِيدُوا فِيهَا" جب کبھی وہاں سے نکلنا چاہیں گے واپس دھکیل دیے جائیں گے۔ ان کے مقابلے میں جو اہل ایمان ہیں، وہ کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کا ٹھکانہ ہمیشہ کے لیے جنت ہوگا۔ وہ دائمی عیش و راحت میں ہوں گے۔ کیونکہ انہوں نے دین اسلام کے مضبوط کڑے کو پکڑ لیا۔ اور پھر اس گرفت کو کمزور نہیں ہونے دیا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۲۵۸﴾

وقف لازم

ترجمہ: کیا آپ نے اس شخص کی طرف نہیں دیکھا۔ جس نے حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے ساتھ جھگڑا کیا تھا۔ اُس کے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بادشاہی دی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا میرا پروردگار وہ ہے۔ جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ تو وہ شخص کہنے لگا، میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا بیشک اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق کی جانب سے لاتا ہے۔ تم اس کو مغرب کی جانب سے لاؤ۔ پس وہ شخص حیران ہو گیا جس نے کفر کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والی قوم کو راہ نہیں دکھاتا ﴿۲۵۸﴾

ربطِ آیات

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان اور کفار کا ذکر فرمایا تھا کہ اللہ ایمان والوں کا کارساز ہے۔ اُن کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جنہوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے۔ ان کے ساتھی طاغوت یا شیطان ہیں، جو انہیں ایمان کی روشنی سے نکال کر کفر کے اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ گویا دو قسم کے گروہوں کا ذکر ہوا۔ ایک اولیاء الرحمٰن یعنی وہ لوگ جن کا ولی اللہ تعالیٰ خود ہے۔ وہ رحمٰن کے دوست ہیں۔ اور دوسرا گروہ اولیاء الشیطان کا ہے۔ جنہوں نے طاغوت کو اپنا دوست بنا رکھا ہے۔

آج کے درس سے شروع ہونے والے رکوع میں بھی اللہ جل جلالہٗ نے

انہیں دو قسم کے گروہوں کے متعلق بات کی وضاحت کے لیے تین مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ جن میں مسئلہ توحید، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حیات بعد الممات کا مسئلہ اچھی طرح سے سمجھایا ہے۔ پہلی آیت میں اللہ نے اپنی قدرت اور صنعت کو سمجھایا ہے۔ اور ساتھ توحید خالص کی وضاحت فرمائی ہے۔ دوسری اور تیسری آیت میں مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ اور توحید کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح ان آیات کو پہلی آیات کے ساتھ ربط ہے۔

ابراہیم علیہ السلام اور نمرود میں مناظرہ

آج کے درس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُس مناظرے کا ذکر ہے، جو انہوں نے بادشاہِ وقت نمرود کے ساتھ کیا تھا۔ اور جس میں آپ نے توحید باری تعالیٰ کے متعلق دلائل دیے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ کیا آپ نے اُس شخص کو نہیں دیکھا۔ جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اُن کے رب کے متعلق جھگڑا کیا۔

اَلَمْ تَرَ اس سے پہلے بنی اسرائیل کے واقعہ میں بھی آچکا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ رؤیت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک بصری اور دوسری قلبی یا علمی۔ رؤیت بصری وہ ہے۔ جسے آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اور پھر واقعہ بیان کیا جائے۔ اور رؤیت علمی وہ ہے۔ جو علم کے ذریعے حاصل ہو۔ کسی واقعہ کو آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا یہ واقعہ بھی حضور علیہ السلام کی بعثت سے تقریباً اڑھائی ہزار سال پہلے پیش آیا۔ اس لیے رؤیت بصری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا مشاہدہ علم کے ذریعہ کرایا۔ اور اس کو اس طرح یاد کرایا۔ اَلَمْ تَرَ کیا آپ نے نہیں دیکھا یا آپ کو نہیں معلوم۔ مطلب یہ کہ آپ کو اچھی طرح اس واقعہ کا علم ہے کہ کس طرح اُس شخص نے اللہ تعالیٰ کے متعلق ابراہیم علیہ السلام سے مکالمہ کیا۔ اور وہ شخص کون تھا۔ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ جسے اللہ تعالیٰ نے ملک یعنی حکومت عطا کی ہوئی تھی۔ وہ وقت کا بادشاہ تھا۔

نمرود کا شجرہ نسب

اس شخص کے متعلق مختلف تفاسیر اور تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے۔ کہ اُس کا نام

نمرود تھا۔ اُس کے باپ کا نام کنعان بن کوش تھا۔ لہٰذا وہ نمرود ابن کنعان کہلاتا تھا۔ بعض اوقات اسے اپنے دادا کی طرف منسوب کر کے نمرود بن کوش بھی کہا جاتا ہے۔ بہر حال یہ شخص حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں حام، سام اور یافث میں حام کی نسل میں سے تھا۔ اور اس کا پایہ تخت عراق میں بابل کے مقام پر تھا۔ اس زمانے میں یہ بڑا مشہور و معروف شہر تھا۔ جو موجودہ بغداد سے ستر یا سو میل کے فاصلے پر تھا اس شہر سے بہت سی تہذیبیں وابستہ ہیں۔ نمرود، کلدانی خاندان کا بادشاہ تھا۔ اس خاندان نے چار سو سال تک حکومت کی تفسیری روایات میں آتا ہے۔ کہ نسل کے اعتبار سے یہ شخص ٹھیک نہیں تھا۔ تاہم یہ وہ شخص ہے۔ جس نے سب سے پہلے سر پہ تاج شاہی رکھا۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں۔ کہ چار شخص ایسے گزرے ہیں۔ جن کی پوری دنیا پر حکمرانی تھی۔ ان میں سے دو مسلمان تھے اور دو کافر۔ مسلمانوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنین ہیں۔ جن کا واقعہ سورۃ کہف میں ملتا ہے۔ کفار میں ایک نمرود اور دوسرا بخت نصر تھا۔ جس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں آیا ہے۔ اس شخص نے بنی اسرائیل کو بالکل برباد اور ذلیل کر دیا تھا۔

مناظرہ کب ہوا

اس بات میں اختلاف ہے۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ مناظرہ اُن کے آگ میں ڈالے جانے سے پہلے ہوا یا اس کے بعد۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے سے پہلے کا ہے جونہی ابراہیم علیہ السلام جوان ہوئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی تبلیغ شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اوائل عمر سے ہی رشد و ہدایت عطا کی تھی۔ قرآن پاک میں موجود ہے وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ابتداء سے ہی رشد و ہدایت دی۔ آپ کے والد آذر سرکاری ملازم تھے۔ اس کے علاوہ وہ اُس بڑے بت خانے کے انچارج تھے۔ جسے بادشاہ کے حکم سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ مناظرہ اسوقت ہوا۔ اس کے بعد آپ کو آگ میں ڈالا گیا۔ بعض دوسرے مفسرین کی تحقیق یہ ہے کہ مذکورہ مناظرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

[1] تفسیر ابن کثیر صفحہ ۳۱۳ ج ۱ و قرطبی صفحہ ۲۸۳ ج ۳ [2] تفسیر کبیر صفحہ ۲۳ ج ۷ (فیاض)

کے آگ میں ڈالے جانے کے بعد ہُوا، ابراہیم علیہ السلام کے آگ سے زندہ بچ جانے کا معجزہ دیکھکر بھی وہ آپ پر ایمان نہ لائے "فَاٰمَنَ لَہٗ لُوْطٌ" حضرت لوط علیہ السلام کے سوا کسی نے آپکی تصدیق نہ کی البتہ گھر میں آپ کی بیوی سارہ تھی۔ جسے ایمان کی دولت حاصل تھی۔ اُن ایام میں یہ مناظرہ ہوا۔ آخر وہ وقت بھی آیا جب ابراہیم علیہ السلام کو اپنا وطن بابل بھی چھوڑنا پڑا۔ اس سفر میں آپ کے ہمراہ حضرت لوطؑ اور آپکی بیوی تھے۔ آپ عراق سے چل کر فلسطین پہنچے۔ وہاں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو تبلیغی مشن پر بحر لوط کے کنارے متعین کیا۔ پھر آپ مصر پہنچے۔ وہاں سے مکہ مکرمہ پہنچکر بیت اللہ شریف کی تعمیر کی۔ اور اپنے فرزند اسمٰعیل کو وہاں چھوڑا۔ آپ واپس فلسطین آگئے۔ اور وہیں آپ کا انتقال ہوا۔ آپکے دوسرے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام نے وہاں کے تبلیغی فرائض سنبھالے۔

مناظرے کا پس منظر

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان بحث و مباحثے کی نوبت کیوں پیش آئی۔ اس کے متعلق مولانا شیخ الہندؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے اپنی تفاسیر میں مختصر نوٹ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ اس سے پہلی آیت میں اہل ایمان اور اہل کفر کا تذکرہ تھا۔ اُن کے نور اور ظلمت کا بیان تھا۔ اور اب اس آیت میں اُسی سلسلہ میں بعض نظیریں پیش کی گئی ہیں اور اس پہلی نظیر میں نمرود اور حضرت ابراہیم کا ذکر ہے کہ جو کوئی شخص نمرود کے دربار میں جاتا تھا۔ وہ سب سے پہلے اُسے سجدہ کرتا تھا جب ابراہیم علیہ السلام دربارِ نمرود میں پہنچے۔ تو آپ سے بھی سجدہ کرنے کی توقع کی گئی مگر آپ نے نمرود کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر مناظرے کی مذکورہ صورت پیش آئی۔

نمرود کا واقعہ تاریخ کی تمام پرانی کتابوں میں ملتا ہے مگر محض تاریخی روایات پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ تاریخ میں ہر قسم کے واقعات بلا تحقیق نقل کر دیے جاتے ہیں۔ پرانے مؤرخین میں ابن خلدون کو اونچا مقام حاصل ہے۔ یہ آٹھویں صدی ہجری میں ہوئے ہیں۔ اور تاریخ کے امام تصور کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے تاریخ کا ایک ضخیم "مقدمہ" قلمبند کیا ہے جس میں تاریخ کے مختلف موضوعات

پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس نے پوری دنیا کو تاریخ کا فلسفہ سکھا دیا ہے۔ یورپ اور ایشیاء کے تمام مؤرخین ابن خلدون کے شاگرد ہیں۔ خود قاضی بھی تھے۔ مگر تاریخی روایات کی صحت کے متعلق ان پر بھی مکمل انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ طبری کی تاریخ میں بھی صحیح اور غلط ہر قسم کے واقعات ملتے ہیں۔ تاریخ دان کسی واقعہ کی پوری تحقیق نہیں کرتے۔ یہ تو محدثین کو شرف حاصل ہے۔ کہ کسی واقعہ کو نقل کرنے سے پہلے راویوں کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ ہر غلط ملط واقعہ درج نہیں کیا جاتا۔ البتہ امام ابن کثیرؒ نے اس ضمن میں کافی پیش رفت کی ہے۔ آپ کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے شاگردوں میں ہیں۔ آپ نے واقعات کی جانچ پڑتال کی کوشش کی ہے۔ روایات پر صحیح یا غلط ہونے کے متعلق جرح بھی کی ہے۔ آپ کی تاریخ کی کتاب "البدایہ والنہایہ" سولہ جلدوں میں ہے۔ جس میں آدم علیہ السلام سے لے کر اپنے زمانے تک کے واقعات تفصیل کے ساتھ قلمبند کیے ہیں۔ یہ سب سے زیادہ مستند تاریخ تسلیم کی جاتی ہے۔ بہر حال انہوں نے واقعات کی صحت کا کسی حد تک خیال رکھا ہے آپ نے قرآن پاک کی "تفسیر ابن کثیر" لکھی ہے۔ جو اعلیٰ درجے کی تفسیر تسلیم کی جاتی ہے۔

تاریخی روایات کی صحت کی جانچ پڑتال میں امام مسعود بغویؒ کا نام سر فہرست ہے

آپ امام رازیؒ سے بھی پہلے پانچویں صدی میں ہوئے ہیں۔ آپ کا وطن خراسان میں بغات ہے۔ آپ اعلیٰ پائے کے محدث تھے۔ آپ کی حدیث کی کتاب "مصابیح" کے نام سے موجود ہے۔ جو علم حدیث کی بلند پایہ کتاب ہے۔ جسے صاحب مشکوٰۃ نے مزید شرح کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ آپ مفسر قرآن بھی ہیں۔ آپ کی تفسیر "معالم التنزیل" کے نام سے موجود ہے، جو چار جلدوں میں ہے۔ اور اُس دور کی معتبر تفسیروں میں شمار ہوتی ہے۔ بہر حال انہوں نے تاریخی واقعات میں صحت کا کسی قدر زیادہ التزام کیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے واقعہ کے متعلق امام ابن کثیرؒ اور امام بغویؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ اُس نہ ملنے کا واقعہ ہے۔ جب کہ ملک میں قحط پڑ گیا اور لوگ بھوکوں

مرنے لگے، اس وقت نمرود کے پاس غلّے کا ذخیرہ موجود تھا۔ لوگ اُس کے پاس غلہ لینے کے لیے جاتے تھے۔ اور دربار میں پہنچ کر سب سے پہلے سجدہ کرتے اور پھر اپنا مدعا بیان کرتے۔

اصل مناظرہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی نمرود کے دربار میں پہنچے، مگر آپ نے اُسے سجدہ نہ کیا۔ اُس نے وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا۔ کہ میں اپنے رب کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ نہیں کرتا۔ نمرود نے کہا۔ کہ رب تو میں ہوں لہذا مجھے سجدہ کرو۔ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا، تم تو محض حاکم وقت ہو، رب نہیں ہو۔ رب وہ ذات ہے۔ جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ تمہارے اختیار میں یہ چیز نہیں ہے۔ لہذا تم رب نہیں ہو سکتے۔ اس آیت پاک میں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ یعنی میرا رب ہے۔ جو زندگی بخشتا ہے اور مارتا ہے نمرود فوراً بولا قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ چنانچہ اپنی طاقت کے مظاہرہ کے لیے اس نے دو قیدی منگوائے۔ جو بے گناہ تھا اُس کو قتل کروا دیا۔ اور جو مجرم تھا اُسے آزاد کر دیا۔ اور کہنے لگا۔ دیکھو میں نے جس کو چاہا زندگی دے دی اور جسے چاہا موت کے حوالے کر دیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے محسوس کیا کہ یہ شخص عقل کا ایسا اندھا ہے۔ کہ موت وحیات کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکا۔ یہ گنہگار کو چھوڑ دینے اور بے گناہ کو قتل کر دینے کو زندگی اور موت سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ زندگی کا مالک تو وہ ہے جو بے جان چیز میں جان ڈال دے اور جاندار کی جان اپنے اختیار سے قبض کر لے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو بیوقوف سمجھتے ہوئے اس نکتہ پر مزید بحث نہ کی۔ بلکہ ایک دوسری دلیل سے سمجھایا۔ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا۔ اب اُس کے حواس درست ہوئے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے ایسا سوال کیا ہے جس کا اس کے پاس کوئی جواب

نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ نمرود حیران ہو گیا گویا اللہ نے اس کی مت مار دی۔ وہ لاجواب ہو گیا۔ چنانچہ اُس نے مزید بحث نہ کی۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر ابراہیم علیہ السلام سے مزید مناظرہ کیا۔ تو بات بالکل بگڑ جائیگی اور وہ جھوٹا ثابت ہو جائے گا۔ لہذا وہ خاموش ہو گیا۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں۔ کہ اس مقام پر مزید بحث و تمحیص ہو سکتی تھی فرض کرو اگر نمرود سورج کے طلوع و غروب کے متعلق ابراہیم علیہ السلام کو یہ جواب دیتا کہ سورج کو مشرق سے تو میں طلوع کرتا ہوں تم اپنے رب سے کہو کہ مغرب سے نکالے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ یقیناً ابراہیم علیہ السلام کو سچا کر دکھاتا اور سورج کو مغرب سے طلوع کر دیتا۔ مگر نمرود کو اپنی شکست کا یقین ہو گیا۔ لہذا اُس نے خاموشی اختیار کرنے میں ہی مصلحت جانی۔

غیر اللہ کو سجدہ

غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا دور بر صغیر پاک و ہند میں بھی پیش آیا تھا۔ مغل بادشاہ جہانگیر بھی اپنے آپ کو سجدہ کرواتا تھا۔ حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اس کے سامنے سجدہ کیا جائے۔ مخلوق میں سے کسی کے لائق نہیں کہ اُسے سجدہ کیا جائے۔ چنانچہ جہانگیر کے زمانے میں حضرت مجدد الف ثانی رح نے سجدہ کی علی الاعلان مخالفت کی۔ بہر حال یہ آپ کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ کہ جہانگیر جیسا اکھڑ مزاج بادشاہ بھی اس فعل سے تائب ہو گیا۔ اور اس کا عقیدہ درست ہو گیا۔ البتہ اسکی بیوی رافضیہ تھی۔ مگر وہ رافضیوں کا طرفدار نہیں بنا۔ اور صحیح دین اسلام پر قائم رہا۔ اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ جہانگیر کے بعد شاہجہان مزید دین کی طرف راغب ہوا۔ اور پھر اورنگ زیب عالمگیر رح جیسا خوفِ خدا رکھنے والا بادشاہ بھی پیدا ہوا جس نے اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی۔

ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ

بہر حال جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو اُس نے آپ کو غلہ دینے سے انکار کر دیا۔

اور آپ کو خالی واپس آنا پڑا۔ واپسی پہ دل میں خیال آیا۔ کہ گھر والوں کو خالی لوٹنے کا کیا جواب دونگا۔ آپ نے راستے میں اپنا تھیلہ ریت سے بھر لیا۔ تاکہ گھر والوں

کو معلوم ہو کہ خالی ہاتھ واپس نہیں آئے۔ گھر پہنچکر کہ تھیلہ گھر میں کھا اور خود سو گئے بیوی نے سمجھا کہ آٹا لے آئے ہیں چنانچہ وہ اٹھی تا کہ تھیلے میں سے آٹا لیکر روٹی تیار کرے تھیلہ کو کھولا تو اس میں واقعی آٹا تھا کھانا تیار کرنے کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو جگایا کہ کھانا کھالیں آپنے پوچھا روٹی کہاں چیز سے پکائی ہے۔ بیوی نے عرض کیا، اُس آٹے سے جو آپ لائے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے خاص مہربانی کی ہے۔ اور ریت کا آٹا بن جانا ایک معجزہ ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کو سمجھنا بڑا مشکل کام ہے۔ وہ کمال قدرت کا مالک ہے۔ اس کی صفت اس کے فعل سے سمجھ میں آتی ہے۔ جب کوئی عجیب و غریب فعل سرزد ہوتا ہے۔ تو پھر پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ کام صرف اللہ تعالےٰ کا ہے۔ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اور جب یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ تو پھر اس کی توحید کی پہچان ہوتی ہے۔ کہ ایسی صفت کا مالک اور کمال قدرت اور کمال صفت کا مالک صرف اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہے۔ گویا اس سارے واقعہ سے یہ بات نکلی کہ موت و حیات کا مالک اور نظام شمسی کو چلانے والا فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ چاہے تو بڑے سے بڑے سرکش کو لاجواب کر دے۔ اور چاہے تو ریت کو غلّہ میں تبدیل کر دے۔ یہ سب اس کی کمال قدرت کے کرشمے ہیں۔ جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔

ظالم ہدایت سے محروم ہیں

فرمایا اللہ تعالیٰ کی صفات کو کھلی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا، تو پھر وہ پہلے درجے کا ظالم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے۔ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ۔ اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا یعنی ان کی راہنمائی نہیں کرتا پہلی آیت میں بھی آچکا ہے۔ وَالْکٰفِرُوْنَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ کہ کافر لوگ ہی ظالم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان نہیں لاتے۔ وہ مشرک ہیں اور شرک کی حقیقت یہ ہے۔ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اور اس کے مرتکب ظالم لوگ ہیں۔ جو لوگ شرک جیسے ظلم عظیم میں پھنس جاتے ہیں۔ اللہ ان کو راہِ راست کی طرف راہنمائی نہیں کرتا۔ یہ اللہ کا عام قانون ہے۔ کہ جب تک کوئی

ظالم ہے تائب نہیں ہوگا، اُسے ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔

الغرض گذشتہ درس میں بیان ہونے والے اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطٰن کی مثال اس درس میں آگئی۔ نمرود طاغوت کا پرستار تھا۔ اور ابراہیم علیہ السلام حق پہ قائم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حق کو فتح نصیب فرمائی۔ اور اپنی صفت کے ذریعے اپنی ذات کی پہچان کرائی۔

درس یکصد سیزدہ (۱۱۳) — آیت ۲۵۹

اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۵۹﴾

ترجمہ: (کیا نہیں دیکھا آپ نے اس شخص کو) جو ایک بستی پر گزرا، جو کہ اپنے چھتوں پر گری ہوئی تھی۔ اُس شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کیسے زندہ کرے گا اس کے ویران ہونے کے بعد، پس اللہ تعالیٰ نے اُس شخص پر موت طاری کر دی سو سال تک۔ پھر اُسے اٹھایا۔ اور کہا کہ تو یہاں کتنی دیر تک رہا ہے۔ اُس نے کہا، میں یہاں ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا نہیں بلکہ تو سو سال ٹھہرا ہے۔ پس دیکھ اپنے کھانے اور مشروب کی طرف، وہ متغیر نہیں ہوا۔ اور دیکھ اپنی سواری کے گدھے کی طرف اور تاکہ ہم تجھے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیں۔ اور دیکھ ہڈیوں کی طرف، کس طرح ہم ان کو ابھارتے ہیں۔ پھر اُن کو گوشت پہناتے ہیں۔ جب اُس شخص پر یہ بات واضح ہو گئی، تو وہ کہنے لگا، میں جانتا ہوں کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ﴿۲۵۹﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اولیاء الرحمٰن اور اولیاء الشیطان کی مثال بیان فرمائی۔ ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام اولیاء الرحمٰن کا نمونہ ہیں۔ اور دوسری طرف نمرود

اولیا ء الشیطان کی مثال ہے دونوں کا مناظرہ ومباحثہ اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دلائل وبراہین کی رو سے غالب آجانا اور کافر کا حیران وپریشان ہوجانا یہ سب بیان ہوچکا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوگیا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دستگیری فرمائی اور اس بات کو ثابت کر دیا کہ اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا کارسانہ ہے۔ اس مثال سے شیطان کی شیطنت بھی سمجھ میں آئی۔ کہ نمرود کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہی عطا کی تھی۔ مگر اس انعام کا شکر گزار ہونے کی بجائے، وہ شیطان کے پیچھے لگ گیا اور خود خدائی کا دعویدار بن گیا۔ اس نے انعام الٰہی سے غلط فائدہ اٹھایا اور سرکشی اختیار کی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اُسے صراط مستقیم دکھانا چاہا۔ تو اس نے جھگڑا شروع کر دیا۔

آج کے درس والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور مثال کے ذریعے اپنی قدرت کاملہ اور حیات بعد الممات کا مسئلہ سمجھایا ہے۔ یہ مثال بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کو ثابت کیا ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس قسم کے واقعات معارف الٰہیہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر انسان کا روز قیامت پر یقین پختہ ہوتا ہے۔ لہٰذا خلیفہ وقت کا فرض ہے کہ وہ ایسے واقعات کی تشہیر کرے تاکہ لوگوں کے دلوں میں دوبارہ جی اٹھنے کے متعلق کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے۔

متعلقہ شخص کون تھا

اس آیت کی ابتداء اَوْ کَالَّذِیْ سے کی گئی ہے یعنی اُس شخص کا واقعہ جس کا گزر ایک تباہ شدہ بستی پر ہوا۔ اور اس نے دل میں سوچا کہ اللہ تعالیٰ ایسی پامال شدہ بستی کو کیسے دوبارہ آباد کرے گا۔ یہاں پر اُس شخص کا تعارف نہیں کرایا گیا۔ جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ حدیث پاک میں بھی اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔ البتہ بائیبل، تفسیری روایات اور تاریخ سے اُس شخص کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مفسرین کے اقوال میں سے ایک قول تو یہ ہے۔ کہ یہ شخص سرے سے مسلمان ہی نہیں تھا۔ بلکہ حیات بعد الممات کا منکر تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے اپنی آنکھوں سے دوبارہ جی اٹھنے کا مشاہدہ کرایا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ شخص نہ صرف

مومن تھا بلکہ اللہ کا نبی تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ کون سا نبی تھا، تو بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ یہ یرمیاہ نبی تھے جن کا ذکر توراۃ میں موجود ہے۔ اور زیادہ مشہور قول یہ ہے۔ کہ آپ عزیر علیہ السلام تھے۔ اور اسی عجیب و غریب واقعہ کی بنا پر اسرائیلی آپ کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں موجود ہے "وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ" یعنی یہودیوں نے کہا۔ کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔

تاریخی پس منظر

یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت سے پانچ سو سال پہلے پیش آیا۔ جب بنی اسرائیل میں سرکشی پیدا ہو گئی۔ اور وہ مختلف قسم کی برائیوں میں مبتلا ہو گئے۔ تو اس وقت بابل پر بخت نصر جیسا جابر و ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ نمرود کی طرح بخت نصر نے بھی پوری دنیا پر حکومت کی۔ چنانچہ اس نے شام و فلسطین پر حملہ کر کے تباہ و برباد کر دیا۔ اور یروشلم اور بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بیشمار بنی اسرائیلیوں کو قتل کر دیا۔ اور لاتعداد لوگوں کو غلام اور لونڈیاں بنا کر اپنے ساتھ عراق لے گیا بنی اسرائیل کی تمام کتابیں توراۃ سمیت جلا ڈالیں۔ حتیٰ کہ توراۃ کا ایک نسخہ بھی سلامت نہ بچا۔ تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ قید ہونے والوں میں حضرت عزیر علیہ السلام بھی شامل تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب آپ قید سے رہا ہو کر واپس اپنے وطن آ رہے تھے تو یہ واقعہ راستے میں پیش آیا۔ اس وقوعہ کے مقام کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ راستے میں کوئی شہر یا بستی تھی۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ یہ خود یروشلم کا شہر تھا۔ بہر حال اس کی حالت یہ تھی۔ کہ مکانوں کی چھتیں اور دیواریں زمین بوس ہو چکی تھیں اور وہاں کوئی شخص زندہ سلامت موجود نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی زمانے میں یہ ایک پر رونق اور آباد شہر تھا مگر اس وقت کھنڈرات کا ڈھیر بن چکا تھا

واقعہ پر سطحی نظر

کہتے ہیں۔ کہ حضرت عزیر علیہ السلام گدھے پر سوار آ رہے تھے۔ آپ کے پاس کھانے پینے کا کچھ سامان بھی تھا۔ ایک برتن میں پھلوں کا کچھ شیرہ تھا۔ اور ایک ٹوکری میں انجیر تھے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو جلد خراب ہو جاتی ہیں۔ بہر حال آپ کا اس

اجڑے ہوئے شہر پہ گزر ہوا۔ کھنڈرات کو عبور کرتے ہوئے ایک مقام پر اُن کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ کیا یہ اجڑا ہوا شہر بھی کبھی آباد ہو گا؟ اسی سوچ و بچار میں کھنڈرات کے درمیان ایک مقام پر اتر پڑے۔ گدھے کو باندھا، کھانے کا کچھ حصہ کھایا اور باقی پاس رکھ لیا۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی، ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ اور پھر ایسے سوئے کہ اللہ تعالیٰ نے سو سال تک سلائے رکھا۔ جس وقت سوئے تھے تو دن کا ابتدائی حصہ تھا اور جب بیدار ہوئے تو ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ اٹھنے کے بعد ان سے سوال و جواب ہوئے کہ کتنا عرصہ سوئے۔ انہوں نے کہا کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، مگر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ سو سال تک سوتے رہے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے کرشمہ کے طور پر انہیں دکھایا کہ اس سو سال کے عرصہ میں ان کا کھانا بالکل تر و تازہ تھا خراب نہیں ہوا تھا۔ البتہ ان کا گدھا مر چکا تھا اور اس کی ہڈیاں ادھر اُدھر بکھری پڑی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے گدھے کو زندہ کیا۔

جب عزیر علیہ السلام موت کی نیند سو رہے تھے۔ تو اس دوران بخت نصر گیا، ایران کے بادشاہ خسرو نے فلسطین پر حملہ کر کے اسے اپنے زیر نگیں کر لیا، اور بنی اسرائیلوں کو آزاد کر دیا۔ اور انہیں فلسطین کو دوبارہ آباد کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ انہوں نے تیس سال کے مختصر عرصہ میں اس اجڑے ہوئے شہر کو دوبارہ آباد کر لیا۔ اور پھر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ شہر کبھی ویران ہوا ہی نہیں۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ پر رونق ہو گیا۔ دنیا کی تاریخ میں آبادی اور بربادی کی ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ مگر جنگ کے خاتمہ سے چند سال کے اندر اندر جرمنی اس طرح آباد ہو گیا۔ کہ گویا وہاں کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا۔ بڑی بڑی بلڈنگیں۔ فیکٹریاں، کاروباری مراکز پہلے سے بھی زیادہ شان و شوکت کے ساتھ معرض وجود میں آ گئے۔

اسی طرح تیس سال کے عرصہ میں وہ شہر پوری آب و تاب کے ساتھ دوبارہ آباد ہو گیا۔ اور جب عزیر علیہ السلام اپنی موت کے سو سال پورے ہونے

پر دوبارہ اٹھائے گئے تو وہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ میلوں تک پھیلے ہوئے کھنڈرات ہنستے بستے شہر میں تبدیل ہو چکے تھے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے بطور نمونہ دکھا دیا۔ کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ظہور ہے۔

تباہ شدہ بستی

ارشاد ہوتا ہے۔ اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ کیا آپ کے علم میں یہ بات نہیں آئی۔ کہ وہ شخص جو ایک بستی پر گزرا۔ یہ بستی یروشلم تھا یا کوئی اور نگری تھی۔ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا اور اس بستی کی حالت یہ تھی کہ اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی۔ تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ نہ کوئی دیوار سالم تھی اور نہ کسی مکان کی چھت باقی تھی بلکہ پوری بستی ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی۔ وہاں کوئی زندہ سلامت آدمی موجود نہیں تھا۔ اگرچہ عام خیال یہی ہے۔ کہ یہ بستی بخت نصر بادشاہ نے تباہ کر دی تھی۔ مگر کہتے ہیں۔ کہ یہ کسی حادثہ کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ جب زبردست قسم کا زلزلہ آتا ہے۔ تو سینکڑوں میل تک تباہی پھیل جاتی ہے۔ بذرنہ کی بستی میں زلزلے نے وہ تباہی مچائی کہ رات کے تھوڑے سے حصہ میں دس بارہ ہزار کی آبادی میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ ۱۹۲۳ء میں جاپان میں بہت بڑا زلزلہ آیا تھا۔ ہزاروں میل زمین میں لمبے لمبے شگاف پڑ گئے تھے۔ ڈیڑھ لاکھ آدمی ہلاکت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ قیامت صغریٰ کا نمونہ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ جیسا آباد شہر آناً فاناً ملبے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ ہزاروں جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ بہرحال اللہ کے نبی نے بستی کی بربادی کو دیکھ کر تعجب کے ساتھ کہا قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا اس قدر تباہی کے بعد اللہ تعالیٰ اس بستی کو کیسے زندہ کریگا۔ یہاں پر حیات اور موت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اگر هٰذِهٖ سے مراد وہ بستی ہے۔ تو اس کا معنیٰ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس اجڑی ہوئی بستی کو دوبارہ کیسے آباد کریگا۔ اور اگر اس سے مراد اس بستی کے لوگ ہیں جو بستی کی تباہی کے ساتھ ہی موت کی آغوش میں چلے گئے تھے تو اس کا معنیٰ یہ ہو گا۔ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو کیسے زندہ کرے گا، جب کہ ان پر موت طاری ہو چکی ہے

موت و حیات کا منظر

حضرت عزیر علیہ السلام کے اس تعجب خیز سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے

اس طرح دیا کہ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ آپ پر سو سال تک کے لیے موت طاری کر دی۔ ثُمَّ بَعَثَهٗ پھر آپ کو اٹھایا۔ اور کہا قَالَ كَمْ لَبِثْتَ تم کتنی دیر ٹھہرے یعنی اس حالت میں کتنا عرصہ رہے ہو، ذرا بتاؤ تو سہی۔ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ عرض کیا، ایک دن یا دن سے کچھ کم ٹھہرا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ بلکہ تم ایک سو سال تک ٹھہرے اور آپ کو باور کرانے کے لیے فرمایا فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ذرا اپنے کھانے اور مشروب کی طرف دیکھو، وہ متغیر نہیں ہوا یعنی اتنا عرصہ گزر لینے کے بعد گل سڑ کر خراب نہیں ہوا نہ اس کی شکل تبدیل ہوئی ہے۔ نہ ذائقہ اور نہ رنگ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت ہے۔ کہ جلد خراب ہو جانے والی چیز کو اتنے لمبے عرصے تک محفوظ رکھا۔ اور دوسری طرف خود عزیر علیہ السلام ہیں۔ ان کا جسم سو سال تک کھنڈرات کے درمیان پڑا رہا مگر بالکل صحیح سلامت اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نہ اس کا گوشت گلا سڑا اور نہ ہڈیاں علیحدہ ہوئیں۔ جس طرح اس مالک الملک نے اصحاب کہف کو تین سو نو سال تک ایک غار میں محفوظ رکھا، اسی طرح حضرت عزیر علیہ السلام کے جسم کو ایک سو سال تک آنچ نہ آنے دی۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے اپنی حکمت کے ساتھ ایسی چیزیں ظاہر کرتا ہے۔ پورا شہر آباد ہو گیا مگر جس جگہ عزیر علیہ السلام آرام فرما تھے، وہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔ آج لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ دجال کہاں مقید ہے۔ آج دنیا کا کوئی حصہ نظروں سے اوجھل نہیں رہا۔ آخر وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔ بھائی! اللہ تعالیٰ نے اسے لوگوں کی نظروں سے مخفی کر دیا ہے۔ جب اس کا حکم ہو گا، ظاہر ہو جائے گا۔ یاجوج ماجوج کی قوم بھی ایسی ہی ہے۔ وہ بھی کسی کو نظر نہیں آتے۔ انگریزوں نے دعوے کیا کہ انہوں نے پوری دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا ہے مگر یاجوج ماجوج کہیں نظر نہیں آئے۔ مگر یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی حکمت سے چھپا رکھا ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ جب اس کا حکم ہو گا، قوم پہاڑوں سے نکل کر ظاہر ہو جائے گی۔

گدھا کیسے زندہ ہوا

حضرت عزیر علیہ السلام کے خود اپنے ساتھ اور کھانے کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا۔ اب اپنے گدھے کا انجام دیکھئے۔ ہمارے ہاں تو گدھے کی سواری کو مستحسن نہیں سمجھا جاتا۔ مگر اس زمانے میں یہ ایک علیحدہ سواری شمار ہوتی تھی۔ بڑے خوبصورت اور طاقتور گدھے ہوتے تھے، خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گدھے کی سواری کی ہے۔ آپ بالکل تکلف نہیں فرماتے تھے۔ جو سواری میسر آئے، استعمال میں لے آتے تھے جب آپ بنو قریظہ سے جنگ کے لیے تشریف لے گئے۔ تو آپ کے پاس یہی سواری تھی۔ اور اس پہ پالان بھی نہیں تھا۔ مگر آپ نے اسی حالت میں اس پہ سفر کیا۔ آپ نے اونٹ اور گھوڑے پہ بھی سفر کیا، اور اگر کوئی سواری نہیں ملی تو پیدل ہی چل دیئے، حضرت جابرؓ بیمار ہو گئے۔ آپ کا گھر مدینہ طیبہ سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ حضور علیہ السلام بیمار پرسی کے لیے جانا چاہتے تھے، کوئی سواری نہیں ملی تو پیدل ہی چل دیے، حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ حضور تشریف لائے۔ تو آپ پہ گرد و غبار پڑا ہوا تھا۔ بہر حال گدھے کی سواری کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے عزیر علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا۔ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ ذرا اپنے گدھے کی طرف دیکھو۔ کہ اس کا کیا حشر ہوا ہے۔ فرمایا یہ سب واقعات پیش کرنے کا کوئی مقصد ہے۔ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ تاکہ ہم آپ کو لوگوں کے لیے نمونہ بنا دیں۔ کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے موت طاری کرنے کے بعد پھر کس طرح زندہ کر دیا۔ اب دیکھو گدھا کس طرح زندہ ہوتا ہے۔ فرمایا وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ۔ ان ہڈیوں کی طرف نگاہ کرو۔ گدھا مر چکا ہے۔ گوشت گل سڑ کر ختم ہو چکا تھا۔ اور اس کی ہڈیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ فرمایا ان کی طرف دیکھو كَيْفَ نُنْشِزُهَا ہم کس طرح ان کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ نشز کا معنی ہوتا ہے، ابھارنا، اٹھانا وغیرہ ناشزہ اس عورت کو کہتے ہیں، جو خاوند کی نافرمان ہو اور مقابلے میں اٹھ کھڑی ہو۔ فرمایا دیکھو! ہم ان ہڈیوں کو جوڑ کر ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا پھر ان پہ گوشت چڑھاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عزیر علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے ہڈیاں

ابھریں، ان کا ڈھانچہ تیار ہوا۔ پھر ان پہ گوشت چڑھا۔ گدھے کی شکل وصورت بنی اور پھر وہ زندہ ہو کر بولنے لگا۔

ہر ذی جان کا جسم ہڈیوں پہ قائم ہوتا ہے۔ حضور علیہ السّلام نے فرمایا، جب انسان مر جاتا ہے۔ تو اسکے جسم کی تمام کثافتیں گل سڑ جاتی ہیں۔ صرف دم کی ہڈی کسی نہ کسی صورت میں باقی رہتی ہے۔ قیامت کے دن اسی ہڈی سے پورا ڈھانچہ اور پھر پورا جسم اٹھایا جائے گا۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے گدھے پہ وارد کیا اور پھر حضرت عزیرؑ علیہ السّلام کی آنکھوں کے سامنے جیتے جاگتے گدھے کی صورت میں کھڑا کر دیا۔

عالم برزخ

وارد ہونے والی موت کے اس سو سالہ عرصہ کو عالم برزخ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جب کوئی انسان مر جاتا ہے۔ تو اس کا تعلق اس دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ اور قیامت کے روز دوبارہ جی اٹھنے تک برزخی زندگی کہلاتی ہے۔ اس عرصہ میں انسان کو وقت کا احساس نہیں ہوتا۔ کہ وہ کتنا عرصہ برزخ میں رہا ہے جیسا کہ سورۃ یٰسین میں آتا ہے کہ جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے، تو کہیں گے "مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا هٰذَا" ہمیں ہماری خواب گاہوں سے کس نے اٹھایا۔ ان کو ایسا ہی محسوس ہوگا جیسے کوئی شخص رات کو یا دن کے وقت کچھ دیر کے لیے سوتا ہے۔ اور پھر اٹھ بیٹھتا ہے۔ یہی چیز حضرت عزیرؑ علیہ السلام کے ساتھ پیش آئی۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ سو سال تک سوئے رہے ہیں۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے۔ کہ دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں

عالم برزخ میں وقت کا احساس تو نہیں ہوتا۔ مگر راحت اور تکلیف کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ جیسا کہ احادیث میں آتا ہے۔ کہ جب کسی شخص کو دفن کر دیا جاتا ہے تو پھر منکر نکیر اس سے سوال وجواب کرتے ہیں اس ابتدائی امتحان میں اگر وہ شخص کامیاب ہوا ہے۔ تو اس کو میٹھی نیند سلا دیا جاتا ہے اور اس کے لیے راحت کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر وہ ناکام ہو گیا ہے۔ سوالات کا جواب نہیں دے سکا۔ تو پھر قیامت تک کے لیے اسے تکلیف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اس طرح اسے تکلیف کا احساس تو ہوتا ہے مگر وقت کا احساس نہیں ہوتا۔

اجسام کی حفاظت

مرنے کے بعد ایک عام انسان کے جسم کی حفاظت کی کوئی گارنٹی نہیں۔ قانونِ قدرت کے مطابق مردہ جسم گل سڑ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ قبروں کی کھدائی کے دوران بعض اوقات چھوٹی موٹی ہڈیاں ملتی ہیں۔ اور بعض اوقات وہ بھی نہیں ملتیں۔ البتہ اس امر پہ اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام قبر میں بھی محفوظ رہتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَنْ تَاْکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا۔ کہ وہ نبیوں کے جسموں کو کھا سکے۔ ہاں شہدا کے متعلق مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے۔ کہ بعض شہدا کے جسم بھی قبروں میں محفوظ رہتے ہیں۔ بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ بعض شہدا کو شہید ہوئے پینتالیس سال گزر چکے تھے۔ بارش اور سیلاب کی وجہ سے ان کی قبروں میں شگاف پڑ گئے، تو لوگوں نے دیکھا کہ اُن کے جسم ویسے ہی محفوظ تھے جیسا وہ دفن کیے گئے۔ ابھی پچھلے دنوں اس بات کا انکشاف ہوا ہے۔ کہ جو لوگ چھ سو سال پہلے تاتاریوں کے علاقے میں کفار سے لڑ کر شہید ہوئے تھے، اُن کے جسم بالکل محفوظ برآمد ہوئے تھے۔

یقین کے تین مدارج

فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗ جب یہ تمام چیزیں حضرت عزیر علیہ السلام پہ واضح ہو گئیں ان کے سوال کا جواب مل گیا۔ انہوں نے حیرانگی کے انداز میں سوال کیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ اس اجڑی ہوئی بستی کو کیسے دوبارہ زندہ کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اُن کی آنکھوں سے دکھا دیا۔ کہ اُس نے نہ صرف پورے شہر کو آباد کر دیا بلکہ خود اُن کو اور اُن کے گدھے کو سو سال کے بعد پھر زندہ کر دیا۔ تو عزیر علیہ السلام نے کہا قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ میں جان گیا ہوں اور مجھے علم ہو گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ آباد کو برباد اور اجڑے دیار کو پھر سے آباد کر سکتا ہے زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔

کسی چیز کو تسلیم کر لینے یا اس پر یقین کر لینے کے تین درجے ہیں۔ اگر کسی چیز کا علم کسی دوسرے ثقہ شخص کی معرفت ہو تو اسے علم الیقین کہتے ہیں۔ کیونکہ ایسی چیز کا ادراک علم کے ذریعے ہوا ہے۔ اور اگر کوئی شخص خود اپنی آنکھوں سے کوئی واقعہ

دیکھ لے۔ تو اسے عین الیقین کہتے ہیں۔ اور یقین کا تیسرا درجہ حق الیقین ہے۔ اور یہ اُس صورت میں ہوتا ہے۔ کہ جب کوئی واقعہ خود اپنے ساتھ پیش آئے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز خود اپنے اوپر وارد ہوئی ہو۔ اور اس کی کیفیت خود اپنے اوپر طاری ہوئی ہو۔ اس سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور یہ کسی چیز کو تسلیم کر لینے کا آخری درجہ یعنی حق الیقین ہے۔

حضرت عزیر علیہ السّلام کا واقعہ عین الیقین بھی ہے اور حق الیقین بھی۔ عین الیقین اس لحاظ سے کہ حضرت عزیر علیہ السلام نے خود اپنی آنکھوں سے مردہ گدھے کو زندہ ہوتے دیکھا۔ ان کی نظروں کے سامنے گدھے کی بوسیدہ ہڈیوں سے ڈھانچہ تیار ہوا، پھر اُن پر گوشت چڑھا۔ گدھے کی شکل وصورت بنی اور پھر وہ آواز دینے لگا۔ یہ واقعہ حق الیقین کے درجے میں اس لحاظ سے ہے کہ یہ معاملہ خود عزیر علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ وہ خود سو سال تک موت کی آغوش میں رہے۔ اور پھر زندہ ہو گئے۔
جہاں تک پہلے درجے علم الیقین کا تعلق ہے۔ تو حضرت عزیر علیہ السلام کو بھی حاصل تھا۔ کیونکہ آپ اللہ کے نبی اور برگزیدہ مومن تھے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قیامت کے دن دوبارہ جی اُٹھنے پر علمی لحاظ سے بھی یقین تھا۔

اگلی آیت میں بھی اسی قسم کا واقعہ ہے۔ وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا اظہار اور علم الیقین سے عین الیقین اور حق الیقین تک کا مشاہدہ ہے۔

درس یکصد چہاردہ (۱۱۴) — آیت ۲۶۰

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ
تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ
اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی
كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ ع ۳۵/۳
وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ﴿۲۶۰﴾ ع

ترجمہ: اور اس بات کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے کہا کہ مجھے دکھا تو مُردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کیا تم یقین نہیں رکھتے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیوں نہیں میں یقین رکھتا ہوں لیکن یہ اس لیے تاکہ میرا دِل تسکین پکڑے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، چار پرندے پکڑ لو اور پھر انہیں اپنے پاس مانوس کر لو (یا اپنے پاس ٹکڑے ٹکڑے کر دو) پھر ہر پہاڑ پر اُن میں سے ایک ایک جزو رکھ دو۔ پھر اُن کو بلاؤ، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ کمال قدرت کا مالک اور حکمت والا ہے ﴿۲۶۰﴾

تمہید

توحید باری تعالیٰ، اُس کی کمال قدرت اور بعث بعد الموت کے متعلق اس رکوع میں دو واقعات آچکے ہیں۔ گذشتہ سے پیوستہ درس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے مناظرے کی تفصیلات بیان ہوئی تھیں۔

اور گذشتہ درس میں حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ آیا تھا۔ جس میں انہوں نے موت وحیات کے منظر کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر کے اطمینان قلب حاصل کیا۔ آج کے درس میں اسی قسم کا تیسرا واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ اس میں بھی بعث بعد الموت کا بیان ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود اللہ تعالیٰ سے سوال کیا۔ کہ انہیں

مُردوں کے زندہ ہونے کا مشاہدہ کرایا جائے تاکہ اُن کا ایمان عین الیقین کے درجے تک پہنچ جائے۔ اللہ تعالٰی نے آپ کی دُعا قبول فرمائی۔ اور حکم دیا کہ چار پرندے لے کر ذبح کرو۔ ان کے گوشت آپس میں ملا دو۔ پھر اُن کے تھوڑے تھوڑے حصے مختلف پہاڑوں پر رکھ دو۔ اس کے بعد ہر ایک پرندے کو اُس کا نام لے کر بلاؤ۔ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے مردہ پرندوں کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھ کر اطمینان قلب حاصل کیا۔

پس منظر بعض مفسرین کرام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اللہ تعالٰی سے اس سوال کے پس منظر میں یہ بات بیان کرتے ہیں کہ موت اور زندگی سے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرود کے ساتھ مکالمہ ہو چکا تھا۔ جس میں آپ نے دعویٰ کیا تھا کہ زندگی اور موت اللہ تعالٰی کے قبضہ میں ہے۔ مگر نمرود اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اور اس نے بے گناہ کو قتل کر دیا اور مجرم کو آزاد کر دیا۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اُس کی اس احمقانہ حرکت پر موضوع سخن بدل کر طلوع شمس کی دلیل پیش کر دی جس سے نمرود عاجز آگیا تو مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اگرچہ ابراہیم علیہ السلام کو پورا پورا یقین تھا۔ کہ اللہ تعالٰی مُردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ مگر اُن کے دل میں موت و حیات کا منظر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ اللہ تعالٰی نے آپ کو دکھا دیا۔ کہ کس طرح پرندے زندہ ہو گئے۔

بعض دوسرے مفسرین اس پس منظر میں یہ واقعہ بیان کرتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دریا کے کنارے پر ایک مُردہ جانور پڑا دیکھا۔ جب دریا میں مد آتی اور پانی کناروں سے باہر نکلتا تو دریائی جانور مردہ جانور کا گوشت کھاتے اور جب پانی پیچھے ہٹ جاتا۔ تو خشکی کے جانور اُس مردار کا گوشت کھاتے اور اُوپر سے پرندے بھی آکر گوشت کھا جاتے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کہ اس مردار کا گوشت خشکی، پانی اور فضا کے جانور کھا رہے ہیں۔ یہ گوشت کتنے مختلف پیٹوں میں جا رہا ہے۔ تو اللہ تعالٰی اس کے مختلف اجزا کس کس جگہ سے

کیسے اکٹھے کر کے اس کو دوبارہ زندہ کریگا۔ لہذا اُن کو خواہش پیدا ہوئی۔ کہ اللہ تعالےٰ انہیں وہ کیفیت مشاہدہ کرا دے جس طرح وہ قیامت کے دن لوگوں کو دوبارہ زندہ کریگا۔

چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا۔ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ اے مولا کریم! مجھے دکھا دے تو مُردوں کو کیسے زندہ کریگا۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن کیا تمہیں یقین نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ کیا تمہیں اس معاملے میں کوئی شک ہے۔ قَالَ بَلَىٰ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیوں نہیں، میں یقین رکھتا ہوں، مگر سوال کرنے کا مقصد یہ ہے۔ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي کہ میں اس معاملے میں اطمینانِ قلب چاہتا ہوں۔

انبیاء شک سے پاک ہیں

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کسی شک کی بنا پر تھا۔ کہ واقعی کوئی شخص مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ اس معاملہ میں تو کسی عام مومن کو بھی شک نہیں ہو سکتا۔ ابراہیم علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر تھے انہیں یہ شک کیسے ہو سکتا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَوَلَمْ تُؤْمِنْ تو یقین نہیں رکھتا۔ کہ مردے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ تو ابراہیم علیہ السلام کا جواب تھا بَلَىٰ کیوں نہیں زندہ ہو سکتے اے اللہ کریم! مجھے تو یقین کامل ہے۔ مگر میں محض تسکین قلب کے لیے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ لہذا وہاں پر شک کا کوئی احتمال نہیں تھا۔ صحیحین کی روایت میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ نَحْنُ أَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ إِبْرَاهِيمَ یعنی اگر ابراہیم علیہ السلام کو کسی قسم کا شک یا تردد ہوتا تو ہم ان کی نسبت شک کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کبھی شک ہوا۔ اور نہ میں نے کبھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کیا ہے۔ انبیاء ہمیشہ شک سے پاک ہوتے ہیں۔

اطمینانِ قلب کے لیے کسی چیز کا مطالبہ کرنا کمال یقین کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ تسکین قلب ایمان سے زاید چیز ہے۔ سورۃ فتح میں حدیبیہ کے واقعہ سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب صحابہ کرامؓ درخت کے نیچے بیٹھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ

والسلام کے دستِ مبارک پر بیعتِ رضوان کر رہے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کی بات کو جانتا تھا "فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ" اور ان پر تسکین نازل فرمائی۔ نبی کریم اور تمام صحابہ کرام کو تسکین قلب حاصل ہو گئی۔ بعض دوسرے مواقع پر بھی اس قسم کے اشارات ملتے ہیں۔ تو بہرحال نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی یہی بات سمجھائی۔ کہ مُردوں کو زندہ کرنے یا اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کسی بھی معاملے میں کسی نبی کو شک نہیں ہو سکتا۔ جب میں کسی معاملہ میں شک نہیں کرتا، تو ابراہیم علیہ السلام کیسے شک کر سکتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے "لَوْ كُشِفَ الْغِطَاءُ مَا ازْدَدْتُ يَقِيْنًا" یعنی اگر غیب کا پردہ بھی کھول دیا جائے۔ تو میرے یقین میں اضافہ نہیں ہو گا۔ اس قول سے بعض لوگوں نے یہ اخذ کیا ہے۔ کہ حضرت علیؓ کا علم الیقین اتنا پختہ ہے۔ کہ عین الیقین سے ان کے ایمان میں کوئی اضافہ نہیں ہو گا۔ برخلاف اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام اطمینانِ قلب کے لیے خود عین الیقین کا مطالبہ کر رہے ہیں لہٰذا بقول ان کے اس سے حضرت علیؓ کی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ بھائی! یہ بات نہیں ہے۔ حضرت علیؓ تو اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں۔ ان کے مراتب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مفسر قرآن مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ ایک ولی کا عین الیقین بھی نبی کے علم الیقین تک نہیں پہنچ سکتا۔ نبی کا اصل یقین ہی اتنا بلند ہے کہ ولی کی وہاں تک رسائی نہیں۔ چہ جائیکہ نبی کے طمانیت قلب والے یقین تک پہنچ جائے وہ تو اور بھی بلند ہوتا ہے۔ لہٰذا ولی کی نبی پر فضیلت تو کجا، وہ تو انبیاء کی گرد تک کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ حضرت علیؓ کا مطلب یہ ہے۔ کہ ایمان کی حد تک ان کا یقین اتنا پختہ ہے۔ کہ اس میں مزید اضافے کی گنجائش نہیں اگرچہ درمیان سے غیب کا پردہ بھی اٹھ جائے آپ نے اطمینانِ قلب کی بات نہیں کی۔ یقین اور طمانیت قلب دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ اسی لیے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا۔ کہ مولا کریم! تیری قدرت پہ مجھے پورا پورا

یقین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر میں دلی اطمینان چاہتا ہوں۔ جو کہ اس سے اگلا درجہ ہے۔ مجھے میری آنکھوں سے مشاہدہ کرا دے کہ مُردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں۔

چار پرندے

قَالَ اللّٰہُ تعالیٰ نے فرمایا فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ چار پرندے پکڑ لو۔ فَصُرْهُنَّ اِلَیْکَ انکو مانوس کرلو، اپنی طرف مائل کرلو۔ بعض اُسے ص کی زیر کے ساتھ فَصِرْهُنَّ پڑھتے ہیں۔ صَارَ یَصِیْرُ کا معنی ٹکڑے ٹکڑے کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے معنیٰ یہ ہوگا۔ کہ چار پرندے لو اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ بہر حال یہ لفظ دونوں معنوں میں آتا ہے۔ اپنے ساتھ مانوس کر لو۔ یا ذبح کر کے بوٹی بوٹی کر دو۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ پرندوں کو محض مانوس کیا گیا تھا، ذبح نہیں کیا گیا تھا۔ مگر یہ تفسیر مردود ہے اصل بات یہ ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے اُن پرندوں کو ذبح کیا۔ اُن کے پَر اُتار دیے اور ان کا گوشت ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں ملا دیا۔ خلط ملط کر دیا۔ جیسے گوشت کا قیمہ کیا جاتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ وہ چار جانور کون کون سے تھے۔ قرآن پاک میں تو اسکی تفصیل نہیں ہے۔ البتہ تفسیروں میں آتا ہے۔ کہ یہ چار جانور، مرغ، کوا، کبوتر، اور مور تھے۔ اور ان پرندوں کا انتخاب اس وجہ سے تھا۔ کہ ان میں کوئی نہ کوئی انسانی صفت پائی جاتی ہے۔ مثلاً مرغ میں شہوت کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے اور یہی چیز انسان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی وجہ سے بڑے ہنگامے، جنگیں اور پھر تباہی ہوتی ہے کوے میں حرص کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور بعض انسان بھی حرص و ہوا میں بہت آگے ہوتے ہیں۔ کبوتر میں دنیا کی محبت بیحد ہوتی ہے اور بعض دنیا دار انسان بھی اسی مرض میں مبتلا ہوتے تھے۔ چوتھا جانور مور ہے۔ اس میں تکبر کی فراوانی ہوتی ہے جب خوش ہوتا ہے۔ تو ناچنے لگتا ہے۔ اور اپنے خوبصورت پر پھیلا دیتا ہے۔ اُسے اپنے حسن و جمال پر بڑا فخر ہوتا ہے۔ مگر جب اپنے پاؤں کی طرف دیکھتا ہے تو شرمسار ہو جاتا ہے۔ اور پر گرا دیتا ہے۔ یہی حال حضرت انسان کا بھی ہے ذرا آسودگی ملتی ہے۔ تو غرور و تکبر کرتا ہے۔ بات بات پہ اکڑنا شروع کر دیتا ہے۔ اور جب اللہ

کی بچپ آتی ہے۔ تو ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ بعض لوگوں نے کوے کی جگہ گدھ کا ذکر کیا ہے وہ بھی کھانے کا بڑا لالچی ہوتا ہے۔ جب کہ اکثر انسان بھی کھانے پینے کو ہی زندگی سمجھتے ہیں۔ انسان میں پائے جانے والے ان چار اوصاف یعنی حرص، شہوت، حبّ دنیا اور تکبر کے علاوہ ہر انسان کے بعض اپنے اپنے خواص بھی ہیں۔ جن میں خون، سودا، بلغم اور صفرا شامل ہیں۔ بہر حال ان چار اوصاف والے پرندوں کے انتخاب سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کہ ان کو ذبح کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان بھی اگر ان اوصاف قبیحہ کو کچل ڈالے، تو کمال تک پہنچ جائے گا۔ جب تک یہ گندے اوصاف انسان میں موجود رہیں۔ وہ کامیابی کی منزل سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔

پرندوں کی موت وحیات

بہر حال قرآن پاک یا حضور علیہ السلام نے ان پرندوں کی تفصیل نہیں بتائی۔ اس قسم کی باتیں تفسیری روایات میں آتی ہیں۔ اس قسم کی حکمت کی باتیں مفسرین کرام سمجھا دیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چاروں پرندوں کو ذبح کیا۔ اُن کے پر علیحدہ کر دیے۔ پھر اُن کے گوشت کا قیمہ کر کے آپس میں ملا دیا۔ اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا پھر ہر پہاڑ پر اُس ملے جلے گوشت کا ایک جزو رکھ دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیل حکم کیا۔ اُس قیمہ کے چار حصے کیے اور چار مختلف پہاڑوں پر رکھ دیے

پھر ارشاد ہوا۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ پھر انہیں بلاؤ تفسیری روایات میں آتا ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے باری باری ہر ایک پرندے کا نام لے کر بلایا۔ اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ يَأْتِينَكَ سَعْيًا تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب آپ نے مرغ کو آواز دی تو فضا میں اس کی ہڈیاں نمودار ہوئیں۔ پھر اس کے گوشت کا جو جو حصہ جس جس پہاڑ پر تھا، وہاں سے فوراً آیا اور ہڈیوں پر چڑھ گیا۔ پھر مرغ کے پر آکر لگ گئے اور مکمل مرغ بن کر زندہ ہو گیا۔ اس طرح دوسرے پرندے بھی زندہ سلامت ہو گئے۔ جس طرح عزیر علیہ السلام کے گدھے کی ہڈیاں اکٹھی ہوئیں ان پر گوشت چڑھا۔ اور پھر وہ مکمل گدھا بن کر آواز دینے لگا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام

کی نظروں کے سامنے ذبح شدہ پرندے دوبارہ زندہ ہو گئے۔ اور اس طرح اللہ تعالےٰ نے دکھا دیا کہ وہ مردوں کو کیسے زندہ کریگا۔ یہ جواب تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کا "رَبِّ اَرِنِی کَیۡفَ تُحۡیِ الۡمَوۡتٰی" کہ مولا کریم! مجھے مشاہدہ کرادے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

کمال قدرت کا مشاہدہ

زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا ایک نمونہ ہے اس قسم کے بیشمار مشاہدات انسان اپنی روزمرہ زندگی میں کرتا ہے۔ انسان کی آنکھوں کے سامنے زمین بالکل خشک ہو جاتی ہے۔ کوئی سبزہ نہیں ہوتا۔ پھر بارش ہوتی ہے۔ تو پھر سرسبز ہو جاتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ "یُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا" مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ فرمایا "کَذٰلِکَ یُحۡیِ اللّٰہُ الۡمَوۡتٰی" اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کریگا یہ کوئی عجوبہ نہیں جس کا انکار کر دیا جائے۔ اس قسم کی چیزیں تو ہم ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ہر موسم کی اپنی بہار ہوتی ہے۔ کبھی درخت اور نباتات اپنے جوبن پر ہوتے ہیں۔ پھر خزاں کا موسم آتا ہے۔ تو درختوں کے پتے گر جاتے ہیں۔ اور درخت ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں۔ پھر جب بہار کا موسم آتا ہے تو نئے شگوفے پھوٹتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے درخت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ ان میں پھل لگتے ہیں۔ پکتے ہیں اور پھر لوگ انہیں اتار لیتے ہیں۔ یہی حال سبزیوں اور فصلوں کا ہے جب موسم آتا ہے۔ تو کسان زمین کو پانی دیتا ہے۔ یا آسمان سے بارش برستی ہے۔ پھر زمین میں ہل چلایا جاتا ہے بیج بویا جاتا ہے۔ پھر فصل اور سبزیاں اُگتی ہیں۔ اور جب پک کر تیار ہو جاتی ہیں۔ تو انہیں کاٹ لیا جاتا ہے۔ اور زمین پھر ایک دفعہ ویران ہو جاتی ہے۔

بنی اسرائیل کے ایک مردہ کے زندہ ہونے کا واقعہ گزر چکا ہے اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے بنی اسرائیل کو حکم دیا۔ کہ گائے ذبح کرو۔ اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا اس مردہ کو لگاؤ تو وہ زندہ ہو جائے گا۔ وہاں پر بھی یہی الفاظ آئے تھے "کَذٰلِکَ یُحۡیِ اللّٰہُ الۡمَوۡتٰی" اللہ تعالیٰ اسی طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی

آنکھوں کے سامنے ذبح شدہ پرندوں کو زندہ کیا۔ مطلب یہی تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ کمال قدرت کا مالک ہے جب اس کا حکم ہوگا۔ قیامت برپا ہوگی۔ تو تمام مردے دوبارہ زندہ ہوجائیں گے۔ فرمایا وَاعْلَمْ اور جان لو، خوب اچھی طرح سمجھ لو، اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے۔ جس طرح چاہے کرے، اس کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ وہ حکیم ہے۔ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ وہ کمال درجہ کی حکمت کا مالک ہے عزیز کا معنیٰ عزت دینے والا بھی ہوتا ہے یہ خدا کی صفت ہے۔ وہ عزت کا مالک بھی ہے۔

معجزہ اور کرامت

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمال قدرت کے تین واقعات آچکے ہیں۔ خصوصاً بعث بعد الموت کے متعلق حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ پرندوں والا واقعہ بالکل واضح ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ اس قسم کا جو عجوبہ ظاہر کرتا ہے، اسے معجزہ کہتے ہیں۔ قرآن پاک اور احادیث میں بے شمار معجزات کا تذکرہ موجود ہے۔ اگر اس قسم کے واقعات کسی امتی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں تو وہ کرامت کہلاتے ہیں۔ قادری سلسلہ کے بزرگوں میں سے یہاں پنجاب میں ایک بزرگ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے ان کے لیے ثابت ہے کہ انہوں نے اللہ کے حکم سے مردہ کو زندہ کیا تھا۔ لکھنؤ میں ایک مردہ کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ لوگوں نے یہ کرامت بھی دیکھی۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے چچا کے سامنے بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ انہوں نے بھی مردہ کو زندہ کیا تھا الغرض! اس قسم کے واقعات کرامت کہلاتے ہیں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیئے۔ کہ معجزہ یا کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ ایسا کام انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ "وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ" کسی نبی کے اختیار میں بھی نہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسا کرسکتا ہے لہذا معجزات اور کرامات کے جو سچے واقعات ہیں۔ انہیں تسلیم کرنا چاہیئے۔ مگر بلا تحقیق ہر بے سروپا کو کرامت تسلیم کرنا درست نہیں

ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہاتھ پہ بہت سی کرامات ظاہر ہوئیں جن کا ثبوت ملتا ہے مگر بارہ سال تک کشتی ڈوبنے والے واقعہ کی کوئی اصل نہیں ہے۔ لہذا یہ قابل تسلیم ہرگز نہیں۔

معجزہ اور کرامت کے علاوہ ایک اور چیز ہے، جسے استدراج کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے۔ تو کسی کافر کے ہاتھ بھی کوئی عجوبہ ظاہر کر دے۔ مگر یہ عزت والی بات نہیں ہوتی بلکہ یہ امتحان ہوتا ہے، جس طرح حدیث شریف میں موجود ہے۔ کہ دجال مُردوں کو زندہ کریگا۔ یہ کرامت نہیں بلکہ استدراج ہوگا۔

توحید باری تعالیٰ اور معاد کے متعلق تین واقعات بیان کرنے کے بعد روئے سخن پھر انفاق فی سبیل اللہ کی طرف جاتا ہے اگلی آیات کا تعلق پھر اُسی پہلی آیت اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ کے ساتھ ہے۔ لہذا اگلے رکوع کا موضوع پھر وہیں سے چلیگا، جہاں پچھلا بیان ختم ہوا تھا۔ درمیان میں اس کی تائید کے لیے تین واقعات کا ذکر آگیا ہے۔

درسِ یکصد پانزدہ (۱۱۵)
آیت ۲۶۱ تا ۲۶۳

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ
حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ
حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ
لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۶۲﴾ قَوْلٌ
مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ
وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

ترجمہ: اُن لوگوں کی مثال جو اللہ کے راستے میں اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔ اُس دانے جیسی ہے۔ جس نے سات بالیوں کو اُگایا۔ ہر بالی میں سو دانے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ دگنا کرتا ہے (بڑھاتا ہے) جس کے لیے چاہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۶۱﴾ جو لوگ اپنے مالوں کو اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں۔ پھر جو کچھ انہوں نے خرچ کیا اس کے پیچھے احسان جتلانا اور تکلیف دینا نہیں لگاتے ایسے لوگوں کے لیے اُن کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور اُن پہ کوئی خوف نہیں ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۶۲﴾ دستور کے مطابق بات اور درگذر کرنا اُس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے تکلیف (ستانا) ہو۔ اور اللہ تعالیٰ بے نیاز اور بردبار ہے ﴿۲۶۳﴾

ربطِ آیات
انفاق فی سبیل اللہ

آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان تھا، جو دین کا اصل الاصول اور بنیاد ہے اس آیت میں اللہ کی صفات کا ذکر بھی آچکا ہے۔ گذشتہ رکوع کی تین آیات میں تین

واقعات بیان ہوئے ہیں، جن کو جان لینے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ کہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت سے نوازتا ہے اور جسے چاہے اس سے محروم رکھتا ہے، زندگی اور موت بھی اللہ جل جلالہٗ کے دست قدرت میں ہے۔ کسی اور کے اختیار میں نہیں۔ اس سے پہلے بنی اسرائیل کے جہاد کا واقعہ بھی بیان ہوا۔ کہ کس طرح اُن لوگوں نے جہاد سے گریز کیا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا میں مبتلا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں واضح ہدایات دیں کہ جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کرو۔ اہل ایمان سے یہ بھی فرمایا "اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ" ہم نے جو تم کو رزق دیا ہے۔ اس میں سے خرچ کرو۔ درمیان میں مذکورہ بالا بیانات کے بعد روئے سخن پھر انفاق فی سبیل اللہ کی طرف ہے۔ ان آیات میں اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی فضیلت کا بیان ہے۔ اور ان شرائط کا ذکر ہے۔ جن کی بنا پر خرچ کیا ہوا مال اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے سات باتیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے دو باتوں کا ذکر آج کے درس میں ہے اور باقی پانچ اگلی آیات میں آئیں گی۔

اجر و ثواب کے درجات

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اور اس کے بدلے میں ملنے والے اجر کا نقشہ کھینچا ہے۔ نیکی کے ہر کام میں خرچ کرنا انفاق فی سبیل اللہ کہلاتا ہے۔ تاہم جہاد کی خاطر خرچ کرنا اس کی خصوصی مد ہے۔ کیونکہ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے دین کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ جس سے دین کی اشاعت میں مدد ملتی ہے۔ دینی تعلیم کا فروغ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے علاوہ غرباء و مساکین کی اعانت، بیوگان اور یتامیٰ کی حاجت روائی انفاق فی سبیل اللہ کا اہم جزو ہے۔ اس قسم کے تمام اخراجات کی فضیلت اور اجر و ثواب کو اللہ تعالیٰ نے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے مال کی مثال اُس دانے جیسی ہے اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ جو سات خوشے اگاتا ہے۔ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ اور ہر خوشے میں سو دانے پیدا

ہوتے ہیں۔ جس طرح زرخیز زمین میں ایک دانہ بویا جائے اور اس کی مناسب دیکھ بھال اور آبیاری کی جائے تو اس سے سات سو دانے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ ہونے والے ایک پیسہ کا اجر و ثواب سات سو گناہ حاصل ہوتا ہے۔

قرآن و سنت میں ہر نیکی کے اجر و ثواب کے کئی معیار ہیں جن کا ذکر آتا ہے سورۃ انعام میں آتا ہے۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا۔ ایک نیکی کا بدلہ دس گنا ہے جب کہ حدیث میں سات سو گنا تک بیان کیا گیا ہے۔

اس ضمن میں مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ نیکی کے کام میں جس قدر اخلاص پایا جاتا ہے۔ اُس کے مطابق اس نیکی کا اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے۔ تاہم سورۃ انعام کی آیت پاک کے مطابق ہر نیکی کا کم از کم اجر دس گنا ہے۔ اس کے بعد جس قدر اخلاص بڑھتا جائیگا۔ ثواب میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ اعلیٰ درجہ کے اخلاص پر سات سو گنا تک اجر حاصل ہوگا۔ تاہم مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ جس کے ساتھ دین کی اقامت اور اشاعت وابستہ ہے اس سلسلہ میں کی گئی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کی نیکی کا ثواب سات سو گنا سے شروع ہوتا ہے اور پھر جس قدر خلوص بڑھتا جاتا ہے اُسی قدر اجر و ثواب بھی بڑھتا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ کسی جہاد کے موقع پہ ایک شخص نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایک اونٹنی پیش کی جس کو مہار لگی ہوئی تھی اور اس پہ کجاوہ کسا ہوا تھا آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا، تم نے بہت اچھا کیا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت والے دن ایسی کسے ہوئے کجاوے والی سات سو اونٹنیاں عنایت کرے گا۔ گویا جہاد میں خرچ کیے جانے والے مال کا کم از کم اجر سات سو گنا سے شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ دین کی عزت اور بقا جہاد کی وجہ سے ہے۔ اور اعلیٰ درجے کی کوئی انتہا نہیں ہے اللہ تعالیٰ جتنا چاہے۔ بڑھا چڑھا کر دے دے وہ مالک ہے۔ اسی لیے فرمایا وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے جس کے لیے چاہے وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے صدقہ کی فضیلت کے متعلق دو باتیں یہاں بیان فرما دیں پہلی یہ

کہ عام نیکی کا بدلہ دس گناہ سے لے کر سات سو گنا تک ہے۔ اور جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے کا کم از کم اجر سات سو گناہ اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں ۔

معیار قبولیت

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کیے جانے والے مال کی قبولیت کا ایک معیار مقرر کیا ہے۔ اور وہ ہے۔ کہ صدقہ محض رضا الٰہی کے لیے ہو۔ اور وصول کنندہ کو نہ تو احسان جتلایا جائے۔ اور نہ اُسے صدقہ کے بدلے اذیت دی جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی پھر اُس خرچ کرنے کے پیچھے احسان اور اذیت نہیں لگاتے یعنی وہ کوئی چیز دے کر مستحق کو نہ احسان جتلاتے ہیں۔ کہ میں نے تیری فلاں وقت حاجت پوری کی اور نہ اسکو اذیت پہنچاتے ہیں یعنی ستاتے نہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ غریب آدمی کو صدقہ دیا۔ اور پھر اُسے بار بار یاد دلاتے رہے۔ یا دوسروں کے سامنے بیان کرتے پھرتے ہیں۔ کہ میں نے فلاں آدمی کو زکوٰۃ و خیرات دی ہے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب محتاج کو کوئی چیز عطا کی ہے۔ اس کے بدلے میں اس سے بیگار لی جائے۔ جو ظاہر ہے کہ اُسے تنگ کرنے اور ستانے کے مترادف ہو گا۔ کسی کو دھکا دیدیا جائے۔ پٹائی کر دی جائے، گالی نکالی جائے یا طعن و ملامت کی جائے۔ یہ سب ایذا رسانی کی باتیں ہیں۔ فرمایا وہ لوگ جو خرچ کرنے کے بعد ایسی بری حرکات سے باز رہتے ہیں۔ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ایسے ہی لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں اجر ہے۔ جو انہیں کئی گنا بڑھا چڑھا کر دیا جائے گا۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ایسے لوگوں کو نہ اس دنیا میں کوئی خوف ہو گا۔ اور نہ وہ اگلے جہاں میں غمگین ہوں گے۔ بلکہ ان کی دنیا و آخرت ہر دو مقامات سنور جائیں گے اور وہ کامیاب و کامران ہونگے۔

برخلاف اس کے اگر کسی شخص نے کسی محتاج کی مالی اعانت بھی کی۔ اور اس کو احسان جتلایا یا اذیت پہنچائی۔ تو اس کا صدقہ باطل ہو گا۔ اور اس کے بدلے میں

کوئی اجر و ثواب بھی حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ الٹا معصیت میں مبتلا ہو کر عذاب کا مستحق ہو جائیگا۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ احسان جتلانے والے شخص کی طرف نظر شفقت سے دیکھنا بھی پسند نہیں کریگا۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پاک بھی نہیں فرمائے گا۔ بلکہ اُن کے لیے عذاب الیم تیار ہوگا۔ اس حدیث میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اپنا تہبند یا شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکاتا ہے۔ اس کی طرف نظر شفقت سے نہیں دیکھیگا۔ اور وہ جہنم میں جائیگا۔ حدیث کے الفاظ میں اسفل من الکعبین ففی النار بھی آیا ہے۔ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ لٹکانا مکروہ تحریمی اور قابل مؤاخذہ ہے۔ بہر حال صدقہ کے متعلق دو چیزوں کی سخت وعید فرمائی۔ کہ صدقہ دینے والا نہ تو احسان جتلائے اور نہ تکلیف دے۔ اگر ایسا کرے گا۔ تو نہ صرف اس کا صدقہ باطل ہو جائے گا۔ بلکہ خود معطی گنہگار ہوگا اور عذاب کا مستحق ٹھہریگا۔

سائل کے ساتھ نرم رویہ

بعض اوقات سائل لجاجت کرتا ہے۔ منت سماجت کرتا ہے۔ اور اپنے سوال پر اصرار کرتا ہے۔ اس صورت میں فرمایا قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ دستور کے مطابق نرم جواب دینا وَّمَغْفِرَةٌ اور درگزر کرنا اس کے اصرار پہ بدزبانی سے پرہیز کرنا خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى اس صدقہ سے بہتر ہے۔ جس کے بعد اذیت پہنچائی جائے۔ مطلب یہ کہ سائل کے بضد ہونے پر اُسے نرمی کے ساتھ جواب دے دیا جائے تو بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ اُسے کچھ دے بھی دیا جائے۔ اور ساتھ طعن تشنیع اور گالی بھی دے دی جائے۔ یا اُسے دھکے دیکر نکال دیا جائے۔ ایسا کرنے سے صدقہ باطل ہو جائے گا۔ لہذا ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرتے وقت یہ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے صدقات و خیرات کی ضرورت ہے۔ نہیں، بلکہ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ اللہ تعالیٰ تو ایسی چیزوں سے بے نیاز ہے۔ صدقہ دینے سے انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے اسے تقرب الی اللہ حاصل ہوگا۔ اس کا نفس پاک ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ حَلِيْمٌ بھی ہے۔ بڑا بردبار ہے۔ اکثر اوقات مجرموں کو مہلت دیتا ہے۔ بہت سے

لوگ اللہ کی اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بُرے کاموں میں لگ جاتے ہیں ۔
مگر انہیں معلوم ہونا چاہیئے۔ کہ اللہ تعالیٰ وقت مقرر پہ گرفت بھی کر لیتا ہے ۔

درس یکصد شانزدہ (۱۱۶) — (آیت ۲۶۴ تا ۲۶۶)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ
وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ
تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ۭ لَا يَقْدِرُوْنَ
عَلٰي شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٦٤﴾
وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ
اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۢ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا
وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۭ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿٢٦٥﴾ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ
مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا
مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَاَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ښ صلے
فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٢٦٦﴾ ع ٣٦ ع ٤

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے صدقات کو باطل نہ کرو۔ احسان جتلا کر اور تکلیف دے کر۔ اُس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتا۔ پس اُس شخص کی مثال (یعنی اس کے خرچ کرنے کی) صاف چٹان یا پتھر کی ہے، جس پر مٹی ہو پس پہنچے اس کو موسلا دھار بارش اور چھوڑ دے اس کو بالکل خالی اور صاف۔ یہ لوگ اس میں سے کسی چیز پر قادر نہیں

ہوں گے جو کچھ انہوں نے کمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کفر کرنے والی قوم کی راہنمائی نہیں کرتا۔ (۲۶۴) اور اُن لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے، اور اپنے دلوں کی پختگی کے لیے، ان کی مثال اُس باغ جیسی ہے۔ جو اونچی جگہ پر واقع ہو۔ اس کو موسلا دھار بارش پہنچے، پس وہ اپنا پھل دگنا دے۔ پس اگر زوردار بارش نہ پہنچے تو ہلکی بارش بھی اس کے لیے کارآمد ہوگی، اور اللہ تعالیٰ نگاہ میں رکھتا ہے۔ جو کام تم کرتے ہو (۲۶۵) کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے۔ کہ اُس کا کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو۔ اُس کے سامنے نہریں بہتی ہوں۔ اور اس شخص کے لیے اس باغ میں ہر قسم کے پھل ہوں۔ اور اُس شخص کو بڑھاپا آ پہنچے اور اس کی اولاد کمزور ہو۔ پس اس باغ کو بگولہ پہنچے جس کے اندر آگ ہو اور وہ اُس باغ کو جلا ڈالے۔ اسی طرح اللہ تعالےٰ واضح طور پر اپنی آیات بیان فرماتا ہے۔ تاکہ تم غور و فکر کرو (۲۶۶)

ابطال صدقہ کی پہلی دو وجوہات

ابطال صدقہ کے متعلق دو وجوہات کا ذکر گذشتہ درس میں بھی آ چکا ہے۔ آج کے درس میں ان کا تذکرہ دوبارہ آ رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی اے اہل ایمان! اپنے صدقات و خیرات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل نہ کرو۔ یہی دو چیزیں پہلے بھی بیان ہوئی ہیں وہاں فرمایا تھا "ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی" گویا دونوں مقامات پر احسان اور اذیت کو ابطال صدقہ کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ایسا کرنے سے نہ صرف صدقہ بے مقصد ہو جاتا ہے۔ بلکہ الٹا انسان گنہگار ہو کر عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ گویا یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے خرچ کرنے کا نام ہے۔ یہ دو باتیں آ گئیں۔

تیسری وجہ ریاکاری

ابطال صدقہ کی تیسری وجہ کے متعلق فرمایا کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ جو شخص لوگوں کے دکھانے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اس کا صدقہ بھی اسی طرح باطل ہو جاتا ہے۔ جس طرح احسان جتلا کر اور اذیت پہنچا کر

ضائع ہوتا ہے۔ ریاکار نہ صرف اجر و ثواب سے محروم رہتا ہے بلکہ الٹا گناہ گار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس نے اللہ کی رضا کے لیے خرچ نہیں کیا۔ بلکہ شہرت اور نیک نامی کی خاطر کیا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ریاکار کو فرمائے گا، جاؤ تمہارے بیلے میرے پاس کوئی اجر نہیں۔ تم ایسے صدقہ کا اجر ان سے لو۔ جن کی خوشنودی کی خاطر صدقہ کیا تھا۔ کیونکہ انا اغنی الشرکاء میں شریکوں سے پاک ہوں میرا کوئی ہمسر نہیں۔ اسی لیے ریا کو شرک اصغر کہا گیا ہے۔ شرک کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں ریا ہلکی قسم کا شرک شمار ہوتا ہے۔

فرمایا ایک تو ایسا شخص دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے اور دوسرے وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر یقین بھی نہیں رکھتا۔ اگر اسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی قدرت کاملہ اور بعث بعد الموت کا یقین ہوتا۔ تو پھر دوسروں کو دکھاوے کے لیے نیکی کا کام نہ کرتا محض رضا الٰہی کے لیے اپنا مال خرچ کرتا۔

چٹان کی مثال

فرمایا وَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ ریاکار کی مثال اس چٹان کی سی ہے۔ جس پر مٹی پڑی ہو۔ اور بظاہر یہ نظر آئے۔ کہ اگر اس مٹی میں بیج بو دیا جائے تو فصل اُگ آئے گی۔ مگر حقیقت میں وہ مٹی نہیں ہوتی بلکہ سخت اور صاف چٹان پہ مٹی کی تہ جمی ہوتی ہے۔ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ جب اس پر زور کا مینہ برسا، تیز بارش ہوئی فَتَرَكَهٗ صَلْدًا تو مٹی بہ گئی اور صاف چٹان باقی رہ گئی۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح چٹان پہ بوئے گئے بیج سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ریاکاری میں خرچ کیے گئے مال کا کچھ بدلہ نہیں ملے گا۔ جو بھی صدقہ احسان جتلانے، ایذا پہنچانے یا ریاکاری کے لیے دیا جائے گا وہ باطل ہو جائے گا فرمایا لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا یہ لوگ اس میں سے کسی چیز پہ قادر نہیں ہونگے جو کچھ انہوں نے کمایا ہے یعنی جو صدقہ وخیرات کیا ہے۔ کیونکہ اس میں ریاکاری کا عنصر شامل ہے لہذا انہیں اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔

کافر راہنمائی سے محروم ہیں

فرمایا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ اللہ تعالیٰ کافروں کی راہنمائی نہیں کرتا۔ جو لوگ بظاہر نیکی کا کام کرتے ہیں۔ دھڑا دھڑ مال خرچ کر رہے ہیں مگر نیت میں خرابی ہے۔ کوئی احسان جتلا رہا ہے۔ کوئی ایذا پہنچا رہا ہے۔ اور کوئی محض ذاتی شہرت کی خاطر خرچ کر رہا ہے۔ تو ایسے لوگ ہمیشہ غلط راستے پر بھٹکتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی راہِ راست کیطرف راہنمائی نہیں فرمائیں گے۔ یہ ان کے لیے سزا کے طور پر ہے۔ ورنہ اگر ان میں ذرہ بھی نیک نیتی موجود ہو، تو اللہ تعالیٰ ان کی راہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف فرما دے۔ مگر جب تک یہ لوگ اپنی بُری حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ کفر، شرک اور فسق و فجور پر نادم ہو کر اس کو ترک نہیں کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ سے خود صراطِ مستقیم کی راہنمائی طلب نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نصیب نہیں کرے گا۔

رضائے الٰہی کے لیے خرچ

ریاکاری کے طور پر خرچ کرنے کی وضاحت کے بعد اب تصویر کا دوسرا رُخ پیش کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ اور اُن لوگوں کی مثال جو اللہ کی رضا کے لیے اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ رضائے الٰہی کا حصول بہت بڑی نعمت ہے۔ جس سے اللہ راضی ہوگیا۔ اسے سب کچھ مل گیا۔ اور جس کسی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوگیا۔ وہ ہر چیز سے محروم ہوگیا، تو فرمایا جو لوگ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے مال خرچ کرتے ہیں وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ اور ان کا دوسرا مقصد اپنے نفسوں کو ثابت رکھنا ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ اُن کا مقصود اصلاحِ نفس بھی ہوتا ہے۔ تاکہ دل انفاق فی سبیل اللہ اور نیکی کے دوسرے کاموں پر ثابت قدم رہے۔ اور ان کے دلوں سے بخل کا مادہ دور ہو کر ان میں فیاضی کا مادہ پیدا ہو جائے۔ فرمایا ایسے لوگوں کی مثال كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اُس باغ جیسی ہے۔ جو اونچی جگہ پر واقع ہو اَصَابَهَا وَابِلٌ جب اس باغ پر زوردار بارش ہو۔ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ تو وہ دُگنا پھل دے۔ فَاِنْ لَّمْ

يُصِبۡهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ اور اگر تیز بارش نہ ہو تو اس کے لیے معمولی بارش جیسے اوس، بھی کافی ہو۔ مفسّرین کرام فرماتے ہیں۔ یہاں پر تیز بارش سے مراد یہ ہے۔ کہ کوئی شخص فیاضی کا خوب مظاہرہ کرتا ہے۔ اور اللہ کے راستے میں کھُل کر خرچ کرتا ہے۔ تو اس مثال کے مطابق وہ کئی گنا زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہے۔ اور معمولی بارش یعنی تھوڑی مقدار میں خرچ کرتا ہے۔ تو اس کی کامیابی کے لیے وہ بھی کافی ہے۔ بشرطیکہ اس کی نیت درست ہو، احسان، ایذا اور ریاکاری سے پاک ہو۔ نیت بمنزلہ زمین کے ہے۔ اگر زمین زرخیز ہے یعنی نیت درست ہے۔ تو تھوڑا خرچ کرنا بھی اس کے لیے مفید ہوگا۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے۔ اَخۡلِصۡ فِیۡ دِیۡنِكَ يَكۡفِيۡكَ قَلِيۡلٌ مِّنَ الۡعَمَلِ اپنے دین میں اخلاص پیدا کر لو، تو تھوڑا عمل بھی کفایت کرے گا۔ لہٰذا نیکی کے ہر کام میں رضا الٰہی ہمیشہ پیش نظر ہونی چاہیے، قبولیت کا یہی معیار ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس کو خوب دیکھ رہا ہے۔ تمہارے کسی عمل سے غافل نہیں۔ تمہارے دلوں کے حالات اور نیت سے واقف ہے۔ وہ تمہارے اخلاص کے درجے کو جانتا ہے۔ اس سے کوئی چیز اوجھل نہیں لہٰذا ہر کام کرتے وقت اپنی نیت کو درست کر لو۔

باغ کی مثال

کسی متوقع نعمت کے ضائع ہو جانے پر کس قدر پریشانی ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت، چٹان والی مثال میں ہو چکی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ اس قسم کی ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں۔ جس میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت پر ہی انسان کا انحصار ہو۔ اور وہ ضائع ہو جائے تو انسان کو کس قدر دکھ ہوتا ہے۔ اور اس کی امیدوں پر کس طرح پانی پھر جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص نیکی کا کام کرنے کے باوجود بعض وجوہ کی بنا پر اس کے اجر و ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو اس کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمۡ اَنۡ تَكُوۡنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ کیا تم میں سے کوئی شخص

یہ بات پسند کرتا ہے۔ کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو۔ جس کے سامنے نہریں بہتی ہوں لَهُ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ اس باغ میں ہر قسم کے پھل موجود ہوں وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ اور باغ کا مالک بڑھاپے کی عمر میں ہو۔ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ اور اس کی اولاد کمزور ہو۔ یعنی اُن کے لیے کوئی اور ذریعہ معاش بھی نہ ہو۔ تو ایسی صورت میں فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ باغ کسی بگولے کی لپیٹ میں آجائے جس کے اندر آگ ہو جو باغ کو جلا کر خاک کر ڈالے۔ تو ذرا اندازہ کیجئے، ایسی صورت میں اُس باغ کے مالک کی کیا حالت ہوگی۔ اس کا ایک ہی ذریعہ معاش تھا۔ یہ باغ ہی اس کی کل پونجی تھی۔ جس پر اس کا اور اس کی اولاد کا انحصار تھا۔ جب یہ ہی جل کر خاکستر ہو گیا۔ تو وہ کس طرح ہر چیز سے محروم ہو گیا۔

فرمایا احسان جتلانے والے، ایذا پہنچانے والے یا ریاکاری کے لیے خرچ کرنے والے کی حالت بھی قیامت کے دن ایسی ہوگی۔ جس طرح وہ باغ اپنے مالک کا کرسنی کا سہارا تھا۔ اسی طرح یہ شخص اپنے خرچ کردہ مال کے اجر و ثواب کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ مگر جب قیامت کا دن ہوگا۔ تو ایسا شخص اسی طرح ثواب سے محروم ہو جائے گا۔ جس طرح باغ کا مالک باغ کے جل جانے کے بعد اس کے ثمرات سے محروم ہو گیا، قیامت کے دن ایسا شخص ایک محتاج اور بالکل قلاش کے طور پر پریشان پھرے گا۔ مگر اس کو فائدہ پہنچانے والی کوئی چیز اس کے پاس نہ ہوگی۔

فرمایا كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام یا نشانیاں تمہارے پاس کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ تاکہ تم غور و فکر کرسکو۔ اچھی اور بری چیز میں امتیاز کر سکو لہٰذا آج صراط مستقیم پر گامزن ہو جاؤ تاکہ کل قیامت کو پریشانی سے بچ جاؤ۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ
اَخۡرَجۡنَا لَـكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۚ وَلَا تَيَمَّمُوا الۡخَبِيۡثَ مِنۡهُ
تُنۡفِقُوۡنَ وَلَسۡتُمۡ بِاٰخِذِيۡهِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِيۡهِ ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا
اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيۡدٌ ﴿۲۶۷﴾ اَلشَّيۡطٰنُ يَعِدُكُمُ الۡفَقۡرَ
وَيَاۡمُرُكُمۡ بِالۡفَحۡشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمۡ مَّغۡفِرَةً
مِّنۡهُ وَفَضۡلًا ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيۡمٌ ۖ ﴿۲۶۸﴾

ترجمہ :- اے ایمان والو! وہ پاک چیزیں خرچ کرو، جو تم نے کمائی ہیں۔ اور اس میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہیں۔ اور ردی چیز کا قصد نہ کرو کہ تم اس سے خرچ کرتے ہو۔ اور خود اس سے لینے والے نہیں، سوائے اس کے کہ تم اس میں چشم پوشی کرو۔ اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ بے پرواہ ہے اور تعریفوں والا ہے ﴿۲۶۷﴾ شیطان تم کو فقر کا وعدہ دیتا ہے۔ اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۲۶۸﴾

ربطِ آیات

صدقات کی قبولیت کے متعلق تین شرائط کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ کہ کسی کو خیرات دے کر نہ تو اس پہ احسان جتلایا جائے۔ نہ اُسے تکلیف پہنچائی جائے اور نہ خرچ کرنے میں ریاکاری کا عنصر شامل ہو۔ یعنی خالص نیک نیتی کے ساتھ رضائے الٰہی مقصود ہو۔ اگر یہ چیزیں موجود ہوں گی، تو صدقہ باطل ہو جائے گا۔ اور دینے والا گنہگار ہو کر اُلٹا وبال میں پڑ جائے گا۔ آج کے درس میں قبولیت کی چوتھی شرط مال کی پاکیزگی کا بیان ہے۔

قبولیت کی چوتھی شرط پاکیزگی مال

ارشاد ہوتا ہے۔ یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ اے ایمان والو! خرچ کرو پاک اور ستھری چیزیں جو تم نے کمائی ہیں۔ گویا قبولیت صدقہ کے لیے یہ بھی ایک شرط ہے۔ کہ صاف ستھری اور بہتر چیز اللہ کے راستے میں دی جائے۔ مفسرین کرام نے طیبات کی تفصیل میں دو چیزیں بیان کی ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ جو مال فی سبیل اللہ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ حلال ہو۔ جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ حرام مال سے ادا کردہ صدقہ قابلِ قبول نہیں۔ مثال کے طور پہ اگر کوئی شخص چوری، ڈاکہ یا رشوت کا مال صدقہ کرتا ہے تو وہ بارگاہ ایزدی میں کیسے قبول ہو گا۔ بلکہ ایسا کرنے سے انسان الٹا گنہگار ہو گا۔ مسند احمد کی روایت میں ہے۔ کہ جو شخص حرام کمائی کی خوراک کھائے گا یا لباس پہنے گا۔ نہ اُس کی عبادت قبول ہو گی اور نہ اُس کا صدقہ خیرات قبول ہو گا۔ اور اگر ایسا شخص مر گیا اور اپنے پیچھے مال چھوڑ گیا تو وہی مال اس کے لیے جہنم کا زادِ راہ ہو گا۔ بعض چیزیں تو شرعاً قطعی حرام ہیں اور بعض مشتبہ ہوتی ہیں۔ مشتبہ مال کی خیرات بھی درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتی۔ کیونکہ واضح حکم موجود ہے۔ " كُلُوْا مِمَّا فِى الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا " یعنی حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ حرام سے پرہیز کرو۔

طیب کا دوسرا مفہوم یہ ہے۔ کہ جو چیز بھی صدقہ میں دی جا رہی ہے۔ وہ اعلیٰ اور بہتر ہو۔ نہ کہ نکمی اور ردی چیز۔ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔ کہ اچھی چیز اپنے لیے رکھ لی جائے اور کمتر چیز زکوٰۃ و صدقات میں دی جائے۔ یہ بھی مناسب نہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ بعض لوگ ایسے ہیں۔ جو کھجور کے اچھے گچھے اپنے واسطے محفوظ کر لیتے ہیں اور کمتر گچھے اصحاب صفہؓ کے لیے لٹکا دیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے ایسی تقسیم سے منع فرمایا ہے۔ جب تم خود ردی چیز کو پسند نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ اُسے کیسے پسند کریگا۔ لہٰذا زکوٰۃ و صدقات میں بہتر چیز دینی چاہیئے۔

ذاتی کمائی میں سے خرچ

فرمایا، اے اہل ایمان! اُن پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو مَا كَسَبْتُمْ جو تم نے کمائی ہیں۔ اب کمائی کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ منجملہ اُن کے کمائی کا اولین

ذریعہ انسان کی ذاتی محنت و مشقت ہے۔ کوئی تجارت کرتا ہے۔ دکاندار ہے۔ ملازم ہے ________ کارخانہ دار ہے
یا مزدور ہے۔ یہ سب ذاتی آمدن کے ذرائع ہیں آمدن کے بعض دوسرے ذرائع اضطراری ہوتے ہیں۔ جن میں انسان کی ذاتی مشقت کا دخل نہیں ہوتا، مثلاً کہیں سے ہدیہ مل گیا، وصیت کے ذریعے کوئی چیز حاصل ہو گی یا اُسے وراثت سے حصہ مل گیا۔ ان ذرائع سے حاصل شدہ مال بھی انسان کی ملکیت ہوتا ہے۔ تو پاکیزہ چیزیں خرچ کرنے کا قانون ان تمام ذرائع سے حاصل شدہ آمدنی پہ ہو گا۔ لہٰذا حکم ہوا ہے۔ کہ تم جس حلال مال سے بھی خرچ کرنا چاہو، اچھی اور بہتر چیز دو۔ اللہ کے راستے میں کم تر چیز دینے کی کوشش نہ کرو۔ پہلے گزر چکا ہے "اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ" اس میں سے خرچ کرو، جو ہم نے تمہیں دیا ہے۔ جب سارے کا سارا مال اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ تو پھر اُسی کے نام پہ اچھی سے اچھی چیز دینی چاہیئے۔ نہ کہ گھٹیا چیز۔ کیونکہ دینے والا تو وہ خود ہی ہے

زرعی پیداوار میں سے خرچ

براہِ راست خود محنت کر کے کمانے کے علاوہ ایک ذریعہ آمدنی زرعی پیداوار بھی ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان میں سے بھی خرچ کرو وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا زرعی پیداوار میں ہر قسم کا غلہ مثلاً گندم، جو، چاول، مکئی، باجرہ اور دالیں وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہر قسم کا پھل اور سبزیاں بھی زرعی پیداوار ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کتنا خرچ کیا جائے۔ تو سب سے پہلے جو کچھ فرض ہے، وہ ادا ہونا چاہیئے، جس طرح تجارت وغیرہ کے مال میں کل مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض ہے۔ اس طرح زرعی پیداوار سے عشر یعنی دسواں حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا فرض ہے۔ البتہ اس مد کے دو حصے ہیں۔ بارانی زمین یعنی جو زمین مالک کی مشقت کے بغیر سیراب ہوتی ہے۔ اس میں سے دسواں حصہ اور جو نہری یا چاہی زمین ہے جسے مالک خود محنت کر کے پانی بہم پہنچاتا ہے، اس میں سے بیسواں حصہ نکالنا فرض ہے البتہ بعض خودرو چیزوں جیسے گھاس، لکڑیاں اور کانٹے، ان تین چیزوں پر عشر نہیں

ہے۔ یہ معاف ہیں اگر یہ چیزیں خود کاشت کی جائیں۔ چارے کے لیے گھاس وغیرہ خود بوئی جائے البتہ ہی کے لیے درخت لگائیں یا کاتنے کی کاشت کی جائے، تو پھر ان پہ عشر ادا کرنا ہوگا۔ امام ابوحنیفہؒ کا یہی فتویٰ ہے۔ عشر کی ادائیگی تو فرض ہے۔ یہ تو لازمی ہے اس کے علاوہ اگر کوئی مزید خرچ کرے گا۔ تو وہ نوافل میں شمار ہوگا۔ اور موجب اجر و ثواب ہوگا۔

یہاں پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ حضور علیہ السلام کی حدیث ہے۔ لَيْسَ فِي الْخَضْرَوَاتِ صَدَقَةٌ یعنی سبزیوں میں صدقہ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بھی ہی پیداوار ہے۔ اور زمین ہی سے نکلتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ سبزیوں پہ عشر بالکل معاف ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے سبزیوں کا عشر سرکاری خزانے میں جمع کرانے کی ضرورت نہیں مالک خود اپنی صوابدید کے مطابق مستحقین میں تقسیم کر دے۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔ کہ سبزیاں جلد خراب ہو جانے والی چیز ہے سرکاری انتظام میں پہنچتے پہنچتے اور پھر تقسیم ہونے تک اس کے ضائع ہو جانے کا خدشہ ہے۔ اس لیے سبزی عشر یعنی دسواں یا بیسواں حصہ مالک کو خود تقسیم کر دینا چاہیئے۔ مثال کے طور پر اگر سبزی کے دس گھٹے حاصل ہوئے ہیں۔ تو ان میں سے ایک اللہ کی راہ میں دے دے۔ یا اگر زمین چاہی یا نہری ہے۔ تو بیس گھٹوں میں سے ایک ادا کر دے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہی مسلک قرآن و سنت سے موافقت رکھتا ہے۔

زرعی پیداوار کے نصاب کے متعلق فقہائے کرام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض فرماتے۔ کہ دو سو درہم سے کم مالیت کی زرعی پیداور پہ عشر نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث سے ثابت ہے کہ پانچ وسق سے کم اناج پہ عشر نہیں۔ اور پانچ وسق دو سو درہم کا بنتا ہے۔ مگر امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ حدیث تجارتی مال سے متعلق ہے۔ جس شخص کے پاس تجارت کی غرض سے پانچ وسق سے کم اناج ہے وہ زکوٰۃ نہ دے کیونکہ یہ نصاب کو نہیں پہنچتا۔ البتہ زرعی پیداوار کے متعلق فرماتے

ہیں۔ کہ زرعی پیداوار قلیل ہو یا کثیر اس پہ عشر ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق حدیث میں واضح الفاظ آئے ہیں۔ زمین کے مالک کو زرعی پیداوار کی کم سے کم مقدار پہ بھی عشر ادا کرنا ہوگا۔ البتہ یہ سوال باقی رہتا ہے۔ کہ عشر کون ادا کرے، مالک اراضی یا کاشتکار یا دونوں۔ بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ عشر کی ادائیگی کاشتکار پہ لازم آتی ہے۔ مالک اراضی پہ نہیں۔ تاہم راجح قول یہ ہے۔ کہ عشر کی ادائیگی کے حصہ رسدی دونوں ذمہ دار ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ کل پیداوار سے پہلے عشر نکالیں اور باقی اناج وغیرہ آپس میں تقسیم کریں۔

معدنیات میں سے خرچ

زمین کی پیداوار کا ایک اور ذریعہ معدنیات ہیں۔ عام زمین میں اور پہاڑوں میں کانیں پائی جاتی ہیں جن سے تانبہ نمک، کوئلہ، لوہا، سونا چاندی، تیل وغیرہ نکلتا ہے ان تمام چیزوں کی زکوٰۃ خمس یعنی کل آمدنی کا پانچواں حصہ ہے۔ چونکہ ان اشیاء کی پیداوار کے لیے عموماً محنت کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ بیج نہ پانی نہ نہلائی وغیرہ اس لیے اس کی کل آمدنی کا پانچواں یعنی بیس فیصد ادا کرنا ضروری ہے۔ البتہ ایک مسئلہ فقہائے کرام کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ کہ ان کانوں کا مالک کون ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں۔ کہ کانوں کا مالک وہ شخص ہے جس کی اراضی سے معدنیات برآمد ہوں، لہٰذا خمس بھی وہی ادا کرے گا۔ اگر یہ معدنیات کسی عام جنگل، صحرا یا سمندر سے نکلیں تو ان کی مالک حکومت ہوگی البتہ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ کان خواہ کہیں بھی نکلے اس کی مالک حکومت ہے۔ امام مالک صاحبؒ انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتے۔

خبیث مال قابلِ قبول نہیں

بہرحال فرمایا کہ اگر کمائی تمہاری ذاتی محنت و مشقت کی ہے۔ تو پھر اس میں سے حلال اور طیب چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور جو زمین کی پیداوار ہے اس میں سے بھی اچھی چیز خرچ کرو، وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنْفِقُونَ اور ردی یا کمتر چیز کو خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو، خبیث سے مراد ردی یا گھٹیا چیز ہے۔ اور اس کا اطلاق ناپاک چیز پر بھی ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ میں صاف

ستھری چیز دینی چاہیئے۔ کیونکہ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ گھٹیا چیز جب تم خود لینے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایسی چیز کیوں دیتے ہو۔ گھٹیا چیز قبول کرنے کی ایک صورت ہے کہ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ تم خود چشم پوشی کر لو۔ مگر یہ تم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ لہٰذا اللہ کی راہ میں بھی اچھی سے اچھی خرچ کرو۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ" تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے اچھی، صاف ستھری اور بہتر چیز ہی پسندیدہ ہوتی ہے۔ لہٰذا بہتر چیز ہی فی سبیل اللہ بھی ادا کرو۔

پاکیزہ چیز کے سلسلہ میں ترمذی شریف کی حدیث ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا تُقْبَلُ صَلٰوةٌ بِغَیْرِ طُهُوْرٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ یعنی طہارت کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتا۔ اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں کرتا۔ لہٰذا جس مال کی زکوٰۃ، صدقات، خیرات وغیرہ دی جارہی ہے اس کا حلال اور طیب ہونا بھی ضروری ہے۔ وَاعْلَمُوْٓا اچھے طریقے سے جان لو۔ اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ کہ اللہ تعالیٰ — بے پرواہ — اور بے نیاز ہے۔ اس کو تمہارے صدقات وخیرات کی کوئی ضرورت نہیں، یہ تو تمہارے اپنے ہی فائدے کے لیے ہے تاکہ تم اس سے آخرت میں مستفید ہو سکو۔ یہ دنیا میں قوم کے غرباء ومساکین کی اعانت کا ایک ذریعہ ہے۔ نیز تمہارے اپنے اخلاق بھی اس کی وجہ سے عالی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تم پر راضی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حمید یعنی تمام خوبیوں کا مالک خود ہے تم اچھا کام کرو یا بُرا کرو۔ وہ بے نیاز ہے۔ تمہارے اچھے اعمال نہ اس کی خدائی میں اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ تمہارے بُرے اعمال اسکی خدائی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو اس کی راہ میں خرچ کرو۔ اور اس کا شکریہ ادا کرو، کہ اس نے تمہیں انعام سے نوازا ہے۔

شیطان کا بہکاوا

فرمایا، دیکھنا اس معاملے میں شیطان کے بہکاوے میں نہ آجانا۔ شیطان کی یہ ہمیشہ کوشش ہوتی ہے۔ کہ وہ طرح طرح کے وسوسے ڈال کر انسان کو نیک عمل سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ شیطان انسان پر اس طرح حملہ آور ہوتا ہے۔ کہ اگر مال تھوڑا ہے۔ تو وہ بہکاتا ہے کہ اگر یہ مال صدقات میں دیدیا تو پھر تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ تم مفلس ہو کر دوسروں کے محتاج ہو جاؤ گے۔ جب اس قسم کا خیال آئے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے۔ اگر مال قلیل بھی ہے۔ تو اس میں سے کچھ نہ کچھ دے دو، اللہ تعالیٰ بقیہ مال میں برکت دیگا۔ فرمایا وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ اگر خرچ کرو گے تو اللہ تعالیٰ اس کی جگہ کسی دوسرے ذریعے مال دے دیگا۔ لہٰذا بخل نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ فراخدلی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو وافر مال دیا ہے۔ تو پھر شیطان دوسرے طریقے سے حملہ کرتا ہے وَیَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ وہ تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ مالدار آدمی کو فحاشی کے کاموں کی طرف لگا دیتا ہے۔ کہ فکر نہ کرو۔ تمہارے پاس بہت مال ہے۔ خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کرو۔ دنیا میں بار بار نہیں آنا۔ لہٰذا کھاؤ پیو، عیش کرو۔ یا پھر اس کا مال کھیل تماشے اور فضول رسم و رواج پر خرچ کراتا ہے۔ کہیں دھوم دھام سے شادی ہو رہی ہے۔ سالگرہ منائی جا رہی ہے۔ باجے بجائے جا رہے ہیں۔ چراغاں کیا جا رہا ہے۔ کہیں عرس منائے جا رہے ہیں۔ اور لاکھوں روپیہ ان فضول رسم و رواج پر ضائع کیا جا رہا ہے یہ سب شیطان کے بہکاوے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ

فرمایا اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ تمہیں ابدی نعمتوں سے نوازنا چاہتا ہے وَاللّٰهُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا اللہ تعالیٰ تم سے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ اگر اس کے حکم کے مطابق اس کے راستے میں خرچ

کروگے۔ تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف فرما دیگا۔ دنیا میں بھی برکت عطا کرے گا۔ اور آخرت میں اپنے فضل سے جنت میں داخل کر دیگا۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔ لہٰذا شیطان کے بہکانے میں نہ آنا بلکہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پر یقین کر کے اس کے احکام کی بجا آوری کرو۔ اور دائمی فلاح پا جاؤ۔ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیمٌ اللہ تعالیٰ بڑا ہی وسعت والا ہے۔ اس کے خزانے بہت وسیع ہیں۔ وہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں لوٹاتا بلکہ انہیں گُنا چوگنا عطا کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کو جاننے والا بھی ہے۔ وہ علیم بذات الصدور بھی ہے تمہاری نیتوں تک سے واقف ہے۔ جس قدر اخلاص تمہارے دلوں میں موجود ہو گا اللہ تعالیٰ اس کے مطابق بڑھا چڑھا کر تمہیں عطا کریں گے۔

درس یکصد ہشردہ (۱۱۸) — آیت ۲۶۹ تا ۲۷۰

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ جس کو چاہے حکمت عنایت فرماتا ہے اور جس کو حکمت دی گئی، اُسے بہت زیادہ بھلائی عطا کی گئی۔ اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر وہ لوگ جو عقل والے ہیں ﴿۲۶۹﴾ اور تم جو بھی خرچ کرو صدقہ خیرات یا کوئی نذر مانو، نذر ماننا تو بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ اور ظلم کرنے والوں کے لیے کوئی مددگار نہیں ﴿۲۷۰﴾

ربط آیات

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کی قبولیت سے متعلق چار شرائط کا ذکر فرمایا ہے۔ جن میں خیرات دیکر احسان نہ جتلانا، ایذا نہ پہنچانا، ریاکاری سے اجتناب اور پاکیزگی مال شامل ہیں۔ باقی شرائط کا ذکر اگلے دروس میں آئے گا۔ یہاں درمیان میں اللہ تعالیٰ نے حکمت کی تشریح بیان کی ہے۔ اور اُسے خیر کثیر سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں نذر ماننے کے متعلق بیان بھی ہے۔ کہ یہ کس حد تک جائز ہے۔

حکمت کا مفہوم

ارشاد ربانی ہے۔ يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَاءُ اللہ تعالیٰ جسے چاہے حکمت عطا کرتا ہے۔ حکمت کا مادہ احکام سے نکلا ہے، جو پختگی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا حکمت سے مراد وہ چیز ہے۔ جو پختہ ہو۔ اور پھر صدقہ کے ساتھ اس کے مختلف اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ حکمت کا عام معنی فہم اور سمجھ کیا جاتا ہے بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں اَلْعِلْمُ النَّافِعُ الْمُؤَدِّيْ اِلَى الْعَمَلِ یعنی حکمت ایسے علم کو کہا جاتا ہے، جو مفید ہو اور انسان کو عمل تک پہنچائے۔

امام مالکؒ حکمت کا معنی سنت کرتے ہیں۔ حکیم خدا تعالیٰ کی صفت بھی ہے

اور قرآن کریم کو بھی حکمت کہا گیا ہے۔ اور حضور علیہ السلام کی سنتِ مبارکہ کو بھی حکمت کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی سمجھ یا دانائی کی باتیں بھی حکمت میں شمار ہوتی ہیں۔

حضرت لقمانؑ کے نام پہ قرآن پاک میں سورۃ موجود ہے۔ آپ نبی نہیں تھے، بلکہ حکیم تھے عربی میں حکیم اُس شخص کو کہتے ہیں مَنْ اَتْقَنَ الْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جو علم اور عمل دونوں ——— میں پختہ ہو۔ علاج معالجہ کرنے والے کو عربی زبان میں حکیم نہیں بلکہ طبیب کہتے ہیں۔ بہر حال حکمت کا اعلیٰ ترین درجہ انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عام مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے حکمت و دانائی میں حصہ عطا کرتا ہے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ قرآن کریم کی سمجھ بہت بڑی حکمت ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عطا کر دے۔ حضرت علیؓ کی روایت میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے ہمیں عام مسلمانوں سے الگ کوئی خاص چیز نہیں دی۔ اَوْ فَهْمًا اُوْتِيَهُ رَجُلٌ ہاں اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی سمجھ دے دی ہو، تو اُس سے انکار نہیں کرتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے۔ اور خاص طور پہ پورے دین کا فہم اور سمجھ حکمت ہے ترمذی شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافق کو دو چیزوں سے محروم رکھا ہے، ایک اچھا اخلاق اور دوسرا دین کی سمجھ۔ بخاری شریف کی روایت میں حضور کا فرمان ہے مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ اللہ تعالیٰ جس کے بارے میں بہتری کا ارادہ فرماتا ہے۔ اسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے۔ پھر جب اس سمجھ کے مطابق عمل کرتا ہے۔ تو ایسا شخص ہی حکیم کہلاتا ہے۔

اس زمانہ میں حکیم کے ہم معنیٰ الفاظ دانشور، علاّمہ یا ڈاکٹر (پی ایچ ڈی) وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر یہ استعمال درست نہیں ہے۔ حکیم کے لیے ضروری ہے۔ کہ علم کی پختگی کے ساتھ اس پہ عمل بھی ہو۔ موجودہ دور میں بے شک بڑی بڑی ڈگریاں تو حاصل کر لی جاتی ہیں۔ مگر وہ عمل کہاں ہے جو حکمت کی اصل روح ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ

حکمت کی جڑ اور بنیاد خوفِ الٰہی ہے۔ حکیم وہی ہو سکتا ہے۔ جس کے دل میں خوفِ خدا ہو۔ وگرنہ محض علم حاصل کرنے سے کوئی شخص حکیم نہیں ہو سکتا۔

انفاق پہ حکمت کا اثر

گذشتہ درس میں گذر چکا ہے۔ کہ شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ شیطان انسان کو یہ پٹی پڑھاتا ہے کہ دیکھو اپنے مال کو خرچ نہ کرنا۔ اگر خرچ کر دیا تو تم مفلس ہو جاؤ گے۔ تمہارے بیوی بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ تمہارا بڑھاپے کا سہارا ختم ہو جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ اس شیطانی وسوسے سے وہی شخص بچ سکتا ہے جسے قرآن پاک کا فہم ہوگا۔ فہم قرآنی والا شخص ہی سوچے گا کہ انفاق فی سبیل اللہ سے مال کم نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ اس میں مزید برکت دینگے اسی چیز کا نام حکمت ہے اسی طرح گویا حکمت انفاق سبیل اللہ پہ اثر انداز ہوگی۔

حکمت منبع حسنات ہے

فرمایا اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ ہر آدمی حکمت حاصل نہیں کر سکتا۔ البتہ جس شخص میں جس قدر حکمت کے حصول کی استعداد ہوتی ہے۔ اس کے مطابق وہ اپنا حصہ وصول کر لیتا ہے۔ اور پھر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا جسے حکمت عطا کر دی گئی، اُسے خیر کثیر سے نوازا گیا۔ گویا حکمت یعنی فہم قرآن یا فہم دین تمام خوبیوں کا منبع ہے۔

اور فہم علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اور علم کی روشنی دینی مدارس پھیلا رہے ہیں۔ برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تقریباً سوا سو سال سے مصروفِ کار ہے۔ اس نے ایک صدی کے عرصہ میں چالیس ہزار علماء تیار کیے ہیں، جو صحیح معنوں میں دین کا فہم رکھنے والے لوگ ہیں۔ انہوں نے دنیا کے کونے کونے میں علم دین کی شمع روشن کی ہے۔

حضرت علیؓ اپنے بیٹوں کو نصیحت فرما رہے تھے۔ انہوں نے شکوے کے طور پہ فرمایا بہت سے آدمی شکل وصورت میں انسان نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں وہ جانوروں جیسے ہیں۔ جب مال میں کمی واقع ہوتی ہے۔ تو فوراً سمجھ جاتے ہیں مگر دین سارے کا سارا بھی برباد ہو جائے تو انہیں کچھ پرواہ نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ عقل دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک عقل وہ ہے جو ماہر معاشیات ہے۔ معاش میں ذرہ بھر کمی بیشی آئے، تو فوراً سمجھ جاتے ہیں۔ مگر دین

کے معاملے میں بڑے سے بڑا نقصان بھی انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا۔ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفروں، بیرسٹروں اور دانش وروں میں یہی خرابی پائی جاتی ہے۔ کہ ان کی عقل معاش تو اعلیٰ درجے کا ہے۔ مگر وہ معاد کے معاملے میں بالکل کورے ہیں۔
حقیقت میں کامل شخص وہ ہے۔ جو قیامت اور اپنی بازگشت کے مقام کو سمجھتا ہے۔
بہر حال اللہ تعالیٰ نے صدقات و خیرات کے ضمن میں یہ آیات نازل فرمائیں۔

گفت حکمت را خدا خیر کثیر — ہر کجا ایں خیر را بینی بگیر

اللہ تعالیٰ نے حکمت کو خیر کثیر فرمایا ہے۔ یہ جس جگہ بھی ملے اس کو اختیار کر لو، ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المؤمن حکمت کی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ اسے جہاں پاتا ہے۔ حاصل کر لیتا ہے۔ حکمت ہی ایسی چیز ہے۔ جو مومن کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ لہذا مومن ہمیشہ اس کا متلاشی رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی اعلیٰ عہدہ منصب یا کسی دوسری قیمتی سے قیمتی چیز کو خیر کثیر سے تعبیر نہیں کیا۔ مگر یہ لقب صرف حکمت کو عطا ہوا، کیونکہ حکمت تمام خوبیوں کا منبع ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ حکمت کی انتہا یہ ہے۔ کہ انسان افضل الاشیا کو افضل العلوم سے معلوم کرے۔ افضل الاشیاء خدا تعالیٰ کی ذات، وحدانیت اور اس کی صفات ہیں۔ لہذا جو شخص علم کے ذریعے اس راز کو پالے گا، وہی صاحب حکمت ہو گا۔ اور پھر علم بھی محض زبانی کلامی نہ ہو، بلکہ اس میں دل کی حضوری اور عقل کا کمال شامل ہو۔ لہذا جسے حکمت عطا کی گئی اُسے گویا بہت بہتری دے دی گئی۔ اور یہی چیز منبع صفات اور ہر چیز کی جڑ اور بنیاد ہے۔

فرمایا وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ یاد رکھو نصیحت قبول نہیں کرتے۔ مگر وہ جو عقل والے ہیں۔ اور پھر عقل کو صحیح طور پر استعمال بھی کریں۔
دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَلصُّمُّ الْبُکْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ وہ لوگ بہرے اور گونگے ہیں۔ جو عقل کو درست طریقے سے استعمال نہیں کرتے

کافروں کی مثال اللہ نے بیان فرمائی۔ کہ وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ کیونکہ جانور بھی بعض باتیں سمجھتے ہیں، مگر جو لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ فرمایا نصیحت کو بھی وہی شخص قبول کرتا ہے، جس کے اندر دانائی اور عقل ہوگی۔ دوسرے شخص کو نصیحت سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔

مسئلہ نذر

انفاق فی سبیل اللہ ہی کے ضمن میں یہاں پہ نذر کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے۔ وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اور تم جو بھی خرچ کرو کوئی خرچہ ہو مطلب صدقہ وخیرات ہی ہے۔ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ یا کوئی نذر مانو فَاِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُہٗ اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ یہاں پہ نذر کو صدقہ کے مقابلے میں ذکر کیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے۔ کہ صدقہ وخیرات تو بلاشبہ حسنات ہیں سے ہے۔ مگر نذر جائز ہونے کے باوجود خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نذر نہ مانا کرو، کیونکہ یہ آدمی کو تقدیر سے نہیں بچا سکتی۔ حدیث کے الفاظ ہیں لَا یُغْنِیْ نَذْرٌ عَنْ قَدَرٍ جو کچھ تقدیر میں ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ نذر بخیل لوگ مانتے ہیں، وگرنہ فیاض آدمی شرط نہیں لگاتے۔ وہ تو غیر مشروط طور پہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ گویا نذر ماننا مشروط عبادت ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں اتنے نوافل ادا کروں گا۔ یا روزے رکھوں گا یا اتنا صدقہ خیرات کروں گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرط ــــ باندھنے والی بات ہے۔ اور پھر یہ ہے۔ کہ جب وہ کام ہو جائے تو نذر کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ نذر جائز ہو۔ اور اگر نذر کو پورا نہ کیا تو انسان گنہگار ہوتا ہے۔

نذرِ معصیت

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے لَا نَذْرَ فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰہِ گناہ کے کام میں نذر ماننا جائز نہیں۔ اور اگر ایسا کر ہی لیا ہے تو پھر اس کا پورا کرنا درست نہیں بلکہ اس کو توڑ کر نذر کا کفارہ ادا کر دینا چاہیئے۔ فقہ کا مسئلہ ہے اَلنَّذْرُ عِبَادَةٌ

منت بمنزلہ عبادت ہے۔ اور عبادت بدنی بھی ہوسکتی ہے اور مالی بھی۔ بدنی عبادت کی کی مثال نوافل یا روزے ہیں۔ اور مالی عبادت میں صدقہ خیرات یا جانور ذبح کرنا ہے اسی لیے فرمایا کہ گناہ کے کام کے لیے یہ عبادت جائز نہیں ہے۔ اور اگر نذر غیر اللہ کے تقرب کے لیے مانی جائے تو یہ شرک بن جاتا ہے۔ جیسا کہ ہماری فقہ کی کتابوں عالمگیری اور شامی وغیرہ میں موجود ہے فقہائے کرام نے لکھا ہے۔ کہ جو لوگ قبروں کا غلاف چڑھاتے ہیں اور نذر مانتے ہیں۔ کہ اے بزرگ! اگر میرا فلاں کام ہوگیا، تو تمہارے دربار فلاں نذرانہ پیش کروں گا، فرمایا ایسی چیز بالاجماع باطل اور حرام ہے۔ کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ ہی کی ہوسکتی ہے۔ ہاں اگر ایسی منت مانے کہ اگر فلاں کام ہوگیا۔ تو اسی بزرگ کو ایصال ثواب کے لیے محتاجوں کی یہ خدمت کروں گا تو وہ الگ بات ہے۔ اور اگر بزرگ کو ہی حاجت روا سمجھ لیا تو کفر شرک میں مبتلا ہو گیا۔ اسی لیے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ معصیت کی نذر سرے سے نذر ہوتی ہی نہیں۔ جیسے کوئی کہے کہ فلاں کام ہونے پر دس آدمیوں کو شراب پلاؤں گا۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ مزاروں پر تیل چڑھانا، موم بتیاں جلانا، چادریں چڑھانا، بکرے چڑھانا یہ سب باطل اور ناجائز منت میں شامل ہیں۔ اور اگر ایسا کرنے سے مراد بزرگ کی قربت حاصل کرنا ہے۔ تو پھر بھی شرک میں داخل ہے۔ اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے۔ کہ خدا کے علاوہ یہ بھی ہماری حاجات پوری کرتے ہیں، تو بھی کفر ہے۔ اور اگر محض مجاوروں کو کھلانا مقصود ہے تو یہ تخصیص بھی غلط ہے۔ اپنے گلی محلے، گاؤں شہر کے غرباء و مساکین کو کھلاؤ، ان کی جائز ضروریات کا خیال رکھو۔ مزاروں پر تو عموماً اوباش قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر نیت درست بھی ہو، تو بھی ایسے لوگوں کو کھلانا جائز نہیں۔ کیونکہ وہ محتاج نہیں بلکہ پیشہ ور گداگر ہیں۔ مزاروں پر موجود انتظامی عملہ بھی کھانے پینے میں شریک ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی اس کے حقدار نہیں ہوتے اگر صاحب نصاب ہے تو منت کا مال تو خود منت ماننے والا بھی نہیں کھا سکتا۔ جس طرح زکوٰۃ کے حقدار، صرف اس کے مستحقین ہیں۔ اسی طرح نذر کا مال بھی

غربا و مساکین کا حق ہے۔ لہٰذا نذر کا مال قبروں کے مجاوروں اور دیگر لواحقین کو کھانا کسی طور جائز نہیں۔

تاہم امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ معصیت کی نذر بطور نذر تو ہو جاتی ہے، مگر اس کو توڑنا ضروری ہے۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں کَفَّارَتُہٗ کَفَّارَۃُ الْیَمِیْنِ اس قسم کی نذر کو توڑ کر اس کا کفارہ ادا کر دو مگر معصیت کی نذر کو پورا نہ کرو۔ نذر کا کفارہ بھی وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے یعنی دس مسکینوں کو کھانا کھلانا یا کپڑے پہنانا، ایک غلام آزاد کرنا، یا تین روزے رکھنا۔ ہاں اگر نذر جائز ہے تو اسکو پورا کرنا چاہیئے۔ جیسے مسجد میں چٹائیاں بچھا دے۔ طالبعلموں کو کھانا کھلا دے۔ اُن کی کُتب کا بندوبست کر دے وغیرہ وغیرہ۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ تم جو بھی نذر مانو فَاِنَّ اللّٰہَ یَعْلَمُہٗ تو اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔ کہ تم نے کس نیت کے ساتھ منت مانی ہے نذر جائز ہے یا ناجائز۔ تم لوگوں کو دھوکا دے سکتے ہو۔ کہ فلاں کام فلاں نیت سے کیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ تو تمہارے دلوں کے رازوں سے واقف ہے۔ وہ تمہاری ظاہر اور پوشیدہ سب باتوں کو جانتا ہے۔

ظالم بے یار و مددگار ہونگے

وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ لہٰذا جو کوئی شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔ کفر کرتا ہے۔ غیر اللہ کی منت مانتا ہے مستحقین کو نظر انداز کرتا ہے۔ کسی قسم کی زیادتی کرتا ہے حق تلفی کا مرتکب ہوتا ہے۔ غرضیکہ جو بھی کوئی بڑے سے بڑا یا چھوٹے سے چھوٹا ظلم کریگا، وہ مدد کے قابل نہیں ہے۔ اس کا کوئی مددگار نہیں ہو گا۔ جو شخص نماز نہیں پڑھتا جنابت کی حالت میں غسل نہیں کرتا روزہ نہیں رکھتا گویا اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہے۔ استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا، فرائض کو ترک کرنا، کسی کو تنگ کرنا یہ سب ظلم میں شمار ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَلظُّلْمُ ظُلُمَاتٌ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ قیامت کے روز اس دنیا میں کیا ہوا ظلم اندھیروں کی صورت

میں سامنے آئے گا اس لیے فرمایا اسد: ظلم کرنے والوں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوگا ظالم اپنے ظلم کی وجہ سے پھنسے ہوئے ہوں گے مگر ان کی خلاصی کے لیے کوئی مدد نہیں پہنچے گی۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ نہ عبادت میں ظلم کا ارتکاب کرے، نہ معاملات میں اور نہ حقوق میں غرض کسی چیز میں ظلم نہیں کرنا چاہیے۔

درس یکصد نوزدہ (۱۱۹) — آیت ۲۷۱ تا ۲۷۲

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا
الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ
وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ
اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ
وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ
يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

ترجمہ: اگر تم صدقات کو ظاہر کرو۔ تو یہ اچھی بات ہے۔ اور اگر ان کو چھپاؤ اور (پوشیدہ طور پر) فقرا کو دے دو، تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ تم سے برائیاں دور کرے گا، اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو، اس کی خبر رکھتا ہے ﴿۲۷۱﴾ آپ کے ذمے نہیں ہے ان لوگوں کو راہِ راست پہ لانا۔ مگر اللہ راہِ راست پہ لاتا ہے جس کو چاہے۔ اور جو کچھ اپنے مال سے خرچ کرتے ہو، وہ تمہارے نفسوں کے لیے ہے۔ اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کی رضا کے لیے۔ اور جو کچھ بھی تم مال سے خرچ کرو گے۔ تم کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائیگا ﴿۲۷۲﴾

ربطِ آیات

اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں صدقات و خیرات کے متعلق سات اصول بیان کیے ہیں۔ جن میں سے چار کا ذکر گذشتہ آیات میں آ چکا ہے۔ آج کے درس میں پانچویں بات کا بیان ہے۔ کہ صدقات و خیرات ظاہری طور پر بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ اور باطنی پوشیدہ طور پر بھی۔ تاہم خفیہ طور پر دینا زیادہ بہتر ہے۔ اس کے بعد چھٹی بات کا ذکر ہے۔ کہ صدقہ و خیرات غیر مسلم کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ ساتویں بات کا ذکر آئندہ درس میں آئے گا۔

ابدا یا اخفا

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ صدقہ خیرات سے متعلق سب سے اہم چیز دینے والے کی نیت ہے اگر خدانخواستہ نیت میں فتور آگیا ہے کسی کو احسان جتلانے یا ایذا پہنچانے کے لیے یا ریاکاری کے طور پر دیا۔ تو صدقہ باطل ہو جائے گا۔ تاہم نیک نیتی کے ساتھ ظاہراً یا باطناً دونوں طرح دینا جائز ہے۔ البتہ اس کی افضلیت کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ کہ فرض صدقات یعنی زکوٰۃ اور عشر کو ظاہر کر کے دینا چاہیئے۔ اور نفلی صدقات کو پوشیدہ طور پر دینا بہتر ہے۔ برخلاف اس کے امام حسن بصریؒ، امام رازیؒ، مولٰنا شاہ اشرف علی تھانویؒ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدقات کی پوشیدہ طور پر ادائیگی کو افضل فرمایا ہے۔ خواہ وہ صدقہ فرض ہو یا نفلی۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ افضلیت اس بنا پر ہے۔ کہ خفیہ دینے سے ایک تو ریا کا امکان باقی نہیں رہتا دوسرے لینے والے کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے بہتر قرار دیا ہے۔

بعض اوقات کسی شخص کے مال کو ظاہر نہ کرنے میں بھی مصلحت ہوتی ہے۔ اگر زکوٰۃ ظاہر کر کے دی جائے تو کل مال کا علم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس لحاظ سے خفیہ دینا بہتر ہے۔ البتہ ظاہر کر کے دینے میں ایک مصلحت بھی ہے کہ دیکھنے والے کو بھی شوق پیدا ہو کہ وہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ اگر اس نیت سے کھلے طور پر صدقہ خیرات کرے تو یہ مناسب ہوگا۔ بایں ہمہ اکثر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خفیہ طور پر خرچ کرنا افضل ہے۔ اس کی تصدیق صحیحین کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جن سات آدمیوں کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ قیامت کے دن ان کو رب العزت کے عرش کے نیچے جگہ ملے گی، ان میں سے ایک آدمی وہ ہے تَصَدَّقَ بِیَمِیْنِہٖ حَتّٰی لَا تَعْلَمُ شِمَالُہٗ کہ دائیں ہاتھ سے صدقہ کرتا ہے مگر بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی۔ اس قدر خفیہ طور پر خرچ کرتا ہے۔

الغرض فرمایا اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا ھِیَ، اگر تم صدقات

کو ظاہر کرو تو یہ اچھی بات ہے۔ کہ اس میں اقتدار کا پہلو نکلتا ہے۔ کہ اس کو دیکھ کر دوسرا بھی انفاق فی سبیل اللہ کے لیے تیار ہو جائے اور اگر زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو کرنے لگ جائے۔ اس کے علاوہ ایسا شخص لوگوں کی طعن و تشنیع سے بھی بچ جائیگا۔ جب وہ لوگوں کے سامنے صدقہ خیرات کریگا، تو کنجوس کہلوانے سے بچ جائے گا۔ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ اور اگر تم اسے چھپاؤ اور فقرا کو دے دو۔ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے کہ اس سے نہ تو ریاکاری لازم آئے گی اور نہ لینے والے کی عزت نفس مجروح ہو گی۔ پھر صدقہ و خیرات کی حکمت بھی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی۔ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہاری کچھ برائیاں تم سے دور کر دیگا۔ تمہارے بعض گناہ معاف کر دیگا، کیونکہ سارے گناہ صدقہ سے معاف نہیں ہوتے حدیث شریف میں آتا ہے اِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ صدقہ و خیرات اللہ تعالیٰ کے غصہ کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ جب کوئی انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالےٰ اس پہ ناراض ہو جاتا ہے۔ احسان جتلانے والے کے متعلق آتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کے غضب کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ قیامت کے دن اللہ ایسے شخص کو نظر شفقت سے نہیں دیکھے گا۔ اور عذاب الیم میں ڈالے گا۔ مگر صدقہ و خیرات اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کر دیتے ہیں۔ مسند احمد میں نبی علیہ السلام کا یہ فرمان بھی موجود ہے۔ اِنَّ الصَّدَقَةَ ظِلُّ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ قیامت کے دن صدقہ مومن کے حق میں بمنزلہ سایہ کے ہو گا۔ جب میدان محشر میں انتہا درجے کی تپش ہو گی اس وقت صدقہ اپنے دینے والے کے سر پہ سایہ کریگا۔ صدقہ و خیرات کی اس قدر فضیلت ہے۔ اور اس کی اس قدر برکات ہیں۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ اللہ تعالیٰ کو تمہارے تمام اعمال کی خبر ہے۔ وہ خوب جانتا ہے۔ کہ تم جو کچھ کر رہے ہو۔ اس کے پیچھے کیا نیت کارفرما ہے۔ پھر جیسی نیت ہو گی۔ اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ بدلہ عطا کرے گا۔ بہرحال صدقہ سے متعلق

یہ پانچویں بات بھی آ گئی۔

غیر مسلم کے لیے صدقہ

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا صدقہ خیرات غیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہ اس ضمن میں چھوٹی بات ہے۔ اس کے متعلق عرض ہے۔ کہ اسلام کے ابتدائی دور میں حضور علیہ السلام نے صرف مسلمانوں کو صدقہ خیرات دینے کا حکم دیا تھا۔ حدیث شریف میں مختلف الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا تَصَدَّقُوا عَلٰی اَهْلِ دِیْنِکُمْ یعنی صرف اہل دین (مسلمانوں) پر صدقہ کیا کرو۔ آپ کا یہ بھی ارشاد ہے لَا تَصَدَّقُوْا اِلَّا عَلٰی اَهْلِ الْاِسْلَامِ یعنی اہل اسلام کے سوا دوسروں (غیر مسلموں) پر صدقہ نہ کیا کرو۔ اس لیے آپ کے صحابہ کرامؓ غیر مسلموں کو صدقہ دینے سے گریز کرتے تھے۔ پھر جب ۶ھ میں کفار مکہ سے صلح کا معاہدہ ہو گیا۔ تو مکے اور مدینے والے ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے لگے۔ اس دوران میں حضرت[1] اسماءؓ کی والدہ اور حضرت ابُوبکر صدیقؓ کی بیوی جو کہ ابھی تک مشرکہ تھی مدینے آئی۔ تو حضرت اسماءؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ حضور! میری ماں آئی ہے۔ وَهِیَ مُشْرِکَةٌ اور وہ مشرکہ ہے۔ تو کیا ایسی حالت میں میں اس سے صلہ رحمی کروں۔ وہ محتاج بھی ہے۔ کیا میں اس کو کچھ صدقہ و خیرات دے سکتی ہوں۔ آپ نے فرمایا، ہاں اجازت ہے۔ تو گویا اللہ کے رسول نے غیر مسلموں کو صدقہ خیرات دینے کی اجازت دے دی۔ لہٰذا ثابت ہوا۔ کہ صدقہ کا مال غیر مسلموں کو دیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالےٰ اس پر بھی اجر عطا کرے گا۔ یاد رہے کہ حضرت ابُوبکر صدیقؓ کی بیوی ام رومانؓ تو شروع ہی سے اسلام لے آئی تھیں مگر آپ کی دوسری بیوی یعنی اسماءؓ کی والدہ قُتیلہ بنت عبدالعزیٰ اسلام نہیں لائی تھیں۔

البتہ زکوٰۃ اور عشر غیر مسلموں کو نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ فرض ہے۔ اور اس کے متعلق بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ جب حضور علیہ السلام نے حضرت معاذؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا، تو دیگر احکامات کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم بھی دیا اور واضح کیا تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَآئِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَآئِهِمْ

---

[1] تفسیر کبیر صفحہ ۸۲ ج ۷ (پارہ ۳)

یعنی زکوٰۃ مسلمانوں کے اغنیاء سے وصول کی جائیگی اور انہیں کے فقراء میں تقسیم کی جائے گی۔ جس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ زکوٰۃ و عشر کسی غیر مسلم کو نہیں دیا جا سکتا۔ یہ ناجائز اور حرام ہے۔ ہاں نفل صدقہ، صدقہ فطر کفارہ کا صدقہ جیسے نذر، قسم یا ظہار کا کفارہ ہے، وہ بھی غیر مسلم کو دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ محتاج ہو۔

حربی غیر مسلم محروم ہے

یہاں پہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے۔ کہ صدقہ وغیرہ ذمی غیر مسلم کو تو دیا جا سکتا ہے۔ مگر حربی کافر، مشرک وغیرہ کو دینا جائز نہیں۔ یعنی ایسے غیر مسلم جو اہل اسلام کے ساتھ برسرپیکار ہوں، وہ اگر محتاج بھی ہوں تو وہ صدقہ کے حق دار نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ ممتحنہ میں اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔" لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ" یعنی جو لوگ تم سے لڑائی نہیں کرتے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالتے اُن کے ساتھ نیکی اور احسان کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتے۔ البتہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے منع فرماتے ہیں، جو تم سے لڑائی لڑیں اور تمہیں گھروں سے نکال دیں۔ اور جو کوئی ایسے لوگوں سے راہ و رسم بڑھائیگا۔ تو ان کا شمار ظالموں میں ہوگا

ہدایت دہندہ صرف اللہ ہے

جہاں تک کفار کو راہِ راست پہ لانے کا تعلق ہے۔ تو یہ صرف اور صرف منشائے ایزدی پہ منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے۔ اے پیغمبر علیہ السلام لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ ایسے لوگوں کو ہدایت دینا آپ کے ذمے نہیں ہے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ بلکہ جسے اللہ تعالیٰ چاہے ہدایت دیدے۔ یہ سراسر اللہ جلّ شانہٗ کے اختیار میں ہے۔ حضور علیہ السلام کے چچا ابو طالب نے آپ کی بڑی خدمت کی۔ ہر مشکل وقت میں آپ کے شانہ بشانہ کھڑے ہوئے۔ مگر حضور کی انتہائی خواہش کے باوجود ابو طالب کو ایمان نصیب نہ ہوا۔ اور وہ کفر کی حالت میں مرا حضور علیہ السلام کو اس بات کا بڑا افسوس تھا مگر اس معاملہ میں آپ بھی مجبور تھے۔ کہ ہدایت تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ابو طالب کے فرزند حضرت علیؓ کم سنی میں ایمان

سے مشرف ہو جاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے داماد، جلیل القدر صحابہ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم میں سے ہیں۔ مگر باپ کو کلمہ نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ۔ دوسرے مقام پر یوں آتا ہے "اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ" کیا آپ لوگوں کو مجبور کر دیں گے کہ وہ ضرور ہی ایمان لے آئیں۔ بلکہ "فَاِنَّمَا عَلَیْکَ الْبَلٰغُ وَعَلَیْنَا الْحِسَابُ" آپ کے ذمے دین کو پہنچانا ہے۔ آپ سے یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لائے۔ حساب تو ہمارے ذمے ہے۔

پورا پورا بدلہ

فرمایا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ فَلِاَنْفُسِکُمْ اور تم جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو، یہ تمہارے اپنے ہی فائدے کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے مالوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہیں اجر عطا کریگا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں بنی نوع انسان کے لیے ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور تمہیں اجر و ثواب سے نوازنا چاہتا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ اللّٰہِ اور تم نہیں خرچ کرتے مگر محض رضا الٰہی کے لیے۔ اس میں کوئی دیگر مقصد نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا مقصد ہو گا۔ مثلاً کوئی اپنا مفاد وابستہ ہو۔ ریاکاری پائی جائے یا کسی کو ایذا دینا مقصود ہو تو ایسی صورت میں صدقہ ضائع ہو جائے گا۔ لہٰذا محض اللہ کی رضا کے لیے صدقہ و خیرات کرنا چاہیئے۔ اس کی مخلوق کے ساتھ احسان کرنا چاہیئے۔ محتاجوں کی حاجت براری کرنی چاہیئے۔ یہ سب رضا الٰہی کے ذرائع ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ اور تم جو بھی خرچ کرو گے، نیکی کرو گے، کسی کے ساتھ بھلائی کرو گے۔ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ ایسی بات نہیں ہے۔ کہ مسلمان محتاج کو دینے سے پورا اجر ملے اور کافر کو دینے سے کم ملے۔ بلکہ پورا بدلہ دیا جائیگا۔ اس بات میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہیئے خالص نیت کے ساتھ جو بھی خرچ کیا جائیگا، اللہ تعالیٰ اس کے عوض میں بڑھا چڑھا کر دیں گے۔ البتہ فضیلت اس بات میں ہے کہ محتاجوں میں سے بہتر محتاج

کو دیا جائے۔ مثلاً ایک نمازی ہے اور دوسرا بے نماز ہے۔ تو نمازی کو دینا زیادہ اجر وثواب کا موجب ہے۔ مگر جہاں مجبوری کا معاملہ ہو۔ وہاں کمتر آدمی کو بھی دینا چاہیئے۔ اگر کوئی بے نمازی بھوکا مر رہا ہے۔ تو اسے پہلے دینا چاہیئے۔ اللہ تعالےٰ ہر نیکی کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ اور کسی شخص پہ ذرہ بھر زیادتی نہیں کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا۔ یہ تو اس کے قانون کے خلاف ہے۔ کہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی کو بھی نظر انداز کر دے۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا
فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ
تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۗ وَمَا
تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾

ترجمہ:۔ (صدقات وخیرات) اُن فقراء کے لیے ہیں جنہیں روک دیا گیا ہے۔ اللہ کے راستے میں۔ وہ زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ انہیں ناواقف آدمی مالدار گمان کرتا ہے۔ سوال سے بچنے کی ____ وجہ سے، تم اُن کو اُن کی نشانیوں سے پہچانو گے وہ لوگوں سے لجاجت کے ساتھ سوال نہیں کرتے۔ اور تم مال سے جو کچھ بھی خرچ کرو اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے ﴿۲۷۳﴾

ربطِ آیات

صدقہ وخیرات سے متعلق اس سے پہلے چھ باتیں بیان ہو چکی ہیں۔ آج کے درس میں ساتویں اور آخری بات کا بیان ہے۔ جیسا کہ گذشتہ دروس میں ذکر آچکا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں پہلی بات یہ ہے۔ کہ صدقہ وخیرات دیکر احسان نہ جتلاؤ، دوسری بات یہ ہے کہ جس کو صدقہ دیا ہے اس کو ایذا نہ پہنچاؤ۔ تیسری بات یہ ہے۔ کہ اس کام میں ریاکاری کو دخل نہ ہو، چوتھی شرط یہ ہے کہ پاکیزہ مال اور اعلیٰ چیز صدقہ میں دی جائے، پانچویں یہ کہ صدقہ کھلے طور پہ بھی دیا جاسکتا ہے، اور پوشیدہ طور پہ بھی بشرطیکہ نیت درست ہو یعنی انفاق محض رضا الٰہی کے لیے ہو، چھٹی بات یہ ہے۔ کہ صدقہ غیر مسلم مستحق کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ یہ صرف مسلمان تک محدود نہیں۔ کیونکہ ہدایت دینے کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے، وہ جسے چاہے ہدایت سے نوازے۔ ہاں حربی کافر صدقے کا مستحق نہیں، اس کا ذمی ہونا ضروری ہے۔ البتہ عشر اور زکوٰۃ جو فرائض میں سے ہیں، وہ خالص مسلمانوں کے لیے وقف ہیں۔ لہٰذا کسی قسم کے

غیر مسلم کو نہیں دیے جا سکتے۔

آج کے درس میں ساتویں اور آخری بات یہ ہے۔ کہ صدقات و خیرات کے سب سے زیادہ مستحق کون لوگ ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ صدقات لِلْفُقَرَآءِ فقیروں کے لیے ہیں۔ لفظ فقیر اصل میں فقار سے مشتق ہے۔ اور فقار ایسے معذور شخص کو کہتے ہیں جس کی کمر کا مہرہ ٹوٹا ہوا ہو، اور وہ چلنے پھرنے سے عاجز ہو۔ اسی مناسبت سے عام اصطلاح میں فقیر سے مراد وہ شخص ہے، جو اپنی جائز ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے دوسروں کا محتاج ہو۔ ایسے محتاجوں کا ذکر سورۃ حشر اور دیگر کئی صورتوں میں آتا ہے۔ سورۃ توبہ میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کیے گئے ہیں جن میں فقراء اور مساکین سب سے پہلے آتے ہیں۔ فقہائے کرام نے فقیر اور مسکین کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ فقیر زیادہ مستحق ہے اور بعض مسکین کو پہلے نمبر پہ لاتے ہیں۔ تاہم ان کی عام تعریف کے مطابق وہ فقیر ہے جس کے پاس بالکل کچھ نہ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ ہو۔ مگر وہ اسکی جائز ضروریات کے لیے ناکافی ہو۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے صرف فقیر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ صدقات و خیرات کے سب سے زیادہ مستحق فقراء ہیں۔ جن کے پاس ضروریات زندگی کے لیے کچھ بھی نہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔

فقیر اور مسکین

آیت زیر درس میں فقراء میں سے اُن خاص فقراء پر خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جو روک دیے گئے ہوں۔ یعنی محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ صدقات اُن فقراء کے لیے ہیں۔ جو اللہ کے راستے میں روک دیے گئے ہیں۔ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ اور زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ایک مقام پہ پابند ہو کر رہ گئے ہیں۔ احصار کا معنی ہے روک دینا، جیسا کہ حج کے احکام میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جو لوگ حج یا عمرہ کے ارادہ سے نکلیں پھر راستہ میں روک دیے جائیں، احرام باندھ چکے ہیں۔ مگر دشمن نے راستہ روک دیا ہے یا کوئی بیمار ہو گیا ہو کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے، تو محصور شخص کو چاہیئے۔ کہ وہ قربانی کا جانور دوسرے

محصور فقراء

شخص کے ہاتھ بھیج دے جسے حرم شریف میں جا کر ذبح کر دیا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ کے فتویٰ کے مطابق ایسی صورت میں محرم احرام کھول دیگا۔ اور پھر آئندہ موقع پر حج یا عمرہ جیسی بھی صورت ہو اسکی قضا دیگا۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ صدقہ و خیرات اُن لوگوں کا حق ہے۔ جو اللہ کے راستے میں روک دیے گیے ہیں۔ اور سفر کی طاقت نہیں رکھتے۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ اللہ کے راستے میں روک دیے جانے والے لوگوں میں دو قسم کے لوگ شمار ہوتے ہیں۔ فی سبیل اللہ سے عموماً جہاد مراد لیا جاتا ہے۔ لہذا مطلب یہ ہوگا۔ کہ جو لوگ اس قدر نادار ہیں۔ کہ جہاد پر محض اس لیے نہیں جا سکتے کہ انہیں ضروریات زندگی کے لیے محنت مزدوری کرنا ہوتی ہے۔ اگر جہاد پر چلے جائیں تو پیچھے ان کے بچوں کی کفالت ممکن نہیں اور اگر کاروبار میں لگے رہتے ہیں تو جہاد پر نہیں جا سکتے اس طرح وہ جہاد پر جانے سے روک دیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے لوگ صدقہ و خیرات کے زیادہ مستحق ہیں۔ اگر ان کی اعانت کر دی جائے، تو جہاد کے فریضہ پر جاتے وقت وہ گھر کی کفالت سے بھی بے فکر ہو جائیں گے۔ اُن پر خرچ کرنا گویا جہاد کے رستے میں حائل رکاوٹ کو دور کرنا ہے۔

محصورین کی دوسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں، جو دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ حصول تعلیم کے لیے وہ مدرسہ میں پابند ہو کر رہ گئے ہیں۔ لہذا دیگر کام کاج کرنے سے عاجز ہیں۔ اگر وہ حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر کاروبار بھی کرنا چاہیں۔ تو ظاہر ہے کسی ایک کام کی طرف بھی پوری توجہ نہیں دے سکیں گے۔ گزر اوقات کے لیے محنت، مزدوری، ملازمت، کاروبار، کھیتی باڑی وغیرہ ہر کام کے لیے پوری توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دینی تعلیم کے لیے بھی پورا وقت درکار ہے جب تک پورا وقت نہیں دے گا، نہ قرآن پاک یاد کر سکتا ہے۔ نہ قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ جز وقتی سے دونوں کام ادھورے رہ جائیں گے، اور طالب علم کسی کام میں بھی کامل نہیں ہو سکے گا۔ بلکہ بعض اوقات اس طرح کا کام نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ "نیم حکیم خطرہ جان اور نیم ملا خطرہ ایمان" ایک مشہور مقولہ ہے

ناقص التعلیم شخص گمراہی پھیلا کر نقصان کا باعث ہی ہوگا۔ لہٰذا جو شخص دینی تعلیم حاصل کرنا چاہے
اُسے دیگر ضروریات سے بے نیاز بنانے کے لیے اُن پر خرچ کرنا ہوگا۔ مولانا اشرف علی
تھانوی فرماتے ہیں۔ کہ اس دور میں صدقہ وخیرات کے سب سے زیادہ مستحق یہی لوگ ہیں۔
آپ فرماتے ہیں۔ کہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ دین حاصل کرنے والے لوگ نکمے
ہوتے ہیں۔ یہ کوئی دوسرا کام کاج نہیں کر سکتے۔ اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے
دیا ہے کہ یہ لوگ اُحۡصِرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اللہ کے راستے میں روک دیے گئے
ہیں انہیں مدرسوں میں دینی تعلیم کے لیے پابند کر دیا گیا ہے۔ دیگر کاروبار کرنے سے
ان کی تعلیم ادھوری رہ جائیگی۔ لہٰذا یہ لوگ تمہارے صدقات وخیرات کے زیادہ مستحق ہیں

فقرا کی پہچان

فرمایا مستحق فقرا کی ایک پہچان تو یہ ہے یَحۡسَبُہُمُ الۡجَاہِلُ اَغۡنِیَآءَ مِنَ
التَّعَفُّفِ ناواقف لوگ ایسے مستحقین کو مالدار سمجھتے ہیں محض اس وجہ سے کہ وہ سوال
نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ اعانت کے مستحق ہیں۔ ایسے لوگوں کی مثال اصحاب صفہؓ کی
ہے حضور علیہ السلام کی مسجد سے قریب ایک چبوترہ تھا، اور یہ کھجور کے پتوں کی چھت
تھی۔ اس مقام پر ایسے لوگ جمع رہتے تھے۔ جنہوں نے اپنی زندگیاں دین کے لیے
وقف کر رکھی تھیں۔ بعض اوقات چار چار سو آدمی بھی اکٹھے ہو جاتے تھے۔ حضور
علیہ السلام سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور جہاد میں جانے کی ضرورت پڑتی تو اُدھر
چل دیتے۔ کوئی کاروبار نہ کرتے تھے۔ مگر مستحق ہونے کے باوجود سوال نہیں کرتے تھے

حضرت قبیصہؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت! میں
بہت مقروض ہو گیا ہوں، میری مدد فرمائیں یعنی زکوٰۃ وصدقات میں سے کچھ دلادیں
آپ نے فرمایا۔ کہ اس وقت تو ہمارے پاس کچھ نہیں۔ البتہ تم رُک جاؤ، جب
کوئی چیز میسر آئیگی، تو تمہارے معاملے پہ غور کریں گے۔ پھر آپ نے فرمایا یا قبیصہ
اِنَّ الۡمَسۡئَلَۃَ لَا تَحِلُّ یعنی اے قبیصہ! سوال کرنا حلال نہیں۔ سوائے تین قسم
کے آدمیوں کے۔ اول وہ شخص جو ایسے فقر میں مبتلا ہو جائے۔ کہ مٹی میں مل جائے
یعنی اس کے پاس کوئی چیز باقی نہ رہے۔ دوسرا وہ شخص جس پہ کوئی تاوان پڑ جائے یا

قرضہ دینا ہے۔ اور تیسرا وہ شخص جس کی قوم کے تین عقل مند آدمی گواہی دیں کہ واقعی یہ شخص بڑا نادار ہے۔ فاقہ کشی کر رہا ہے۔ اور اس کے پاس کچھ نہیں۔ فرمایا ان تین شخصوں کے علاوہ جو کوئی سوال کرتا ہے، وہ حرام کھاتا ہے۔ اس کے لیے سوال کرنا جائز نہیں۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔ کہ جس شخص کے پاس مال موجود ہو۔ اس کے باوجود وہ سوال کرے، تو ایسا شخص قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس حالت میں پیش ہوگا۔ کہ اُس کے چہرے پر گوشت ہی نہیں ہوگا۔

امام ابُو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ جس شخص کے پاس خوراک، لباس اور رہنے کے لیے مکان کے علاوہ دو سو درہم کی مقدار میں مال موجود ہو، وہ صاحب نصاب بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے سوال کرنا حلال نہیں ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ جس کے پاس چالیس درہم ہوں، وہ بھی سوال نہیں کر سکتا۔ امام سفیان ثوریؒ پچاس درہم کی مقدار بتاتے ہیں حتیٰ کہ ایک اور حدیث میں حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ہے۔ کہ جس شخص کے پاس دو وقت کا کھانا موجود ہو، اس کے لیے بھی سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض اہل حرفت یا پیشہ ور ہوتے ہیں، جنہیں کچھ اوزار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس اگر چالیس، پچاس یا دو سو درہم سے کم مال ہو تو اُن کے لیے سوال کرنے کی گنجائش ہے۔ ورنہ سوال کرنا حرام ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ اصحاب صفہؓ میں سے ہیں۔ اُن کے متعلق ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام کے منبر اور حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے درمیان غش کھا کر گرے پڑے تھے۔ فرماتے ہیں۔ کہ لوگ میری گردن پر پاؤں رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مجھے جنون کا دورہ پڑ گیا ہے حالانکہ مَا بِہٖ اِلَّا الْجُوْعُ یہ صرف بھوک کی وجہ سے ہوتا تھا۔ اس قدر زبوں حالی کے باوجود آپ نے کبھی دستِ سوال دراز نہیں کیا۔ یہ اُن صحابہؓ کا حال تھا، جنہیں اپنی عزتِ نفس اس قدر عزیز تھی۔ اس آیت میں اسی بات کو بیان کیا گیا ہے۔ کہ خوش پوش ہونے اور سوال نہ کرنے کی بنا پر ناواقف آدمی سمجھتے ہیں۔ کہ یہ شخص بڑا مالدار ہے۔ حالانکہ وہ اپنی

عزتِ نفس کی خاطر سوال سے گریزاں ہے۔ اکبر الہ آبادیؒ نے اسی چیز کی یوں ترجمانی کی ہے۔ ؎

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے۔ کسی پہ کیا گزرتی ہے

آج کے ملحدانہ دور میں بھی عزتِ نفس کی پاسداری کی جاتی ہے۔ آج تو اشتراکی بھی کہتے ہیں الخبز بالکرامۃ یعنی ہر آدمی کو باعزت روٹی ملنی چاہیئے۔ تاکہ اُسے سوال کر کے ذلیل نہ ہونا پڑے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ سوال کرنے سے پاک دامن ہیں۔ وہ صدقات و خیرات کے زیادہ مستحق ہیں۔

مستحق فقراء کی دوسری پہچان یہ فرمائی تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ تم انہیں اُن کی نشانیوں سے پہچانو گے۔ واضح نشانی یہ ہے۔ کہ بھوک کی وجہ سے لاغر ہوں گے، اُن کے چہروں پہ زردی چھائی ہو گی مزید براں لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا وہ لوگوں سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ اگر بامر مجبوری سوال کرنا ہی پڑے تو پُروقار طریقے سے کرتے ہیں۔ پیشہ ور بھکاریوں کی طرح پیچھے نہیں پڑ جاتے کہ ضرور لے کر ہی چھوڑیں گے

امام ابوبکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ الحافاً سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ لجاجت سے سوال نہیں کرتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ وہ بالکل ہی سوال نہیں کرتے۔ کیونکہ اگر سوال کریں گے تو لوگوں کو علم ہو جائے گا۔ کہ نادار ہیں۔ مگر وہ تو اپنی ناداری کو ظاہر ہونے ہی نہیں دیتے۔ اسکی دلیل یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی فرما چکے ہیں۔ کہ سوال نہ کرنے کی وجہ سے تو لوگ انہیں غنی یعنی مالدار تصور کرتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگ مطلقاً سوال کرتے ہی نہیں۔

گداگری حرام ہے

یہ بات خاص طور پہ قابل ذکر ہے۔ کہ پیشہ ور بھکاری فقرا کی فہرست میں شامل نہیں ہیں۔ کیونکہ بھیک مانگنا تو سخت معیوب ہے۔ اور جن ناداروں کا یہاں ذکر ہو رہا ہے ان کی اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے۔ کہ وہ اس قدر خوددار ہیں کہ سخت ضرورت کے باوجود سوال سے گریز کرتے ہیں۔ مسلم ممالک میں عموماً اور ہمارے ہاں خصوصاً لوگ جگہ جگہ

بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ جس طرح چوری، ڈاکہ، قمار بازی وغیرہ اکتساب ضارہ ہیں، اسی طرح گداگری بھی اسی فہرست میں شامل ہے۔ یہ بھی ناجائز اور حرام ہے۔ یورپ کی عیسائی، یہودی اور دہریہ اقوام میں آپ کو کہیں بھکاری نظر نہیں آئے گا۔ اُن کی حکومتیں اپنے ناداروں کی کفالت کرتی ہیں۔ برطانیہ میں تو بے روزگاروں کو باقاعدہ گذارہ الاؤنس ملتا ہے۔ جب تک کسی شخص کو کام مہیا نہیں کیا جاسکتا، اُسے گذر اوقات کے لیے وظیفہ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا وہاں پہ گداگری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سوال سے بچنے کا اصول تو اسلام نے پیش کیا تھا مگر اسے اغیار نے اپنا لیا اور خود مسلمان اس سے محروم ہو گئے۔ ہمارے حکمران اس طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔ گداگری بڑی بُری خصلت ہے اور عزتِ نفس کے خلاف ہے۔ اس کا سدّباب ہونا چاہیئے۔

دین کی خدمت

فرمایا وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ اے ایمان والو! تم جو کچھ بھی اپنے مال سے خرچ کرو فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ اسے اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ صدقات سے متعلق احکام میں اللہ نے آخری بات یہ سمجھائی کہ تمہارے صدقات کے سب سے زیادہ حقدار کون ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو دین کا کام خاموشی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں مگر سوال نہیں کرتے۔ سلف صالحین میں ایسے بزرگوں کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ، ان کے استاد عبدالرزاقؒ امام ابن ہمامؒ، امام ابو یوسفؒ، امام شافعیؒ، امام بخاریؒ وغیرہم ایسے بزرگ ہیں کہ علم دین کی خاطر لمبے لمبے پیدل سفر کیے۔ بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں مگر سوال نہیں کیا امام ابن جریرؒ کے متعلق آتا ہے۔ کہ حصولِ تعلیم کے لیے رخصت ہونے لگے تو والدہ نے دو سو کلچے تیار کر کے ساتھ دے دیا۔ فرماتے ہیں۔ کہ پورے دو سو دن ان کلچوں پہ گذارہ کیا، ہر روز ایک کلچہ کھا کر پانی پی لیتا اور اللہ کا شکر بجا لاتا مگر کسی سے سوال نہیں کیا۔ یہ وہی مفسر قرآن ہیں۔ جنہوں نے قرآن پاک کی سب سے بڑی تفسیر لکھی ہے۔ آپ چالیس سال تک بغداد میں مقیم رہے، ہر روز چالیس ورق لکھتے تھے۔ آپ کی وفات

کے بعد حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے زندگی میں پانچ سو پونڈ سیاہی استعمال کی۔ یہ اُن لوگوں کے کام کی برکات ہیں کہ دین کا قافلہ چل رہا ہے۔ ورنہ اگر اس زمانے کے بھکاریوں والی بات ہوتی، تو پھر دین کا اللہ ہی حافظ تھا۔ اسی لیے فرمایا۔ کہ تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے۔ کہ کس نیت سے خرچ کر رہے ہو اور کس پر خرچ کر رہے ہو۔ اس مقام پہ اللہ تعالیٰ نے خرچ کی بہترین مد بھی بیان فرما دی۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً
فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ
اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ۭ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ
وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۭ فَمَنْ جَاۗءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى
فَلَهٗ مَا سَلَفَ ۭ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي
الصَّدَقٰتِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

ترجمہ: وہ لوگ جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں رات کے وقت اور دن کے وقت، پوشیدہ طور پر اور ظاہری طور پر، ان کے لیے ان کے رب کے پاس بدلہ ہے۔ اور نہ اُن پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۷۴﴾ وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں، وہ نہیں کھڑے ہوں گے۔ مگر اس شخص کی طرح جس کے حواس شیطان مختل کر دیتا ہے چمٹنے کی وجہ سے۔ یہ اس لیے کہ بیشک انہوں نے کہا کہ بیشک سوداگری بھی سود کی مثل ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سوداگری کو حلال قرار دیا ہے۔ اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ پس جس کے پاس نصیحت

آگئی اسکے رب کی طرف سے، پس وہ رُک گیا پس جو کچھ ہو چکا وہ اسکے لیے ہے اور اُسکا معاملہ اللہ کی طرف ہے اور جس نے پلٹ کر کیا، پس یہی لوگ دوزخ والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے (۲۷۵) اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے، اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ناشکر گزار اور گنہگار کو پسند نہیں کرتا (۲۷۶) بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی۔ اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس اجر ہے۔ اُن پر نہ خوف ہوگا۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے (۲۷۷)

صدقہ بمقابلہ سود

گذشتہ کئی دروس میں صدقہ کا بیان آیا ہے۔ اور گذشتہ درس میں صدقات سے متعلق ساتویں بات یعنی اس کے بہترین مصرف کا ذکر تھا۔ اب آج کے درس میں پہلے صدقات ہی کے ضمن میں ان کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اور پھر اس کے مقابلے میں سود کی مذمت ہے، صدقہ و خیرات کرنے سے انسان کے اندر فیاضی کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور بخل دور ہوتا ہے۔ اس کے سبب انسان کے اندر بنی نوع انسان کے لیے جذبہ ہمدردی پیدا ہوتا ہے، مکارم اخلاق کی تکمیل ہوتی ہے، اور پھر یہی خصائل انسان کی نجات کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے سود خور میں بخل کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اخلاق کا جنازہ نکلتا ہے۔ اور لامحدود پیمانہ پر مال جمع کرنے کی حرص پیدا ہوتی ہے۔ انسانی ہمدردی اور فیاضی اُٹھ جاتی ہے سود خور سنگ دل اور ظالم بن جاتا ہے۔ جبکی وجہ سے اس کا دین تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اُس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برستی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔

لعن اللہ اٰکل الرّبٰو وموکلہ .... الخ اللہ تعالیٰ نے سود لینے والے اور دینے والے پر، اسکی دستاویز کے کاتب اور گواہان سب پر لعنت کی ہے اُدھر صدقہ و خیرات کرنے والوں پر اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے تو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے دونوں متضاد چیزوں کو اکٹھا بیان کیا ہے۔

صدقہ کے چار مواقع

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خیرات کے چار مستحسن مواقع بیان کیے ہیں اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَھُمْ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ وہ لوگ جو اپنے

مالوں کو خرچ کرتے ہیں رات اور دن سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً چھپا کر اور ظاہر کر کے۔ یعنی اہل ایمان چار حالتوں میں خرچ کرتے ہیں، وقت کے لحاظ سے رات ہوگی یا دن ہوگا اور حالت کے لحاظ سے پوشیدہ طور پر ہوگا یا ظاہر ہوگا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرامؓ اس آیت کے مکمل مصداق تھے۔ امیر المؤمنین حضرت علیؓ کے پاس اگر چار درہم آگئے ہیں۔ تو انہوں نے ایک رات خرچ کر دیا، ایک دن کے وقت ایک پوشیدہ طور پر خیرات کر دیا اور ایک کسی عام مجلس کے اندر، اور اس طرح اس آیت کریمہ پر پورا پورا عمل کیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس چالیس ہزار درہم آئے۔ انہوں نے بھی قرآن پاک کے حکم کے مطابق انہیں چار حصوں میں تقسیم کیا۔ دس ہزار درہم رات میں خرچ کیے، دس ہزار دن میں پھر دس ہزار پوشیدہ طور پہ اور دس ہزار علانیہ خرچ کئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بہت بڑے تاجر اور مالدار تھے۔ آپ بھی خرچ کرتے وقت چاروں مواقع کا خیال رکھتے تھے۔

یہاں سے یہ بات اخذ ہوتی ہے۔ کہ صدقہ خیرات کے لیے کوئی خاص وقت یا کوئی خاص جگہ معین نہیں ہے۔ بلکہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں اور ظاہراً باطناً ہر حالت میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ ایسے لوگوں کے لیے اُن کے رب کے ہاں اجر ہے۔ وہ ضرور اس اجر سے مستفید ہوں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وہ مستقبل میں پیش آنے والے کسی خطرے سے خوفزدہ نہیں ہوں گے۔ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ اور نہ ہی گزری ہوئی زندگی پہ انہیں کسی قسم کا افسوس اور غم ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے دنیا میں نیکی اور بھلائی کا کام کیا ہے۔ وہ عنداللہ ماجور ہوں گے۔

ایصالِ ثواب کے لیے تعینِ وقت

اس آیت پاک سے واضح ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کے لیے کوئی خاص وقت یا دن مقرر نہیں کیا۔ کہ ضرور فلاں دن اور فلاں وقت پہ ہو۔ بلکہ ہر روز اور ہر وقت خیرات ہو سکتی ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کے لیے جمعرات کا روز یا ہر ماہ کی گیارھویں تاریخ مقرر کرتے ہیں۔ شعبان کی پندرھویں اور رمضان کی ستائیسویں

تاریخ بھی بطور خاص مقرر کی جاتی ہے۔ یہ چیز اصولاً غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی پابندی عاید نہیں کی۔ البتہ جس چیز کی پابندی ہونی چاہیئے، وہ یہ ہے۔ کہ جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ حلال کمائی سے ہو۔ دن رات اور تاریخ کا کوئی تعین نہیں۔ غرباء مساکین کی خدمت کرنی ہے۔ تو کسی وقت بھی کی جا سکتی ہے۔ نیت درست ہونی چاہیئے۔ محض اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ مُردوں کو ایصال ثواب کے لیے تیسرا دن، ساتواں، دسواں، یا چالیسواں دن ہی کیوں ضروری ہے۔ اسی طرح مُردوں کے ثواب کے لیے جمعرات کی تخصیص بھی ناقابل فہم ہے یہ محض ڈھونگ اور غلط رسم ہے۔ صدقہ و خیرات کے لیے کوئی تاریخ اور کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، خود ساختہ شریعت کے احکام ہیں۔

سود خور کی حالت زار

سود کی مذمت اور حرمت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا یعنی جو لوگ سود کھاتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے سود کھانے کا ذکر فرمایا ہے لیکن مراد اس سے لینا دینا ہی ہے، صرف کھانا مراد نہیں۔ یہاں پر کھانے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے۔ کہ انسانی زندگی کھانے پینے پر منحصر ہے اور یہ انسان کی اولین ضروریات میں سے ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی محنت مزدوری، کام کاج کرتا ہے تو کہتے ہیں۔ کہ پیٹ کی خاطر یہ کچھ کیا جا رہا ہے۔ آدمی کو دو وقت کی روٹی تو ضرور ملنی چاہیئے، باقی چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ تو امام صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اس مقام پر کھانے کا ذکر انہی معنوں میں کیا گیا ہے۔ تاہم سود کھانے سے مراد سود کا لینا دینا اور ہر قسم کے استعمال ہیں اللہ نے فرمایا جو لوگ سود کھاتے ہیں لَا یَقُوْمُوْنَ وہ قیامت کے دن نہیں کھڑے ہونگے اپنی قبروں سے اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان نے چمٹ کر مخبوط الحواس کر دیا ہو جب کسی شخص پر جن اثر ڈالتا ہے۔ جیسے جن کا سایہ یا جن کا چمٹنا کہتے ہیں۔ تو وہ شخص اپنے ہوش و حواس قائم نہیں رکھ سکتا۔ اچھے طریقے سے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ طرح طرح کی

حرکتیں کرتا ہے۔ تو فرمایا قیامت کے دن سود خور کی بھی یہی حالت ہو گی۔ جب وہ قبروں سے اٹھیں گے، تو ان کے پاؤں لڑکھڑاتے ہوں گے۔ اور ان پہ جنون کی سی کیفیت طاری ہو گی۔ یہ اُن کے لیے سود خوری کی سزا ہو گی۔

جن کا سایہ

جن کا انسان کو چمٹ جانا اکثر مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ جب کوئی شخص ایسی غلطی کرتا ہے۔ جس سے شیاطین کو تکلیف پہنچتی ہے، تو وہ لوگوں کو چمٹ کر تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ جنات کی مختلف قسمیں ہیں۔ جیسا کہ سورۃ جن میں آتا ہے "مِنَّا الْمُسْلِمُونَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ" جس طرح انسانوں میں مومن اور کافر فاسق وغیرہ ہوتے ہیں، اسی طرح جنوں میں بھی ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے، کہ وہ انسانوں کو نظر نہیں آتے کیونکہ ان کا مادہ تخلیق زیادہ لطیف ہے۔ انسانی آبادی کی طرح یہ دنیا جنوں سے بھی بھری ہوئی ہے۔ وہ بعض اوقات انسانوں کو چمٹ جاتے ہیں، مِنَ الْمَسِّ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں پنجاب میں کچھ مصنوعی اور جعلی کاروبار بھی ہوتا ہے عامل لوگ ایسے واقعات اور بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ اکثر عورتوں کو بعض بیماریاں ہوتی ہیں، مگر عاملین اسے بھی جنات چمٹنے پہ محمول کرتے ہیں۔ حالانکہ بیماری کا علاج طبی طور پہ ہی کرنا چاہیئے۔ یہ اعتقاد کی کمزوری اور جہالت کا نتیجہ ہے۔ وگرنہ حقیقی طور پہ جن چمٹنے کی کیفیت تو سب کو معلوم ہی ہے۔ کہ انسان کیسی کیسی حرکتیں کرتا ہے۔ اور کس طرح حواس باختہ ہو جاتا ہے۔

تجارت بمقابلہ سود

فرمایا سود خور قیامت کے روز قبر سے حواس باختہ اٹھیگا۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اس کی وجہ یہ ہے کہ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا انہوں نے کہا تجارت سود کی مانند ہے۔ دونوں چیزوں میں کوئی فرق نہیں۔ لوگ تجارت کرتے ہیں، کاروبار کرتے ہیں۔ اور پھر اس میں نفع کماتے ہیں۔ اس طرح ساہوکار بھی اپنی رقم لگاتا ہے۔ اور اس پر نفع لیتا ہے۔ سود خور کا یہ نظریہ ظاہر کرتا ہے کہ دُنیا میں اُسے سرمایہ جمع کرنے اور حلال حرام میں عدم تمیز کا جنون ہو چکا ہے۔ اسی لیے یہ سود کو تجارت کے برابر قرار دے رہا ہے، حالانکہ منافع کسی جنس کے بدلے میں ہوتا ہے۔ ایک شخص کوئی چیز

بیچتا ہے۔ اور اپنی لاگت سے زیادہ وصول کر کے نفع کماتا ہے۔ مگر سود میں تو کسی چیز کا تعلق ہی نہیں ہوتا۔ سود خور نہ کوئی چیز خریدتا ہے۔ اور نہ اُسے بیچتا ہے۔ بلکہ صرف روپیہ ادھار دیکر اُس پر سُود لیتا ہے۔ جو قطعاً حرام ہے۔

سود دو شکلوں میں ہوتا ہے، ادھار کی شکل میں یا اجناس کی صورت میں۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو قرض کے طور پر کچھ رقم دیتا ہے۔ اور پھر مقررہ مدت کے بعد اصل رقم کے ساتھ کچھ زائد بھی لیتا ہے۔ تو یہ صریحاً سود ہے۔ کیونکہ قرض دینے والے نے اس میں محنت کی ہے، نہ وقت دیا اور نہ صلاحیت صرف کی ہے۔ وہ محض اپنی رقم کے بل بوتے پر مقررہ نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو سود ہے۔

جنس کی صورت یہ ہے۔ کہ کوئی شخص جنس کسی دوسرے شخص کو مقررہ مدت کے لیے دے اور پھر واپسی پر اداشدہ جنس سے زیادہ لے۔ یہ بھی سود ہوگا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے اَلذَّهَبُ بِالذَّهَبِ یعنی جب جنس کا لین دین ہو۔ اور ایک جنس کا تبادلہ ہو۔ تو برابر برابر ہونا چاہیئے۔ سونے کے بدلے سونا ہو، چاندی کے بدلے چاندی ہو، نمک کے بدلے نمک ہو۔ جَو کے بدلے جَو ہو، گندم کے عوض میں گندم ہو تو یہ تبادلہ برابری کی بنیاد پر اور دست بدست ہونا چاہیئے۔ جو کوئی ایک سیر گندم دیکر سوا سیر گندم واپس لے گا تو یہ سود ہوگیا اسی طرح ایک سیر گندم دے کر کچھ مدت کے بعد ایک سیر چاول واپس لے تو یہ بھی سود ہوگا۔ ہاں اگر اجناس مختلف ہوں تو شرح تبادلہ میں کمی بیشی جائز ہے۔ مثلاً ایک سیر گندم کے بدلے میں دو سیر جَو لے سکتا ہے، ایک تولہ سونے کے عوض کئی گنا زیادہ چاندی حاصل کی جا سکتی ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔ مگر یہاں پر شرط یہی ہے۔ کہ سودا دست بدست ہو۔ اگر اس میں ادھار کیا ہے۔ اور اُس مدت کے معاوضہ میں کچھ زیادہ حاصل کر لیا تو یہ سود ہو جائیگا۔

امام مالکؒ فرماتے۔ کہ جو چیز بطور خوراک استعمال ہو سکتی ہے۔ جیسے گندم، جَو، چنا وغیرہ اور وہ اپنی قیمت بھی رکھتی ہے۔ اس میں اگر ادھار کی بنیاد پر کمی بیشی ہو گی، تو یہ سود ہوگا۔ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بھی خوراک والی اشیاء میں یہی حکم لگاتے،

ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایسی جنس جس کا وزن یا پیمائش ہو سکتی ہے۔ اُس کے تبادلے میں کمی بیشی کریگا۔ تو سود شمار ہوگا۔ لوہے کا ایک سیر یا دیکھ دو سیر نہیں لے سکتا، ایک من چونا دیکھ ڈیڑھ من وصول نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ ہر وہ چیز جو وزن یا ناپ یا پیمائش میں آسکتی ہے۔ اس کا تبادلہ برابری کی بنیاد پر ہو، تو اجازت ہے۔ اگر زیادہ وصول کیا، تو پھر یہ سود ہوگا۔

سابقہ سود کی معافی

فرمایا سود خوروں کا نظریہ یہ ہے۔ کہ تجارت سود کی مثل ہے وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے۔ اور سود کو حرام کیا ہے تجارت میں کبھی منافع ہوتا ہے اور کبھی نقصان کا احتمال بھی ہوتا ہے۔ جب کہ سود ایک مقررہ منافع ہے، جو بہر صورت رقم دہندہ کو وصول ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے اندر حضور نبی کریمؐ نے فرمایا، سود بالکل چھوڑ دو، سابقہ تمام سود ختم ہو گئے۔ فرمایا میرے خاندان والے جو سود وصول کرتے تھے، وہ بھی میں نے ختم کر دیا۔ اب کسی کو سود کی رقم لینے کی اجازت نہیں ــــــــــــــــ سب سے پہلے حضور نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کا سود ختم کیا، اور فرمایا کہ اصل قرضہ واپس لے سکتا ہے۔ مگر سود کا ایک پیسہ تک لینے کی اجازت نہیں۔ تمام سود مٹا دیئے گئے۔

فرمایا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آگئی۔ یعنی سود کی حرمت کا حکم پہنچ گیا۔ فَانْتَهٰى تو اُس شخص نے سود لینا چھوڑ دیا۔ فَلَهٗ مَا سَلَفَ تو جو کچھ ہو چکا وہ اُس کے لیے ہے۔ یعنی جو سود حاصل کر چکا ہے۔ اُس کا کچھ مؤاخذہ نہیں یعنی حرمتِ سود کا قانون آنے سے پہلے سود کی جو رقم لے چکا ہے۔ وہ اس کی ہو گئی، اب اس کی واپسی کی ضرورت نہیں۔ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے۔ وہ اُسے معاف کرنے پر قادر ہے۔ تاہم یہ اس کی نیت پر منحصر ہے۔ کہ اس نے دل سے اللہ کے حکم کو قبول کر لیا ہے۔ یا محض دکھاوے کے لیے سود لینا بند کیا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ایسے شخص کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ وَمَنْ عَادَ اور جو کوئی دوبارہ سودی کاروبار شروع کر دے گا۔ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ یہی لوگ اہل جہنم ہیں هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ

وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجانے کے بعد جو شخص سُودی لین دین سے باز نہ آیا، تو وہ اسی لائق ہے۔ کہ جہنم کے گڑھے میں پھینک دیا جائے۔ جہاں سے کبھی چھٹکارا نہ ہو۔ اگر اُس نے سود کو حلال سمجھ کر کھایا ہے۔ تو پھر تو قطعی کافر ہے۔ اور حلال تو نہیں جانتا مگر کھا رہا ہے۔ تو بھی شدید درجے کا گنہگار ہے اور دوزخ کا مستحق ہے۔

حرمت سود کی حکمت

سود کے واضح احکام بیان کرنے کے بعد اسکی حکمت بھی بیان فرمادی۔

یَمۡحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے۔ سود کا جتنا بھی مال اکٹھا کر لو، مگر انجام کار اس سے فائدے کی بجائے نقصان ہی پہنچے گا۔ ایسا مال اکثر تعیش کے کاموں، لہو ولعب، بینڈ باجے، آتش بازی، بے جا فیشن یا غلط رسم ورواج کی نظر ہو جاتا ہے "مال حرام بود بجائے حرام رفت" کے مصداق حرام کے مال سے صحیح نتائج مرتب نہیں ہو پاتے اس میں خیر و برکت نہیں آتی۔ انسان سکونِ قلب سے محروم رہتا ہے، حرص بڑھتی رہتی ہے، باقی لوگ خواہ بھوکوں مر جائیں، اسے مال اکٹھا کرنے سے غرض رہے، یہ سب نقصان دہ چیزیں ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ سود کو مٹاتا ہے۔ وَیُرۡبِی الصَّدَقٰتِ اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ زکوٰۃ و صدقات دینے والے کے مال میں اللہ تعالیٰ برکت عطا کرتا ہے۔ صدقات کا جذبہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی اور خیر سگالی کا جذبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے مال میں دنیا میں بھی اضافہ کرتا ہے۔ اور آخرت میں تو سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی بڑھا چڑھا کر اجر عطا ہوگا۔ اللہ مالک الملک کھجور کے ایک دانے کو احد پہاڑ جتنا بڑھا کر معاوضہ دیگا۔ صدقہ وخیرات کی یہ برکات ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ صدقات کو بڑھاتا ہے۔ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیۡمٍ اللہ تعالیٰ ناشکر گزار اور گنہگار آدمی کو پسند نہیں کرتا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت کو چند دن کے لیے کسی کو ادھار نہیں دے سکتا، کسی غریب و لاچار کی مدد نہیں کر سکتا، کسی بھوکے کو کھانا نہیں کھلا سکتا۔ اللہ ایسے ناشکر گزار کو پسند نہیں کرتا۔ اور پھر جو شخص اُلٹا کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اُسے سود پہ قرض

دیتا ہے۔ اس کا خون چوستا ہے۔ وہ پہلے ہی کمزور ہے۔ اس پر اور مالی بوجھ ڈالتا ہے، وہ شخص سخت گنہگار ہے۔ اور اللہ ایسے آدمی کو بھی ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اہل ایمان کے لیے بشارت

احکام الٰہی کی خلاف ورزی کرنے والوں کے برخلاف اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جو لوگ ایمان لائے وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور نیک اعمال کئے۔ یعنی اوّلاً وہ اہل ایمان ہیں۔ ان کا عقیدہ صحیح ہے۔ توحید خداوندی پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ بعث بعد الموت پر یقین ہے۔ کتب سماویہ پر ایمان ہے اور ثانیاً وہ اچھے اور شائستہ کام انجام دیتے ہیں، برائی سے بچتے ہیں۔ بالخصوص وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ نماز کو قائم کرتے ہیں۔ جو کرام العبادۃ المقربہ الی اللہ کا تقرب دلانے والی چیز ہے۔ اسلام کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ یعنی بدنی عبادت کے ساتھ ساتھ مالی عبادت بھی کرتے ہیں۔ ان کے دل میں انسانی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے۔ بخل سے محفوظ ہیں۔ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اُن کے لیے اُن کے رب کے ہاں اجر مقرر ہے۔ اُن کے نیک اعمال کا ایک ایک ذرہ محفوظ ہے، اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی عمل ہے۔ تو اللہ اُسے ضائع نہیں کرتا بلکہ اس کا بدلہ سات سو گنا تک یا اس سے بھی بڑھا چڑھا کر عطا کرتا ہے۔ ایسے ہی نیکوکار لوگوں کے متعلق فرمایا وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ نہ انہیں اس دنیا میں کسی قسم کا خوف ہوگا، وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اور نہ ہی آخرت میں وہ کسی غم و فکر میں مبتلا ہوں گے۔ قیامت کا ڈر تو ہر ایک کو ہونا چاہیئے۔ مگر حقیقت میں وہ اپنے اچھے اعمال کی وجہ سے مامون ہونگے برخلاف اس کے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والے سخت مغموم ہوں گے۔ ایسے لوگ قیامت کے دن اپنے کیے پر پشیمان ہونگے، اور کہیں گے "يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ" افسوس اللہ کی دی ہوئی مہلت سے میں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور آج قیامت کے دن نقصان اٹھانے والوں میں شمار ہو گیا۔ بہرحال ایمان اور اعمال صالحہ کے حامل لوگوں کو نہ خوف ہوگا۔ اور نہ کسی قسم کا غم ہوگا۔

درس یکصد بست و دو (۱۲۲) — آیت ۲۷۸ تا ۲۸۱

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ
لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ
فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَیْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَى اللّٰهِ ۗ قف
ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ ع ۳۸/۸/۶

ترجمہ:- اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو سود باقی رہ گیا ہے، اُسے چھوڑ دو، اگر تم (حقیقت میں) ایماندار ہو ﴿۲۷۸﴾ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا، پس سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کا چیلنج۔ اور اگر تم توبہ کر لو، تو تمہارے اصل مال تمہارے ہی ہیں نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائیگا ﴿۲۷۹﴾ اگر وہ شخص تنگدستی والا مقروض ہے، پس اس کو مہلت دینی چاہیئے آسودگی تک۔ اور یہ کہ تم صدقہ کرو (بخش دو) یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم جانتے ہو ﴿۲۸۰﴾ اور اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کے سامنے لوٹائے جاؤ گے۔ پھر ہر نفس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ جو اس نے کمایا) اور ان پر کسی طرح ظلم نہیں کیا جائیگا ﴿۲۸۱﴾

ربطِ آیات

صدقہ وخیرات کی فضیلت کے بعد اللہ تعالیٰ نے سود کی حرمت اور مذمت بیان فرمائی۔ گذشتہ درس میں سود خور کی قیامت کے دن دوبارہ اٹھنے کی حالت کا تذکرہ تھا۔ کہ وہ اپنی قبروں سے اس طرح مخبوط الحواس اٹھیں گے جیسے اُن کو جن چمٹ گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ یہ لوگ دنیا میں مال جمع کرنے کی فکر

میں اس قدر اندھے ہو گئے کہ ان کے نزدیک تجارت اور سود میں کوئی امتیاز نہ رہا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ سود کی حرمت کے نفاذ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے دو طریقے بتائے ہیں۔ پہلا طریقہ تو گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ "فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ" یعنی وعظ و نصیحت کے ذریعے سود خور کو سود سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر وہ اللہ کا حکم مان کر سود سے کنارہ کش ہو جائے تو بہتر و گرنہ ایسے لوگ "اَصْحٰبُ النَّارِ" ہیں۔ ان کا گناہ ناقابلِ معافی ہے۔ "هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" یہ دائمی جہنمی ہیں۔

سود کی لعنت سے نجات دلانے کا دوسرا طریقہ تعزیری عمل ہے جو آج کے درس میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب کہ حکومت اسلامی ہو اور وہ اسلامی احکام کا نفاذ کرے اور پھر ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف تعزیری کارروائی کرے۔ کسی بھی ملک و قوم کے لیے معاشی مسائل بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر یہ نظام درست ہو جائے، تو لوگوں کے بیشتر دنیوی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے اقتصادی نظام میں سود ایک بنیادی رخنہ ہے۔ جسے دور کیے بغیر لوگوں کی معاشی حالت درست نہیں ہو سکتی لہٰذا ایک اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے۔ کہ ملک کو سود کی لعنت سے پاک کرے اور اس راستے میں آنے والے ہر روڑے کو ہٹا دے، اور یہ چیز تعزیری قوانین کے ذریعے حاصل ہو گی، جس کا ذکر آج کے درس میں آ رہا ہے۔

شانِ نزول

زمانہ جاہلیت میں طائف میں آباد قبیلہ بنو ثقیف کے کچھ لوگ سودی کاروبار کرتے تھے۔ مکہ میں آباد بنو مغیرہ والے بنو ثقیف کے مقروض تھے۔ انہوں نے سود پر روپیہ لے رکھا تھا۔ جب اسلام کی شمع نے خطہ عرب کو منور کیا، تو یہ دونوں قبیلے مسلمان ہو گئے۔ چونکہ بنو ثقیف کی رقم بنو مغیرہ کی طرف واجب الادا تھی، اول الذکر نے اپنی اصل رقم معہ سود مطالبہ کیا، تو بنو مغیرہ نے جواب دیا کہ اسلام میں تو سود کا لین دین جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اب تمہارا دعویٰ درست نہیں ہے۔

آخر معاملہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر مسئلہ حل کر دیا۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اور سود کی بقیہ رقم چھوڑ دو، یعنی مطالبہ نہ کرو۔ اب یہ تمہارے لیے روا نہیں ہے۔ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اگر تم فی الحقیقت مومن ہو، یعنی اگر سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکے ہو، تو سود کا خیال قطعاً دل سے نکال دو۔

سود خوروں کے لیے تعزیر

اس آیت پاک میں سود خوروں کے لیے تعزیر کا بیان ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں، کہ اس آیت کی رُو سے مسلمان حاکم کا فرض ہے۔ کہ سودی کاروبار کو ختم کرنے کا انتظام کرے اور اگر سود خور سود خوری سے باز نہ آئیں تو پھر ان کے خلاف جہاد کیا جائے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا اور اگر تم نے ایسا نہ کیا یعنی سود لینے سے باز نہ آئے، تو پھر فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کا چیلنج سن لو تمہارے خلاف جنگ ہوگی یہانتک کہ تم اس قبیح حرکت سے باز آجاؤ۔ وَاِنْ تُبْتُمْ پھر اگر تم نے توبہ کر لی۔ سودی کاروبار کو ختم کر دیا فَلَکُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِکُمْ تو تمہارا اصل زر تمہیں مل جائے گا۔ اور اس رقم پر جو سود لگایا گیا ہے۔ وہ نہیں ملے گا۔ وہ چھوڑنا ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ یہ بھی فرماتے ہیں، کہ مسلمان حاکم کا فرض ہے۔ کہ سود خور سے توبہ کرائے کہ آئندہ کے لیے سودی کام سے قطعاً دست بردار ہو جائے۔ اگر اس نے ایسا کر لیا تو معاملہ ختم ہو گیا اور اگر کوئی شخص توبہ سے انکار کرتا ہے، تو حاکم اسے سزا دینے کا پابند ہے، اور یہ سزا سزائے موت بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ جو تابعین میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اگر سود خور توبہ نہ کرے تو اسلامی نظام کے تحت ایسے شخص کا سر تلوار سے قلم کر دینا چاہیئے۔

اب سود لینے والا دو طرح کا ہو سکتا ہے اگر ایسا شخص جو سود کو حرام نہیں سمجھتا، تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اور مرتد سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اس نے اسلام کے

ایک قطعی حکم کا انکار کیا ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف جہاد ضروری ہو جائے گا۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تھا۔ اور پھر یہ ہے۔ کہ مرتد نے جو مال اسلام کے دور میں کمایا تھا، وہ اس کے مسلمان ورثا میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اور جو مال اس نے ارتداد کے بعد کمایا تھا، وہ اسلامی بیت المال میں جمع ہو جائے گا۔

سود خور کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ اُسے حرام تو سمجھتا ہے۔ مگر لے رہا ہے ایسا شخص دین کا باغی ہے۔ اور ایسے شخص کے خلاف بھی جنگ ضروری ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں منکرین زکوٰۃ نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ کہتے تھے۔ کہ ہم زکوٰۃ کا مال بیت المال میں جمع نہیں کرائیں گے۔ بلکہ اپنی مرضی سے اسے خرچ کریں گے۔ تو ایسے لوگوں کے خلاف حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جہاد کیا تھا۔ اسی طرح جو لوگ سود کو حرام سمجھتے ہوئے بھی اسے وصول کرتے ہیں۔ وہ باغی ہیں۔ اور ایک اسلامی حکومت کو ایسے باغیوں کے خلاف جہاد کا حکم ہے۔ اور پھر باغی کا مال بھی چھین لیا جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کرے تو مال واپس دے دیا جائے گا۔ اور اگر تائب نہ ہو، تو اس کا مال حکومت کے حق میں ضبط ہو جائے گا۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ ارتداد کے لیے صرف فرائض کا انکار ہی ضروری نہیں بلکہ اگر کوئی شخص سنت کا بھی انکار کریگا۔ تو مرتد ہو جائے گا۔ امام محمدؒ نے فرمایا ہے۔ کہ اگر کسی بستی کے لوگ اذان دینا ترک کر دیں، تو اُن کے خلاف بھی جہاد ہو گا۔ اگرچہ اذان دینا فرض نہیں ہے بلکہ سنت ہے۔ اسی طرح اگر بعض مسلمان ختنہ کرنا چھوڑ دیں اور سمجھانے پر بھی اس پر آمادہ نہ ہوں، تو ایسے لوگ بھی باغی سمجھے جائیں گے۔ اور اسلامی قانون کے مطابق ان کے خلاف جہاد ہو گا۔ ختنہ کرنا بھی سنت ہے، فرض واجب نہیں ہے۔ مگر اس کے تارکین کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ جیسا کہ فرائض کے تارکین کے ساتھ روا ہے۔

فرمایا اگر تم اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے سود کو چھوڑ دو، تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے۔ وہ تم لے سکتے ہو۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ٥

نہ تم کسی پہ زیادتی کرو اور نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا جائے گا۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور علیہ السلام نے اعلان فرمادیا کہ جاہلیت کی تمام رسومات کو اللہ تعالیٰ نے میرے پاؤں کے نیچے روند دیا ہے۔ تمام سودی کاروبار ختم ہوگئے ہیں۔ لہذا سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے لوگوں کے سودی کاروبار ختم کرتا ہوں۔ حضرت عباسؓ کا سودی کاروبار بڑا وسیع تھا۔ آپ نے یکسر ختم کر دیا۔ اور سود کا ایک پیسہ تک لینے کی اجازت نہیں دی فرمایا کہ اپنی اصل رقم لے سکتے ہو تاکہ تمہیں بھی نقصان نہ ہو اور سود لے کر دوسرں کو بھی نقصان مت پہنچاؤ۔

تنگدست مقروض کیلیے مہلت

اس کے بعد مقروض سے متعلق ایک خصوصی مسئلہ بیان کیا گیا ہے وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ اور اگر مقروض تنگدست ہے وعدہ کے مطابق قرض واپس نہیں کر سکتا فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ط تو اُسے آسودگی تک مہلت دے دینی چاہیئے۔ محدثین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں، کہ آیت کی رُو سے تنگ دست کو مہلت دینا واجب ہو جاتا ہے اور اگر مقروض جان بوجھ کر ٹال مٹول کرتا ہے، تو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ موجود ہونے کے باوجود ٹال مٹول کرنا اور قرض کی ادائیگی سے اعراض کرنا ظلم کے مترادف ہے۔ اور ظالم شخص تعزیر کا مستحق ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر شبہ ہو کہ مقروض کے پاس مال موجود ہے مگر ادا نہیں کرتا تو قرض خواہ عدالتی چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ اور حاکم ایسے مقروض کو قید میں ڈال سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس مال موجود ہے تو قرضہ ادا کر کے رہائی حاصل کرلے گا اور اگر عدالت کو یقین ہو جائے۔ کہ یہ شخص قرضہ لوٹانے کے قابل نہیں ہے تو اسے مہلت دی جاسکتی ہے۔

معاف کر دینا بہتر ہے

فرمایا وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ اگر مقروض اس قدر مفلوک الحال ہے کہ قرضہ ادا کرنے کے قابل نہیں۔ تو ایسی حالت میں قرضہ بالکل معاف کر دینا ہی بہتر ہے۔ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ اگر تم کچھ جانتے ہو۔ بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا جس نے تنگ دست مقروض کو مہلت دی أَوْ وَضَعَ عَنْهُ یا اسے بالکل معاف ہی کر دیا، تو فرمایا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام

نے کہ قیامت کے دن ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے عرش کے سائے میں ہو گا۔ اور وہ ایسا دن ہو گا جس دن عرش کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہو گا۔ بخاری شریف میں ہے حضور علیہ السلام نے کسی سابقہ امت کے ایک شخص کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہو گا جس کے پاس کوئی نیکی نہ ہو گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ——————— دیکھو اس نے کوئی نیکی کی ہے۔ دریافت کرنے پر وہ شخص عرض کریگا کہ میرے پاس نیکی تو کوئی نہیں ہے البتہ ایک بات یہ ہے۔ کہ میں تجارت کرتا تھا۔ نوکر چاکر تھے۔ لوگ مجھ سے قرضہ بھی لیتے تھے۔ میں نے نوکروں کو حکم دے رکھا تھا۔ کہ تنگدست کو مہلت دے دیا کرو۔ ایسے شخص پر سختی نہ کیا کرو۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے فرمائیگا نَحْنُ اَحَقُّ ہم درگذر کرنے کے زیادہ لائق ہیں۔ یہ شخص دنیا میں تنگدستوں سے درگذر کرتا تھا، لہذا آج میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم قرضہ معاف کر دو، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم اس عمل کی حقیقت کو جانتے ہو۔

حکومتِ وقت کی ذمہ داری

سودی نظام کی بیخ کنی کے لیے حکومتِ وقت پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی رح فرماتے ہیں۔ کہ جو حکومت سودی نظام کی سرپرستی کرتی ہے، وہ مٹا دینے کے قابل ہے ورنہ لوگوں کو کبھی سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔ فرماتے ہیں۔ کہ زمین میں دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت اور دوسرے سود کا قلع قمع۔ سودی نظام کا قیام یہودیت کی سرپرستی ہے۔ ناجائز منافع خوری مخرب اخلاق چیز ہے اور قابلِ مذمت ہے۔ اسلام نے اس کو مٹانے کا سختی سے حکم دیا ہے۔ مگر آج کی دنیا میں کتنے ملک ہیں جو سودی نظام سے پاک ہیں؟ ہر ملک کے ہر بنک میں سودی کاروبار ہو رہا ہے۔ حالانکہ مسلمان ممالک میں غیر مسلموں کو بھی سودی کاروبار کی اجازت نہیں۔ غیر مسلموں کے ہاں شراب نوشی جائز ہے۔ لہذا وہ پی سکتے ہیں۔ مگر اسلامی حکومت میں اس کی تجارت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح وہ سور کا گوشت حلال سمجھ کر کھا سکتے ہیں، مگر سود حرام ہے، وہ نہیں لے سکتے۔ یہ اتنی بُری

چیز ہے۔ بہرحال سود کے متعلق بعض تفصیلات بیان ہوگئیں، کچھ مزید باتیں سورۃ آل عمران اور سورۃ روم میں بھی آئیں گی۔

آخرت میں محاسبہ

سود کے مسائل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر ان احکام پر عمل نہیں کرو گے۔ تو وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ قف اُس دن سے ڈر جاؤ، جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے یعنی قیامت کا دن آنے والا ہے۔ وہاں پر ہر شخص کا محاسبہ ہوگا ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ پھر ہر نفس کو اُس کے کئے کا بدلہ دیا جائیگا وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں۔ کہ قرآن پاک کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی یہی آیت ہے۔ اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے حضور علیہ السلام کی وفات سے تین ماہ قبل حجۃ الوداع کے موقع پر عرفہ اور جمعہ کے دن "اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ" والی آیت نازل ہوئی تھی۔ مگر یہ آیت وَاتَّقُوْا يَوْمًا..... سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق اس آیت کے نزول کے بعد آپ اس دنیا میں ۲۲ دن تک تشریف فرما رہے۔ شاہ رفیع الدینؒ کی تفسیر کے مطابق آپ صرف تین دن بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ بہرحال حجۃ الوداع والی آیت کے ذریعہ اللہ نے تکمیل دین کا اعلان فرمایا اور پھر اس آخری آیت میں محاسبہ کی یاد دہانی کرا کے وحی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ اس آیت کو سورۃ بقرہ میں اسی مقام پر رکھنے کا حکم بھی خود اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے دیا۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى
فَاكْتُبُوْهُ ؕ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ
كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ
شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا
اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ

ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کرو وقتِ مقررہ تک تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور چاہیئے کہ تمہارے درمیان لکھے کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ۔ اور نہ انکار کرے کوئی کاتب (لکھنے والا) اس بات سے کہ وہ لکھے جیسا کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے۔ اور اس کو چاہیئے کہ وہ لکھ دے۔ اور چاہیئے کہ لکھوائے وہ شخص جس کے اوپر حق ہے۔ اور اس کو چاہیئے کہ اللہ سے ڈرتا رہے جو اس کا پروردگار ہے اور اس میں سے کسی چیز کو کم نہ کرے۔ اور اگر وہ شخص جس کے اوپر حق ہے، بے عقل ہے یا کمزور ہے۔ یا لکھوانے کی طاقت نہیں رکھتا، پس چاہیئے کہ لکھوائے اس کا سرپرست انصاف کے ساتھ۔

دستاویز کی اہمیت

اس سورۃ کے چھتیسویں (۳۶) رکوع سے مالی مسائل بیان ہو رہے ہیں۔ پہلے صدقہ و خیرات کے متعلق مختلف مسائل کا ذکر ہوا۔ پھر سود کی حرمت اور اس کے احکام بیان ہوئے۔ اب اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے قرض یا ادھار کے قوانین نازل فرمائے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ لین دین کے معاملات ہیں۔ ان میں تین بنیادی قوانین ہیں اور ان کے ساتھ کچھ ضمنی مسائل ہیں۔ بنیادی قوانین ہیں

دستاویز کی تیاری، گواہ کا تقرر اور رہن کی تفصیلات شامل ہیں ان کے ذریعے ادھار کے معاملات میں کسی ممکنہ تنازعہ سے بچا جاسکتا ہے۔ آج کے درس میں تحریر یعنی دستاویز کی تیاری کے متعلق احکام ہیں۔ آج کے دور میں تحریر کرلینا ایک معمولی بات نظر آتی ہے۔ کیونکہ تعلیم عام ہے۔ اور یہ کام آسانی کے ساتھ ہوسکتا ہے۔ مگر چودہ صدیاں قبل جب کوئی پڑھا لکھا آدمی خال خال ہی نظر آتا تھا، تحریر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اُس وقت لوگ اپنے معاملات عموماً زبانی ہی طے کرتے تھے جس کی وجہ سے اکثر جھگڑے پیدا ہوجاتے تھے۔ لہٰذا تحریر کے یہ احکام نازل کیے گئے۔

کسی امر میں تحریر کرلینا کوئی فرض واجب تو نہیں مگر معاملات کی درستگی کیلیے مستحب کے درجہ میں آتا ہے معاملہ طے کرنے کے بعد آدمی بھول بھی سکتا ہے کہ کیا شرائط تھیں کتنی مدت مقرر تھی نَسِیَ اٰدَمُ فَنَسِیَتْ ذُرِّیَّتُہٗ کے مصداق حضرت آدم علیہ السلام سے چوک ہوئی تو ان کی اولاد بھی بھول جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ بات لڑائی جھگڑے تک پہنچتی ہے اگر تحریر موجود ہوگی۔ تو تنازعہ کے وقت کام آئیگی۔ اور کوئی عدالت اس تحریر کی بنا پر فیصلہ کرسکیگی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دستاویز کے احکام نازل فرمائے تاکہ معاشرہ میں اس وجہ سے بگاڑ پیدا نہ ہو۔ اسی لیے مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں۔ کہ تعلیم جبری ہونی چاہیئے۔ تاکہ لوگ معاملات کو درست رکھ سکیں۔

تحریر کے مسائل

ارشاد ہوتا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا یعنی اے اہل ایمان! اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی جب تم کسی خاص مدت تک ادھار کا معاملہ کرو فَاکْتُبُوْہُ پس اس کو لکھ لیا کرو۔ وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ اور چاہیئے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ کیونکہ قلم کا فتنہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ لبا اوقات اسکی وجہ سے بڑا نقصان اٹھانا پڑتا ہے لہٰذا کاتب کے لیے ضروری ہے۔ وَلَا یَاْبَ کَاتِبٌ اَنْ یَّکْتُبَ کَمَا عَلَّمَہُ اللّٰہُ کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے جب کہ اللہ نے اُسے علم دیا ہے۔ فَلْیَکْتُبْ بلکہ چاہیئے کہ وہ لکھ دے یعنی جب کسی ان پڑھ شخص کو تحریر کی ضرورت ہو تو پڑھے

لکھے آدمی کو اسکی مدد کرنا چاہیئے۔ اور حسبِ ضرورت تحریر کر دینی چاہیئے اللہ تعالےٰ نے علم کی جو نعمت اُسے عطا کی ہے۔ اس میں بخل نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ کہ اُس نے علم کی دولت دی تو اُسے خدمتِ خلق کا موقع ملا۔

حضور علیہ السلام کا ارشادِ گرامی ہے۔ اِنَّ مِنَ الصَّدَقَۃِ اَنْ تُعِیْنَ صَانِعًا اَوْ تَصْنَعَ لِاَخْرَقَ یہ بھی صدقہ میں شامل ہے۔ کہ تو کسی کاریگر کی مدد کر دے یا کسی بے ہنر آدمی کو کوئی چیز بنا کر دے دے۔ اس اصول کے مطابق اگر کوئی شخص ان پڑھ ہے۔ خود لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ تو اس کی فرمائش پر تحریر کر دینا بھی صدقہ میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں اپنے علم سے دوسروں کو مستفید نہ کرنے والوں کے لیے حدیث شریف میں وعید بھی آئی ہے۔

مَنْ سُئِلَ عِلْمًا یَعْلَمُہٗ جس سے کوئی ایسی بات دریافت کی گئی جسے وہ جانتا ہے فَکَتَمَہٗ پھر اُس نے اُسے چھپایا۔ ایسے شخص کے متعلق فرمایا اُلْجِمَ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ قیامت کے دن ایسے شخص کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ کیونکہ اس نے دانستہ چیز کو چھپا لیا۔ لہٰذا کاتب کے لیے ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے علم کے مطابق حق و انصاف کے ساتھ تحریر کرے۔

البتہ یہ بات ذہن میں رہے۔ کہ کاتب کے لیے تحریر کرنا واجب نہیں ہے۔ بلکہ یہ مستحب کا درجہ رکھتا ہے مطلب یہ کہ کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ کہ وہ ضروری یہ فرمائش پوری کرے، اُسے انکار کرنے کا اختیار ہے۔ اور اگر لکھائی کی اجرت لینا چاہے۔ تو مناسب معاوضہ بھی جائز ہے۔ تاہم لکھ دینا بہتر ہے۔ کیونکہ مستحسن بات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسکی ترغیب دلائی ہے تاکہ ضرورت مند کی خدمت کی جائے کہ یہ بھی خدمتِ خلق کا ایک حصہ ہے۔

قرض اور دین میں فرق

قرض اور دَین (ادھار) میں قدرے فرق ہے۔ اگرچہ دونوں الفاظ ادھار کے معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں مگر ادھار یا دَین عام ہے۔ اور قرض خاص ہے قرض صرف رقم کے ادھار پر بولا جاتا ہے۔ جب کہ دَین میں ہر قسم کا ادھار شامل ہے خواہ وہ نقد رقم کا لین دین ہو۔ یا کسی چیز کے بدلے میں ادھار ہو۔ قرض کے متعلق

پہلے بیان ہو چکا ہے " مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا " جو اللہ کو قرضِ حسن دے۔ یعنی کسی ضرورت مند کو مقررہ مدت کے لیے نقد رقم ادھار پر دے دے اور اس سے زاید وصول نہ کرے۔ اگر نقد رقم کی واپسی پر اس کے ساتھ کچھ زاید وصول کرے گا تو وہ سود ہوگا، جسکی حرمت کا بیان آچکا ہے۔ البتہ اگر کسی چیز کے تبادلے کے ضمن میں کوئی نقد رقم واجب الادا ہے۔ تو وہ ادھار ہے۔ اس صورت میں چیز بیچنے والا اپنی اصل لاگت سے زائد بھی لے سکتا ہے۔ جسے منافع کہتے ہیں۔ اور یہ جائز ہے۔ اس آیت کریمہ میں اسی بات کا تذکرہ ہے۔ کہ جب تم مقررہ مدت کے لیے ادھار کا معاملہ کرلو، تو اسے لکھ لیا کرو۔ کوئی شخص مکان یا زمین بیچتا ہے۔ کوئی جانور فروخت کرتا ہے جنس کا سودا ہوتا ہے۔ اور رقم کی ادائیگی کے لیے تاریخ یا دن کا تقرر ہوتا ہے۔ تو یہ مشتری کے ذمے دین یعنی ادھار ہے۔ جو وہ مقررہ تاریخ پر ادا کرنے کا پابند ہے۔ عام طور پر خرید و فروخت نقد ہوتی ہے۔ مالک کے پاس چیز موجود ہے۔ اور گاہک کے پاس رقم موجود ہے۔ تو تبادلہ دست بدست ہو جائیگا۔ اور اگر گاہک قیمت کی ادائیگی کے لیے مہلت طلب کرے۔ تو یہ ادھار کہلائے گا۔ ہاں اگر دونوں طرف چیز موجود نہ ہو۔ نہ تو مالک کے پاس چیز موجود ہے اور نہ گاہک کے پاس رقم اور سودا طے پا جاتا ہے مثلاً زمیندار کہتا ہے کہ آئندہ فصل پر میں فلاں جنس اس بھاؤ پر فروخت کروں گا۔ یا کارخانے کی فلاں مہینے کی فلاں پیداوار اتنے دام میں دوں گا، اور گاہک اُسے تسلیم کر لیتا ہے۔ تو شرعی اصطلاح میں اسے " بیع الکالی بالکالی کہتے ہیں۔ یہ ناجائز ہے نھٰی عن بیع الکالی بالکالی ایسی خرید و فروخت سے شریعت نے منع کر دیا ہے۔

بیع سلم

خرید و فروخت کی باقی دو صورتیں جائز ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ قیمت موجود ہے مگر چیز موجود نہیں، وہ ادھار ہے۔ اس کو بیع سلم کہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ فَلْیُسْلِفْ فِیْ کَیْلٍ مَعْلُومٍ وَّوَزْنٍ مَعْلُومٍ اِلٰی اَجَلٍ یعنی بیع سلم بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ جب کہ اسکی پیمائش، وزن یا مدت معلوم ہو اور جگہ بھی معلوم ہو۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ جنس بھی معلوم ہونی چاہیے

اور بھاؤ طے کر لینا ضروری ہے۔ مثلاً دو فریقوں کے درمیان طے پاتا ہے۔ کہ فلاں چیز یا جنس کا اتنے تول یا ماپ میں فلاں تاریخ کو اس بھاؤ سے لین دین ہوگا۔ چنانچہ قیمت نقد ادا کر کے سودا طے پاتا ہے۔ تو یہ درست ہے۔ چیز کے ناپ تول میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اور بھاؤ کے مطابق اس کی کل قیمت میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ بیع سلم کے لیے بعض دیگر شرائط بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سودے کی مدت کم از کم پندرہ دن ہونی چاہیئے۔ بعض نے ایک ماہ کا تعین کیا ہے۔ ایک شرط یہ بھی ہے کہ جس چیز کا سودا ہوا ہے وہ مارکیٹ سے بالکل معدوم نہ ہو بلکہ معاہدہ طے پاتے وقت بازار میں موجود بھی ہو۔ اس قسم کی بیع میں مدت تبادلہ واضح ہونی چاہیئے۔ اگر مدت کا تعین نہیں ہوگا تو بیع درست نہ ہوگی۔ مثلاً اس قسم کا معاہدہ ہوتا ہے۔ کہ جنس کا تبادلہ اس وقت ہوگا جب فصل پکے گی جب کہ فصل پکنے اور کٹنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ اسی طرح کوئی شخص یہ سودا کرتا ہے۔ کہ جب جانور بچہ دیگا، اس وقت قیمت ادا کی جائے گی۔ اس قسم کی مجہول مدت قابل قبول نہیں اور ایسی بیع فاسد شمار ہوگی۔ اَجَلٍ مُّسَمًّى کا لفظ وضاحت کر رہا ہے۔ کہ مدت کا تعین لازمی ہے کہ فلاں دن یا فلاں تاریخ کو چیز وصول کی جائے گی۔ اور اگر مدت مجہول ہو تو اسے بیع الغرر کہتے ہیں۔ یہ دھوکے والی بیع ہے۔ اور شریعت کی رو سے ناجائز ہے۔

بیع سلم کی دوسری صورت یہ ہے۔ کہ چیز موجود ہے، وہ گاہک وصول کر لیتا ہے۔ مگر قیمت فوری طور پر ادا نہیں کرتا بلکہ خاص مدت کے لیے ادھار کر لیتا ہے یہ بھی جائز ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ نے عرض کیا حضور! آپ کے پاس اوڑھنے کے لیے کپڑا نہیں ہے۔ فلاں یہودی کے ہاں کپڑا موجود ہے۔ آپ پیغام بھیج کر کپڑا ادھار لے لیں۔ اور مدت مقررہ پر رقم ادا کر دیں۔ حضور علیہ السلام نے یہودی کو ایسا پیغام بھیجا تھا، مگر اس نے کپڑا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم بیع کی یہ صورت بھی جائز ہے۔ مدت مقرر کر کے قیمت کا ادھار کیا جا سکتا ہے۔

ادائیگیِ قرض کا عجیب واقعہ

قرض کی واپسی کس قدر ضروری ہے۔ اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے سابقہ امت کا ایک عجیب و غریب واقعہ بیان فرمایا۔ فرماتے ہیں۔ ایک شخص نے دوسرے سے مقررہ مدت کے لیے ایک ہزار دینار قرض لیا۔ قرض خواہ نے کہا۔ کہ کوئی گواہ لاؤ، تو ضرورت مند کہنے لگا۔ میرا گواہ تو اللہ ہی ہے۔ پھر اُس نے کہا، کوئی ضامن ہی لاؤ۔ تو وہ کہنے لگا میرا ضامن بھی اللہ ہی ہے۔ غرض اس نیک دِل آدمی نے بغیر گواہ اور ضامن کے ایک ہزار دینار قرض میں دے دیے۔ اتفاق ایسا ہوا۔ کہ جب قرض کی ادائیگی کا وقت آیا، تو مقروض دریا سے اُس پار سفر پر تھا، تاہم اُسے ادائیگیِ قرض کی ذمہ داری کا احساس تھا۔ وہ کنارے پہ آیا، مگر کوئی کشتی نہ پائی جو اُسے دوسرے کنارے پر پہنچا دے۔ سخت پریشان تھا، کہ قرض کی ادائیگی وقت پہ نہ ہو سکے گی۔ اسی سوچ بچار میں اُس نے دونوں ہاتھ اللہ کی بارگاہ میں دُعا کے لیے اٹھا دیے اور عرض کیا، مولا کریم! میں نے فلاں شخص کے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ کہ اسکی رقم فلاں تاریخ کو لوٹا دوں گا۔ رقم موجود ہے۔ مگر دریا کے پار جانے کے لیے سواری موجود نہیں۔ اگر قرض خواہ کو رقم وقت پہ نہیں ملتی تو وعدہ خلافی ہوتی ہے۔ اے اللہ! اب تو ہی اس کا انتظام فرما۔ آخر اس کے دِل میں ایک خیال آیا۔ اُس نے ایک لکڑی لی۔ اس کو کھوکھلا کر کے اس میں ایک ہزار دینار اور قرض خواہ کے نام ایک رقعہ رکھ دیا۔ پھر اس کا منہ اچھی طرح بند کر کے اس کو دریا میں ڈال دیا اور خود پھر ادھر اُدھر کشتی تلاش کرنے لگا۔ اُدھر قرض خواہ کو یاد آیا کہ آج قرض کی ادائیگی کی تاریخ ہے۔ اور مقروض دریا سے اُس پار گیا ہوا ہے۔ پتہ نہیں آتا ہے یا نہیں۔ اِسی خیال میں وہ دریا کے کنارے پہنچا۔ مگر دوسری طرف سے کوئی کشتی آتی دکھائی نہ دی۔ وہ مایوس ہو گیا۔ وہ واپس آنے ہی والا تھا۔ کہ اُسے بہتی ہوئی ایک لکڑی نظر آئی۔ اُسنے قریب سے لکڑی کو پکڑ لیا کہ گھر میں کسی کام آئے گی۔ یا ایندھن کے طور پہ ہی استعمال کر لیں گے۔ گھر پہنچ کر جب اس کو توڑا گیا۔ تو اس میں سے ایک ہزار دینار اور مقروض کا رقعہ مِلا۔ وہ شخص اپنا قرض واپس پا کر مطمئن ہو گیا۔

○

کئی دن بعد مقروض شخص کو کشتی میسر آگئی چنانچہ وہ دریا پار کر کے قرض خواہ کے ہاں پہنچا۔ اور اُسے ایک ہزار دینار پیش کیے۔ اس کے ساتھ معذرت بھی کی کہ وہ قرض کی رقم مقررہ تاریخ پر نہ لوٹا سکا۔ کیونکہ اُسے کشتی میسر نہیں آئی تھی۔ مگر قرض خواہ نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کر دیا کہ مجھے رقم واپس مل چکی ہے۔ جب مقروض نے زیادہ اصرار کیا تو قرض خواہ نے کہا کہ تم حلفیہ بیان کرو کہ کیا تم نے ایک ہزار دینار لکڑی میں بند کر کے سمندر میں نہیں بہا دیے تھے۔ آخر کار اُسے تسلیم کرنا پڑا کہ اُس نے واقعی تاریخ مقررہ پر ایسا ہی کیا تھا۔ چنانچہ ان کے درمیان تصفیہ ہو گیا۔ یہ واقعہ نبی علیہ السلام سے صحیح سند کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ اس قسم کے واقعات اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نمونے ہوتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کر کے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ پکے سچے مسلمانوں کا شیوہ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ جیسے ان دو مسلمانوں کا تھا۔ کہ قرض دینے والے نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا۔ اور لینے والے نے دوبارہ رقم لینے سے انکار کر دیا۔ مگر آج کے مسلمان کا حال یہ ہے۔ کہ مقررہ تاریخ گزر جاتی ہے۔ قرض خواہ پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ اور مقروض ٹال مٹول کرتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچتی ہے۔ نہ مقروض کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔ اور نہ قرض خواہ اسکی مجبوری کو سمجھتا ہے دونوں خود غرضی کا شکار ہیں۔ ایک دوسرے کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی ہمدردی مفقود ہو جاتی ہے جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ مذکورہ مثال سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ جب فریقین نیک نیت ہوں تو پھر اللہ تعالیٰ بھی اُن کی مدد فرماتا ہے۔

تحریر مدیون کا حق ہے

دستاویز کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ دستاویز کی تیاری کس کا حق ہے۔ یعنی کون فریق اس کو لکھوانے کا حقدار ہے۔ فرمایا وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ یعنی تحریر وہ شخص کرائے جس کے اوپر حق ہے۔ اور وہ مدیون یا مقروض ہے۔ اُسے چاہیئے کہ وہ قرضہ کی شرائط ٹھیک ٹھیک لکھوائے۔ اور اس معاملہ میں کسی قسم کی زیادتی نہ کرے۔ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ اور اپنے پروردگار سے ڈر جائے۔

وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا اور تحریر کراتے وقت کسی چیز کی کمی نہ کرے، بلکہ دستاویز بالکل درست طور پر لکھوائے۔ کہ اتنی رقم یا فلاں چیز قرض پر لی گئی ہے۔ اور یہ فلاں تاریخ کو فلاں جگہ واپس کرنی ہے۔ بعض اوقات لکھاتے وقت بھی ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ اور تحریر میں زبانی معاہدے کے برخلاف لکھواتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیئے اور انصاف کی بجائے ظلم قائم ہوجاتا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ کہ لکھوانے والا اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ درست طریقے سے دستاویز تیار کروا سکے۔

ایسی صورت کے متعلق فرمایا فَإِن كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَن يُمِلَّ هُوَ یعنی اگر مقروض جسے دستاویز لکھوانے کا حق ہے بے عقل ہے یا ضعیف ہے۔ یا تحریر کروانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ مقصد یہ کہ اس میں کوئی ایسی فطری کمزوری ہے جس کی بنا پر وہ درست تحریر کروانے سے قاصر ہے۔ ایسا کم عقل ہے، کہ معاملے کو سمجھتا نہیں۔ یا بہت کمزور یا بوڑھا ہے کہ حواس درست نہیں یا زبان نہ جاننے کی وجہ سے لکھانے کی استطاعت نہیں رکھتا، تو فرمایا فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ اس کے ترجمان، ولی، سرپرست، نمائندہ یا وکیل کی ذمہ داری ہے کہ وہ انصاف کے ساتھ تحریر مکمل کرائے۔ اور کسی قسم کی رو رعایت نہ کرے۔ ادھار سے متعلق باقی دو قوانین یعنی گواہی اور رہن کا ذکر آئندہ دروس میں آئیگا۔

درس یکصد بست وچہار (١٢٤) — آیت ٢٨٢ نصف آخر

وَاسۡتَشۡهِدُوۡا شَهِيۡدَيۡنِ مِنۡ رِّجَالِكُمۡ‌ۚ فَاِنۡ لَّمۡ يَكُوۡنَا رَجُلَيۡنِ فَرَجُلٌ وَّامۡرَاَتٰنِ مِمَّنۡ تَرۡضَوۡنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنۡ تَضِلَّ اِحۡدٰٮهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحۡدٰٮهُمَا الۡاُخۡرٰىؕ وَلَا يَاۡبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوۡاؕ وَلَا تَسۡـَٔمُوۡۤا اَنۡ تَكۡتُبُوۡهُ صَغِيۡرًا اَوۡ كَبِيۡرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖؕ ذٰلِكُمۡ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰهِ وَاَقۡوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدۡنٰٓى اَلَّا تَرۡتَابُوۡۤا اِلَّاۤ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيۡرُوۡنَهَا بَيۡنَكُمۡ فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَلَّا تَكۡتُبُوۡهَا ؕ وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ ۖ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيۡدٌ ؕ وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّهٗ فُسُوۡقٌ ۢ بِكُمۡ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿٢٨٢﴾

ترجمہ: اور گواہ بنا لو دو گواہ اپنے مردوں میں سے۔ پس اگر نہ ہوں "مرد" تو ایک مرد اور دو عورتیں اُن میں سے جن کو تم گواہوں میں سے پسند کرتے ہو اس وجہ سے کہ اگر اُن دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اُس کو یاد دلا دے۔ اور گواہ انکار نہ کریں جس وقت اُن کو بلایا جائے گواہی کے لیے، اور نہ دلگیر ہو اس بات سے کہ لکھو تم معاملے کو چھوٹا ہو یا بڑا اُس کی مدت تک، یہ بات زیادہ انصاف والی ہے اللہ کے نزدیک، اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی ہے۔ اور یہ زیادہ قریب ہے کہ تم شک نہ کرو مگر یہ کہ دست بدست تجارت ہو جس کو تم اپنے درمیان گردش دیتے ہو۔ اور تم پر گناہ نہیں ہے۔ اس بات میں کہ اسے نہ لکھو، اور گواہ بنا لو جس وقت تم سودا کرتے ہو، اور نہ نقصان پہنچایا جائے لکھنے والے کو

اور نہ گواہ کو، اگر تم ایسا کرو گے تو یہ تمہارے اندر فسق اور نافرمانی والی بات ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور اللہ تم کو سکھاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے (٢٨٢)

ربط آیات

ادھار کے معاملے سے متعلق تین قوانین کا ذکر گذشتہ درس میں ہو چکا ہے یعنی دستاویز کی تیاری، گواہی اور رہن۔ ان میں دستاویز یعنی تحریر کے احکام بیان ہو چکے ہیں۔ آج کے درس میں گواہی سے متعلق احکام ہیں اور اس کے ساتھ تحریر کی دوبارہ تاکید آئی ہے۔ البتہ تیسرے اصول یعنی رہن کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں آئے گا۔

گواہی کی شرائط

آپس میں لین دین کرتے وقت یا کوئی دیگر معاملہ طے کرتے وقت فرمایا وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ اپنے میں سے دو گواہ مقرر کر لو۔ گواہی کی ضرورت مختلف معاملات میں پڑتی ہے۔ مثلاً مقدمات میں سے فوجداری مقدمہ اور دیوانی مقدمہ میں گواہی کے معیار مختلف ہیں۔ اسی طرح دینی معاملات اور دنیوی معاملات میں گواہی کی شرائط مختلف ہیں۔ تو جس قسم کا معاملہ درپیش ہوگا۔ اس کے مطابق گواہی کی شرائط عائد ہونگی۔ عام معاملات میں اس آیت کی رو سے کم از کم دو گواہ ہونے چاہئیں۔ مگر حدیث نبوی کی روایت کے متعلق ایک ثقہ آدمی کی شہادت بھی کافی ہے۔ عام معاملات میں آزاد مرد کی گواہی قابل قبول ہوتی ہے، غلام کی گواہی معتبر نہیں ہوتی۔ روایت کے مسئلہ میں اگر استاذ اور شاگرد ایک مجلس میں موجود ہوں تو شاگرد کی روایت مقبول ہے۔ مگر دنیوی معاملات میں شہادت علی الشہادت کا اصول تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب اصل موجود ہو، تو فرع کی گواہی معتبر نہیں سمجھی جاتی۔ یعنی اصل کی موجودگی میں فرع گواہی نہیں دے سکتا۔

اس آیت کریمہ میں جس گواہی کا ذکر ہے، وہ عام معاملات سے متعلق ہے ان میں سے فوجداری مقدمات میں سے حدود و قصاص کے مقدمات میں صرف مردوں کی گواہی قابل قبول ہے۔ عورتوں کی شہادت قبول نہیں کی جاتی۔ زنا کے مقدمہ میں سورۃ نور میں "بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ" کا ذکر ہے۔ یعنی چار مرد عینی گواہ

ہونے چاہئیں۔ وہاں پہ عورتوں کی شہادت قابلِ قبول نہیں ہے۔ عام طور پہ نابالغ بچے کی گواہی تسلیم نہیں کی جاتی مگر امام مالکؒ بعض شرائط کے ساتھ بچے کی گواہی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ دیگر ائمہ کا مؤقف یہ ہے کہ گواہی کے سلسلے میں رجال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس سے مراد بالغ مرد ہے، نہ کہ نابالغ بچہ، اسی طرح مسلمان کی گواہی معتبر ہے۔ مگر کافر کی گواہی قابلِ قبول نہیں۔ جب کہ وہ مسلمان پر ہو۔ ہاں کافروں کی گواہی ایک دوسرے کے خلاف درست ہے۔ علاوہ ازیں گواہ کا عادل ہونا بھی شرط ہے۔ فاسق کی گواہی معتبر نہیں۔ جو شخص شرعی حدود کی علی الاعلان خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ فاسق ہے اور ایسے شخص کی گواہی بھی مقبول نہیں۔ پھر گواہ کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ جس معاملے کے متعلق گواہی دے رہا ہے۔ اس معاملے کا اسے علم ہو۔ اگر اسے علم ہی نہیں۔ تو پھر اس کی گواہی چہ معنی دارد۔ وہ تو جھوٹا گواہ کہلائے گا۔
شہادت میں گواہ کا ذاتی مفاد نہیں ہونا چاہیئے اگر اسے کوئی ذاتی فائدہ پہنچ رہا ہے تو ایسی گواہی مردود ہوگی۔ یا اگر گواہ اس لیے گواہی دے رہا ہے کہ وہ خود کسی نقصان سے بچ جائیگا تو ایسی شہادت بھی مقبول نہ ہوگی اسی طرح گواہ لالچی اور بے مروت نہیں ہونا چاہیئے جسکے خلاف گواہی دے رہا ہے اسکے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہونی چاہیئے۔ ورنہ گواہی باطل ہوجائیگی فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ جہاں تہمت کا اطلاق ہوتا ہو وہاں بھی گواہی قبول نہیں کی جائیگی مثلاً باپ بیٹے کے بارے میں گواہی دے تو نامنظور ہوگی۔ یا غلام نوکر وغیرہ اپنے مالک کے حق میں گواہی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ وہ محکوم ہے اور لازماً اپنے حاکم کے حق میں جائیگا۔

عورتوں کی گواہی

فرمایا معتبر گواہی یہ ہے۔ کہ تم میں سے دو مرد گواہی دیں فَاِنْ لَّمْ یَکُوْنَا رَجُلَیْنِ اور اگر دو مرد گواہ میسر نہ ہوں فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ تو ایک مرد اور دو عورتیں کافی ہیں۔ یعنی دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا۔ اور یہ گواہ ایسے ہوں مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ جو تمہیں پسند ہوں۔ ظاہر ہے۔ کہ پسندیدہ وہی ہونگے، جو نیک اور عادل ہوں گے۔ جن سے ٹھیک ٹھیک گواہی کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ غیر ثقہ اور جھوٹے آدمی سے درست گواہی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

فرمایا ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کو اکٹھا رکھنے میں حکمت یہ ہے۔ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا اگر ان میں سے ایک بھول جائے۔ فَتُذَكِّرَ

إِحْدٰهُمَا الْأُخْرٰى تو دوسری اُسکو یاد دلائے کیونکہ عورتیں عام طور پر مردوں کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہیں، ان کے دماغ میں رطوبت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے اُن سے نسیان زیادہ واقع ہوتا ہے اور وہ بھول جاتی ہیں یہ ایک انسانی فطرت ہے ورگرنہ بعض عورتیں بڑی ذہین ہوتی ہیں۔ بعض اوقات، ایک لڑکی امتحان میں لڑکے سے زیادہ نمبر حاصل کر لیتی ہے۔ بعض عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیت بخشی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بعض اوقات مردوں کے مقابلہ میں زیادہ ذہین ثابت ہوتی ہیں۔ تاہم عام فطرت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے یہ قانون عطا کیا۔ کہ چونکہ عورت کا مزاج اعصابی ہوتا ہے۔ اکثر بھول جاتی ہیں۔ اللہ نے دماغی کیفیت ہی ایسی بنائی ہے۔ لہٰذا ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی مقبول ہوگی

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دفعہ خطبہ کے دوران فرمایا کہ عورتیں ناقصات العقل وَالدِّیْن ہیں۔ ایک عورت نے عرض کیا کہ ہم ناقص العقل کیوں ہیں۔ ہم میں کیا کمزوری پائی جاتی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کیا اللہ نے دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر نہیں رکھی۔ تو اس نے عرض کیا۔ ہاں حضور ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ عقل کی کمی کی وجہ سے ہے۔ عورت میں نسیان یعنی بھول کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ پھر فرمایا کہ عورتوں میں دین کا نقصان یہ ہے۔ کہ وہ ہر ماہ کئی کئی روز تک نماز نہیں پڑھ سکتیں، روزہ نہیں رکھ سکتیں، یہ دین کا نقصان ہے۔ اگرچہ گناہ نہیں ہے۔ یہ اُن کی مجبوری ہے مگر نقصان تو بہر حال ہے۔

شہادت اور قسم

یہ شہادت کا قانون ضروری ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ کسی مقدمہ کا فیصلہ دو طریقے سے ہو سکتا ہے۔ یا تو فریقین گواہ پیش کریں گے یا فیصلہ قسم پر ہوگا۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ قَضٰی بِیَمِیْنٍ وَشَاهِدٍ یعنی حضور علیہ السلام نے یا تو گواہوں پر فیصلہ فرمایا یا قسم پر۔ یعنی اگر گواہ موجود نہیں ہیں۔ تو پھر فیصلہ قسم کے ذریعے ہوگا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ معاملات میں چونکہ دو گواہ ضروری ہیں۔ اور اگر دو کی بجائے صرف ایک ہی گواہ میسر ہو تو دوسرے

گواہ کی کمی قسم اٹھانے سے پوری ہوگی، وگرنہ فیصلہ درست نہ ہوگا۔ امام ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمہ کرام فرماتے ہیں۔ البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر یعنی گواہ پیش کرنا مدعی کی ذمہ داری ہے اور قسم اٹھانا مدعا علیہ کے ذمہ ہے۔ بہر حال حضور نے بعض اوقات گواہوں پر فیصلہ کیا اور بعض اوقات قسم پر یعنی اگر موقع کا کوئی گواہ موجود نہیں ہے۔ تو مدعا علیہ کی بریت کے متعلق اس سے قسم اٹھوائی کہ وہ بے گناہ ہے۔

گواہ کی ذمہ داری

گواہوں کی حاضری کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوْا اور جب گواہوں کو طلب کیا جائے تو وہ گواہی کے لیے آنے سے انکار نہ کریں۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ کوئی معاملہ الجھ گیا ہے۔ وہ موقع کے گواہ ہیں تو انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک شہادت دیکر معاملہ کا تصفیہ کرا دیں۔ یہ ان کی اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ تاہم فقہائے کرام فرماتے ہیں، کہ گواہ کا گواہی دینا استحباب کے درجے میں ہے، اسے گواہی کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں اگر معاملہ اس نہج کا ہے۔ کہ کوئی اور گواہ نہیں ہے۔ صرف یہی ایک گواہ ہے۔ جو شہادت دینے پر آمادہ نہیں۔ تو ایسی صورت میں اس پر واجب ہو جاتا ہے۔ کہ وہ گواہی کے لیے حاضر ہو، وہاں انکار کی کوئی گنجائش نہیں ایسے ہی معاملہ سے متعلق فرمایا۔ کہ جب گواہوں کو شہادت کے لیے طلب کیا جاوے تو وہ انکار نہ کریں۔

جھوٹی گواہی

حضور علیہ السلام نے جھوٹی گواہی (شہادت زور) کو شرک کے برابر قرار دیا ہے خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ فرقان میں عباد الرحمان کی صفات بیان فرمائی ہیں ان میں یہ بھی ہے "وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ" کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ جھوٹی گواہی دینا سخت گناہ کی بات ہے۔ اس کی وجہ سے ہی جھوٹ کا سچ اور سچ کا جھوٹ بن جاتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں۔ کہ انگریز کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق شہادت خود بنائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں گواہ آزاد نہیں ہوتا۔ کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق

شہادت دے بلکہ وکیل حضرات اور خود پولیس والے گواہ کو سکھاتے پڑھاتے ہیں۔ کہ اس طرح کہنا ہے۔ اور اس طرح نہیں کہنا۔ یہ چیز دیانتداری کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم تو یہ ہے۔ "اَقِیْمُوا الشَّھَادَۃَ لِلّٰہِ" اللہ کے لیے بغیر کسی رو رعایت کے گواہی دو۔ کسی امیر غریب، چھوٹے بڑے، اعلیٰ ادنیٰ کا لحاظ نہ کرو بلکہ صحیح صحیح واقعہ بیان کر دو۔ نہ کسی فریق سے ناجائز امید رکھو اور نہ کسی کے شر کا خوف دل میں لاؤ بلکہ گواہی کو محض اللہ کے لیے قائم کرو۔ اگر یہ چیز پیدا نہ ہوگی، تو دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ لوگ ذلیل و خوار ہی ہوتے رہیں گے۔ لہٰذا گواہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس کے بغیر انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

تحریر کب ضروری ہے

آیت کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے تحریر کی دوبارہ تاکید فرمائی ہے۔ فرمایا وَلَا تَسْئَمُوْٓا اَنْ تَکْتُبُوْہُ صَغِیْرًا اَوْ کَبِیْرًا اِلٰٓی اَجَلِہٖ معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا معمولی نوعیت کا ہو یا اہم اُسے لکھنے میں دلگیر نہ ہوں یعنی تحریر میں تساہل نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اُسے مدتِ مقررہ تک لکھ لینا چاہیئے۔ مستدرک امام حاکمؒ کی روایت ہے جسے امام ابن کثیرؒ نے بھی بیان فرمایا ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا، کہ تین قسم کے آدمیوں کی دُعا قبول نہیں ہوتی۔ پہلا شخص وہ ہے جو خود مومن اور عادل ہے۔ مگر اس کی بیوی بدکردار، بداخلاق اور فاسق ہے وہ سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتی۔ اگر ایسا شخص بُری عورت کو طلاق دے کر جُدا نہیں کرتا، تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ بے غیرتی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ دوسرا شخص وہ ہے۔ جو کسی یتیم کا سرپرست ہے مگر یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے ہی اُس کا مال اُس کے حوالے کر دیتا ہے اور بچہ مال کو ضائع کر دیتا ہے۔ یہ ایسے شخص کی دُعا بھی قبول نہیں ہوتی، فرمایا، تیسرا شخص وہ ہے، جو کسی کو قرض دیتا ہے مگر اُسے لکھتا نہیں، یہ شخص بھی اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے لہٰذا اس کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔

فرمایا تحریر کر لینا ذٰلِکُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ

انصاف والی بات ہے۔ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی چیز ہے۔ وَاَدْنٰی اَلَّا تَرْتَابُوْا اور زیادہ قریب ہے کہ تم شک و شبہ میں نہ پڑو۔ یہ سب تحریر کے فوائد میں سے ہیں۔ ہاں ایک صورت میں عدم تحریر کی گنجائش ہے اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ کہ دست بدست تجارت ہو جسے تم اپنے درمیان گردش دیتے ہو۔ یعنی معاملہ ایسا ہو۔ کہ ادھر چیز لی اور ادھر رقم ادا کر دی یعنی سودا بالکل نقد ہے۔ اس میں ادھار کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا تو پھر نہ لکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ تحریر کا مقصد تو یہ ہے۔ کہ مقررہ مدت پہ جب لین دین ہو، تو کوئی جھگڑا نہ کھڑا ہو جائے۔ مگر جب ادھار کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ اور تعین مدت کا سوال ہی نہیں تو پھر تنازعہ پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لہذا نقد معاملے میں تحریر کی ضرورت نہیں ہے ہاں اگر ایسی صورت میں بھی کوئی لکھنا چاہے۔ تو احسن ہے۔ اگر آئندہ زمانے میں معاملے کی نوعیت معلوم کرنا چاہو، تو تحریر کے ذریعے ٹھیک معلومات حاصل ہو سکیں گی۔ تاہم ایک عام اصول یہ بتایا کہ لین دین کے معاملہ میں وَاَشْهِدُوْآ اِذَا تَبَايَعْتُمْ سودا کرتے وقت گواہ ضرور بنا لو، اگر اس کی تحریر نہیں کرتے تو کوئی حرج نہیں۔ مگر گواہ ضرور بنا لو۔ کہ لین دین کا معاملہ ہے کسی وقت بھی کوئی تنازعہ پیدا ہو سکتا ہے جس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے گواہی ضروری ہے۔

کاتب اور گواہ کا تحفظ

اللہ تعالیٰ نے جہاں کتابت اور گواہ کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ وہاں کاتب اور گواہ کا تحفظ بھی فرمایا ہے۔ تنازعہ کی صورت میں بعض اوقات فریقین کے ساتھ کاتب اور گواہ کو بھی مشکلات پیش آتی ہیں۔ جن کی وجہ سے انہیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے زمانے میں کوئی شخص گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے۔ کہ اسے کتنی دفعہ عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ اور اس کا کتنا وقت ضائع ہوگا۔ اور پھر جس کے خلاف گواہی دیگا۔ وہ اس کا دشمن بن جائے گا اور اسے نقصان پہنچائے گا۔ گواہی سے باز رکھنے کے لیے کتنے

گواہوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالےٰ نے معاملے کے فریقین کو نصیحت فرمائی ہے وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ اور نہ نقصان پہنچایا جائے لکھنے والے کو اور نہ گواہ کو۔ اگر ان اصحاب کو اور کوئی تکلیف نہ ہو تو کم از کم اُن کے وقت کی قدر اور ان کی سواری کا انتظام تو ہونا چاہیئے تاکہ کسی دوسرے شخص کی گواہی کے لیے انہیں ذاتی طور پر نقصان تو نہ ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ کاتب اور گواہ کو تکلیف نہ دو، اُسے نقصان نہ پہنچاؤ:

فرمایا وَاِنْ تَفْعَلُوْا اگر تم ایسا کرو گے۔ ان شریف آدمیوں کو نقصان پہنچاؤ گے، ان کا تحفظ نہیں کرو گے۔ فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ یہ فسق ہوگا، خدا کی اطاعت سے باہر نکلنے کے مترادف ہوگا، لہٰذا جہاں اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہو، وہاں کاتب اور گواہ کی جان و مال کے بھی محافظ بنو، اور انہیں ناجائز تکلیف نہ پہنچاؤ۔

خوفِ خدا

فرمایا وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللہ سے ڈر جاؤ۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرنا معاملہ لین دین کا ہو، یا نکاح طلاق کا، ہر حالت میں خوفِ خدا کو دل سے نہ نکالنا۔ دنیا کے معاملات کے متعلق ہیرا پھیری کر کے، دھوکا اور فریب دیکر معاملے کو رفع دفع کر لینے سے بظاہر مسئلہ ختم ہو جاتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ یاد کرا رہے ہیں۔ کہ یہ معاملہ ایک دن اللہ کی عدالت میں بھی پیش ہونا ہے۔ یہاں تو تم چالاکی کر کے مواخذہ سے بچ جاؤ گے، مگر اس سب سے بڑی عدالت کے سامنے کوئی چال کام نہیں آئیگی۔ وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر رہے گا۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ جس کی عدالت میں بالآخر تمہیں پیش ہونا ہے۔ فرمایا وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ اللہ تمہیں ایسی ہی نیکی اور اچھائی کی باتیں سکھاتا ہے۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات کے معاملات اور ان کے متعلق احکام تمہیں اللہ تعالیٰ سکھاتا ہے۔ ان پر عمل کرو گے تو اس دنیا میں بھی چین کی زندگی بسر کرو گے اور آخرت میں بھی اس کی گرفت سے بچ جاؤ گے اور یاد رکھو وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ وہ تمہارے حال سے ناواقف ہے بلکہ وہ تمہاری نیتوں سے بھی واقف ہے لہٰذا تم اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتے

اپنے اعمال کو ہمیشہ درست رکھو گے، تو فلاح پاؤ گے۔

قرآن پاک کی یہ سب سے لمبی آیت ہے اس ایک آیت میں اللہ تعالےٰ نے بیسیوں مسائل بیان فرمائے ہیں۔ تاہم لین دین کے معاملے میں دو قوانین یعنی تحریر اور گواہ کا بیان آچکا ہے۔ اب اگلی آیت میں تیسرے اہم قانون رہن کا تذکرہ ہو گا۔

درس یکصد بست و پنج (۱۲۵)

آیت ۲۸۳

وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۳﴾

ع ۳۹/۷

ترجمہ :- اور اگر تم سفر میں ہو، اور کاتب (لکھنے والے) کو نہ پاؤ، پس رہن ہے قبضہ کیا ہوا۔ پس اگر تمہیں بعض کو بعض پر اعتبار ہو، پس چاہیئے کہ وہ شخص ادا کر دے اس چیز کو جس میں اس پر اعتبار کیا گیا ہے اور جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے۔ وہ اپنی امانت کو ادا کر دے اور ڈرتا رہے اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے اور مت چھپاؤ گواہی کو۔ اور جو شخص اس گواہی کو چھپائیگا۔ بیشک اس کا دل گنہگار ہوگا اور اللہ جو کچھ تم کام کرتے ہو، اس کو خوب جانتا ہے۔ ﴿۲۸۳﴾

ربطِ آیات

اس سے پہلے لین دین کے معاملے سے متعلق دو احکام کا بیان آچکا ہے۔ سب سے پہلے اللہ جل شانہ نے تحریر کے متعلق احکام اور اس کی اہمیت بیان فرمائی۔ پھر ایسے معاملات میں گواہ کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا ذکر فرمایا۔ اب اگلی آیت میں تیسرے اصول یعنی رہن کے متعلق مسائل کا تذکرہ ہے۔ یعنی جب کسی کو ادھار دو اس کے بدلے میں کوئی چیز رہن کے طور پر رکھ لو۔ جب قرضہ واپس ہوگا تو رہن شدہ چیز واپس کر دی جائے گی۔

مسئلہ رہن

رہن وہ چیز ہوتی ہے۔ جو قرض کے بدلے میں کسی شخص کے پاس رکھی جاتی ہے اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے۔ کہ اگر قرضہ کی رقم مقررہ مدت میں ادا نہ کی جائے تو قرض خواہ اُس چیز کو فروخت کر کے اپنی رقم پوری کر لے، اور جو کچھ باقی بچے وہ مقروض کو لوٹا دے

اس اصطلاح میں مقروض یا مدیون کو راہن کہتے ہیں کہ اس نے کوئی چیز رہن رکھی ہے اور جس کے پاس رہن رکھی جاوے وہ مرتہن کہلاتا ہے۔ رہن میں چیز پر قبضہ ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر رہن مکمل نہیں ہوتا۔ فَرِهٰنٌ مَّقْبُوضَةٌ میں اسی طرف اشارہ ہے رہن میں منقولہ یا غیر منقولہ کوئی بھی جائیداد رکھی جا سکتی ہے مثلاً مکان، زمین، باغ۔ جانور، زیور، گاڑی وغیرہ وغیرہ۔

ارشاد ہوتا ہے۔ وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ اور اگر تم سفر پر ہو وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا اور کاتب نہ ملے فَرِهٰنٌ مَّقْبُوضَةٌ پس رہن ہے قبضہ کیا ہوا۔ اس آیت کریمہ میں رہن کے لیے سفر کی حالت ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تم سفر کی حالت میں ایسا کر سکتے ہو، مگر فقہائے کرام اور محدثین عظام کا اس بات پر اتفاق ہے۔ کہ رہن حضر یعنی اقامت کی حالت میں بھی درست ہے۔ اور یہاں پر سفر کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اس عمل کی ضرورت سفر میں زیادہ پڑتی ہے۔ خاص طور پر جبکہ لکھنے والا میسر نہ ہو تو پھر اس کے بغیر چارہ نہیں کہ مرتہن راہن کی کوئی چیز بطور رہن رکھ لے۔ اور جب راہن قرضہ واپس کرے تو اپنی مرتہنہ چیز واپس لے لے۔ اقامت کی حالت میں رہن خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے، بخاری اور ترمذی شریف کی صحیح حدیث میں آتا ہے۔ کہ آپ نے اپنے گھریلو اخراجات کے لیے مدینے کے ایک یہودی (ابوالشحم) سے بیس صاع اور بعض روایات کے مطابق تیس صاع اناج ادھار پر لیا تھا۔ اور اس کے بدلے میں اپنی درع یہودی کے پاس رہن رکھی تھی مگر آپ اسے اپنی حیات مبارکہ میں واپس نہ لے سکے۔ آپ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے قرض ادا کر کے درع واپس لی۔ مقصد یہ کہ رہن آپ نے مدینہ میں قیام کے دوران رکھا تھا۔ لہٰذا اس آیت میں سفر کی قید اتفاقی ہے۔

رہن شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرتہن رہن شدہ چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے یا نہیں مثلاً زیور پہن سکتا ہے یا نہیں، باغ کا پھل یا زمین کی پیداوار حاصل کر سکتا ہے یا کوئی دودھ دینے والا جانور ہے، تو اس کا دودھ پی سکتا ہے یا نہیں۔ اس معاملے

میں محدثین اور فقہائے کرام کے درمیان قدرے اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ راہن کی اجازت سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ مگر جمہور فقہائے کرام جن میں امام ابوحنیفہؒ آپ کے شاگردان امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ، امام زفرؒ، حسن بن زیادؒ، امام سفیان ثوریؒ وغیرہ فرماتے ہیں۔ کہ رہن شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جن روایات سے استفادہ حاصل کرنے کا جواز ملتا ہے۔ وہ ابتدائی دور کی روایات ہیں جب کہ سود کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی۔ جب سود کی ممانعت ہو گئی۔ تو رہن شدہ چیز سے نفع حاصل کرنا بھی جائز نہ رہا۔ ہاں نفع اٹھانا صرف ایک شکل میں جائز ہے۔ کہ جتنی مالیت کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اتنی رقم قرض میں سے منہا کر دی جائے۔ مرہونہ چیز اور اس کی آمدنی مرتہن کے پاس بطور امانت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس سے فائدہ اٹھا کر امانت میں خیانت کا مرتکب ہونا قطعاً جائز نہیں۔ آجکل اکثر لوگ مکان یا زمین وغیرہ نفع اٹھانے کی غرض سے رہن رکھتے ہیں۔ چونکہ راہن مجبور ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اس سے اجازت لے لیتے ہیں۔ اس ضمن میں فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ راہن کی اجازت کے باوجود مرتہن کو فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص مقروض کی اجازت سے سود کو جائز قرار دے لے۔ لہٰذا رہن شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

امانت کی پاسداری

فرمایا فَإِنْ أَمِنَ بَعْضُكُم بَعْضًا اگر تمہیں بعض کو بعض پر اعتبار ہو فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ تو جس شخص کے پاس امانت رکھی گئی ہے اُسے چاہیے کہ اپنی امانت واپس کر دے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر قرض خواہ مدیون پر اعتبار کر کے بلا گواہ یا بلا رہن قرض دے دیتا ہے۔ تو پھر قرض کی رقم مقروض کے پاس امانت ہے اُسے یہ امانت مقررہ مدت پر واپس لوٹانی چاہیئے۔ اس ضمن میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی بھی ہے۔ عَلَى الْيَدِ حَتَّىٰ تُؤَدِّيَ ہر چیز حاصل کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ اُسے واپس بھی کرے اس کو امین سمجھ کر رقم یا کوئی دوسری چیز دی گئی تھی۔ لہٰذا امانت میں خیانت نہیں ہونی چاہیئے۔ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ اور اپنے پروردگار سے ڈرتا

سے ہے۔ کہ اگر امانت واپس نہ کی، تو اس کا ضرور مؤاخذہ ہوگا۔ اور اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکیگا،

کتمانِ شہادت گناہ ہے

گواہی کا مسئلہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ گواہ کون ہو اور گواہی کا نصاب کیا ہے یہاں پر شہادت کا ایک دوسرا پہلو بیان کیا گیا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص کسی معاملے کو جانتا ہے۔ اور وہ تنازعہ کے تصفیہ میں معاون ہو سکتا ہے۔ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ تو پھر شہادت کو چھپانے کی اجازت نہیں ہے۔ وَمَن يَكْتُمْهَا اور جو کوئی شہادت کو چھپائیگا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ تو اس کا دل گنہگار ہوگا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پہ دل کا اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ دل جسم انسانی میں ایک اعلیٰ حیثیت کا جزو ہے۔ اگر دل کی اصلاح ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے۔ اور دل کا بگاڑ پورے جسم کا بگاڑ ہے۔ دل مرکزِ اخلاق ہے۔ عقیدہ کی اچھائی یا برائی کا تعلق بھی دل سے ہے۔ اس لیے یہاں پہ فرمایا کہ جو کوئی گواہی کو چھپائے گا۔ حقیقت میں اس کا دل گنہگار ہے۔ اس کے دل میں فتور ہے۔ ورنہ وہ ایسی حرکت نہ کرتا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہے۔ تو سارا جسم ٹھیک ہے۔ اگر وہ بگڑ گیا ہے۔ تو سارا جسم خراب ہے فرمایا اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ یاد رکھو وہ لوتھڑا دل ہے۔ جس پہ سارے جسم کا دارومدار ہے۔ یہ دل ایسی چیز ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں سزا کا ذکر کیا ہے۔ تو وہاں بھی فرمایا تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ جہنم کی آگ کا اثر پہلے دل پہ ہوگا۔ پھر جسم پہ ہوگا۔ اسی لیے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب گواہی نہ دینے سے کسی کا حق ضائع ہو رہا ہو تو پھر گواہ کے لیے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ ضرور گواہی دے۔ گواہ کی یہ ذمہ داری وجوب کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے اگر گواہی سے انکار کرتا ہے۔ تو کتمانِ شہادت کا مرتکب ہو کر گنہگار ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی جھوٹی شہادت دیتا ہے۔ تو وہ بھی کتمانِ شہادت کا مرتکب تصور ہوگا۔ گویا گواہی کو چھپانا یا جھوٹی گواہی دینا برابر ہے۔

شہادت کا معاوضہ جائز نہیں

یہ ایک اصولی بات ہے۔ کہ جب کسی شخص پہ کوئی چیز واجب ہو جائے، تو پھر

اس کی عدم ادائیگی گناہ کا باعث ہوگی۔ لہذا اس کے لیے اُس کام کا معاوضہ طلب کرنا جائز نہیں رہتا۔ اگر ایسا کرتا ہے تو اس نے واجب کی ادائیگی نہیں کی بلکہ مالی منفعت کے لیے گواہی دی ہے۔ ہاں اتنی گنجائش موجود ہے۔ کہ گواہی دینے پر گواہ کو بھی کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر وہ اپنی جیب سے کرایہ خرچ کر کے گواہی کے لیے جاتا ہے یا اپنی سواری استعمال کرتا ہے، خور و نوش کا سامان خود کرتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا مالی نقصان ہوگا۔ اگر وہ اسے خوشی سے برداشت کرنے کے لیے تیار ہے تو کوئی حرج نہیں۔ تاہم اگر وہ متعلقہ فریق کی سواری استعمال کرے، اس کی طرف سے کھانا کھائے، یا جس قدر اس کا خرچ ہوا، وہ لے لے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ اس کے لیے جائز ہے۔

فرمایا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے حتیٰ کہ وہ تمہارے ارادوں اور مخفی عزائم سے بھی واقف ہے۔ تم غلط کام کر کے اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیکر انسان کی مزید راہنمائی فرمائی ہے۔ کہ اگر گرفت سے بچنا ہے۔ تو تقویٰ اختیار کرو۔ حیلے بہانے سے غلط کام کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تم اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپا نہیں سکتے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا
مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ
يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

ترجمہ:- اللہ ہی کے واسطے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم ظاہر کرو اس چیز کو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا اُسے چھپاؤ تو اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا تم سے۔ پس بخش دے گا جس کو چاہے اور سزا دے گا جس کو چاہے۔
اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۲۸۴﴾

اختتامی کلمات

سورۃ بقرہ کے دروس اختتام پذیر ہیں۔ اور آج کے درس سے سورۃ کا چالیسواں اور آخری رکوع شروع ہو رہا ہے قرآن پاک کی اس سب سے لمبی سورۃ میں مختلف الانواع احکام بیان ہوئے ہیں۔ جن میں اصول بھی ہیں اور فرعی مسائل بھی ہیں، عبادات، معاملات مالی و جانی جہاد، نکاح و طلاق اور دیگر بے شمار مسائل بیان ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے اس سورۃ کو سنام القرآن بھی کہا گیا ہے۔ گویا یہ سورۃ مبارکہ قرآن پاک کی کوہان ہے۔ اس کو قرآن پاک میں بلند مقام حاصل ہے۔

سورۃ کے آخری رکوع میں قرآن پاک کو نازل کرنے والے اللہ جل جلالہٗ کی حاکمیت اعلیٰ کا بیان ہے کیونکہ اس میں مندرج تمام احکام و شرائع اسی کی جانب سے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی قدرت اور تصرف کا بیان ہے۔ کہ اقتدار اعلیٰ بھی اسی کے پاس ہے اور ہر چیز کے تصرف پر بھی اُسی کا حق ہے۔ وہ جس طرح چاہے۔ اپنی پیدا کردہ اشیاء کو تصرف میں لائے۔ رکوع کی آخری آیات میں ایمان کی تفصیلات کا تذکرہ ہے۔ اور پھر بالکل آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دُعا کا قانون بتایا گیا ہے۔ اور وہ کلمات سکھائے گئے ہیں۔ جن کے ذریعے ایک بندے کو اپنے خالق و مالک کے حضور

دست بدعا ہونا چاہیئے، اور اپنے مالکِ حقیقی سے اپنے گناہوں کی مغفرت اور اللہ تعالےٰ کی مدد کی درخواست پیش کرنی چاہیئے۔

حاکمیت اعلیٰ

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا اعلان ان الفاظ میں ہوتا ہے۔ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ یعنی کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ کسی چیز کی تخصیص کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جن کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ فلاں چیز کو فلاں کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے۔ تخصیص کی پہلی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کا بنانے والا ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص کوئی برتن، مشینری، اوزار بناتا ہے تو اس کے حق میں وہ چیز خاص ہوتی ہے۔ خصوصیت کی دوسری وجہ ملکیت ہوتی ہے جس چیز کا کوئی مالک ہے۔ اُسے اس کے ساتھ تخصیص حاصل ہے۔ اور تیسری وجہ حق تصرف ہے۔ جس شخص کو کوئی چیز تصرف میں لانے کا حق ہے۔ اس کو بھی خصوصیت حاصل ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی تمام کائنات کے ساتھ تخصیص ملاحظہ فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ میں مذکورہ بالا تینوں صفات پائی جاتی ہیں۔ جن کی بناء پر اُسے کائنات کے ذرہ ذرہ کے ساتھ تخصیص ہے۔ وہ ہر چیز کو بنانے والا۔ وہ "بَدِیۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" ہے آسمان و زمین کو پیدا کرنے والی وہی ذات ہے۔ وہی ہر شے کا صانع ہے "اَلَّذِیۡۤ اَتۡقَنَ کُلَّ شَیۡءٍ" ہر چیز اللہ تعالیٰ کی کمال صنعت اور کاریگری کا شاہکار ہے۔ خود انسان اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے "لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِیۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِیۡمٍ" ہم نے انسان کو بہترین شکل و صورت میں پیدا کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے[۱] وان اللّٰہ صانع کل صانع وصنعتہ ہر چیز اور اس کی صنعت کو پیدا کرنے والا اللہ وحدہ لاشریک ہے۔

چونکہ ان تمام چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اُسی نے ہر چیز کو بنایا ہے۔ لہٰذا ان کا مالک حقیقی بھی وہی ہے "لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کائنات

۱؎ روح المعانی ص ۳۶ ج ۲۲ (فیاض)

کی تمام چیزیں اس کی ملک ہیں۔ اللہ کے علاوہ انسان کو جن چیزوں کی ملکیت حاصل ہے یہ عارضی ہے اور اللہ کے حکم سے ہے۔ حقیقی ملکیت صرف خدا تعالیٰ کی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی کسی انسان کی ملکیت قائم رہتی ہے۔ وہ جب چاہتا ہے کسی سے حقِ ملکیت سلب کر لیتا ہے۔ اور پھر نہ ملکیت باقی رہتی ہے اور نہ قبضہ۔ انسان خود فنا ہو جاتا ہے۔ اور وہ تمام چیزیں جن پہ ملکیت کا دعویٰ تھا۔ یہیں رہ جاتی ہیں۔ گویا حقیقی مالک بھی ہر چیز کا اللہ ہی ہے۔

تیسری چیز تصرف ہے۔ اور کائنات کے ذرے ذرے پہ اللہ تعالیٰ ہی کو کامل اور مکمل تصرف حاصل ہے۔ اگر کسی دوسرے کو تصرف کی اجازت ہے۔ تو وہ خاص وقت تک کے لیے اور عارضی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہی ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو ذاتی تصرف حاصل نہیں۔ چونکہ خلقت، ملکیت اور تصرف کی تینوں صفات اللہ تعالیٰ ہی میں پائی جاتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ ہی کے لیے ہے۔

محاسبہ کب ہوگا

اللہ تعالیٰ نے اپنی حاکمیت اعلیٰ بیان کرنے کے بعد بنی نوع انسان سے فرمایا وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ط جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے، تم اسے ظاہر کرو، یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ اُس کا حساب لے گا یہاں پہ یہ بات قابلِ غور ہے۔ کہ کسی اچھے یا بُرے کام کا مرتکب ہونا اور کسی چیز کا محض دل میں خیال آنا، دو مختلف چیزیں ہیں۔ کسی غلط کام کے کرنے سے محاسبے کا عمل تو ذہن میں آتا ہے۔ مگر محض دل میں کسی خیال کے آجانے سے محاسبہ کیسا ہوگا جب کہ یہ ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ اس ضمن میں شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ کہ انسان کے نفس میں جو چیزیں آتی ہیں، وہ پانچ اقسام ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز اعتقاد ہے۔ انسان کا اعتقاد کیسا ہے، وہ توحید پر کاربند ہے یا شرک میں ملوث ہے۔ اس کے دل میں اخلاص پایا جاتا ہے۔ یا نفاق سے پُر ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ اُسے اللہ تعالیٰ پہ پختہ یقین ہے یا وہ تردد اور شک کا شکار ہے۔ اعتقاد

سے متعلق جو کچھ بھی اس کے دل میں پایا جاتا ہے۔ اس کا محاسبہ ہوگا۔ اگر وہ موحد مخلص اور اللہ پر یقین رکھنے والا ہے۔ تو اللہ کے ہاں جزا پائیگا اور اگر مشرک، منافق یا متردد ہے۔ تو سزا کا مستحق ہوگا۔ بہر حال ہر انسان کا اعتقاد قابلِ محاسبہ اور قابلِ مواخذہ ہے۔

دوسری چیز جس پر محاسبے کا دارومدار ہے، محبت یا نفرت کا جذبہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ محض اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت یا نفرت ہونا اچھے اعمال میں سے ہے۔ ایسا شخص اللہ کے ہاں جزا کا حقدار ہے۔ اور جس کے دل میں جذبہ محبت و نفرت اپنی ذاتی اغراض یا غیر اللہ کے لیے ہے۔ وہ لازماً سزا کا مستوجب ہوگا۔ دوسری حدیث میں فرمایا من احبّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ جس نے اللہ کی خاطر کسی سے محبت کی۔ اُسی کی خاطر نفرت کی۔ اُسی کی خاطر دیا اور اسی کی خاطر نہ دیا۔ تو اس نے ایمان کو مکمل کر لیا۔ ایک اور روایت میں اَنْکَحَ لِلّٰہِ کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی کو اللہ کے لیے نکاح کر دیا تو وہ کامل ایمان دار بن گیا۔ مقصد یہ ہے۔ کہ دل میں آنے والے محبت یا نفرت کے جذبات اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابل محاسبہ ہیں۔

اس ضمن میں تیسری چیز فرمایا نیت اور عزم ہے۔ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے متعلق اچھی یا بُری نیت قابل محاسبہ ہے۔ اگر کوئی شخص اچھائی کا کام کرنے کی محض دل سے نیت کرتا ہے۔ اور ابھی اس پر عملدرآمد شروع نہیں کیا، تو اسکو نیکی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور پھر جب نیک عمل کو کر گزرتا ہے۔ تو دس نیکیوں کا حقدار ہو جاتا ہے۔ جہاں تک بُری نیت کا تعلق ہے۔ محض نیت پر مواخذہ نہیں ہے۔ البتہ جب اس نیت یا ارادے کے مطابق عمل کریگا۔ تو اس کے نامۂ اعمال میں صرف ایک ہی برائی لکھی جائیگی، اور وہ قابل محاسبہ ہوگا۔

نفس انسانی میں غیر اختیاری طور پر آنے والی چوتھی چیز اخلاق ہے۔ اور اس میں تقویٰ، زہد، حرص، لالچ وغیرہ آتے ہیں۔ کسی انسان کے اندر جس قدر تقویٰ اور زہد ہوگا

اُسی قدر اُس کے درجات بلند ہوں گے۔ اس کا ہر عمل اُس کے تقویٰ اور زہد کے ساتھ پرکھا جائیگا۔ اور اگر کوئی شخص حرص، لالچ یا دیگر قبیح اشیاء کا شکار ہے۔ تو پھر اس کے مطابق اس کا فیصلہ ہوگا۔ بہر حال اخلاق بھی قابلِ محاسبہ اور قابلِ مؤاخذہ ہیں۔

پانچویں چیز جس پر محاسبہ انسانی کا انحصار ہے، وہ خطرات ہیں جو انسان کے دِل میں کھٹکتے رہتے ہیں۔ اِن خیالات کی کئی قسمیں ہیں۔ جن میں سے بعض قابلِ مؤاخذہ ہیں اور بعض پر کوئی گرفت نہیں۔ پہلی چیز ایسا خیال ہے جو انسان کے دِل میں پیدا ہوتا ہے کہ فلاں غلط کام کرنا چاہیئے۔ مگر فوراً یہ خیال خود بخود چلا جاتا ہے۔ ایسے خیال پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہے اسے حاجس کہتے ہیں۔ دوسری قسم کا ایسا خیال ہے جو انسان کے دِل و دماغ پر وارد ہو کر کچھ دیر قائم رہتا ہے اور پھر زائل ہو جاتا ہے اسے خاطر کہتے ہیں اور اس پر بھی کوئی محاسبہ نہیں۔ تیسری قسم کا خیال ایسا ہے کہ جب یہ آتا ہے تو اس سے انسان لطف اندوز بھی ہوتا ہے، اسے کو ہم کہتے ہیں۔ اور ہماری اس امت میں ایسے خیال کا بھی کوئی محاسبہ نہیں، چوتھی قسم کا خیال حدیث نفس ہے۔ کہ انسان خود اپنے دل میں کوئی ایسی ویسی قابلِ مؤاخذہ بات کرتا ہے، جس پر عمل نہیں کرتا ایسے خیال پر بھی امت محمدیہ پر کوئی مؤاخذہ نہیں اگرچہ سابقہ امتیں قابلِ مؤاخذہ تھیں اس ضمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول مشہور ہے۔ کہ ایسے خیالات سے بچا کرو۔ کیونکہ جس گھر میں دھواں اٹھتا ہے۔ وہ اگرچہ جلاتا تو نہیں مگر گھر کو سیاہ ضرور کر دیتا ہے۔ اِس قسم کے خیالات انسان پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا، کہ پہلی امتیں اس سے مستثنیٰ نہ تھیں تاہم ہماری امت میں اس خیال پر بھی کوئی مؤاخذہ نہیں۔

فرمایا اِن خطرات کی پانچویں قسم وہ عزم اور ارادہ ہے جس کے ذریعے انسان برائی پر عملدرآمد میں پختہ ہو جاتا ہے۔ ایسے خیالات کا دِل میں آنا قابلِ مؤاخذہ ہے۔

شانِ نزول

جب یہ آیت نازل ہوئی، کہ تم اپنے دِل کی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ، یُحَاسِبْكُم بِهِ اللّٰهُ اللہ تم سے حساب لیگا، تو صحابہ کرامؓ پریشان ہو گئے۔ اور حضور علیہ السلام سے عرض کیا، حضور! ہم نماز، روزہ، صدقہ، جہاد وغیرہ کی تکالیف برداشت کر سکتے ہیں

مگر اب ایک ایسی چیز کا حکم آیا ہے، جو ہمارے بس میں نہیں۔ دل میں خیالات کا آنا ایک ایسی چیز ہے جسے از خود ٹال نہیں سکتے۔ اگر اس پر محاسبہ شروع ہو گیا، تو ہمارے لیے کوئی جائے رفتن نہ ہو گی۔ ہم اللہ کے ہاں کیسے سرخرو ہوں گے۔
حضور علیہ السلام نے فرمایا، تم اس طرح کے لوگ نہ بنو جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم تھی۔ جنہوں نے کہا تھا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا یعنی ہم نے احکام کو سُن لیا مگر ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تمہارا کام یہ ہے۔ کہ اللہ مالک الملک کی طرف سے جو بھی حکم آئے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دو اور اس کیلئے جذبہ اطاعت کا اظہار کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے بخشش کی دعا مانگو۔ چنانچہ جیسا کہ آگے آرہا ہے صحابہ کرامؓ ہر حکم کی تصدیق اس طرح لیا کرتے تھے "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا" یعنی اے ہمارے رب ہم نے تیرا حکم سن لیا۔ اسکی اطاعت کی۔ تو ہمیں معاف فرما دے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے صحابہ کے سوال کے جواب میں فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ میری امت کے دلوں میں آنے والے وسوسوں پر مؤاخذہ نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ گرفت اُن کی ہے جو دل سے نکل کر زبان پر آجائیں گے۔ یا اُن پر عمل درآمد ہو جائے گا۔ جب تک عمل نہیں ہو گا، ایسے خیالات پر مؤاخذہ نہیں ہو گا۔

حضرت امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ باطل اعتقادات، برے اخلاق یا فاسد نیت جو دل میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ کرے گا۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اسکی اس طرح توجیہ فرماتی ہیں۔ کہ مؤاخذہ تو ہر چیز پر ہوتا ہے مگر انسان کو جو تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچتی رہتی ہیں، وہ ایسے اعمال کا کفارہ بن جاتی ہیں اور انسان محاسبے سے بچ جاتا ہے۔ حضور کا فرمان ہے۔ کہ جب کسی شخص کو کوئی کانٹا چبھ جائے، ٹھوکر لگ جائے۔ یا وہ کوئی چیز رکھ کر بھول جائے تو اس وجہ سے اس کو جو پریشانی لاحق ہوتی ہے، وہ اسکی خطاؤں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اور انسان جب دنیا سے جاتا ہے تو پاک صاف ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے

فرمایا محاسبے کے اس قانون کے باوجود فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ اللہ تعالیٰ

جسے چاہے معاف کر دے۔ جس شخص میں بخشش حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہوگی، اللہ تعالیٰ اُسے معاف فرما دے گا۔ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ اور جو سزا کے قابل ہوگا، اُسے سزا میں مبتلا کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ وہ کسی کو ناجائز تکلیف میں نہیں ڈالتا۔ کیونکہ اس کا اپنا فرمان ہے "وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ" اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اس کے ہاں رائی کے ایک دانے کے برابر بھی کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے بھی آچکا ہے "وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ" تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی اور یہ بھی فرمایا "تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ" ہر شخص کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

فرمایا یہ سزا اور جزا اللہ تعالیٰ کو ہی سزاوار ہے۔ کیونکہ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ مالک ہے اور اسے حق حاصل ہے۔ کہ وہ جس طرح چاہے تصرف کرے۔ الغرض گذشتہ دروس میں آنے والے ہزاروں مسائل کا یہ اجتماعی تبصرہ ہے۔ کہ مالک الملک جو چاہے کرے۔ وہ جو بھی حکم دے، بندوں کا فرض ہے کہ اسکی تعمیل کریں۔ اور ہر مشکل حکم پر اس سے آسانی کی دُعا کریں اور اس کے ساتھ بخشش طلب کریں۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ
كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ
بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ
رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ﴿۲۸۵﴾

ترجمہ: ایمان لایا ہے رسول اُس چیز پر جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر اتاری گئی ہے۔ اور مومن بھی ایمان لائے ہیں۔ سب ایمان لائے ہیں۔ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر (اور وہ یہ کہتے ہیں) ہم نہیں تفریق کرتے کسی میں اس کے رسولوں میں سے۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور ہم اطاعت کرتے ہیں۔ ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! اور تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے ﴿۲۸۵﴾

ربطِ آیات

گذشتہ آیت میں محاسبہ کا تذکرہ تھا۔ کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اُسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ اُس کا حساب لیگا۔ نزولِ آیت پر صحابہ کرامؓ کو سخت تشویش ہوئی۔ کہ اگر غیر اختیاری خیالات پر بھی انسان کی گرفت ہوگئی، تو نجات مشکل ہو جائے گی۔ صحابہ کرامؓ نے اپنی تشویش کا ذکر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا، تم یہودیوں کی طرح یوں نہ کہو سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا یعنی ہم نے سن لیا اور انکار کر دیا۔ بلکہ اس قسم کی صورت حال میں یوں کہا کرو۔ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ہم نے سن لیا اور مان لیا۔ اور اس کے بعد اللہ تعالےٰ سے معافی مانگو۔ چنانچہ صحابہ کرام نے دل کی پوری محبت کے ساتھ کہا "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ"

مدح صحابہ کرامؓ

اس آیت میں درحقیقت اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کی تعریف فرمائی ہے۔

کیونکہ انہوں نے دلی محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کو قبول کیا۔ اور اس میں کسی قسم کا لیت ولعل نہ کیا۔ بلکہ اللہ کے حضور اپنی عاجزی کا اظہار کیا۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو صحابہؓ کی ادا پسند آئی اور اس کے ساتھ ساتھ حضور علیہ السلام کا ذکر مبارک بھی ہے۔ جس کی وجہ سے صحابہؓ کی شان مزید بلند ہو گئی۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس آیت میں اللہ نے صحابہؓ کے ساتھ حضور نبی کریم کا ذکر کرکے یہ بات واضح کی ہے۔ کہ صحابہ کرامؓ بھی حضور کی طرح ایماندار تھے۔ اور ان کے ایمان حضور کے ایمان کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اگرچہ پیغمبر کا ایمان اکمل درجے کا ہوتا ہے۔ اور صحابہؓ کا ایمان کامل درجے کا۔ مگر دونوں طرح کے ایمانوں کو باہم ملانے سے صحابہ کرامؓ کے درجات کی بلندی کی نشان دہی ہوتی ہے صحابہ کرامؓ کی اس اطاعت گزاری پہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ جو چیز رسول کی طرف اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی تھی۔ رسول اس پہ ایمان لایا۔ اور اس کے ساتھ مومن بھی ایمان لائے۔ یہاں پہ ایک بات تو یہ ثابت ہوتی ہے۔ کہ شریعت نبی پہ نازل ہوتی ہے کسی غیر نبی پہ نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ صحابہ بھی اس چیز پہ ایمان لائے جس پہ پیغمبر لایا ہے۔ تو یہ صحابہ کرامؓ کی مدح ہو گئی۔ اور ان کی حوصلہ افزائی ٹھہری اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوئی جب کہ صحابہؓ نے کمال عاجزی وانکساری کے ساتھ اللہ کے حکم کو قبول کیا۔ اور اپنی لغزشوں کی معافی طلب کی۔

تصدیق بالقلب

اور آگے ایمان کے ارکان کا بیان ہے کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ سب کے سب صحابہ کرامؓ اللہ تعالیٰ پہ ایمان لائے۔ بنیادی طور پہ ایمان کے پانچ ارکان ہیں جن کی دل سے تصدیق کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ایمان مکمل نہیں ہو گا۔ یہ ارکان سب سے پہلے اللہ پہ ایمان لانا، پھر فرشتوں پہ، رسولوں پہ، کتابوں پہ اور قیامت کے دن پہ ایمان لانا ہے۔ شاہ عبد القادرؒ اٰمَنَ کا ترجمہ مان لیا کرتے ہیں یعنی دل سے تسلیم کر لیا۔ گویا دل سے تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔ اگرچہ زبان سے اقرار

بھی لازم ہے۔ مگر اس کی تکمیل تصدیق قلبی سے ہی ہوتی ہے۔ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ

ایمان باللہ

سب سے پہلے ایمان باللہ کا درجہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہونا کیونکہ یہ بنیادی چیز ہے۔ نہ صرف اس کا وجود ہے بلکہ وہ واجب الوجود بھی ہے یعنی اس کا وجود خود بخود ہے۔ کسی دوسرے کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ اللہ کے علاوہ ہر چیز کا وجود عطا کیا ہوا ہے اور عارضی ہے مگر اللہ ہی ایک واحد ذات ہے جو واجب الوجود ہے اللہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔ اور اس لفظ میں یہ چیز پائی جاتی ہے واجب الوجود المستجمع لجمیع صفات الکمال واجب الوجود وہ ذات ہے جس میں تمام صفات کمال پائی جاتی ہیں۔ وہ ذات مبرء عن النقص والزوال ہے۔ اس ذات میں نہ کوئی عیب ہے اور نہ کوئی نقصان والی چیز ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ دائم و قائم رہے گا۔ اُسے کبھی زوال نہیں آئے گا۔ جب لفظ اللہ بولا جاتا ہے تو یہ تمام صفات اس میں آجاتی ہیں۔ فارسی زبان میں جب اللہ کا ترجمہ خدا کیا جاتا ہے۔ تو اس کا معنی بھی یہی ہے۔ کہ وہ ہستی جو خود بخود ہے۔ کسی دوسرے کی محتاج نہیں، گویا یہ لفظ بھی واجب الوجود کا ہی ہم معنی ہے کہ وہ ذات خود بخود ہے اور جمیع صفات کمال کے ساتھ متصف ہے۔ وہ ذات نقص و زوال جیسی صفات سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کمال کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ اور ان ہی سے اللہ کی پہچان ہوتی ہے۔ ان صفات میں الرحمٰن، الرحیم، المالک، القہار، الستار الصمد، الغنی، الحی القیوم وغیرہ ہیں۔ یہ سب وجودی یا مثبت صفات ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی بعض منفی صفات ہیں۔ مثلاً "لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ / لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا، وَلَمْ تَکُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ یعنی نہ اس کی اولاد ہے۔ اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اسکی بیوی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ——— نہ کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے۔ "لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ" اس کو نہ اونگھ آتی

ہے اور نہ نیند آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اِن تمام عیب اور نقصان والی صفات سے پاک اور منزہ ہے۔ جب سبحان اللہ کہا جاتا ہے تو اس کا معنیٰ بھی یہی ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نقصان اور عیب والی صفات سے پاک ہے۔ نہ اس کو تھکاوٹ ہوتی ہے۔ اور نہ اس پر موت طاری ہوتی ہے۔ الحمد للہ کا بھی یہی معنیٰ ہے۔ کہ وہ تمام صفاتِ کمال کا مالک ہے۔

صفاتِ الٰہی پر ایمان

جس طرح اللہ کی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسی طرح اس کی صفات پر ایمان لانا بھی لازمی ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ہستی کو مانتا ہے۔ مگر توحید کو نہیں مانتا، تو وہ ایماندار نہیں ہے۔ یا ایک کی بجائے دو یا تین الٰہ مانتا ہے جیسے مجوسی یا عیسائی وغیرہ، تو بھی مشرک اور کافر ہوگیا۔ اگر توحید میں کوئی خرابی آئے گی تو انسان کافر ہو جائے گا۔ حضرت امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اگر کوئی شخص خدا کی ہستی کو ماننے کے باوجود کہتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کے لیے رسول نہیں بھیجتا، تو پھر بھی کافر ہے۔ کیونکہ رسول مبعوث کرنا اللہ کی صفت ہے۔ جس سے انکار کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء اور رسول بھیجے ہیں اور آخر میں آپ کو مکمل پروگرام دے کر سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا ہے اب قیامت کا انتظار ہے۔ کوئی نیا پروگرام نہیں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت تقدیر بھی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں تصریح ہے ——— کہ جب تک کوئی تقدیر پر ایمان نہیں لائے گا، خدا کی بارگاہ میں اس کی عبادت مقبول نہیں۔ خواہ وہ احد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دے اور تقدیر کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کائنات میں ہو چکا ہے، ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا، سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور مشیت سے ہوتا ہے " وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی " وہی ذات ہے جس نے تمام چیزوں کو مقدر فرمایا ہے لہذا لفظ اللہ میں تقدیر پر ایمان لانا بھی

آگیا، کیونکہ یہ اللہ کی صفت ہے اور اس کی تمام صفات پہ ایمان لانا ضروری ہے فرمایا رسول اور اس کے صحابہؓ اللہ پہ ایمان لائے۔ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ اور اس کے فرشتوں پہ بھی ایمان لائے، فرشتوں پہ ایمان لانا، ایمان کا دوسرا رُکن ہے سب سے پہلے فرشتوں کے وجود پہ ایمان لانا ہوگا۔ اور پھر فرشتوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جیسے۔ ملاء الاعلیٰ اور ملاء السافل، عرش کے گرد گھومنے والے فرشتے، علیین میں رہنے والے، آسمانوں پہ مقیم اور پھر فضا میں رہنے والے، زمین پہ رہنے والے یہ تمام فرشتوں کی مختلف اقسام ہیں۔ امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ ملاء الاعلیٰ سے ملاء السافل تک فرشتوں کی سات قسمیں متعین ہیں اور ہر ایک قسم کو اللہ تعالیٰ نے الگ الگ اور مختلف نوعیت میں پیدا کیا ہے۔ جو فرشتے ملاء الاعلیٰ والے ہیں وہ اعلیٰ ترین یا نفیس ترین ہیں۔ ویسے فرشتے خواہ اوپر کے ہوں یا نیچے کے دوسری مخلوق سے لطیف تر ہیں۔ اس نورانی مخلوق میں روح، عقل اور شعور پایا جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ عبادت الٰہی سے نہ تھکتے ہیں، نہ اکتاتے ہیں۔ وہ معصوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کبھی نہیں کرتے "لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ" اور اللہ تعالیٰ انہیں جو کچھ حکم کرتا ہے۔ اس کی تعمیل کرتے ہیں "وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ" یہ اللہ تعالیٰ کی مقرب مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو فیضان کائنات میں پہنچتا ہے وہ انہی فرشتوں کے ذریعے پہنچتا ہے فرشتوں کے بعد لطافت کے لحاظ سے دوسرے درجے کی مخلوق جنات ہیں مگر وہ معصوم نہیں ہیں۔ بنی نوع انسان میں سے صرف انبیاء کی جماعت معصوم ہے باقی کسی مخلوق کو یہ گارنٹی حاصل نہیں ہے۔

فرشتوں پہ ایمان

لطیف مخلوق ہونے کی وجہ سے فرشتے ہمیں اس دنیا میں نظر نہیں آتے ہاں اگر وہ شکل تبدیل کر لیں تو انسانوں کو بھی نظر آسکتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ مبارک میں جب جبرائیل علیہ السلام دحیہ کلبیؓ یا کسی مسافر کی صورت میں آتے تھے، تو

نظر آتے تھے۔ عالم برزخ اس مادی جہان سے لطیف ہے اور حشر اس سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ جب انسان اُس جہان میں پہنچیں گے، تو ان میں بھی کمال درجے کی لطافت پیدا ہو جائیگی، لہذا سب کو فرشتے نظر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جنتی لوگوں کے پاس فرشتے آکر سلام کہیں گے "سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ" غرضیکہ فرشتوں پر ایمان لانا بھی ارکانِ ایمان میں سے ہے۔

کتابوں پر ایمان

ایمان باللہ اور ایمان بالملائکہ کے بعد فرمایا وَكُتُبِهٖ یعنی حضور رسول مقبول اور صحابہ کرامؓ اللہ تعالیٰ کی کتابوں پر بھی ایمان لائے ہیں۔ کُتُب جمع کا صیغہ ہے۔ کہ کہ اجمالاً تمام آسمانی کُتب پہ ایمان لانا اور تفصیلاً قرآن پاک پہ ایمان لانا ضروری ہے۔ قرآن پاک کا ہر حکم صحیح، برحق اور واجب التعمیل ہے۔ پہلی کتابیں بھی اللہ تعالےٰ نے مختلف ادوار میں لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمائیں۔ اُن کے تمام احکام پہ عمل کیا جائے یہ ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے

رہا یہ سوال کہ اللہ نے کل کتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ اس بارے میں قرآن پاک کی کسی آیت یا کسی صحیح روایت میں کوئی تصریح نہیں ملتی۔ ہاں بزرگانِ دین کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ چار کتابیں تو بڑی ہیں یعنی زبور، تورات، انجیل اور قرآن پاک اس کے علاوہ کچھ چھوٹی کتابیں یا صحیفے ہیں۔ امام شافعیؒ کی روایت کے مطابق ایک سو چار کتابیں اور صحیفے اللہ نے نازل فرمائے۔ ہر نبی کے لیے کتاب کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بہت سے انبیاء اپنے سے قبل آنے والی کتاب کی ہی پیروی کا درس دیتے رہے۔ مثلاً نزول تورات کے بعد جتنے نبی آئے وہ تورات کی ہی تبلیغ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پہ وحی آتی تھی، مگر قانون تورات کا ہی چلتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں کا ذکر آتا ہے۔ اسی طرح یونس علیہ السلام اور بعض دیگر انبیاء کے صحیفے بھی تھے۔ موجودہ بائیبل یعنی تورات کے ساتھ ۳۹ صحیفے اور انجیل بھی ہے۔ پہلے پانچ باب تورات کے ہیں اور باقی دوسرے نبیوں کے

صحیفے ہیں۔ اس طرح یہ سب خلط ملط ہو چکا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے اللہ کی کتابوں میں بہت گڑبڑ کی ہے۔ مگر کچھ چیزیں آج بھی صحیح ہیں اور قرآن کے مطابق ہیں۔ یہ روایت بھی مشہور ہے۔ کہ حضرت ادریس علیہ السلام پر تیس ۳۰ صحیفے نازل ہوئے تھے۔ بہرحال آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ارکان ایمان میں سے ہے۔

رسولوں پر ایمان

آگے ایمان کے چوتھے جزو کے متعلق فرمایا وَرُسُلِہٖ یعنی اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرے گا۔ تو کافر ہو جائے گا۔ نصاریٰ کو دیکھ لیں۔ سابقہ تمام انبیاء کو مانتے ہیں مگر حضور خاتم النبیین کو تسلیم نہیں کرتے، لہذا کافر ٹھہرے۔

تمام رسولوں پر ایمان لانے کی کیفیت اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمائی لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ کسی رسول کو مان لیا اور کسی کا انکار کر دیا۔ یہودیوں کا یہی حال ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہیں۔ حضور خاتم النبیین کو بھی نہیں مانتے، لہذا یہ کافر ہی ہیں۔ جب تک ہر رسول پر ایمان نہ رکھیں خواہ ان کا نام معلوم ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس جس دور میں جس جس نبی کو مبعوث فرمایا۔ وہ سب اس کے برگزیدہ بندے تھے۔ اپنی اپنی قوم کے ہادی اور راہنما تھے، ہم ان سب کی تصدیق کرتے ہیں وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ جو کچھ بھی اللہ نے اپنے نبیوں کو دیا ہے سب برحق ہے۔ اور ہمارا ان پر ایمان ہے لَا نُفَرِّقُ کا یہی معنیٰ ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں موجود ہے، انہوں نے عرض کیا حضور انبیاء کرام کا سلسلہ کیسے شروع ہوا۔ تو آپ نے فرمایا کہ سب سے پہلے نبی آدم علیہ السلام تھے۔ گویا سب سے پہلے انسان نبی تھے۔ صحابی نے عرض کیا۔ حضور کیا وہ نبی تھے ارشاد فرمایا، ہاں نبی مکلم تھے۔ اللہ نے اُن سے کلام فرمایا تھا۔ اور سب سے آخری نبی

حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم ہیں۔ روایت میں یہ بھی ہے۔ کہ مجموعی طور پر ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش نبی اور رسول آئے ہیں۔ ان میں سے رسول تین سو تھے تین سو پندرہ اور تین سو پچیس کی روایت بھی آتی ہیں۔ بہر حال یہ سب برحق نبی اور رسول تھے۔ رسول وہ ہوتا ہے جس کو مستقل شریعت ملے، اُسے کتاب کا ملنا ضروری نہیں ہے۔ شریعت ضروری ہے۔ مثلاً حضرت اسماعیل علیہ السلام اللہ کے رسول تھے مگر اُن پر مستقل کتاب نازل نہیں ہوئی۔

الغرض! تفریق بین الرسل کفر ہے۔ تمام انبیاء اور رُسل پر ایمان لانا ضروری ہے اگر کسی ایک کا بھی انکار کیا۔ تو سب کے انکار کے مترادف ہو گا۔ اس آیت میں ایمان کے اجزا بیان ہو چکے اور ساتھ ساتھ حضور علیہ السلام کے صحابہؓ کی تعریف بھی بیان ہو گئی۔

بخشش کی طلب

وَقَالُوا سَمِعْنَا ان سب نے کہا کہ ہم نے سن لیا۔ اللہ تعالےٰ نے جو کچھ نازل فرمایا ہے۔ وہ ہم تک پہنچ گیا۔ وَاَطَعْنَا اور ہم اس کی دل وجان سے فرمانبرداری کرتے ہیں۔ اطاعت کرتے ہیں۔ کسی چیز کا انکار نہیں کرتے۔

غُفْرَانَكَ رَبَّنَا اے پروردگار! ہم تجھ سے بخشش کے طلبگار ہیں۔ ہمیں بخش دے۔ اور ہماری کوتاہیوں کو معاف کر دیا جائے۔ غفران کا معنیٰ ڈھانپ دینا ہوتا ہے۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ ہماری لغزشوں کو اپنی بخشش کے پردے میں ڈھانپ لے۔ ان پر کوئی باز پرس نہ کرنا۔

قیامت پر ایمان

اب ایمان کے پانچویں جزو کے متعلق فرمایا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔ اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ گویا معاد یعنی قیامت پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ کہ ایک وقت آئے گا۔ جب قیامت برپا ہو گی۔ پھر سب کو اللہ تعالیٰ کی عدالت میں حاضر ہو کر اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہو گی۔ اس کے بغیر بھی انسان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ گویا یہ ایمان کے پانچ جزو ہو گئے، توحید، رسول، ملائکہ، کتب اور قیامت کا دن۔ دوسرے مقام پر فرمایا وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ "

وہ آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اس جہاں کا آخری دن ہوگا۔ اس کے بعد دوسرے جہان کے ایام شروع ہوجائیں گے۔ اور ان کی نوعیت الگ ہوگی۔

لہذا آخرت کے دن (Last day) پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ کہ وہ دن آنے والا ہے۔ جب حساب کتاب ہوگا۔ اور اس کے نتیجے میں جزا یا سزا اور جنت یا دوزخ کی منزل برحق ہے۔ جب انسان کو مکلف بنایا گیا ہے۔ تو پھر اس کے لیے جزا و سزا کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اس کی تصدیق ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کافر ہوجائے گا۔ جب تک ایمان کے تمام ارکان پر ایمان نہیں لائے گا، گرفت سے نہیں بچ سکتا۔

یہ وہی اجزائے ایمان ہیں۔ جن کے متعلق سورۃ کی ابتداء میں اشارہ کیا گیا تھا۔ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ یعنی متقین وہ ہیں جو بن دیکھے ایمان رکھتے ہیں۔ یہاں پر اسی چیز کی تشریح ہے۔ کہ وہ کون کون سے امور ہیں۔ جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ تو یہاں پر واضح کردیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات مع اسکی صفات، ملائکہ، کتابیں رسول اور روز قیامت ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حالانکہ نہ ملائکہ کو دیکھا، نہ رسولوں کو اور نہ قیامت کو دیکھا مگر ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہی ایمان بالغیب ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا
مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا ج
رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى
الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ج رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ج
وَاعْفُ عَنَّا وقفة وَاغْفِرْ لَنَا وقفة وَارْحَمْنَا وقفة اَنْتَ مَوْلٰنَا
فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ (۲۸۶) ع ۸

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اس نفس کے لیے وہی ہے جو اس نے کمایا۔ اور اس کے اوپر وبال بھی اُس چیز کا ہے جو اس نے کمایا۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے مؤاخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر جائیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے گزرے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! اور نہ اٹھوا ہم سے وہ چیز جس کی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ اور درگزر کر دے ہم سے۔ اور بخش دے ہم کو اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا آقا ہے۔ پس کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ (۲۸۶)

دین آسان ہے

مسلم شریف کی روایت میں موجود ہے کہ جب صحابہ کو تشویش لاحق ہوئی کہ کہیں دل میں پیدا ہونے والے غیر اختیاری خیالات پر اللہ تعالیٰ کی گرفت نہ آجائے تو نبی علیہ السلام نے انہیں فرمایا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے برعکس یوں کہا کرو "سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ" چنانچہ جب صحابہ کرامؓ نے دل کی گہرائیوں سے یہ کلمات کہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی تو حضور علیہ السلام نے نے صحابہؓ کو تسلی دی کہ غیر اختیاری چیزوں پر اللہ تعالیٰ مؤاخذہ نہیں کرتا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے ایک عام قانون بتا دیا کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا اللہ تعالیٰ

کسی جان کو تکلیف میں نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ کسی کی قوتِ برداشت سے زیادہ بوجھ ڈالنا عقل کے بھی خلاف ہے۔ جس چیز پہ انسان کا بس ہی نہیں اس پہ محاسبہ کرنا کیسے روا ہو سکتا ہے۔ بلکہ دینِ اسلام میں تو آسانی کا قانون کام کر رہا ہے۔ اسی سورۃ میں رمضان کے روزوں کے متعلق گزر چکا ہے "یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ" اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں کرتا۔ وہ تو رحمٰن اور رحیم ہے۔ وہ کسی کو تنگی میں نہیں ڈالتا۔ قرآن کریم میں دوسرے مقام پہ آتا ہے "مَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ" اللہ تعالیٰ نے دین میں تنگی نہیں ڈالی۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے اَلدِّیْنُ یُسْرٌ دین آسان ہے۔ اس میں کسی پہ سختی نہیں کی گئی۔ نماز کے متعلق آتا ہے۔ فَاِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ اگر طاقت نہ ہو کہ کھڑے ہو کر نماز ادا کر سکو فَصَلِّ قَاعِدًا تو بیٹھ کر پڑھ لو۔ اور بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے فَعَلٰی جَنْبٍ تو لیٹ کر پہلو کے بل پڑھ لو۔ گویا ہر مشکل کے وقت اللہ تعالیٰ نے رخصت دی ہے۔ جو چیز انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پہ مجبور نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی شخص نابینا ہے، تو اسے دیکھنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اس میں دیکھنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں ہے۔ اسی طرح جس شخص کے پاؤں کٹے ہوئے ہوں اُسے چلنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور جس کے ہاتھ موجود نہ ہوں۔ اسے کوئی چیز پکڑنے کے لیے نہیں کہا جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اسکی صلاحیت سے زیادہ تکلیف میں نہیں ڈالتے، اور غیر اختیاری باتوں پہ اس کا مؤاخذہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا لَهَا مَا كَسَبَتْ انسان کے لیے وہ چیز ہے جو اس نے کمائی وَعَلَیْهَا مَا اكْتَسَبَتْ اور جو کچھ اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ کمائے گا وہی اس کو مفید ہوگی۔ اور اسی چیز کا اس پہ وبال پڑیگا۔ گویا اچھی چیز کا اچھا بدلہ ملیگا اور برائی پہ مؤاخذہ ہوگا۔ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسانی افعال اس کے اخلاق، نیت اور اندرونی ملکہ کے مطابق سرزد ہوتے ہیں۔ ان پہ مؤاخذہ ہوتا ہے۔

بھول اور خطا میں فرق

نسیان یا بھول ایسی غلطی کا نام ہے۔ جس میں نیت یا ارادے کو دخل نہ ہو۔ بلکہ کوئی کام بھول کر ہو جائے اور خطا سے مراد یہ ہے کہ نیت کچھ اور کام کی ہوتی ہے مگر عمل کوئی دوسرا ہو جاتا ہے۔ مثلاً روزے کی حالت میں کلی کی نیت سے منہ میں پانی ڈالا مگر وہ حلق سے نیچے اتر گیا۔ کسی شخص نے شکار کے جانور کے لیے گولی چلائی مگر وہ کسی انسان یا دوسرے جانور کو لگ گئی یہ خطا ہوتی ہے۔ اور آخرت میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ البتہ دنیا میں اس کی دیت اور کفارہ دینا پڑتا ہے۔ اگر کوئی شخص خطاً قتل ہو گیا ہے۔ تو اس کا خون بہا بھی دینا پڑیگا اور کفارہ کے طور پر دو ماہ کے روزے بھی رکھنے ہوں گے۔

اور اگر کسی کو عمداً قتل کیا ہے۔ تو اس کا دنیا میں بھی قصاص ہوگا اور آخرت میں اللہ کے ہاں بھی مؤاخذہ ہوگا۔ (اگر توبہ نہ کی ہو) بھول اور خطا میں یہ فرق ہے۔

بھول اور خطا پر مؤاخذہ نہیں

بھول کے متعلق حضور علیہ السلام کی حدیث میں آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ رَفَعَ عَنْ اُمَّتِیَ الْخَطَاءَ وَالنِّسْیَانَ وَمَا اسْتُکْرِھُوْا عَلَیْہِ اللہ تعالیٰ نے میری امت سے ایسے گناہ کو اٹھا دیا ہے۔ جو بھول، خطا یا جبر کی وجہ سے سرزد ہو۔ ایسے عمل پر کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اگر کسی کو مجبور کر کے کوئی کام کرایا جائے تو وہ اکراہ میں آئیگا مثلاً کوئی شخص دوسرے کو مجبور کر دے کہ شراب پی لو یا فلاں کام کر دو ورنہ تجھے قتل کر دیا جائے گا۔ تو یہ عمل اکراھاً ہوگا۔ اور اللہ کے ہاں اس پر کوئی محاسبہ نہیں ہوگا۔

البتہ دنیا میں ایسے امور کی تلافی کرنا پڑتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھنا بھول جائے، تو جس وقت اس کو یاد آئے اس وقت ادا کرے۔ اگر ایک دفعہ بھول گیا ہے تو اب بالکل ترک نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعد از وقت بھی ادا کرنا ہوگی۔ اسی طرح روزہ کی حالت میں غلطی سے پانی حلق کے اندر چلا گیا۔ تو اگرچہ عنداللہ اس کا مؤاخذہ نہیں۔ مگر جب روزہ ضائع ہوا، اس کی قضا دینا ہوگی۔ البتہ روزہ میں بھول کر کھانے پینے کی معافی ہے۔ ایسی صورت کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا اَطْعَمَہُ اللّٰہُ وَسَقَاہُ اللہ نے اس کو کھلایا پلایا۔ اس کا روزہ مکمل

ہوگیا۔ ایسے روزہ دوبارہ رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر بھول کر بغیر طہارت کے نماز پڑھ لی، تو اسے لوٹانا ہوگی۔ اس کی نماز نہیں ہوئی۔

دعائیہ کلمات

چنانچہ اسی نسیان اور خطا کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دعائیہ کلمات سکھائے۔ کہ اے میرے بندو! جب بھول جاؤ یا خطا ہو جائے تو مجھ سے ان کلمات کے ساتھ معافی طلب کر لیا کرو رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے تو ہمارا مؤاخذہ نہ کر۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ سورۃ بقرہ کے آخر میں جو دعائیں مذکور ہیں۔ جب بندہ ان کو ادا کرتا ہے۔ تو ہر دعا کے اختتام پہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے نَعَمْ قَدْ فَعَلْتُ یعنی اے میرے بندے ہاں! میں نے ایسا کر دیا، تیری دعا قبول کر لی۔

اس کے بعد دعا کا اگلا حصہ فرمایا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا اے ہمارے پروردگار! تو ہم پہ ایسا بوجھ نہ ڈال كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے لوگوں پہ بوجھ ڈالا۔ یہاں پہ بوجھ سے مراد وہ مشکل احکام ہیں۔ جو پہلی امتوں پہ وارد ہوئے۔ مفسرین کرام مثال کے طور پہ فرماتے ہیں۔ اسرائیلیوں پہ پانچ سے زیادہ نمازیں فرض تھیں لہذا وہ امت محمدی سے زیادہ مشکل میں تھے۔ بعض امتوں کو ہمیشہ روزے رکھنے کا حکم تھا اور بنی اسرائیل کی شریعت میں یہ حکم بھی تھا۔ کہ جس کپڑے پہ نجاست لگ جاتی تھی وہ دھونے سے پاک نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ قینچی سے قیمتی کپڑا بھی نجاست والی جگہ سے کاٹ ڈالنا پڑتا تھا۔ اسی طرح بنی اسرائیل حلال جانور کا گوشت تو کھا سکتے تھے مگر اس کی چربی استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ لہذا وہ گوشت سے چربی کو مشکل علیحدہ کر کے پھر کھاتے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کرنے کے لیے یہ شرط رکھ دی کہ ایک دوسرے کو قتل کرو۔ ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل قتل ہوئے، تب جا کر ان کی توبہ قبول ہوئی اپنے مال کا چوتھا حصہ انہیں بطور زکوٰۃ ادا کرنا پڑتا تھا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ جو کوئی آدمی گناہ کا مرتکب ہوتا تھا۔ تورات کے وقت فرشتے اس کے دروازے

پر لکھ دیتے تھے۔ جس سے اسکی سخت رسوائی ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے بوجھ سابقہ امتوں پر ڈال رکھے تھے جن کے متعلق یہاں یہ دعا کی جا رہی ہے کہ اے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے پہلی امتوں پہ ڈالا تھا۔ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ اور ہم سے وہ چیز نہ اٹھوا جسکی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تَحْمِلْ عَلَيْنَا سے شرعی احکام کا بوجھ ہے۔ جس کے متعلق دعا کی گئی ہے کہ ہم پر مشکل احکام نہ ڈال اور لَا تُحَمِّلْنَا سے مراد وہ قدرتی آفات و بلیات ہیں جو کسی قوم پہ نازل ہو جائیں۔ تو یہاں پہ اُن تکوینی مصائب کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہ مولا کریم! ہم سے ایسے قدرتی مشکلات کا بوجھ بھی نہ اٹھوا کہ جن کی ہم طاقت ہی نہیں رکھتے۔ مقصد یہ کہ ہمیں شرعی اور تکوینی ہر دو مشکل امور سے محفوظ رکھ۔

معافی کی درخواست

وَاعْفُ عَنَّا اے پروردگار! ہم کو معاف فرما دے۔ ہماری خطاؤں سے درگزر فرما۔ وَاغْفِرْ لَنَا ہماری کوتاہیوں کو بخش دے۔ غفر کا معنیٰ ڈھانپ دینا ہوتا ہے یعنی ہماری تمام لغزشوں کو اپنی رحمت سے ڈھانپ دے۔ وَارْحَمْنَا ہم پہ رحم فرما۔ ہم پر مہربانی فرما أَنْتَ مَوْلَانَا تو ہی ہمارا مولا ہے۔ جیسا کہ قاموس والے لکھتے ہیں لفظ مولیٰ پچیس معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تاہم اس مقام پہ مولا کا معنیٰ آقا اور کارگزار ہے۔ یعنی ہمارے کاموں کا بنانے والا اور ہماری سرپرستی کرنے والا تو ہی ہے۔

مولا معبود کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس کا معنیٰ ساتھی، صاحب، رفیق وغیرہ بھی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ یہاں پہ مراد ہمارا آقا ہے۔ متولی امور نا ہمارے کاموں کو بنانے والا، ہماری حاجات پوری کرنے والا۔ اے مولا کریم! تو ہی ہے فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ اور کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ یعنی ہم کو غلبہ عطا فرما۔

غلبہ اسلام

حضرت امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کافروں پہ غلبے کی نعمت بھی عطا فرمائی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ اہل دین اپنے دین پہ قائم رہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پہ فرمایا "اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ"۔

اگر تم صحیح ایمان پر قائم رہو گے، تو تم ہی غالب آؤ گے۔ خلفائے راشدینؓ کا زمانہ اس غلبے کا بہترین ثبوت ہے۔ صفین کے واقعہ تک مسلمان نصف دنیا پر غالب تھے۔ اور باقی دنیا میں بھی کوئی ایسی طاقت نہیں تھی۔ جو اہل ایمان سے ٹکر لے سکے۔ یہ غلبہ صرف پچاس سال تک قائم رہ سکا۔

غرضیکہ اگر دین والے دین پر قائم رہیں اور عام لوگ ان کے معاون ہوں، نفاق سے بچتے رہیں۔ بدعت سے بیزار رہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قائم ہوں، رشوت سود اور دیگر محرمات سے بچتے رہیں، تو کسی غیر قوم کو مسلمانوں پر تسلط حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب مسلمانوں میں یہ قباحتیں پیدا ہو جائیں گی، تو دوسری قومیں ان پر مسلط ہو جائیں گی اور یہ مغلوب ہو کر رہ جائیں گے۔ اب دیکھ لیجئے یہ تمام لعنتیں مسلمانوں میں موجود ہیں۔ حرام خوری عام ہے بدعات کا چرچا ہے۔ بلکہ اس کو عین کارِ ثواب سمجھ کر اس پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ بدعت کے علاوہ لوگ شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کسی حکومت نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں دیا۔ زبانی جمع خرچ ہو رہا ہے۔ عمل صفر کے برابر ہے۔ منافق کی تمام علامتیں مسلمانوں میں موجود ہیں۔ ان حالات میں اسلام کو غلبہ کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے اور صحیح دین اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

سورۃ بقرہ کی خصوصیت

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ بقرہ کو فسطاط القرآن فرمایا ہے۔ یعنی یہ سورۃ قرآن پاک کا بڑا خیمہ ہے۔ جس طرح ایک بڑے خیمے میں بہت سے ساز و سامان رکھنے اور رہائش کی گنجائش ہوتی ہے۔ اسی طرح اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نظامِ خلافتِ کبریٰ کے تمام اصول و فوائد بیان کر دیے ہیں۔ اس سورۃ میں دعوت الی التوحید والرسالت کا بیان ہے۔ قرآن کریم کی حقانیت اور صداقت بیان کی گئی ہے۔ فرائض خمسہ کے علاوہ جہاد، نظام سلطنت اور بے شمار مثالیں اور حکمت کی باتیں اس سورۃ میں پائی جاتی ہیں، اس لیے اسے فسطاط القرآن کہا گیا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں اس سورۃ کو سنام القرآن یعنی قرآن کی کوہان سے تعبیر

کیا گیا ہے۔ جس طرح اونٹ کی کوہان سب سے بلند ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک میں یہ سورۃ بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کی آخری دو آیتیں حضور علیہ السلام کو معراج کے موقع پر عطا ہوئی تھیں۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے لیکر قَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ تک کی آیتیں معراج کا خاص تحفہ ہے۔ پانچ نمازیں بھی معراج کا تحفہ ہے جو حضور امت کے لیے لائے۔ اور تیسرا تحفہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ لائے۔ کہ میری امت کا جو شخص خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنائیگا، اس کی غلطیوں کو معاف کر دیا جائے گا۔ ان آیات کی اہمیت اسی امر سے واضح ہے کہ ان میں اسلام کے ارکان خمسہ کا بیان ہے۔ جو سب سے اہم چیز ہیں۔ اور پھر اس میں اللہ کی مناجات ہے اور اس سے دُعا کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔

فضائل آیاتِ آخر سورۃ

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ جو شخص ان آیات کو رات کے وقت تلاوت کریگا۔ یہ آیات اس کے لیے ساری رات کی عبادت کے قائم مقام ہو جائیں گی۔ یا فرمایا تہجد کے قائم مقام ہوں گی بشرطیکہ انسان فرائض کا پابند ہو اور خلوص نیت کے ساتھ تلاوت کرے۔ یہ بڑی فضیلت والی آیتیں ہیں۔ انہیں ورد کے طور پر اختیار کر لینا چاہیے۔ ایک روایت میں یوں آتا ہے۔ کہ عرش معلی کے نیچے اللہ تعالیٰ کا ایک خزانہ ہے سورۃ بقرہ کی یہ آخری دو آیتیں اللہ تعالیٰ نے اس خزانہ میں سے نازل فرمائی ہیں۔ ان آیات کی اسی قدر فضیلت ہے۔ سبحانک اللھم وبحمدک